

خوبصورت کس اینوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

مارچ 2012

تعمیل
مطالعہ و ترویج

PDFBOOKSFREE.PK

انشائیہ
11

”نوکر شاہی“ پر ایک صاحب
دانش و بینش کا لوفانی تبصرہ

آپ کے خط
12

سپنس کی تلاش شادیت قلمین کی تلو
شیر باتیں کے شکر اور پڑھناں شوری

شہید زندہ
20

ماشی کا آئینہ اختیار اختیار اختیار
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

دائرہ در دائرہ
59

چند چھپرے رستموں
کی عیار یوں کا احوال

آتش نازید
75

ایک ونا شعار
دو شیزوی کی قلمندی کا احوال

کھنکھول
80

اسرار اور تحیر کے پردے میں
لپٹا ایک منفرط و طویل سلسلہ

صلیہ احسان
107

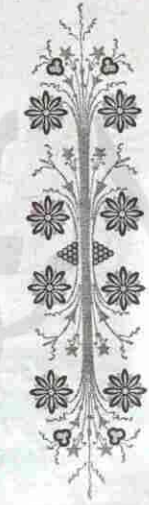
متضاد احساسات کے درمیان
کشمکش کا دلچسپ ماجرا

نیرت کے نائیر
121

اپنا ہست کے ناپرہشت
ویر ہست کی دلکش تصویر

ضروت مند
126

قتل کی ایک پراسرار
واردات کا تحریک انگیز احوال



رضوانہ منظر
151

اپنے محفوظ دار سے نکلنے والا ایک
بے وقوف عاشق کا ماجرا

قارئین
160

آپ کے ہاتھوں ہی ایک نئے نئے رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

کینا اہم زبان
163

معاشرتی تلخ رویوں کا
شکار ایک دو شیزہ کا ماجرا

ایم ایہ راحت
171

ایک ہا سال مسور..... ایک
اصوری زندگی اور سل سلہ

میسافرو
178

گل دھڑلے سے لہر چنار تک ایک
مسافر نے نوکی روداد حیات

محمد عفان
221

نیل پہاڑی کی گردش تیر تیری.....
ایک سنسنی خیز کہانی

حضرت داؤد علیہ السلام
233

طالوت اور حبابوت سے
معت بلکہ کرنے والے نبی کا احوال

سلیم انور
243

شطرنج کی بساط پر ایک
کھلائی کا تیرنگیہ زانجا

سودے بازی
248

اپنے انجمن کے بے خبر چند
معتبر..... ناواؤں کا انجمن پر سنکر

نسخہ نجات

جون ایلیا

جانے کس ستم ظریف نے کب اور کہاں نوکر شاہی کا لفظ ایجاد و اختراع کیا تھا۔ اس ستم ظریف موجد اور مخترع کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ یہ لفظ یا دو لفظی مرکب شہنشاہوں، شاہوں اور حکمرانوں کے شانوں پر بہر قسم پابن کر سوار ہو جائے گا اور سکھ چاہے کسی بھی بادشاہ کا پلے اور شاہی چاہے کسی بھی خاندان کی ہو مگر ”حکومت“ نوکر شاہی کے قبضے ہی میں رہے گی۔

جیسے اس بات پر شک ہو اور جو اس بیان پر یقین کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس کرتا ہو، وہ تاریخ اٹھائے اور وزیروں اور ”امیروں“ کا جاہ و جلال اور اوج کمال دیکھے۔ بھئی برکی اور جعفر برکی ہیں کہ ان کے ترک و احتشام کے سامنے ہارون الرشید کا احتشام اور العرام ماند پڑ جاتا ہے اور وہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ آخر کار جعفر برکی کا سر قلم کرا کے اور اس کے باپ بھئی برکی کو شاہی کا نشانہ بنا کر ہی ہارون ان دونوں باپ بیٹوں سے نجات پاتا ہے اور حقیقی معنوں میں ”غلیفہ ہارون رشید“ کی حیثیت حاصل کرتا ہے۔ ابوالفضل اور فیضی ہیں کہ ان کے اثر و رسوخ کے آگے مہابلی اکبر کے نورعین شہزادہ سلیم کی ایک نہیں چلتی، یہاں تک کہ اسے ابوالفضل سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لیے قاتل کے خنجر آبدار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہم بھئی برکی، جعفر برکی، ابوالفضل اور فیضی کے علی مرتجے کے منکر نہیں ہیں اور ان کی عظمت مسلم ہے۔ ہم تو صرف نوکر شاہی کے تعلق سے ان کا ذکر کر رہے ہیں۔

سیدان بادشاہ گر رہیں جسے چاہیں تخت پر بٹھائیں اور جسے چاہیں تخت سے اتار دیں۔ انہی کے اشارے سے زندگی کے چراغ گل ہوتے ہیں اور انہی کے اشارے سے شہزادے آزاد زندگی کا سانس لیتے ہیں۔

ہم چند صدیوں ہی کی تاریخ کو کیوں دیکھیں۔ دو ہزار، تین ہزار اور چار پانچ ہزار برس پہلے کے دور پر نظر ڈالیں۔ فراعنہ ہوں یا قیصر و کسریٰ کے پر جلال دربار، ہر جگہ اور ہر بارگاہ عالی میں وزیران یا تدبیر اور امیران یا توقیر اور ان کی عمرانی میں کام کرنے والی نوکر شاہی کی حکومت نظر آئے گی۔ نکسالوں میں سکھ شاہوں کے نام کا ڈھلتا ہے اور سلطنت میں حکم ان کی نوکر شاہی کا چلتا ہے۔

شہنشاہی اور نوکر شاہی کی ناک میں اگر ٹیکل ڈالی تو وہ جمہوریت نے ڈالی لیکن یہ وہیں ممکن ہو سکا جہاں واقعی عوام کی مرضی اور شہا سے حکومتیں بنتی اور بدلتی ہیں اور جن کی ناخوشی اور برہمی سے ایوان ہائے حکومت اور تنگ ہائے سلطنت لرزہ برآمد ہوتے ہیں۔

ہم نے یہ ملک جمہوریت کے نام پر بنایا تھا لیکن نوکر شاہی سے تعلق رکھنے والے ایک ”غلام“ نے اس جمہوریت کا گلا ایسا کھونٹا کہ پھر وہ اس ملک سے پنپ نہ پائی۔ اب ہمارے یہاں جمہوریت کے نام پر جو انتشار پھیلا ہوا ہے اس نے نوکر شاہی کو بے

لام کر دیا ہے۔ چوٹے سے چھوٹا ناکارہ جسے چاہے نہال کر دے اور جسے چاہے اسے عبرت ناک زوال کا نمونہ بنا دے۔ جسے چاہے عزت ملے اور جس کی حرمت کو چاہے تار تار کر ڈالے۔ کوئی بھی نہیں ہے جو ان کی دست برد سے محفوظ ہو۔ ان کے نزدیک کسی کی بھی عظمت اور آبرو مندی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

ایسی صورت حال، ایسی وحشت ناک اور وحشت ناک صورت حال کسی بھی جمہوری حکومت کو اس نہیں آتی۔ اس آہی نہیں سکتی اور کوئی بھی منتخب حکمران دوبارہ عوام کے دربار میں بارگاہ پا تا۔ اس لیے اسے حکمرانوں سے ہماری استدعا ہے کہ وہ نوکر شاہی کو اپنے قابو میں لائیں، اس کے تابع مکمل بن گئے ہیں۔ اسی میں حکمرانوں کی اگلا ہے اور اسی میں عوام کی بہبود ہے۔

یہاں ایک خاص بات قابل ذکر ہے اور یہ ہے کہ نوکر شاہی کوئی قوی پیش منظر نہیں رکھتی۔ یہ تو انگریز سامراج کا ”کرم پرورانہ“ تحفہ ہے جس سے ہمیں نوازا گیا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو عوام کا طبقہ اٹنے کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔ اس گروہ کو اس کی حد میں رکھا جائے اور اسے آزاد اور جمہوری حاشا سے آداب سکھائے جائیں۔ یہی ملک اور قوم کے لیے نجات ہے۔



اور بیماری پھیلی چڑیلوں سے درخواست ہے کہ ہولے ہولے سے آگے کی جانب سرک جائیں تاکہ محفل میں غوغا ہی جگہ ہماری بھی نہ جائے۔ جاہد بلوچ صاحب! شانِ بے نیاز سے کرکری صدارت کے مہماستان پر بیٹھے چھوٹے نہ رہا ہے تھے۔ سطر طاہرہ یاکین! آپ کی والدہ کی صحت یابی کے لیے تدبیر دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت یابی فرمائے۔ سعدی بخاری اگر 30:25 برس نہیں تو کتنے برسوں بعد خط لکھا ہے؟

برادراور اس آپ نے چپ کوٹنے کا شرم ارادہ کر کے بہت اچھا کیا ہے، اس لیے سوٹ ویلر اچھے لگتے تھے۔ امیر شیخ صاحبہ اللہ تعالیٰ آپ کی کچی کچا کوراجورست میں جیکہ عطا فرمائے۔ شارجہ بلوچ اس ملک میں سب کچھ حوصلے سے چل رہا ہے۔ کھیل ایلوین صدر کے کپن پر 26 کروڑ روپے دیے جاتے ہیں تو کبھی وزیراعظم اپنے ساتھ 100 کروڑوں کا قافلہ لے کر چلتے ہیں۔ کون روکے، کون نوکے؟ خود ریاض کی تجدید تعلق بہ ظاہر اندرونی طور پر ابھی ہوئی ہے، عربی، انگریز، ایک نے اپنے کیے کی سبجی اچھی اور چٹل اس کا عقیدہ غری۔ کاشف زبیر صاحب کی سادہ لوک ایک خوبصورت لکھنؤ کی ایک عمدہ کہانی تھی۔ کیتو اور سادہ لوح تھا۔ مسٹر امام کی عاقبت نا اعلیٰ میں ملوث ہو رہی تھی، انسان نہ جانے کیا کیا کر رہا تھا۔ زندگی کی فکر میں لگا ہوا ہے جو ایک دن ختم ہونے والی ہے۔ مسٹر امام صاحب ہمیشہ سی ای ایس کیا کیاں لکھتے ہیں جن میں سب کا قصہ فرمایا ہوتا ہے۔ بہت اچھی اور بہت بات ہے۔ سیدہ عابدہ زوجہ کی سیر کو اسیر بالکل اپنے نام کی طرح تھی یعنی جو شخص طبع آزمائی کر رہا تھا حقیقت میں وہ تھا۔ کھا۔ کھا۔ کھا۔ ایک مفرد حیات کی ذرخیم جانین کے قسم اور سادہ اندازوں پر مشتمل ایک عبرت انگیز سوانحی، ایک کلاسیک کا صاحب اپنی سلاطین کی دنیا میں غمراہ کھوسے سب کو بھانگنے کا شرم ارادہ ہے۔ باپ قسم کی حیات کی عیاریوں پر مشتمل ایک زبردست کلاسیک کا صاحب اپنی مینو و پلان کے ساتھ دو گھنٹہ دینے کا سادہ رہی۔ دماغی، لاکھوں لوگوں پر پڑا کر کے والی اسٹوری انڈیا کی کافی اپنے ہو گیا۔ نور اور ہندو نے درواہا شادی کے پہرہ پہننے میں بندھ کر۔ انڈیا ایک لازوال داستان کی ہے۔ داستان اپنی تیز رفتاری، انکسین، سٹپس، مزاح کاری اور صاحب کی عمل گرفت کے باعث عروں یاد رہی جائے گی۔ بالکل نئی! اگر زندگی نے وفا کی تو کیم فروری کو اپنی زندگی کا شیواں جہنم دن کا۔ (سہارا کاں)

✽ محمد نعمان پیارے، ایسے نگہ، علم سے تشریف لائے ہیں "اپنے سونے یار کا دیدار 16 جنوری کو ہوا۔ آہوئی! حسبِ عادت، حسبِ روایت سب سے پہلے حسین پرتاک کو جھانک کر فرماں جو کہ چوڑے کیچھے سے دوری جانب نکلتے میں محوئی لوئی! اچھے! اچھے! یک بیک بواز

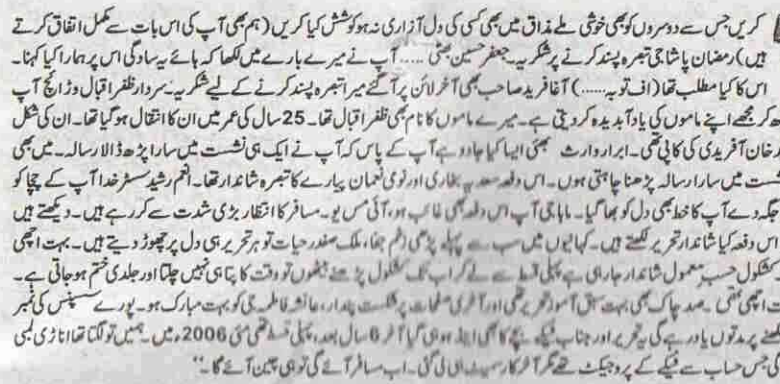


۱۷۔ ابراہیم اور ایشہ اور اباد سندیلہ کو نالی سے تعریف لائے ہیں "اوس کا شمار ہمیں 17 کو ہی لیا گیا تھا تبانی جلدی نہ پڑے کہ کیونکہ 17 کو تالی کی فوت ہو گئی تھیں اس کے دوسرے ہی دن میرے ابا کا چاچا اللہ کو یاد کیا اور جبکہ صرف ایک دن کے وقفے کے بعد میری تالی جو مجھے سب سے زیادہ پیاری تھی 20 تاریخ کو ان کا انتقال حرکت قلب بند ہونے سے ہو گیا۔ آپ سب سے گزرا ایشہ ہے کہ ہمارے ان یادوں کی محفرت کے لیے (۱۔ انشاء رحمتیں کی محفرت فرمائے اور اور انھیں کو میر عطا کرے۔ آمین) آج 24 کی شام کو گھر واپس آیا ہوں اور اپنا یاد کیا راسمی سپنس پہنچا لیکن دفتر میں درود کی پودشہ بجے سے حد بند آئی۔ آپ اب بھی ٹنگر ہے کہ مجھے محفل میں شریک کیا۔ (خوش رہے) آغاز انشاء ہے کیا لیکن اپنی

کلمہ کی وجہ سے جون ایلیا کا انداز تبخیر میں بالکل نہ آیا۔ خطوط میں پہنچتا جہاں ہمچا دیو بلوچ کی صدارت پر بڑی شان سے پرچم لٹکتے تھے میری طرف سے مبارکباد قبول ہو۔ ان کی مصلوبات پر میں خود میرا رنہ کر گیا کہ کہاں 200 آؤٹ لسٹ اور 164 انسٹ اور کہاں سے 16، 17 انسٹ اور 6، 5 آؤٹ لسٹ۔ راجا صاحب نواز دیکھتے نظر آئے پائیں کیوں۔ ہمایوں سعید سے گزارش ہے کہ وہ جو سنے کی بھی بھی کوشش کرتے ہیں وہ بھی نہ کریں تو بہتر ہے۔ محمد جواد بن اشرف میری طرح مکملی باشریف لائے اور انہیں دیکھ کر کیا جبکہ میں تو کسی نے دیکھ بھی نہیں کیا (دیکھ کر کیا ہوتا تو خود کئے شائع ہوتا) محمد جواد صاحب قسمت والے ہو! نعمان حیدر سے بھی آپ کا سایہ ہوں اور آپ نے ہمایوں سعید کی عمر کا بیج تجربہ کیا ہے کیا؟ حضرت حسین کا شہرہ پسند آیا۔ تا فرید احمد خان کوئی آپ کو گانا دی پر اعتراض تھا وہ تو وہاں اپنی اینڈ کرنگی مبارک ہو۔ ظاہر ہے یا حسین صاحب آئندہ خدمت لکھنے والی بات کا بھلا کیا نہ، کوشش تو کرتے رہتا جاوے۔ سعید بھائی صاحبہ لگتا ہے آپ اپنی دی کی ڈر سے شوق سے دیکھتی ہیں۔ انہم رشید آپ کے چچا کو اللہ خنہ افردوں میں جگہ دے اور آپ کو سہرا کرے۔ یہ کیا شاربہ بلوچ صاحبہ نے تو حد ہی مگرادی مجھے تو اس کے سارے خوش میں صرف ایک ہی بات نظر آئی کہ شاربہ محمود کو مرد ذات سے حد سے بھی زیادہ غرت ہے۔ پورے خوش انہوں نے مردوں کو نشانہ نہ بنایا حیرت ہے۔ شاربہ جی جتھہ ہوا تو کہے۔ سب سے پہلے انڈیا پرچی اس کی آخری قطعہ جی جہاں فیکے اور راجا نے تو قہمیں رلا دیا کیسے بچے لگ رہے تھے۔ ڈراما بات پر اتنا لیا ناولز کوئے۔ کیا بات ہے غرتوں سے نہ حاضر میں فیکے کو بہت کچھ کھوتا رہ رہتا ہے، پریچ گیا۔ انڈیا کا کاپی اینڈ ہو گھر ہے کہ روف صاحبہ یا زباب ہو میں اور شادی کے بندن میں بندھ گئی تھیں۔ مکلی بار بہت کم مارا ہوا اور ایکشن کے یہ قطعہ شادی اور ہی مدتوں یاد رہے گی۔ اس کے بعد آخری صفحات وانی لکھتے چدار ڈیڑھ جس نے انڈیا کا سفر کیا کر کر دیا۔ کسی بھی حوالے سے یہ انعام یافتہ کیسے بنی (کہاں تھے مطمئن کے مقابلے میں انعام یافتہ قرار پائی گی) ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی صد چاک سہلہ پسند آیا۔ ایسی ہی کہاں کہاں کلمہ کی جان ہیں۔ گھر ہے کہیں تو مول کو پناہ دی۔ محمد سعیدی نے تو اس دفعہ شاربہ پر دیوں کے فیکے لے ہوئے تھیں، جاوسی میں برف کی چوری اور یہاں جو ہے کی چوری، بات سے کسی نے تو کو دکھانے کا کیا پاور کی سی تیرے کے لیے کل کے اشخاص میں انجمن کا عمران ارشد کا کیشیت جاوے جو کثرت میں اور عمران کھتری کے یہ اشعار پسند آئے۔ زباب مجھ کو کہاں کہاں تھی اور میری یہ بالکل شیک کیا۔ کاشف زبیر ہمیشہ کی طرح ان کو کہاں کہاں تھا جو دینے میں کامیاب رہے۔ یہ دلوں میں کیجیو تو دینے زیادہ واہدہ قاتر ہے۔ وہ کہ اسے زمین نہ آیا کہ چارلس اس کا دوست نہیں دشمن ہے۔ یہ کہ کو سراسر میں تو چور ہے اناماک، مکان کو کتنی کا ناچ بچاؤ دی ہے وہاں عابدہ زبیر جس میں ایک مفسرہ حیات کو کھاتا کیس لائے لیکن صرف سہنس ہی چھایا یا پوری کہاں میں، حالانکہ وہ جہاں کا سوکا پین مجھے تو شروع سے ہی لگ۔ ہاں کہ وہی اصل قاتل نکلیں گی اور یہی ہوا۔

✽ عمران علی، ضلع جھنگ سے ہماری پیاری محفل کی زینت بنے ہیں "زندگی میں پہلی بار کسی رسالے میں خط لکھ رہا ہوں۔ چنانچہ ہماری قسمت، خط شائع ہوتا ہے کہیں یا ملک سب پادری کی نوکری میں۔ (خوش آمدید) ہم 40 سال کی خاموشی کو توڑ رہے ہیں۔ یعنی ہم تو بھی 25 کے ہوئے لیکن ہم سے پہلے ہمارے دادا مرحوم سبھن اور جاسوسی کے کاری تھے۔ اب ماہ کار سال 17 تاریخ کو لاہور میں داخل گھر پر نظر پڑے ہی ایسا کہ جیسے کسی کے انتظار میں پردے کے پیچھے کھڑی ہوں۔ واہ انگل ڈاکر۔ جون ایلیا کے انتظار میں تاریخ کے ورق نمایاں تھے واہ رہے مسلمان۔ خیالات کی محفل میں مجھ جادو بلوچ نوکری صدارت پر پایا، مبارک جو تاج۔ راجا قتب صاحب وزیر اعظم کی کرسی پر براہمن تھے۔ میرا جواد اشراف قسمت والے ہیں جو پہلی دفعہ ہی میں شامل ہو گئے اور زندگی کی نوکری۔ ڈاکٹر وسیم خالد صاحب بڑے رشتے کا غمخوار ہیں۔ واہ رمضان پاشا یہ عورت نہ کہانی کیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہی نظر آ رہا اور خط شائع ہو گیا اور سو کھاسنیں ہی پڑھتی رہتی تھیں سب اب ہواؤں میں ڈھری ہو گئی۔ ماما کی ویسے بہت کی محسوس ہو رہی ہے۔ انیسرہ شہید ہنسٹون ہوا آپ کے چچا کے انتقال کی خبر پڑ کر۔ شارق بلوچ کا خط لکھ کر صدارت پر ہوتا ہے تھا تاکہ سب کو اس کی گری محسوس ہوئی (سری بہت ہے نا) سب سے پہلے کہانی مشکول پڑھی جو واہ کسی کی کو بڑی حد تک پورا کر رہی ہے۔ واہ کسی اور مشکول دونوں حالات حاضرہ کو اجاگر کرنے والی کہانیاں ہیں۔ ڈاکٹر سجاد احمد کی کہانی شور کشا ماضی کے رنگ سمجھ رہے تھے۔ تجویز تعلق خیر و ریاضی کی اچھی کہانی تھی۔ ایسے لوگ جو اللہ کی نہیں لاتے وہ ہمیشہ کسی ایسے کا شکار ہوتا ہے۔ سخر امام کی عاقبت نامائش میں انسان کی کوتاہیوں اور نا فرمانی، لالچ کی واضح کہانی ہے۔ ملک مسعود ریاض کی کہانی دھرم جہاز کی پلچ اور سبق آموز کہانی تھی۔ مجھ سوسنی کی کہانی ہے کہ چوری میں بڑا دانا کھینے کی کوشش کی پر چور ہیرہ نکلا۔ سوانح انبیاء کی زبردست اسلامی معلومات ہے۔ سوانح اولیا کرام میں شروع کی جائے۔ عاشق طاہر کی کہانی کشت پندار اور ماضی انعام یافتہ کہانی ثابت ہوئی ہے۔ کہانی پڑھ کر ایسا معلوم ہوا کہ ایک حقیقت ہے جس سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ محفل شمعوں میں آج نجمہ ہنسٹون اشراف، ظاہر یا سبھن، محمد اشفاق اور مدرہ جیر کے شعر پڑھائے۔ ظاہر جادو محفل صاحب سے گزارش ہے کہ ایک بار شہادت کی طرح جانوروں اور فزوں۔"

[illegible]



۱۲ احمد خان توحیدی، پاکستان اکٹلا، راکری پی، مسلسل میں شامل ہوئے ہیں۔ "ہا فروری کا شمارہ 19 جنوری کو لا۔ 40 سال سے اوپر اری ہونے کے ساتھ جاسوی، ہرگزشت اور پاکیزہ سے بھی دوست ہے۔ (پاکیزہ سے آپ کی دوستی پر کچھ سماجی ضرور حیران ہوں گے تاہم بہت سارے دوست پاکیزہ میں خصوصاً سلسلوں کو شوق سے پڑھتے ہیں، خاص طور پر غیرہ احمد کا ناول اس کو جو جس سے بھر پور ہے۔ ساتھ ہی معروف راکٹر جیسے تاہید سلطانہ اختر جو جس کے لیے بھی لکھی رہی ہیں، عمرہ احمد، انصار اور دیگر مصنفات کو بہت پسند کیا جا رہا ہے) ڈوٹی میں چار شاہوں کے مطالعہ کا ناظم ہیں، مگر محفل خطوط میں لکھا تو بھی منظور نظر نہ ہونے کے باعث لفٹ نہ لی (آپ محفل کے دیگر اراکین کی طرح غیر عرب ہیں) انشایہ جون الیسا کے چند الفاظ گہرا انکشاف ہوتے ہیں۔ خطوط کی عقل، جاوید بلوچ، راجا ثاقب، نعمان بیارے، بیہ، خواجہ عتی، طاہرہ یاسمین بظرف و ادب آج بھی تھرے سے محرم طویل ہونے پر مجھ جیسے پرانے خاموش قاری کو جگ بگبگاتی (خاموش قاری کو کچھ نئے طے کی تاجب دوہلے گا۔ راسخوں کو تو ہم سے پھر بھی شکایت ہے کہ کم کا چھانٹ بہت کرتے ہیں اور آپ کو وہ تھرے بھی طویل محسوس ہیں) سائید احمد کی شورش کاش، تاریخی معلومات کی تحریر ہے۔ تجویز تعلق، جو ریر یاں صاحب پاکستان میں مائیک سے بڑے مگر پڑھی بڑھی کہانیاں موجود ہیں۔ کاشف زبیر، سادہ لوح، اچھی معلوماتی کہانی تھی پاکستان کی اردو کہانیاں لکھا کریں۔ شگول کا اونٹ کس کرٹ بیٹھا ہے؟ اناڑی کا جوڑو کی کاشادیاں خوشگوار رہا۔ اب تاہر ملک کی مسافر کے خنجر ہیں۔ حاقبت ناامینش، واہ منظر اماں آپ کی ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک، کن دور کے ذہنی تفریح ہوتی ہے۔ سیدہ عابدہ زحی، سیر کو سواہر بہت خوب قریبی کی تھانید اری کھڑکی سے ہوا ہوئی۔ ختم چوچہ دری ارشاد کہ انسان کو نور جہاں جیسی ناگن نے ڈس لیا۔ تلی وکھو، ملک مندر حیات نے قانون کے احترام میں یقیناً بائبل سلا لیا ہوگا۔ مات، چوہے کی پھونڈ آئی۔ تاہاب فقہ، شمر عباس۔ مورن کا اقدام درست تھا قریبی بھی ضرورت مند کوئی۔ رضوانہ منظر کی قیمت نے متاثر نہ کیا۔ منظر اماں صاحب لکھا کریں اردو میں۔ بندر دوازے، بالکے جیسے غیر لکھنو، غلو، غا، راج کے ساتھ گئی۔ نیک بینی و پاکیزہ خیالات سے شائستہ نیکی بھی عظیم بہن نکلیں۔ صد جاک، جاہر داؤد رے عیاش ملتے اپنے ہاں پر پردہ ڈالنے کے لیے کاروکاری جیسی غلیظ رسم کا نام دیتا ہے۔ شکست پندار، طاہر، واقعی انعام یافتہ کہانی ہے۔ چوچہ دری ارشاد جیسے فرعون صفت کو جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ انجام تو عمر بھر سے نیچے چلتا ہے۔ جاوید کی پاکیزہ خیال سادگی سے اس کی محبت نور اس کی تھی۔"

ظاہر ہو گا، پشاور، محفل میں پہلی آنری ہیں،" انکل میں سنس، جاسوی اور سرگزشت کی کاٹس 5th سے قاری ہوں میں اس لیے
کافی کریمیر اسو ماہیانی، ابرہاس خفا ہوجانے کا کیونکہ عمروہ خود کو بوڑھا نہ سمجھتے۔ اب یہ لوگ ان کو چکا کہ رنگ کرتے ہیں۔ ایک میرا
مراجہ بھائی کا تفریہ اس خان آف سمکر، بھائی میرے زیادہ عنصر نہ کیا کریں۔ ورنہ جلد بوڑھے ہوجاؤ گے۔ اب میرا شاعر اور شرارتی بھائی تفسیر
بھائی جس نے میری شکایت جاسوی کے ذریعے ادارے کو پہنچائی۔ مگر یہ بھائی، ایک میرا چھوٹا بھائی عمروہ ج کی محفل سے غائب ہے۔
جاؤ۔ انکل نہیں کہیں گے اور دوست Wel Come کریں گے۔ نجم اور رفان آف کو کونترہ لوگ بھی کبھی نکلا کرو۔ نجم جاوے بلوچ آف
ارے دوست ماہیانی راج صاحب بھی جی جی چاہتے ہیں کہ ان کو کوئی خطانی ہے لیکن اشتہار اس طرح کرتے ہیں کہس خدا ہیچے ان سے۔
ان صاحب کیوں آپ تفسیر کے ذریعے غائب ہو گئے۔ دشمن اللہ آپ کو سخت عطا کرے آپ جلدی واپس آئیں کیونکہ میں آپ سے خطوط پڑھ
سے مزہ لیتی ہوں اور آپ ہر بندے کی فطرت کو بھی سمجھنے لگی ہیں۔ دوست بہت اچھے ہیں لیکن ان انچوں کے درمیان ایک بہت ہی بدذوق
ان زبان استعمال کرنے والے بھی ہیں۔ سنس اور سرگزشت میں شاعری بھی بہت معیاری ہوتی ہے۔ دوستوں کے خطوط اور کہانیوں سے

پہری اردو پر مبنی اور پختہ بنتی ابھی ہو رہی ہے۔ کہاں کہاں ہمارے معاشرے اور کرداروں کی عکاسی کرتی ہیں۔ جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ اگے آگے درگزر ہو رہا ہے۔ لیکن ہم انسانوں کی فطرت کو ہم ان سے اچھا نہیں سمجھتے اور برائیاں زیادہ قبول کرتے ہیں۔ یہ سبک ہمارا ہے یہ زمین ہماری ہے۔ دوسروں کو ہم مٹھتے کیوں دے رہے ہیں کہ وہ ہمارے لڑائی جھگڑے سے فائدہ اٹھا لیں اور ہمارے گھر میں داخل ہوں۔ لیکن ہمارے دشمنوں کو مطمئن ہونا چاہیے کہ ہم تکلیف کے وقت سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اگلے اگر آپ سب نے Wel Come کیا تو ضرور لکھوں گی۔“ (خوش آمدید)

حاجی عبدالکلیم، شاہدہ ٹاؤن، لاہور سے سترہ گر رہے ہیں "ماہِ قوری کے سہنس کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے ناچیز خیالات کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، سب سے پہلے آپ سے ایک چھوٹا سا شکوہ۔ ماہِ نومبر میں، میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مسلسل 25 سال تک جاسوسی اور سہنس کا خاموش قاری رہا ہوں۔ پھر آپ کو خطوط لکھنے شروع کیے سب سے پہلے کوہِ کیلیک لٹ میں جگہ پر کار کا دفتر بنایا میرے پانچ خطوط سہنس میں شائع ہوئے۔ سب سے نومبر میں، میں نے آپ کو لکھا کہ میں اب آئندہ خود نہیں لکھوں گا جس کے جواب میں آپ نے ڈیڑھ کے سہنس میں مجھے لکھا کہ ہم سے ناتانہ توڑے اور ہمیں اپنی زرگانہ شفقت سے نوازتے رہیے۔ سہنس کے قارئین میں سے خاندانِ آل کے قدرت اللہ نازی صاحب بنوں سے ایمان سید راج صاحب خاندان سے ماسٹر ضیاء الرحمن نازی صاحب نے مجھے فرمایا کہ اگلے کار ہمارا دل توڑ دے لیکن میں اپنی نوازشات سے نوازتے رہیے۔ ان سب کے اصرار پر میں نے دوبارہ ماہِ دسمبر میں آپ کو خط بھی لکھا اور اس کے ساتھ ہی اقبال زہی جی بھیجے تھے۔ لیکن آپ نے میرے اس خط کا جواب نہیں دیا، لیکن اس بات کی اطمینان نہ دیکھ کر دلِ کوبت دکھائی ہوا اور میں نے مجرور اور جستجو میں آپ کو خط نہیں لکھا (دسمبر میں آپ کا خط بھیجے گا۔ دسمبر میں آپ کا جواب نہ دیا، تاہم ایک ماہ کی بات میں اس کا مطالعہ کیا تھا) دسمبر کے سہنس میں قارئین نے اپنے اپنے خطوط میں میری حاضری کو متحسین کیا (آپ کو جواب نہ دیا، تاہم ایک ماہ کی بات میں اس کا مطالعہ کیا تھا) دسمبر کے سہنس میں قارئین نے اپنے اپنے خطوط میں اور اقلول کا مطالعہ کیا۔ نازی کے بہت ہی خوبصورت احجام پر مصطفیٰ کو بہت بہت مبارکباد دو۔ میری طرف سے آپ کو آپ کے تمام اسلاف اور قارئین کو سال کی بہت بہت مبارکبادیں دیں گے۔" (آپ کے شکوہ تانے کا بھی شکر ہے)

✽ شہزاد اویلیڈ، منسل سرحد کا ستبرہ کرتے ہیں۔ ”صورت حال یہ ہے کہ میں محفل میں ایک سال کے بعد آج دوسری بار شرکت کر رہا ہوں (خوش آمدید)۔ پہلی بار اپریل 2011ء میں پہلا خط لکھا تھا جسے محفل میں آپ سمیت سب نے خوش آید پر یاد کیا تھا مگر پھر میں اس کے بعد نہ لکھ سکا۔ مصروفیت کی وجہ سے۔ آپ سمیت کیساتھ آج دوسری بار لکھنے پر مجبور ہو گیا (بہت دیر کی مہربانیاں آتے آتے) واقعی سب جتنوں دور دور جاتی ہے سالہا سالہ۔ میں ظاہر یہ یقین کا چھوٹا بیٹا ہوں نام تو میرا حق اصرار تھا شہزاد اویڈ دوسری ہے پر باجی ظاہر ہے کہ میرا نام نیلہ دور لکھا ہوا ہے۔ نیلہ کا مطلب ”جنگلی میں لگا (چھوٹا) ہے۔“ مجھے بھی مسافر کا شہادت سے انتظار ہے گا۔ اس ماہ کی بیسٹ نمبروں کہانی تھی شکست پندار اور اناڑی بھی آخر انجام کو پہنچی۔ ملک مفرد بھی اس بار میدان مار گئے۔ محفل کے تمام قارئین کے خطا آجھے تھے۔“

✽ **فقرتی،** کیونکہ راولپنڈی سے محفل میں شامل ہونے میں "فردوسی کا شمار 19 جنوری کو موصول ہوا۔ انھیں مہنگائی اور لڑو شہزادگی کی وجہ سے ملک کے بارے میں فکر منظر آئے۔ اگلے جی! آپ یاپس نہ ہوں۔ میں نے خود سیاست میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے، بس آپ اور دوستوں کی دعا میں روکار رہیں (اوسے ہی اوسے) محفل میں اس بار مہر بلوچ صاحب کیساتی کے حقدار ٹھہرے۔ ان کا تہرہ جاندار تھا۔ راجا ثاب تو نواز تھا! آپ کا تہرہ بھی اچھا تھا۔ جہاں مسجد راج، ہالہ ایمان تو محفل سے غائب ہو کر ہم پر احسان کر چکی ہیں، بس آپ اب بھی سدرہ جاسین تو بہتر ہوگا۔ اگر آپ کو مشکل نارسٹ پسند ہیں تو اس کو آپ کی پسند بدلنے والی ہے کیونکہ اب میں اس کی آچکا ہوں۔ اس بار محفل میں رادی نے جین ہی جین لکھا کیونکہ صنف مذکور کو اس بار زیادہ چس چس کرنے کا اہل نہ موقع ہی نہیں دیا (ارے بھی اس میں ہمارا کوی تو نہیں ہے) شاعر جہ بلوچ صاحب! آپ نے شہیک کہا کہ سر و حضرات صورتوں کی مت مار دیتے ہیں، اس لیے اب بھی اپنا اگھا تہرہ اپنے ننھے سے دماغ سے سوچ بچھ کر گلیے گا ورنہ میں آپ کی مت مار دوں گا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شہلول ڈیڑھی۔ کہانی ایک آہستہ آہستہ کھلتی جا رہی ہے اور لگتا ہے کہ بہت جلد یہ کہانی بھی ایک بہت ہٹ ثابت ہوگی۔ مسافر کی پہلی قسط کا انتقاد ہے۔ ناصر ملک صاحب ایک اچھے راتر ہیں اور امید ہے کہ ان کی یہ کہانی بھی بہتر ہوگی۔ ٹکٹ پندار ایک اچھی کہانی تھی جس میں عالم اور عظیم نے موت کے لیے ایک ہی راستہ اختیار کیا۔ صفر اکوئیں چوہر کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا اور کم سے کم فیض کو تھوکتو ساتھ رکھنا چاہیے تھا۔ تاریخی کہانی بڑھ کر بہت ختمہ آیا۔ ہم نے کتابوں میں تو بابر کی بہادری و فیاضی کے قصے سن رکھے تھے اور بابر کی نیک نامی بہت مشہور تھی مگر یہ کیس کیس کو دیکھا اس کا عاشق بن جانا، خود بیالیس سال کا ہو کر ایک چندرہ سالہ لڑکی سے جبراً شادی کرنا اور سوشی۔ ایسی بہادری کا کوئی فائدہ نہیں۔ تجویز غلطی سادہ لوح اور صمد چاک بہتر نہ کہانیاں تھیں۔ چوہے کی چوری میں شک و یوٹ کا یہ روپ تو میں نے پہلی بار دیکھا۔ شمسغیرا دیب کی کہانی ابھی زندگی کے ایک تلخ پہلو کو اظہار کرتی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر ساجد احمد سے گزارش ہے کہ اسلامی صحافت پر مشہور و منظور علاج کے بارے میں تحریر کریں۔"

ابو شیر علی خان، خانیوال سے تہرہ کر کے تھیں "پچھلے چند سالوں میں وہ بے پرواہی کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ لکھنؤ کی جہازت کر رہا تھا۔" اس نے ہمسوا میداں جنگ میں "کی عملی تصویر بنے ہوئے (خط) ارسال کیا ہوتا تو ضرور شائع ہوتا۔ دیے جہازت (انجمن کی) میں میٹرک کا اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کا نام لکھا۔ اس دفعہ انشائیہ اور تامل پر پردے پر پنی کی مغل شہزادے کی تصویر میں چھ مہاتما نظر آئی جس کے پیچھے ایک لڑکی کی آنکھوں کا

بعض شخصیات کا تعاقب تاریخ بچپن سے ہی کر رہی ہوتی ہے... اس سنہری دور میں جب بچہ کچی مٹی کے گھروندے بناتے اور بگاڑتے ہیں ایسے میں ایک فقیر نے اس بچے "ٹیپو" کے لیے پیش گوئی کی... "تیری خوش نصیبی ایک دن تجھے بادشاہ بنانے کی" اور باپ نے جو ریاست میسور کا سپہ سالار تھا جواباً کہا "بادشاہت، فقیر نہیں بانڈا کرتے" لیکن اسے کیا خبر تھی فقیر کی یہ پیش گوئی مسلسل سفر میں رہے گی۔ رفتہ رفتہ جب مرہٹوں اور نظام دکن کی سازشوں اور بدگمانیوں کی ہوا چلی تو انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام پر ہندوستان میں قدم جماتے چلے گئے۔ گویا "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" کیونکہ جب اس فقیر کی پیش گوئی پوری ہوئی تو "ٹیپو سلطان" کے دربار میں میر صادق جیسا غدار وزیر اعظم موجود تھا... مگر ٹیپو سلطان نے شکست و فتح کی منازل طے کرتے ہوئے فرانس کی بھی حمایت حاصل کر لی افسوس کہ اس وقت فرانس کے دروازے پر انقلاب دستک دے رہا تھا ورنہ آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ اپنی کی غداری کا شکار سلطان ہرگز دار السلطنت چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ تھا بلکہ اس نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میسور کی تاریخ مجھے مقرر کے نام سے یاد کرے۔" اور جب لڑتے لڑتے صبح سے شام ہو گئی تو پھر سے مشورہ ملا کہ خود کو انگریزوں کے حوالے کر دو مگر سلطان نے ایک اور تاریخی جملہ کہا۔ "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے" اور پھر اس بلا کارن پڑا کہ دشمن کے دانت کھٹے ہو گئے... جب فداائیوں کے درمیان اس کی لاش شناخت ہوئی تو دیکھا کہ چہرے پر غیر معمولی وقار سایہ فگن تھا۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

جنوبی بھارت کے شہر سرنگا پٹم کی ایک گلی میں کوئی فقیر اچانک کسی طرف سے نمودار ہوا اور گلی میں کھڑے ایک آٹھ سالہ بچے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اس وقت گلی میں کوئی دوسرا بچہ موجود نہیں تھا جیسے فقیر کو اسی ایک بچے سے مخاطب ہونا تھا اور گویا اس نے دوسرے سب بچوں کو منع کر دیا تھا کہ کوئی اس طرف نہ آئے۔ فقیر کے چہرے پر وحشت کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی سرخ آنکھیں باہر کو نکلے پڑ رہی تھیں۔ کوئی عام بچہ ہوتا تو یقیناً بھاگ کھڑا ہوتا لیکن اس نے فقیر کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بس اتنا ہوا کہ ہاتھ میں دبی ٹین کی ٹکوار پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور اپنی تربیت کے مطابق نہایت ادب سے اس فقیر کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ "صاحبزادے، آپ کا نام کیا ہے؟" فقیر نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

جنوبی بھارت کے شہر سرنگا پٹم کی ایک گلی میں کوئی فقیر اچانک کسی طرف سے نمودار ہوا اور گلی میں کھڑے ایک آٹھ سالہ بچے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اس وقت گلی میں کوئی دوسرا بچہ موجود نہیں تھا جیسے فقیر کو اسی ایک بچے سے مخاطب ہونا تھا اور گویا اس نے دوسرے سب بچوں کو منع کر دیا تھا کہ کوئی اس طرف نہ آئے۔ فقیر کے چہرے پر وحشت کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی سرخ آنکھیں باہر کو نکلے پڑ رہی تھیں۔ کوئی عام بچہ ہوتا تو یقیناً بھاگ کھڑا ہوتا لیکن اس نے فقیر کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بس اتنا ہوا کہ ہاتھ میں دبی ٹین کی ٹکوار پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور اپنی تربیت کے مطابق نہایت ادب سے اس فقیر کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ "صاحبزادے، آپ کا نام کیا ہے؟" فقیر نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"فتح علی ٹیپو سلطان۔" بچے نے قدرے فخر کے ساتھ اپنا نام بتایا۔
 "یہ نام کچھ زیادہ بڑا نہیں، تمہیں یاد کیسے رہتا ہے؟"
 فقیر نے اسے پھیرتے ہوئے کہا۔
 "میرے دادا جان کا نام فتح محمد تھا۔ فتح علی انہی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ میرے اماں ابا تو مجھے ٹیپو سلطان کہتے ہیں۔"
 "اچھا یہ بتاؤ، تمہارا نام ٹیپو کیوں رکھا گیا ہے؟"
 "یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"
 "وقت آنے پر یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ ابھی تو صرف وہ سن لو جو ہم تم سے کہنا چاہتے ہیں۔"
 "میں تو آپ کی ساری باتیں سن رہا ہوں۔"
 "تیری خوش نصیبی ایک دن تجھے بادشاہ بنائے گی۔ تو یہاں کا بادشاہ ہوگا۔"

23 : 2012ء



پاکیزہ

مارچ 2012ء بہار کے خوشنارنگ لیے

عمیرہ احمد عکس

عکس در عکس پھیلتا سلسلہ زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا سفر

شیریں حیدر

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

اپنے مخصوص کرداروں کے ساتھ مسلسل ناول کے پرتیز شیب و فراز

ناہید سلطانیہ اختر زندگی

زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے روشناس کرنا آپ کی پسندیدہ مصنفہ کے قلم سے لکھنا سلسلے وار ناول

راحت وفا ایک تھی نیناں

انسانی ذہن کی نفسانی الجھنوں کی کیفیات اور احساسات کے گرد گھومتا سلسلے وار ناول

انجم انصار اور سکینہ فرخ

کے کش و خوب صورت ناول

سعدیہ رئیس، سیمیا یاسمین مجتبیٰ

زاہدہ بروہن، نظارت نصر، کرن احمد،

عظمیٰ سید افتخار، تابندہ حبیب،

نہایت حبیب ضیا، عائشہ خان اور

بشری گوہر دل کی دلچسپ و پراثر تحریریں

آپ کی ارد گرد شاعری کے تیل ملے

کچھ ایسے اس ناچنے کے بڑے ناچنے نہیں ایکال ہے

اٹھایا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ کریم صاحب کمزور طبیعت کا لڑکا تھا۔ اس پر آسانی سے قابو پایا جاسکتا تھا۔ خفیہ ملاقاتوں میں یہ بھی ملے کہ کیا تھا کہ میسور کے کاغذی راجا کو بغاوت پر اکسایا جائے گا۔ اس بغاوت کو چلنے کے بہانے اگر یزید ریاست میسور میں داخل ہو جائیں گے۔ اس اسکیم کو اگر یزیدوں تک پہنچانے کے لیے ایک آدمی عداس کی طرف روانہ بھی کیا جاتا تھا۔

حیدر علی کی میت کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سرگرم لایا گیا اور وہ نہ خاک کر دیا گیا۔

نہایت کریم کی طرف روانہ ضرور ہوا تھا لیکن ارکاٹ کے قریب کڑک کر رک گیا۔ اسے باپ کے انتقال کی خبر مل گئی تھی لیکن یہ بھی کافی کئی گئی کہ اس کا بھائی تخت نشین ہو چکا ہے۔ وہ یہاں تک کر سرگرم لایا گیا۔ اسے انتظار بھی تھا کہ اس کے امرا اس سے ملنے آتے ہیں یا سب کے سب فرخت ہو چکے؟ اب کس قسم کا رد عمل ظاہر ہوتا ہے یہ دیکھنے کی بات تھی۔

جب سرگرم پنم میں یہ خبر پہنچی کہ نیپو ارکاٹ کے قریب پہنچ کر رک گیا ہے تو سرگرم پنم کے دربار میں اندیشوں نے سرا بھارا۔ امرا کو لگتا تھا کہ یہ لڑکے اگر نیپو سرگرم پنم پر حملہ آور ہو گیا تو ح کے بعد ان سب کی گردنیں اڑا دی جائیں گی۔ وہ وفادار امرا جو باتوں میں آگے تھے، نیپو کے پاس جانے کے لیے مشورے کرنے لگے۔ اب میر صادق کے ہوش اڑنے لگے کہ اگر یہ امرا نیپو کے پاس چلے گئے تو میرا نام ضرور آئے گا کہ یہ تجویز سب سے پہلے میں نے دی تھی۔ وہ بھی ان امرا کے ساتھ مل گیا بلکہ خود کو مجرم ٹھہرانے لگا۔

”مجرم تو میں ہوں۔ یہ میری ہی تجویز تھی کہ کریم صاحب کو تخت نشین کر دیا جائے مگر صاحبو اس وقت یہی مصلحت کا تھا تھا۔ اس میں میری نیت کا تو نہیں تھا۔“

”میر صادق، یہ غلطی تو ہم سب سے ہوئی تھی۔ ہم سب ہی گناہ گار ہیں۔ اب اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم سب معافی مانگ لیں اور نیپو کے حضور پوچھا دیں۔“

”تجویز تو آپ لوگوں کی اچھی ہے لیکن شہزادہ کریم صاحب جو اس وقت بادشاہ ہیں ان کی رضامندی بھی ضروری ہے۔“

میر صادق نے ایک اور چال چلی۔ اسے یقین تھا کہ کریم صاحب بھی اس رائے سے اتفاق نہیں کرے گا۔ بادشاہ کو ان کا دانا ہے بلکہ اس نے غلطی طور پر کریم صاحب کو اس لیے ہی کوٹھل کی لیکن کریم صاحب کی کمزور طبیعت اس غلطی کے سامنے کھڑی نہ ہو سکتی تھی۔

نہانے یہ ہم ادھوری چھوڑی اور اپنا لشکر کے میسور کی طرف روانہ ہوا۔

حیدر علی ایک عرصے سے سرطان کے مرض میں مبتلا تھا۔ ہر سال اس کی پیٹھ پر سرطان کا ہر پلا میٹھوڑا نکلتا تھا جس کا ہر نشتر زنی کے ذریعے نکال دیا جاتا تھا۔ وہ پھر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کس اذیت میں مبتلا ہے۔ اس مرض نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔ موت کے قدم دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ اس مرتبہ اس کی حالت زیادہ غیر ہو گئی۔ اس نے امرا کے مشورے سے نیپو بلانے کے لیے خط بھی لکھ دیا۔

اس کا دل کھد کھد ہوا تھا کہ نیپو کو دیکھنا اب مقدور نہیں۔ اس نے ان امرا کو جو اس وقت قریب تھے طلب کیا۔ وہ بہادر سپاہی اس وقت گھوڑے پر نہیں بستر پر تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ اس نے دہی آواز میں کہنا شروع کیا۔

”میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ جب میرا انتقال ہو جائے تو تم لوگ اسی وفاداری کے ساتھ نیپو کی خدمات انجام دینا جس طرح میری انجام دی ہیں۔“ یہ کم بھی گئی کہ اب کس ہزار فوج ارکاٹ کی طرف روانہ کر دی جائے۔ دربار کے حفاظ موجود تھے انہیں حکم ہوا کہ وہ تلاوت کرتے رہیں۔

اب اس کے پاس حفاظ کرام کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ اسی عالم میں نہ جانے کب اس کی روح اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ گئی۔

حیدر علی کے مرتے ہی سازشوں نے سرا بھایا۔ ہر چند کہ اس کی موت کو پوشیدہ رکھا گیا تھا لیکن یہ خبر کسی نہ کسی طرح سرگرم پنم تک پہنچی۔ وہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو حیدر علی کے خوف سے چپ تھے لیکن دل سے اس کے ساتھ نہیں تھے۔ ان میں میر صادق اور میر معین الدین سب سے آگے

تھے۔ باقی لوگوں کو ان دونوں نے دم دلا سے دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ میر صادق کی بھی کو آواز نہیں کر سکتا تھا کہ ریاست میسور، نیپو جیسے مضبوط سپاہی کے ہاتھ لگ جائے۔ یہ دونوں انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ میر معین تو انگریزوں کے اجلاسوں تک میں موجود ہوتا تھا اور انہیں پل پل کی خبریں پہنچاتا رہتا تھا۔ ان دونوں نے محمد امین کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جس کے تحت چار ہزار سوار تھے اور حیدر علی کا پچھڑا زاد بھائی تھا۔ ان سب نے مل کر نیپو کا انتظار کرنے کے بجائے اس کے چھوٹے بھائی کو جو کریم صاحب کہلاتا تھا تخت نشین کر دیا۔ جو انہیں بلایا گیا کہ کسی ممکنہ خطرے سے بچنے کے لیے یہ قدم

میدر علی خود انوائف تھا اسی لیے وہ نیپو کی تعلیم پر خاص توجہ دے رہا تھا۔ یہ گری کی تعلیم بھی جاری تھی۔

نیپو سلطان پندرہ سال کی عمر میں باقاعدہ حیدری فوج میں شامل ہو گیا۔ یہ ریاست چاروں طرف سے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے دشمن انگریز بھی تھے، فرائسی اور مرہٹے بھی۔ حیدر علی ان سب سے مقابلہ کر رہا تھا اور نیپو اس کے ہمراہ دانشمندی دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ ایٹ انڈیا کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ حیدر علی کو سمجھا جانے لگا۔ اس نے بے شمار جنگیں لڑیں اور انگریزوں کے دانت کھٹے کرنا رہا۔

حیدر علی کے ساتھ ساتھ نیپو سلطان نے بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ حیدر علی کو اس پر اتنا اعتماد ہو گیا کہ اس نے نیپو کو ایک جہز کی طرح فوج کی جگہ کمان سپرد کر دی۔ ☆☆☆

نیپو ان دنوں مالا باری کی طرف گیا ہوا تھا اور اس وقت پالا گھاٹ میں انگریزوں کے مقابلے پر غم غموں سے کھڑا تھا۔ انگریز لشکر کے سالار ہمبر اسٹون اور کرنل روز لینگ تھے۔ پالا گھاٹ انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ نیپو اپنا دباؤ بڑھا رہا تھا یہاں تک کہ انگریز پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے اور پسپا ہوتے ہوئے دریائے پونا پانی کے کنارے پہنچ گئے۔

وہ جنگ میں مصروف تھا کہ اسے حیدر علی کی طرف سے ایک خط موصول ہوا۔ اس نے یہ خط پڑھنے سے پہلے اسے آنکھوں سے لگایا۔ اس نے خط پڑھا۔

”اگر تم اس علاقے کی تادیب سے مطمئن ہو چکے تو چشم پدر کو اپنے دیدار راحت آثار سے روشن اور منور کرو۔ اس سے پہلے پورے معاملات کا جائزہ لے کر دیکھ لو کہ مزید فوج کی ضرورت ہے کہ نہیں۔ اگر ضرورت ہو تو اپنی مدد کے لیے اور فوج بلوا لو۔“

”ہم تمہیں امور سلطنت کا عمار بناتے ہیں اس لیے ایک پل کے لیے بھی سرکاری کاموں میں تھما لیں اور تعاقب نہ برتنو۔“ وہ اس خط کو پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ کبھی انہیں نہیں ہوا تھا کہ اسے میدان جنگ سے واپس بلایا گیا ہو۔ پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ یہ خط سرگرم پنم سے نہیں ارکاٹ کے قریب سے لکھا گیا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ جو بھی کسی بہر پر نکلے ہوئے ہیں۔ یہ حقیقت اس کے لیے پریشانی کا باعث تھی کہ اس کا باپ سرگرم پنم میں نہیں۔ اسے فوجی مدد کی بھی ضرورت نہیں پھر وہ اسے کیوں بلارہا ہے۔ خط کے یہ الفاظ بھی اس کے دل میں کھٹک پیدا کر رہے تھے کہ ”ہم تمہیں امور سلطنت

رعب طاری ہو گیا۔ وہ اپنے لشکر کو لے کر قلعے میں واپس چلا گیا اور قلعہ بند کر لیا۔ سلطان نیچو نے اپنے توپ خانے کو حکم دیا کہ وہ قلعے پر آگ برساتی شروع کر دے۔

نیچو نے تیرہ توپ خانے لگانے کا حکم دیا جن کی متواتر گولہ باری سے قلعے کی عمارتوں کو خاصا نقصان پہنچا۔ متواتر گولہ باری سے روزانہ متعدد انگریز سپاہی مارے جاتے تھے۔

کہتے ہیں قلعے میں ایک ہی کنواں تھا جس میں فصل کا ایک حصہ ٹوٹ کر گر کر اور کنواں بند ہو گیا۔ پانی کی سخت قلت پیدا ہو گئی۔ میسوری فوج نے کھانوں کے دروں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ پانی کے لیے جو بھی قلعے سے نکلتا تھا اسے سہا پی اے بھون کر رکھ دیتے۔

قلعے میں پناہ لینے کی سب جگہیں نیچو کی توپوں نے مسامہ کر دی تھیں لہذا میسوری کے ڈی سپاہی دن بھر دھوپ میں پڑے رہنے پر مجبور تھے۔ سردی پڑنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گولہ بارود روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر اٹھارہ دن تک مدافعت کرنے کے بعد جرنل میسوری نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ نائب قلعہ دار محمد علی بیگ صلح کا جھنڈا اٹھاتا ہوا باہر نکلا اور سلطان کے کیمپ میں آ گیا۔ میسوری نے اسے صلح کے لیے گفت و شنید کرنے میں مجابا تھا۔ قلعہ دار نے قلعہ کے اندرونی حالات تفصیل سے بتائے۔ وہ اپنے ساتھ میسوری کی جانب سے لکھی ہوئی کچھ شرطیں بھی لایا تھا کہ اگر ان شرطوں کو تسلیم کر لیا جائے تو قلعہ اور شہر سلطان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ شرطیں یہ ہیں۔

انگریزی فوج جتنی اعزاز کے ساتھ قلعے سے باہر آئے گی۔ ہتھیار قلعے کی پشت پر جمع کرائے گی اور وہ تمام سامان جو سلطان کی ملکیت ہے قلعے میں چھوڑ دے گی۔ بلا کسی مزاحمت کے یہی تک مارچ کرنے کی اجازت ہوئی چاہیے۔ سلطان نیچو نے ان شرائط کو تسلیم کر لیا۔ اٹھارہ روز کی جان توڑ کوشش کے بعد قلعے پر سلطان کا قبضہ ہو گیا۔ اس معاہدے کا نام معاہدہ حیدر نگر رکھا گیا تھا۔

اس معاہدے میں یہ کہا گیا تھا کہ انگریز فوج اپنے ذاتی سامان کے سوا کچھ نہیں لے جائے گی لیکن جب انگریز فوج کی روانگی سے قبل ایک سردار کو قلعے کے اندر بھیجا گیا کہ وہ خزانے پر قبضہ کر لے تو خزانہ خالی پڑا تھا۔ دراصل میسوری نے اپنے انیسویں کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ خزانے سے جتنا چاہیں نکال لیں۔ انیسویں نے تمام ہیرے جواہرات نکال کر جہاں چھپا سکتے تھے چھپا لیے۔

نیچو نے میسوری سے باز پرس کی تو وہ بولا کہ میں نے اپنے لشکر کو لے کر قلعے میں واپس چلا گیا اور قلعہ بند کر لیا۔ سلطان نیچو نے اپنے توپ خانے کو حکم دیا کہ وہ قلعے پر آگ برساتی شروع کر دے۔

”میں نے یا میرے کسی آدمی نے خزانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ تمہارے سردار نے خرد برد کی ہوتا آگ بات ہے۔“

”یہ کبھی بھولو، اگر میں نے تلاشی لی اور تمہارے آدمیوں کے پاس سے خزانہ نکل آیا تو پھر میں معاہدے کا پابند نہیں رہوں گا۔“

”سپاہیوں کی انفرادی چوری کا میں ذمے دار نہیں۔“

”جب معاہدہ ہی نہیں رہے گا تو مجھ پر بھی کوئی ذمے داری نہیں رہے گی۔“ نیچو نے کہا اور حکم دیا کہ انگریز سپاہیوں کی جامع تلاشی لی جائے۔

جس سپاہی کی تلاشی لی گئی اس کے لباس کے اندر کی تہوں میں ہیرے جواہرات کا ایک ڈھیر فرش پر لگ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہیرے جواہرات کا ایک ڈھیر فرش پر لگ گیا۔ نیچو کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”میں اس معاہدے کو منسوخ کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی حکم دیا۔ ”انگریز فوج اور جرنل میسوری کو سرنگا پٹم پہنچایا جائے اور انہیں قید میں رکھا جائے۔“

حیدر نگر کا باغی قلعہ دار ایاز خاں پہلے ہی منگور بھاگ گیا تھا۔ اسے جب حیدر نگر پر سلطان کے قبضے کی اطلاع ہوئی تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب سلطان منگور کی طرف بڑھے گا۔ وہ منگور سے بھاگ کر سورت پہنچا اور وہاں سے انگریزوں کے پاس پہنچ گیا۔

جرنل میسوری اس شرم ناک شکست اور گرفتاری سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ قید کے دوران بیمار ہوا اور کچھ دنوں بعد مر گیا۔

انگریزوں نے نیچو پر الزام لگایا کہ اس نے میسوری کو زہر دے کر مار ڈالا۔ ان کی جنگی کونسل نے قرارداد پاس کی کہ نیچو سے اس قتل کا بدلہ لیا جائے گا۔

نیچو اس عظیم فتح کے بعد منگور کی طرف روانہ ہو گیا۔

محزل راجا میسور اور اس کے بعد اس کی اولادیں مسلسل ان کوششوں میں مصروف رہیں کہ کسی طرح میسور میں ہندو راج قائم ہو جائے۔ حیدر علی کی زندگی میں بھی یہ کوششیں جاری رہیں اور کئی سازشیں پکڑی گئیں۔ اب نیچو ان سازشوں کا نشانہ تھا۔

ایک خطرناک سازش کا چال اس کے گرد بھی تیار ہوا تھا۔ اس مرتبہ ایک ہندو سردار انچے شامیا اس سازش کا خالق تھا۔ سرنگا پٹم میں ہونے والی ہر سازش میں راج محل کی رانیاں اور مندرجہ ذیل کے ہندو وغیرہ بالواسطہ شریک ہوتے تھے۔

اس سازش میں بھی یہ سب شریک تھے لیکن سازش کی نوعیت ایسی تھی کہ قلعہ دار کو ملانا ضروری ہو گیا تھا۔ یہی ایک مشکل تھی جسے دور کرنے کے لیے انچے شامیا غور و فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

نیچو نے جب سے اقتدار سنبھالا تھا وہ دشمنوں کا بیجا کرنا پھر رہا تھا۔ جیٹن تاج پوٹی کے بعد اسے دارالسلطنت لوٹ کر آنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ انچے شامیا کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ وہ اس کی آمد سے پہلے اس سازش پر عمل پیرا ہونا چاہتا تھا۔

وہ اس وقت راج محل گیا ہوا تھا۔ غور رہا اور چند رانیاں اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ راجا اسے بتا رہا تھا کہ ایک منگور کے محاصرے کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ اس محاصرے میں اسے کئی مہینے لگ سکتے ہیں۔ انچے شامیا نے یہ سن کر کھنڈی ساں بھری۔ اسے سن کر اطمینان تو ہو گیا تھا کہ اس کے پاس وقت بہت ہے لیکن اب بھی ایسی کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسی وقت ایک لوڈی اجازت لے کر اندر آئی اور جو اسے کہنا تھا وہ کام کر کے واپس چلی گئی۔ یہی وقت تھا کہ انچے شامیا کے شیطانی دماغ کو حرکت ہوئی۔

”یہ لڑکی کون تھی؟“

”ملازمہ ہے۔“

”اس سے پہلے تو نظر نہیں آئی۔“

”جی آئی ہے تم نے نہیں دیکھی ہوگی لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”مجھے اس کا چال چلن اچھا نہیں لگا۔“

”ہمیں ملازموں کے چال چلن سے کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے اسے کسی نے یہاں جاسوسی کے لیے بھیجا ہے۔“

”کون سے کیمپ کے؟“

”ان کی اس میں بھی کئی ہے۔“

”تم کا کیا ہے؟“

”اسے میرے حوالے کر دو۔ پھر میں اس کا جو بھی کروں۔“

”ابھی لے جاؤ۔“

”ایہ نہیں۔ اس پر جاسوسی کا الزام لگا کر نکالو تاکہ یہ میری احسان مند رہے۔“

اس لوڈی کا حسن و جمال دیکھ کر انچے شامیا کو قلعہ دار کی یاد آ گئی تھی۔ قلعہ دار بلا کا عیاش تھا۔ عورت اس کی کمزوری تھی۔ وہ اس لوڈی کو قلعہ دار کے سامنے پیش کر کے

اسے اپنے مطلب کے حصول کے لیے خرید سکتا تھا۔ دوسرے دن راج محل میں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ منصوبے کے تحت لوڈی پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا۔ راجا نے حکم دے دیا کہ اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا جائے۔ اسی وقت انچے شامیا وہاں پہنچ گیا۔

”راجا جی آپ کیوں اس کے خون سے ہاتھ دھتے ہیں۔ اسے میرے حوالے کر دو۔ میں قلعہ دار کے حوالے کر دوں گا، وہ اسے موت کے حوالے کر دے گا۔ جاسوسی کرنے والوں کا انجام یہی ہونا چاہیے۔“

راجا نے اس لوڈی کو انچے شامیا کے حوالے کر دیا۔ اس نے بھی شکر بھیا کہ جان تو بچی۔ لوڈی ہی کرنی ہے تو نہیں اور کئی۔ اسے تو اس وقت پہنچتا ہوا تھا جب انچے شامیا نے کھرکھ کر اسے حکم دیا کہ وہ قلعہ دار کو خوب اچھی طرح تیار ہو جائے۔ وہ اس وقت تک یہی سمجھ رہی تھی کہ انچے شامیا اسے کہیں لے جانا چاہتا ہے لیکن جب وہ تیار ہو کر آئی اور انچے شامیا نے اسے غلطی میں طلب کیا تو اس کا ہاتھ ٹھکا۔ وہ اس کے پاس پہنچی تو وہ نئے میں بدست ہو رہا تھا۔

”آؤ خوبصورت پری۔۔۔۔۔ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔“ انچے شامیا نے کہا اور اسے محبت کر اپنی آغوش میں گرایا۔ وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔

”سردار جی، یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“

”کہا تو تھی ہوئی ہے کہ مجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔“

”آپ اس وقت نشے میں ہیں، میں بھراؤں کی۔“

”ایک معمولی لوڈی ہو کر تیری یہ بہت کہ ہم سے ہمارا ہاتھ چڑھائے۔“ انچے شامیا نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

”خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔“

”تو مسلمان ہے؟“

”ہاں۔ اسی لیے میں تجھے نیچو کی دہائی دیتی ہوں۔ مجھے بے عزت مت کر۔“

”واہ! خوبصورت بھی اور مسلمان بھی۔ خوب مزہ آئے گا۔“

وہ چیختی رہی مگر کب تک چیختی۔ انچے شامیا کے فولادی ہاتھوں نے اس کا لباس تار تار کر دیا۔ کچھ دیر بعد اس کی سکیوں کے سوا کچھ بچا نہیں دے رہا تھا۔

انچے شامیا نے کچھ دن اسے اپنے پاس رکھا۔ جب دل بھر گیا تو اسے لے کر قلعہ دار کے پاس پہنچ گیا۔ وہ لوڈی اتنی خوبصورت تھی کہ اسے دیکھ کر قلعہ دار کے من میں پانی بھر آیا۔

”ابھی اسے اس کے پاس چھوڑ جاؤں؟“
 آپ نے اسے جس طرح اپنے پاس رکھا ہے میں
 بھی اسی طرح رکھوں گا۔“
 وہ لڑکی یہ سن کر ہنس مچی لیکن پھر یہ سوچ کر مطمئن بھی
 ہوئی کہ قلعہ دار کو کیا معلوم اچھے شامیانے میرے ساتھ کیا
 سلوک کیا ہے۔ وہ تو یہ کہنا چاہ رہا ہوگا کہ جس طرح تم نے
 آرام سے رکھا ہے اسی طرح میں بھی رکھوں گا۔ اس کی یہ غلط
 فہمی تو اس وقت دور ہوئی جب وہ دونوں بچے کے لیے بیٹھے
 اور حکم ہوا کہ وہ دونوں کا دل بہلائے۔
 ”قلعہ دار جی، آپ تو مسلمان ہیں اور نیچے کے وفادار
 بھی۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر نیچے کے نام کی دہائی دی۔ اس
 مرتبہ بھی اس کی پکار ضائع چلی گئی۔
 قلعہ دار نے اسے اپنی داشتہ بنالیا تھا۔ اچھے شامیا
 بھی تقریباً روز آنے لگا تھا۔ ایک روز یہ غیر معمولی واقعہ پیش
 آیا کہ جب اچھے شامیا آیا تو قلعہ دار نے اس لڑکی کو کمرے
 سے باہر جانے کے لیے کہا۔
 ”آج ہم اکیلے بیٹھ کر بیٹیں گے۔ جب تمہاری
 ضرورت ہوگی تو ہمیں بلا لیا جائے گا۔“
 وہ لڑکی اٹھی اور کمرے کے دوسرے کمرے میں چلی گئی
 لیکن وہ یہ سوچ ضرور رہی تھی کہ اسے کیوں ہٹا دیا گیا۔ اس کا
 دل گواہی دے رہا تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ وہ بے
 چینی سے کمرے میں بٹتی رہی پھر خاموشی سے چلتی ہوئی اس
 کمرے تک آگئی جہاں وہ دونوں بیٹھے شراب کے جام خالی
 کر رہے تھے۔ ان کی بویسل آواز میں صاف بتا رہی تھیں کہ
 دونوں کا نشہ گہرا ہو چکا ہے۔ انہوں نے اتنی بے احتیاطی کی
 تھی کہ دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا۔ وہ دروازے سے لگ کر
 کھڑی ہوئی اور باتیں سننے لگی۔

”تمام لوگوں سے بات ہو چکی ہے۔ کوئلور سے سنگھیا
 آچکا ہے اس سے بھی بات ہو چکی ہے۔ رنگ انگریز بھی پوری
 طرح تیار ہے۔ رنگ راؤ بھی تیار ہو چکا ہے۔ ایک آدمی
 انگریزوں کی طرف بھی بھیج دیا ہے۔ گورنر جملے میں نہیں
 آ رہا ہے۔ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ انگریز جنگی قیدیوں کو ہار کر
 دیا جائے گا، وہ بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔ نیچو کا تختہ الٹ کر ہم
 اپنا راج قائم کریں گے۔“
 ”یہ کام کب ہوگا؟“ قلعہ دار کی آواز ابھری۔
 ”فوج کی خواہش ہے کہ ہمیں ہونے والے دن۔ اس روز وہ
 منتشر ہوں گے اور غیر منظم بھی۔ بس چاروں باقی رہ گئے ہیں۔“
 وہ لوہڑی دروازے سے گئی یہ باتیں سن رہی تھی۔
 اسے ان معاملات سے کوئی غرض نہ ہوئی لیکن وہ ان دونوں
 سے اتنی نفرت کرتی تھی کہ انہیں پھلتا پھولتا دیکھنا نہیں چاہتی
 تھی۔ راجا کے جس خاندان نے اس پر جاسوسی کا الزام لگایا
 تھا ان کا اقتدار وہ بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ خاموشی سے
 دروازے کے پاس سے ہٹ گئی۔ اس کے کانوں کو یقین نہیں
 آ رہا تھا کہ اس نے کیا سنا ہے۔ پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔ یہ
 باتیں سمجھے کی تک پہنچانی چاہئیں۔ اسے یاد آیا، ایک صوبے
 دار کی بھی اس کے پاس آتا تھا اور اس سے لگاؤ تھا کی باتیں
 کیا کرتا تھا۔ وہ خود کو اس کے قابل نہیں سمجھتی تھی اس لیے اس
 کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی تھی۔ اس نے سوچا اس صوبے دار
 کو تمام حالات سے آگاہ کر دے۔ اتفاق یہ ہوا کہ دوسرے
 ہی دن وہ آج بھی گیا۔ اس لوہڑی نے اسے اس سازش سے
 آگاہ کر دیا۔
 یہ صوبے دار فوراً گورنر کا پٹم سید محمد سے ملا اور
 سازش کا پردہ چاک کر دیا۔ گورنر نے فوراً کارروائی کی۔
 سازش کے سرغنہ گرفتار کر لیے گئے۔ سنگھیا کو بہت سے
 باغیوں کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ رنگ راؤ کو
 چھائی دے دی گئی۔ اچھے شامیا کو گرفتار کر لیا گیا کہ اس کا
 قبیلہ نیچہ خود کرے گا۔

☆☆☆

نیچو ابھی منگھور پہنچا نہیں تھا کہ اسے یہ خبر ملی کہ کرنل
 کیسبل ایک بڑے لشکر کے ساتھ حیدرنگری کی طرف جا رہا ہے۔
 سلطان ابھی منگھور سے بارہ میل کے فاصلے پر تھا کہ اسے یہ خبر
 مل گئی۔ سلطان کے پاس ایک لاکھ سے زیادہ جاہ بازوں کا
 لشکر تھا اس لیے اسے پروا نہیں تھی۔ اس نے جملہ کا حکم دے
 دیا۔ لشکر نے پیچھا کیا اور کرنل کیسبل کو جا لیا۔ کیسبل نے بھی
 سامنے آ کر لشکر تیب دیا۔
 دونوں طرف سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ دوپہر
 پوری ہوئی نہیں تھی کہ انگریزوں کا گولہ بارود ختم ہو گیا۔ کرنل
 اپنے لشکر کو لے کر قلعے کی طرف بھاگا۔
 نیچو جب منگھور پہنچا تو اس وقت تک انگریز ایک اہم

موقع پر قلعہ کر چکے تھے۔ وہاں سے شہر کو جانے والا
 راستہ صاف نظر آتا تھا ایک میل کے فاصلے پر تھا لیکن شہر کا
 محاصرہ ہونے کے بعد سپاہیوں کے ہپا ہو کر بھاگنے کا
 راستہ بند ہو گیا تھا چنانچہ جملہ ہوا تو ان میں دھت کھیل
 گئی اور وہ قلعے کی طرف بدحواسی سے بھاگے اور خود کو قلعے
 کے اندر محصور کر لیا۔ نیچو نے محاصرہ کر لیا۔

نیچو کی طرف سے ہونے والی گولہ باری قلعے کی
 دیواروں میں مسلسل گھٹاؤں ڈال رہی تھی۔ قلعے تک رسائی
 پانے کے لیے مورچے برابر قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔
 ارٹیلری شروع ہو چکی تھیں۔ محاصرے کو چار مہینے ہو چکے
 تھے۔ نیچو فوج قلعے کے اندر داخل ہونے کی کوشش
 کر رہی تھی لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔
 محصورین کی حالت روز بروز پستی ہوئی جا رہی تھی۔
 بنگال کے گورنر لارڈ ڈسٹرکٹ کو اس محاصرے پر تشویش تھی۔ نیچو
 کے محاصرے نے اسے کھٹے ٹھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے گھبرا
 کر دو کشتیوں کو سلطان نیچو کی طرف روانہ کیا کہ وہ وہاں جا کر
 سلطان سے صلح کی شرائط طے کریں۔

دونوں کشتیوں کا وفد منگھور کے قریب پہنچا تو سلطان
 نے اپنے دو افسروں کو استقبال کے لیے بھیجا۔ یہ وفد سلطان
 کے لیے پیش قیمت تحائف لے کر آیا تھا۔ سلطان نے اس
 مفروضہ قوم کے ان دونوں کشتیوں سے ملاقات کی زحمت
 نہیں کی بلکہ اپنے دو مقررین پر نیا اور کرنل راؤ کو بات چیت
 کے لیے بھیجا۔

ان ملاقاتوں کے کئی دور ہوئے اور بالآخر ایک معاہدہ
 طے پا گیا جسے ”معاہدہ منگھور“ کہا جاتا ہے جس میں طے پایا
 کہ فریقین ایک دوسرے سے جنگ کریں گے اور نہ ایک
 دوسرے کے دشمنوں کی مدد کریں گے۔ فریقین کے علاقوں کو
 انگریز اور قیدیوں کو واپس کر دیا جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔

معاہدہ منگھور سلطان نیچو کی زبردست فتح تھی۔ اس
 صلح نامے کی نقل انگلستان پہنچی تو وہاں صف ماتم بچھ گئی۔
 حکومت کے اس داغ کو دھونے کے لیے بڑے پیمانے پر
 رد و بدل ہوا۔ گورنر مدراس اور گورنر جنرل کو فوری طور پر
 انگلستان واپس بلا لیا گیا۔ ایک ایسے شخص کو گورنر جنرل بنا کر
 بھیجا گیا جس کے بارے میں یقین تھا کہ وہ جنوبی ہند میں
 اچھی طرح قدم جما کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے راہ ہموار
 کرے گا۔ وہ قوم تجارت کی غرض سے آئی تھی اور مدراس
 میں اے اے ڈالے تھے، اب ہندوستان پر قبضے کے لیے اپنی
 لوہیں اتار رہی تھی۔

اس نئے گورنر جنرل کا نام کارنوالس تھا۔ وہ چونکہ
 امریکی جنگ آزادی کو دبانے میں ناکام رہا تھا اس لیے اسے
 ہندوستان میں برطانیہ کے لیے ایک وسیع سلطنت قائم کرنے
 کی غرض سے بھیج دیا گیا۔ گویا وہ ہندوستان میں اپنے ہم
 قوموں کی نظر میں سرخرو ہو سکتا تھا۔ اس نے انگلستان سے
 روانگی سے قبل حکام کو یقین دلایا تھا کہ وہ سلطان نیچو کو نیست
 و نابود کر دے گا۔

کارنوالس 1786ء میں کلکتہ پہنچا تو خزانے کو خالی اور
 کشت و دھقان کو غیر موزع پایا۔ کمپنی کے مظالم نے بنگال کے
 سرسبز اور زرخیز گاؤں ویران کر دیے تھے۔ بدقسمتی نے
 کسانوں کو حسرت و پاس کی تصویر بنا دیا تھا۔ قحط نے سیکڑوں
 خاندانوں کے غریب افراد کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔

مرہٹہ سردار سندھیا نے اس سے بھی بنگال کا سالانہ
 خراج طلب کیا لیکن اس نے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس
 نے نواب اودھ سے بھی بدترین سلوک کیا۔ نظام سے کھٹو کا
 علاقہ چھین لیا۔

عہد نامہ منگھور کارنوالس کے پاؤں کی زنجیر بنا ہوا تھا۔
 اس معاہدے کی رو سے انگریزوں نے نیچو کو اپنا حلیف قرار دیا
 تھا اور یہ وقت ضرورت دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کرنے
 کا عہد کیا تھا لیکن کارنوالس نیچو سے صرف اس لیے جنگ آزما
 نہیں ہونا چاہتا تھا کہ امریکی نقصانات کی تلافی ہو سکے۔ عہد
 نامہ منگھور کی رو سے وہ نیچو سے جنگ آزما نہیں ہو سکتا تھا اس
 لیے اس نے ایسا رویہ اختیار کیا جس سے نیچو کو یقین ہو جائے کہ
 کارنوالس اس کا دشمن ہے۔ اس نے نظام دکن کو اپنے حلیفوں
 کی ایک فہرست بھیجی تو نیچو کا تمام اس فہرست میں شامل نہیں
 کیا۔ نیچو کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ کارنوالس اس سے ضرور جنگ
 کرے گا۔ کارنوالس نے مرہٹوں اور نظام کو اپنے ساتھ شامل
 کر لیا تو نیچو نے بھی اپنے اتحادی تلاش کرنے کے لیے سفارتی
 کوششیں شروع کر دیں۔

کارنوالس کی نیت کو دیکھتے ہوئے اس نے شہنشاہ دہلی
 کو متحہ و خطوط لکھے جن میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کے
 لیے مدد مانگی گئی تھی۔
 مظوں کا یہ حال تھا کہ مرہٹے ان کے سروں پر تاج
 رہے تھے۔ خزانہ خالی تھا اور وہ انگریزوں سے قرض لے
 رہے تھے۔ شاہ عالم ہندوستان کا شہنشاہ تھا لیکن اس کی
 حیثیت ایک بے ملک نواب کی تھی۔ وہ اس کے سوا کیا کر سکتا
 تھا کہ وہ نیچو کو تسلیم دیتا رہے۔
 اس طرف سے مایوس ہو کر اس نے تمام عہد نامین

سلطنت کو فتح کیا۔ اس مجمع میں اس ہزاروں مساجد میں خطبہ

”شہنشاہ دہلی علی طور پر بے بس اور نام کا بادشاہ رہ گیا ہے لیکن اب تک خطبہ جمعہ میں اس کا نام پڑھا جاتا ہے جبکہ خطبہ میں اس حکمران کا نام شامل کرنا چاہیے جو بالکل آزاد اور خود مختار ہو اور جس کی زندگی کا مقصد دین اسلام کی خدمت کرنا ہو۔ اس لیے حکم دیا جاتا ہے کہ خطبہ جمعہ میں ہمارا نام بے طور سلطان پڑھا جائے۔“

سلطنت خداداد میسور کی ہزاروں مساجد میں خطبہ جمعہ میں سلطان کا نام لیا جانے لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی ریاست ایک خود مختار ریاست بن گئی۔

کارنوال اس شہر کو گھیرنے کے لیے جو جال بچھا رہا تھا اس کی بنیاد دو باتوں پر تھی۔ ایک تو یہ کہ سلطان ٹیپو کو ہمایوں کے ساتھ جنگ میں مصروف رکھا جائے تاکہ انگریزوں کو اپنی طاقت بڑھانے کے لیے مناسب وقت مل جائے دوسرے یہ کہ ٹیپو کے خلاف پروپیگنڈا کر کے یہ ظاہر کیا جائے کہ ٹیپو نہایت ظالم اور سفاک ہے اور انگریز اس بات کے خواہش مند ہیں کہ میسور کو سلطان سے جھین کر اس کے اصل حاکموں کے حوالے کریں۔ چنانچہ فورٹ ولیم کی دیواریوں پر کھڑے ہو کر اعلان کر دیا گیا کہ ٹیپو سفاکی میں چنگیز اور ہلاکو سے کہیں زیادہ ہے۔

ہمایوں سے لڑوانے کے لیے مرہٹوں اور نظام دکن سے مدد لی جارہی تھی۔ ارد گرد کے متبوعہ علاقوں میں بغاوتوں کے بیج بونا انگریزوں کی حکمت عملی کا نتیجہ تھا لہذا ٹیپو کو ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔

ابھی وہ منگور سے فارغ ہو کر سرنگا پٹم پہنچا تھا کہ کورگ میں بغاوت پھیلنے کی خبریں اس سے پہلے پہنچ گئیں۔ کورگ ریاست میسور کا سب سے زرخیز اور بخت نظیر علاقہ تھا۔ کمر تک کھیت لہلاتے تھے۔ جنگلوں میں ساگوان اور صندل کے قیمتی درخت تھے۔ سیاہ مروج کے مسلسل جال نہایت دلربا معلوم ہوتے تھے۔ چھوٹی الائچی کے درختوں کے نیچے اعلیٰ درجے کی الائچیاں عکریزوں کی طرح بکھری رہتی تھیں۔ دار چینی کے درخت آسمان سے ہاتھیں کرتے تھے۔ باغستانی درختوں میں فالس، اناس، کسل، جامن وغیرہ کو دیکھ کر اس سرزمین پر بہشت کا گمان ہوتا تھا۔ یہی حال پھولوں کا تھا۔ گھنڈی، گیندا، نسرین، سوسن اور چنایا کے پھول آسمانوں کو تراوٹ بجھتے رہتے تھے۔ ان کی عورتیں حسن کی دیویوں نظر آتی تھیں۔

اس علاقے کو حیدر علی نے فتح کر کے اپنے علاقے

میں شامل کیا تھا۔ بغاوت کا سنتے ہی وہ بارہ ہزار پیادہ اور دس ہزار سوار لے کر نکلا اور کورگ کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ اس کے سواروں نے بڑے بڑے شہروں کا رخ کیا اور خود پیادہ فوج لے کر اندرون علاقہ بڑھا۔ دن منڈل مقام پر باغیوں سے مقابلہ ہوا۔

شدید جنگ کے بعد سلطان نے باغیوں کو شکست دے دی۔ باغیوں نے لڑنے کی سکت نہ دیکھی تو جنگوں میں چھپ کر گوریلا جنگ کا آغاز کر دیا۔ ٹیپو نے بھی انداز بدلا۔ فوج کو ایک جگہ جمع رہنے کے بجائے اپنے سرداروں کو اطراف و جوانب میں روانہ کیا۔

یہ علاقہ بہت طویل رقبے میں پھیلا ہوا تھا اور پھر جنگوں سے گھرا ہوا تھا۔ ٹیپو کو ان باغیوں کا قلع قمع کرنے میں پورے آٹھ ماہ لگ گئے لیکن پورے علاقے کو از سر نو مسخر کر لیا۔ ایک بھی باغی کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ کہتے ہیں آٹھ ہزار مرد و عورت گرفتار ہوئے۔ باغیوں کی پناہ گاہیں نذر آتش کر دیں۔ غرض ایسا ظلم و فسق کیا کہ اتنے بڑے علاقے میں اعلانیہ یا پوشیدہ ایک بھی باغی زندہ نہ چھوڑا۔

وہ آٹھ دس مہینے کی غیر حاضری کے بعد سرنگا پٹم واپس آیا تو اسے اطلاع ملی کہ نظام حیدر آباد نے مرہٹوں کے ساتھ مل کر سازش شروع کر دی ہے۔ مرہٹوں کے ساتھ مل کر میسور پر حملہ کرنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس کے پیچھے یقیناً انگریز بھی ہوں گے۔ معاہدہ منگوران کے ٹکڑے کی ہڈی بنا ہوا تھا۔ اب وہ اپنے حریفوں کے ذریعے ٹیپو کو کمزور کر دینا چاہتے تھے تاکہ خانہ جنگی کو بہانہ بنا کر اس جنگ میں خود بھی کود پڑیں۔ یہ دونوں حریف اس بیرونی دشمن کے اشاروں پر ناک رہے تھے۔ مرہٹوں کی تو خیر لیکن نظام دکن تو مسلمان تھا۔ وہ بھی ٹیپو سے مصالحت کی ہر کوشش کو ٹھکراتا چلا جا رہا تھا۔

ٹیپو نے آخری کوشش کے طور پر نظام کے نام ایک دردمند اہل لکھی اور اپنے اپنی کے ہاتھ یہ خط نظام کی خدمت میں بھیجا۔

”میں ٹیپو سلطان مسلمانوں کی سلطنت کو تقویت دینا چاہتا ہوں۔ ایسی حالت میں تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ میرا ساتھ دیں۔“

”انسوس کہ میں نے نظام علی خاں کو کئی بار بھی پیغامات کے ذریعے سمجھا لیکن وہ مرہٹوں کی یلغار کو اپنے ملک سے دور رکھنے کے لیے ان کی دوستی کو غنیمت سمجھتے رہے حالانکہ مرہٹوں نے حیدر آباد کو نقصان پہنچایا۔ اس سب کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ میری طاقت کو اپنی طاقت سمجھتے اور جب یہ دونوں

وہ بھاگ کر قلعے میں گھس گئے۔ اتحادیوں نے پیچھا کیا اور قلعے میں گھسنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ قلعہ فی الحال بچا لیا گیا تھا لیکن اس کے کمانڈر حیدر بخش نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ زیادہ دیر جمائیں رہ سکے گا۔ اس کے باوجود اس کی تین ہزار فوج جس میں سے بہت سے مارے جاسکے تھے کسی طرح قلعے سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔

مرہٹہ اس قوت مدافعت پر سخت بھنبھلا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس کے دماغ میں انگریزوں کی آواز گونجی۔ اس نے انگریزوں کے ساتھ رہ کر یہ سیکھ لیا تھا کہ جو کام کوار سے نہ نکلے، دولت کے جوتوں سے نکالو۔ اس نے فوراً جنگ روک دی اور اپنا پیغام بر حیدر بخش کے پاس بھیجا اور یہ تجویز پیش کی کہ قلعہ حوالے کرنے کے بدلے میں وہ جو بھی شرط رکھے گا، وہ پوری کی جائے گی۔

حیدر بخش پہلے ہی اسکا چکا تھا۔ اس پیشکش کو اس نے نعمت سمجھا اور مرہٹہ پیشوا کے کپ میں آگیا۔ اپنی فوج سے بھانہ یہ کیا کہ صلح کی شرائط طے کرنے جا رہا ہے۔ عہد کر کے گیا تھا کہ قلعہ کسی قیمت پر حوالے نہیں کرے گا۔ حیدر بخش مرہٹہ پیشوانا صاحب کے سامنے پہنچا تو نانا کو خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ حیدر بخش اس کے سامنے کھڑا ہے۔ حیدر بخش کی اسی طرح پزیرائی ہوئی جیسے کسی کی مطلب نکالنے وقت ہوتی ہے۔

”حیدر بخش، ہماری کوئی شرط نہیں ہے۔“ نانا نے کہا۔ ”جیت تو آپ کی ہوئی ہے، نواہ گزر گئے۔ ہم اب تک قلعے میں قدم بھی نہیں رکھ سکے ہیں۔ اب آپ بتائیے۔ ہم آپ کو منہ مانگی قیمت دیں گے۔ آپ قلعے سے سلطانی جھنڈا اتارنے کا کیا لیں گے۔ یہ وہ قلعہ ہے جو بیچو کے باپ نے زبردستی چھین لیا تھا۔ یہ آپ کی جیت ہے کہ یہ قلعہ ہمیں خریدنا پڑا ہے۔“

ابھی نانا حیدر بخش کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھ رہا تھا کہ اس کے دوسرا در پر شور مارا اور ہری پنت اندر آئے۔

”اوہو! حیدر بخش جی پدھارے (تشریف) ہیں۔“ سے بھی کیا کیا دکھاتا ہے۔ یاد ہے نرگند کے معاملے میں آپ نے ہم سے غداری کی تھی۔“ پھر وہ نانا سے مخاطب ہوا۔ ”آئے پیچی کو جانے نہیں دینا چاہیے۔ انہیں گرفتار کر کے ہم لوٹا لے جاتے ہیں۔ انہیں ان کی غداری کی سزا بھی مل جائے گی اور بدنامی بھی ہمارے ہاتھ لگ جائے گا۔“

نانا نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ”آپ دونوں نے

دلیرانہ لڑائی کی پہلے ہی انگریزوں کے ہاتھوں میں کھو گیا ہوا تھا۔ اس نے ہندوستانی وفد کے خلاف غلط فہمی پھیلانا شروع کر دیا۔ جب اس کی یہ کوششیں اثر انداز ہو گئیں تو اس نے میر غلام علی کو خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا۔ انہوں نے جو یہ خلیفہ کے نام تحریر کیا تھا اس کا آغاز ہی اس نسلے سے ہوتا تھا۔

”میں انگریزوں سے جہاد میں مصروف ہوں اس لیے آپ کی تائید چاہتا ہوں۔“

اس خط میں اور بھی معاہدے تحریر تھے۔ خلیفہ کا جھکاؤ پہلے ہی انگریزوں کی طرف ہو چکا تھا۔ اس نے سلطان کے کسی بھی منصوبے کی تائید نہیں کی۔

اب تک انگریزوں کو صرف وہ معلوم تھا جو میر غلام علی نے بتایا تھا۔ اب انہیں وزیراعظم کی زبانی خط کے مندرجات کا بھی علم ہو گیا۔ انہوں نے عرب اور ایران میں بھی سلطان کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا لہذا آئندہ سلطان کو عرب و ایران سے بھی کوئی تعاون نہ مل سکا۔

☆☆☆

پونا کے مرہٹہ پیشوا اور دکن کے نظام میں گفت و شنید جاری تھی۔ ڈیڑھ مہینے تک مذاکرات جاری رہنے کے بعد بالآخر طے ہوا کہ دونوں کی فوجیں مل کر میسور پر دھاوا بول دیں۔ اپنے اپنے علاقے بیچو کے قبضے سے نکالنے کے بعد نظام اور مرہٹے باقی متبوضہ علاقے آپس میں تقسیم کر لیں۔ دونوں کے وکیل جیسے ہی اس نتیجے پر پہنچے نظام اور مرہٹوں کی فوجیں سلطنت خدا داری کی طرف بڑھیں۔ یہ مقدمہ انگریزوں کے لیے ایک نیا سوراخ بن گیا تھا۔

انہوں کی شامی سرحد کے ایک قبائلی علاقے میں قلعہ بند کر رہے تھے۔ لیکن ملتے جلتے اتحادی دیواروں میں شکاف ڈالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن کامیاب نہیں ہوئے اس لیے انہوں نے براہ راست حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بیس ہزار جاووں کو ساتھ لے کر دھاوا بول دیا لیکن جیسے ہی وہ آگے بڑھے بارود سے بھری خندقیں بھجک سے اڑ گئیں۔ یہ سرنگیں انہوں نے خفایت کی غرض سے بچھا دی تھیں۔ اس سے اتحادیوں کی بہت سی جائیں ضائع ہوئیں لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ وہ آگے بڑھے اور سیز جیوں کے ذریعے دیواروں پر چڑھ گئے۔

خفایتی فوج نے مزاحمت کی لیکن انہیں شکست ہوئی اور

قافلے کے ساتھ بحری جہاز میں روانہ ہوا۔ اس قافلے کو بحر قلمزم اور مصر سے ہوتے ہوئے سب سے پہلے قسطنطنیہ جا کر عثمانی خلیفہ کے حضور پیش ہونا تھا۔

بصرہ پہنچتے ہی وفد کو سردہری کا سامنا کرنا پڑا۔ عثمانی خلیفہ کی طرف سے سفارت کو قسطنطنیہ آنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ اس کشمکش میں پانچ ماہ گزر گئے۔ آخر میر غلام علی اکیلا قسطنطنیہ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے عجیب ہوا چلتی ہوئی دیکھی۔ انگریز بھی انگلستان سے سفارت پر آئے ہوئے تھے اور خلیفہ کو فرانس کے خلاف بھڑکا کر انگریزوں سے معاہدہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ انگریزوں کی جیت اسی میں تھی کہ انگریزوں اور خلیفہ کے درمیان معاہدہ ہو جانے سے پہلے ہندوستانی سفارت کو خلیفہ سے نہ ملنے دیا جائے۔ ترکی کا سفیر اور دیگر وزیرانگریزوں کے ہاتھ کا کھلونا بنے ہوئے تھے لہذا نواہ تک اسے خلیفہ کے حضور پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔

میر غلام علی خلیفہ سے تو نہیں مل سکا لیکن انگریزوں کے جال میں پھنس گیا۔ انگریزوں نے وزیراعظم ترکی کے ذریعے میر غلام علی سے روابط استوار کر لیے۔ میر غلام علی شراب کا عادی تھا۔ انگریزوں کے ذریعے اسے شراب ملنے لگی تو وہ ان کی محفلوں میں پابندی سے جانے لگا۔ ایک روز شراب کا دور چل رہا تھا۔ میر غلام علی کچھ زیادہ ہی ترنگ میں آ گیا تھا۔ وہ جام لے کر کھڑا ہو گیا اور انگریزوں کے خلاف ایک تقریر کر ڈالی۔

یہ تک کہہ دیا۔ ”میں خلیفہ سے ملاقات ہونے کی دیر ہے۔ پھر دیکھتا ہوں لوگ ہندوستان میں کیسے رہتے ہو، میں یہاں بھیجا ہی اس لیے گیا ہوں کہ تمہیں ہندوستان سے نکالنے کے لیے خلیفہ سے مدد مانگوں۔“

”تمہارا بیچو تو بڑا بھادر بیٹا ہے پھر یہ بزدلی کیوں۔ خلیفہ کی مدد کیوں مانگ رہا ہے؟“

”اگر تم بزدل نہیں ہو تو خلیفہ سے مجھے ملنے کیوں نہیں دیتے۔ یاد رکھو اگر خلیفہ نے مدد نہیں کی تو بھی ہم تمہیں ہندوستان سے نکال باہر کریں گے۔“

اس نے نشے میں وہ راز اگل دیا جسے رازداری سے پہنچانے کے لیے سلطان نے اسے اور وفد کے دوسرے ارکان کو یہاں بھیجا تھا۔

تیرکان سے نکل چکا تھا۔

انگریزوں کو جو بھی اس راز کا علم ہوا انہوں نے وزیراعظم کو خبردار کر دیا کہ وہ خلیفہ کو پہلے ہی اس بات پر آمادہ کرے کہ بیچو کے خیالات کی تائید نہیں کرے گا۔

طاقتیں مل جائیں تو مرہٹوں کو اپنے علاقے سے باہر نکلنے کی ہمت بھی نہ ہوگی۔

اس کا سب سے بڑا سبب انگریزوں کی وہ چال ہے جس نے ہمیں اور نظام کو ملے نہیں دیا۔ اب میرے اور نظام علی خاں کے ہاتھ ہونے کی صورت یہ ہے کہ میرے خاندان کی لڑکیاں نظام کے بیٹوں اور بیٹیوں سے بیاہی جائیں تاکہ طرفین میں یکجہتی کے دروازے وا ہوں اور سب کو معلوم ہو جائے کہ درو اسلامی ملکوں میں اتحاد اور اتفاق ہو گیا ہے۔“

اس خط کے ساتھ جتنی جواہرات اور تحائف اور امرا کے لیے عطیات بھی تھیں۔ نظام اس وقت تو اس خط سے متفق نظر آتا تھا لیکن بعد میں نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے اس منصوبے کو ناقابل عمل قرار دے کر اپنی کو واپس کر دیا۔

دراصل سازشوں اور بدگمانیوں کی ایسی ہوا چلی ہوئی تھی کہ کسی نے بھی اسے ہکا بکا دیا ہوگا۔ انگریز یہ کب گوارا کر سکتا تھا۔ اس طرف سے کوئی مشورہ ملا ہو۔ خود بیچو کے دربار میں میر صادق جیسا خاندان وزیراعظم بنا ہوا تھا اور پورنا وزیر مالیت تھا۔ ایک وقت وہ آیا جب یہ دونوں محل کر سامنے آئے اور بیچو کی شہادت کا سبب بنے۔

انہی کے بے نیل و صرام واپس آنے پر بیچو کو زبردست دھچکا لگا۔ وہ انگریزوں کے خلاف جس جہاد میں مصروف تھا اس میں کوئی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا۔ شہنشاہ دہلی سے بھی امید نہیں رہی تھی۔ نظام نے بھی گورا جواب دے دیا، ارد گرد کی ریاستیں بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ نہ صرف یہ کہ ساتھ نہیں دے رہی تھیں بلکہ انگریزوں کی حلیف بن کر بیچو کے دشمن کی جڑیں کھوکھلی کر رہی تھیں۔

اس نے ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد خلیفہ اسلامی سلطان ترکی کو امید کا ستارہ سمجھا اور ایک سفارتی وفد خلیفہ کے دربار میں قسطنطنیہ روانہ کیا۔ اس وفد کو پہلے ترکی اور پھر فرانس ہوتے ہوئے انگلستان جانا تھا اور وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم سے حکومت انگلستان کو آگاہ کرنا تھا لیکن اصل مقصد یہ ظاہر تجارتی تعلق قائم کرنا تھا لیکن اصل مقصد ترکی کی مدد سے انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا تھا۔ جو کچھ پس پردہ کہنا تھا وہ اس وفد کے ارکان کو بھیجا دیا گیا تھا۔

اس وفد کے ارکان میں میر غلام علی (جو بیچو کے آخری دنوں میں غداری کا مرتکب ہوا) لطف علی بیگ، نور اللہ خاں، جعفر خاں اور بخش محمد حلیف شامل تھے۔

یہ وفد بھی قیمت تحائف لے کر حاجیوں کے ایک

کے سامنے یہ درخواست رکھتی پڑی کہ وہ قلعہ ادھونی پر حملہ نہ کرے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ رقم کی بھی پیشکش کی تھی لیکن سلطان نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ اسد علی جواب پہنچانے کے لیے قلعے میں واپس آ گیا۔ مہابت جنگ نے دوسرے دن پھر اسد علی خاں کو ٹیپو کے پاس بھیجا۔ اب اس کی درخواست یہ تھی کہ خود اسے اور حرم شاہی کو یہ حفاظت جانے دیا جائے۔ ٹیپو نے یہ شرط مان لی لیکن مہابت جنگ کو وقت گزارنا تھا لہذا اس نے دو تین دن کی مہلت مانگ لی۔ اسے یقین تھا کہ اس دوران میں ملک آجائے گی۔

شریف انفس ٹیپو نے یہ شرط مان لی لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ یہ مدت ختم ہونے کے بعد وہ شہر پر حملہ کر دے گا۔ اس کے بعد بھی قلعے کے دروازے نہیں کھلے تو وہ قلعہ کا محاصرہ کر لے گا۔ اسی اثنا میں ٹیپو کو معلوم ہوا کہ مہابت جنگ نے چالاکی سے کام لیا ہے۔ نظام اور مرہٹوں کی فوج کو بلا کر اسے باتوں میں پھنسا رہا ہے۔ اس نے ملک آنے سے قبل شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کی تو جیسں ادھونی شہر میں داخل ہو گئیں اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

ہری پنت کو بکسر گڑھ میں خبر ملی تو اس نے نظام کی ان فوجوں کو جو اس کے ساتھ تھیں اور بیس ہزار مرہٹوں کو ادھونی کی مدد کے لیے جلد سے جلد روانہ ہونے کا حکم دیا۔ نظام نے اسی مہابت جنگ کا خط لے کر اپنے چھوٹے بھائی مغل خاں کو 25 ہزار سواروں کے ساتھ مدد کے لیے بھیجا۔

یہ ساری فوجیں بنور میں جا کر جمع ہوئیں اور ننگا بھدرا ندی کو پار کر لیا۔

ٹیپو نے اس فوج کی آمد کا سن کر محاصرہ اٹھایا اور وہاں سے چند میل کے فاصلے پر ایک بلند مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔

دشمن نے اپنی فوج کا بڑا حصہ پیچھے چھوڑا اور صرف سات ہزار آدمیوں کو لے کر ادھونی کی طرف بڑھا۔ قلعہ

بدای کا قلعہ دار حیدر بخشی بھی اس وقت ٹیپو کے ساتھ تھا۔ یہ وہی تھا جس نے رشوت لے کر قلعہ مرہٹوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے عجیب حرکت کی۔ اپنے سردار

غازی خاں کی اجازت کے بغیر مرہٹوں کی ایک بڑی فوج پر حملہ کر دیا۔ ہونا یہی تھا کہ اسے سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اس نے قبل از وقت جنگ چھیڑ دی تھی۔ اس کی شکست کا احوال

سن کر ٹیپو کو اس کی مدد کے لیے جانا پڑا اور اس طرح وہ ادھونی سے دور ہو گیا۔

مہابت جنگ نے دیکھا کہ ٹیپو ملک کے لیے آنے والی

نہیں آئی۔

”اس کا اطلاق مشہور ہے لیکن اس کے سپاہیوں کو دست درازی سے کون روک سکا ہے۔“

”یہ آپ کن باتوں میں الجھ گئے۔ یہ تو کوئی تدبیر سوچنا کا مقام ہے۔“

”اسی لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”جب طاقت کام نہ آنے تو مصلحت سے کام لیا جاتا ہے۔“

”مصلحت ہی تو آپ بتائیں گی۔“

”مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ابا جان (نظام) اور مرہٹوں کے پاس آدمی دوڑائیں اور ان سے ملک طلب کریں۔ یہ کام جلدی ہونا چاہیے کیونکہ اگر ٹیپو ادھونی کے

لوہ میں پہنچ گیا تو کسی کا قلعہ خالی ہو جائے گا۔“

”ملک کیا اتنی جلدی آجائے گی۔ ٹیپو تو اس سے پہلے ہی حملہ آور ہو جائے گا۔“

”ملک آنے تک اسے باتوں میں الجھائے رکھنا آپ کا کام ہے۔ آپ دیوان اسد علی خاں کو اس کے پاس بھیجیں تاکہ وہ اسے ادھونی پر حملہ نہ کرنے کے لیے آمادہ

کرے۔ کچھ دن اس میں گزر جائیں گے۔ اگر وہ نہ مانا تو اس سے درخواست کریں کہ وہ حرم شاہی کو قلعہ ادھونی سے یہ حفاظت نکل جانے کی اجازت دے۔ اس کے بعد قلعے کے دروازے اس پر کھل جائیں گے۔“

مہابت جنگ نے یہی کیا۔ اس نے وہ اچھی روانہ کی۔ ایک کمرہ سردار ہری پنت کے پاس جانا تھا جو اس وقت اپنی کمرہوں کے قریب کچھ گڑھ میں تھا اور

دوسرے کون کچھا۔

”اب اس کا کیا کام اور اس کے لنگر لے پڑاؤ کیا دونوں

مہابت جنگ نے دیوان اسد علی خاں کو آمادہ کیا کہ وہ ان کے لنگر میں جائے اور ٹیپو سے ملاقات کر کے اسے ادھونی پر حملہ نہ کرنے کی ترغیب دے۔

اسد علی کا مشورہ یہ تھا کہ مہابت جنگ کو جانا چاہیے۔ ایک حکام ہی دوسرے حکام سے گفتگو کرتا ہوا اچھا لگتا ہے لیکن

مہابت جنگ کو اپنی گرفتاری کا خوف تھا۔

”سلطان ٹیپو نظام پر دباؤ بڑھانے کے لیے مجھے گرفتار کر سکتا ہے۔ اس لیے میرا جانا ٹھیک نہیں میرے

لہاسدے کے طور پر تم جاؤ گے۔“

دیوان اسد علی کو مجبوراً ٹیپو کے لنگر میں جانا پڑا اور اس

ہو جائے گی۔

وکیل نے جواب دیا۔ ”پہلے آپ جنگ بند کر دیں اور انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں، خراج ادا کر دیا جائے گا۔“

اس پر تیار نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی ٹیپو نے کوشش جاری رکھی لیکن نانا نے صاف جواب دے دیا اور وکیل کو واپس چلے جانے کو کہہ دیا۔

دونوں طرف سے کورا جواب ملنے کے بعد ٹیپو بنگوری طرف روانہ ہو گیا تاکہ اپنی سلطنت کے دفاع کے انتظامات

کر سکے۔ اس وقت اس کی فوج میں بارہ سو باقاعدہ فوج تھی۔

تیس ہزار سوار اور ہزار باقاعدہ پیدل اور 22 توپیں تھیں۔

اتحادیوں کا خیال تھا کہ ٹیپو بنگور سے بدای آئے گا۔ وہ سب بدای میں جمع ہو گئے لیکن وہ انہیں حیرت میں ڈال کر

ایک ایک قلعہ ادھونی پہنچ گیا۔

یہ وہ قلعہ تھا جس پر نظام کے داماد مہابت جنگ نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ قلعہ نہیں تھا بلکہ نظام کی ایک محکمہ سرحدی

چوکی تھی اور اس کے بھائی اور بال بچے وہاں رہتے تھے۔

ایک سیکی ترکیب تھی جس کے ذریعے وہ اتحادی فوجوں کو اپنی سرحدوں سے نظام کا سرحدوں پر بلا سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے ادھونی کا انتخاب کیا تھا۔

مہابت جنگ نے جو بھی ٹیپو کی آمد کا غلط فہمیا تو وہ لرزہ بر اندام ہو گیا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اکیلا ٹیپو کے

لنگر جوار کا مقابلہ کر سکتا۔ حرم شاہی الگ کھرا مچا ہوا تھا۔

مہابت جنگ کے عقد میں نظام دکن کی بیٹی تھی۔ خوبصورت

بھی تھی اور بیک بھی۔ مہابت جنگ اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ حرم شاہی کی طرف

بھاگا۔ شہزادی کو بھی اس واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے مہابت جنگ کی گھبراہٹ دیکھی تو تھوٹے بغیر نہ رہ سکی لیکن

جلد ہی اس کی ہنسی پر اس کا غصہ غالب آ گیا۔

”آپ مہابت جنگ کہلاتے ہیں اور ٹیپو کی ہیبت کا عالم یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ پاؤں کا پ رہے ہیں۔“

”آپ لاکھ قتل مند کی لیکن جنگ کے میدان کو کبھی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہوگا۔ ٹیپو یہاں شکار کھیلنے نہیں آ رہا ہے۔ میں ایک محدود فوج کے ساتھ اس کے لنگر جوار کا

مقابلہ کب تک کروں گا۔ مقابلہ کیا بھی ہو جتنا وقت گزرے گا اس کا غصہ بڑھتا جائے گا۔ مجھے خود سے زیادہ قلعے میں

موجود عورتوں کا خیال ہے۔ نہ جانے اس کے سپاہی کیا سلوک کریں۔“

”اس کی شرافت مشہور ہے۔ وہ کبھی عورتوں پر ہاتھ

آنے میں دیر کر دی ورنہ شاید ہم آپ کی تجویز مان لیتے، اب تو ہمارا ان سے معاہدہ ہو چکا۔ ابھی ان سے اور بھی کئی کام لینے ہوں گے۔“

وہ دونوں سردار برا سامنے بنا کر واپس چلے گئے۔

یہ شخص اتفاق تھا یا ان دونوں کو اس لیے بلایا گیا تھا کہ حیدر بخشی کو خوف زدہ کیا جائے، اس کے بارے میں کچھ نہیں

کہا جاسکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد حیدر بخشی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے نانا کی تجویز کو قبول کیا اور ہماری

رشوت طلب کر کے قلعہ ان کے حوالے کر دیا۔

وہ قلعہ جو نو ماہ تک مقابلہ کرتا رہا تو منٹ میں دشمن کے حوالے ہو گیا۔ حیدر بخشی سے یہ بھی وعدہ لے لیا گیا تھا کہ وہ ٹیپو کے ساتھ رہے گا لیکن ہماری مدد کرتا رہے گا۔

قلعہ بدای کا رخ ہونا تھا کہ چھوٹے قلعہ داروں نے بغیر جنگ و جدل کے یا معمولی سا مقابلہ کرنے کے بعد یا حیدر

بخشی کی طرح مال وصول کر کے اپنے قلعے دشمن کے حوالے کر دیے۔ دھارواڑ، جالی دار، بکسر، لوکنڈو، نرگندہ وغیرہ

مرہٹوں کے پاس پہنچ گئے۔

ٹیپو سلطان اس وقت کورگ میں تھا کہ اس کے وکیل نے پیڑیں اس تک پہنچائیں۔ ٹیپو ہر مرحلے پر کوشش کرتا تھا کہ جنگ کی نوبت نہ آئے۔ اس مرتبہ پھر اس نے اپنے

وکیلوں کو نظام اور نانا کے پاس پونا بھیجا۔ نظام سے یہ درخواست کی کہ وہ اس اتحاد سے الگ ہو جائے۔

”آپ کو یہ زب نہیں دیتا کہ میرے خلاف اعدائے اسلام کا ساتھ دیں اور اسلامی سلطنت کو تاراج کرنے کی

کوشش کریں۔ آپ انگریزوں کے بہکائے میں آکر ایک مسلمان بھائی کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں کے دشمن کا ساتھ

دینے لگے ہیں۔ آپ ان کا ساتھ چھوڑ دیں اور میری طاقت کو اپنی طاقت سمجھیں۔“

پونا جا کر ٹیپو کے وکیل نے نانا صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”کیا آپ حیدر علی کا وہ احسان بھول گئے جب اس نے آپ کی اس وقت مدد کی تھی جب انگریزوں کے ہاتھوں آپ کے بے دخل ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ آپ نے

انگریزوں کے اتحادی بن کر اس سانحے کو توڑ دیا جو آپ کے اور حیدر علی کے درمیان ہوا تھا اور اب اس کی مملکت کو تباہ

کرنے کے درپے ہیں۔“

نانا کا جواب آیا کہ ٹیپو نے کئی سال سے خراج ادا نہیں کیا۔ جیسے ہی وہ خراج ادا کرے گا مخالفت اور جنگ ختم

دینے ہائیں گے۔

اس کے بدلے میں شیپو نے مرہٹوں سے وعدہ لیتا چاہا کہ وہ تمام وہ مقامات اسے واپس کریں جن پر انہوں نے جنگ کے دوران قبضہ کر لیا ہے اور اسے (شیپو) بادشاہ کے خطاب سے مخاطب کریں گے۔

ہری پنت کو تمام تہاویز سے اتفاق تھا لیکن وہ اس پر تیار نہیں تھا کہ اسے بادشاہ کے لقب سے مخاطب کیا جائے لیکن ٹوکوجی ہوکر نے جو گفتگو میں شریک تھا مدخلت کی تو وہ اس پر راضی ہو گیا کہ آئندہ شیپو کو نائب شیپو سلطان فتح علی خاں کہہ کر مخاطب کیا جائے گا۔

نظام کو اس معاہدے کا فریق نہیں بنایا گیا کیونکہ مرہٹے نظام سے غیر مطمئن اور ناخوش تھے کیونکہ اس نے جنگ میں برائے نام حصہ لیا تھا تاہم جب نظام نے اس کو صلح نامے سے الگ تھلک رکھنے جانے کی حکومت سے شکایت کی تو اسے بھی معاہدے میں شریک کر لیا گیا اور شیپو اس کی سرحدی چوکیاں واپس کرنے پر راضی ہو گیا جن پر اس نے جنگ کے دوران قبضہ کر لیا تھا۔

یہ عجیب بات تھی کہ فتح مند ہونے کے باوجود شیپو نے اتنی کمزور شرائط پر صلح کر لی۔ مرہٹے ہار بھی جیت گئے۔ اسے نہ کوئی علاقہ اور نہ تادان ملا۔ اس کے برخلاف رانچور اور ادھونی نظام کے حوالے کرنے پڑے اور مرہٹوں کو خراج کے بھاری ایک بڑی رقم دینی پڑی۔ کٹور، ترنگٹ اور ہدای سے دست بردار ہونا پڑا۔ یہ وہی مقامات تھے جن کی مدافعت کے لیے وہ نبرد آزما ہوا تھا۔ اس کی سلطنت کی وسعت کم ہو گئی تھی۔

یہ سب نقصان اس نے صرف اس لیے اٹھائے کہ وہ مرہٹوں کو انگریزوں سے دور کرنا چاہتا تھا۔ کارنوالس کے جوتوڑ اور فوجی تیاریوں کے پیش نظر مرہٹوں سے دوستی کے رشتے کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کا یہ خواب محض خواب رہا۔ کچھ ہی عرصہ بعد پیشوائے یہ معاہدہ ٹوڑ دیا اور اس کو زیر کرنے کے لیے انگریزوں سے اتحاد کر لیا۔

سلطان شیپو اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد سرنگا پٹم واپس آ گیا تھا۔ وہ پچھلے چار سال تک مرہٹوں اور نظام سے الجھتا رہا تھا۔ اس تمام عرصے میں ایٹ انڈیا کمپنی خاموش تماشائی دکھائی دیتی تھی لیکن وہ اندر ہی اندر سازشوں کا جال بھی بچھا رہی تھی۔ کارنوالس کو یقین تھا کہ اگر انگریز ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں تو انہیں جلد یا بدیر شیپو سے جنگ کرنی پڑے گی کیونکہ توازن قوت کا جھکاؤ

”ہو تو آپ کے آدمی بات چیت کے ذریعے ہی ملے کریں گے۔ صلح کے لیے پہلی ہری پنت نے کی ہے اس لیے آپ ہی کی شرائط ماننا چاہئیں گی۔“

”اپنے سردار سے یہ بھی کہنا کہ میرے آدمیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

”اگر آپ کو اندیشہ ہے تو ہم دونوں کو یا ہم میں سے ایک کو اپنے پاس روک لیجیے۔“

”میں ایسا بزدل نہیں ہوں۔ میں نے تو ایک بات کہی تھی کہ اپنے سردار کو جتنا دینا۔ اپنے سردار سے کہہ دینا کہ میں آپ کا پیغام لے گیا ہے۔ ہمارے دوسرے دارگفتگو کے لیے ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔“

ان کے جانے کے بعد شیپو نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور بدرا لڑیاں خاں اور علی رضا خاں کو حکم دیا کہ وہ چند افسروں کو ساتھ لے کر ملاقات کے لیے جائیں۔

اس وقت مرہٹہ لشکر پسپا ہو کر دس میل دور پہنچا ہوا تھا۔ شیپو نے جو شرائط تجویز کیں وہ یہ تھیں کہ مرہٹے ہنگامہ اور کرشنا کے درمیان والے علاقے پر اس کے اقتدار اور فرماں روائی کو تسلیم کریں اور لڑائی کے دوران جو مقامات انہوں نے حاصل کر لیے ہیں ان کو بحال کریں۔ اس کے بدلے میں خراج کے بقایا اڑتالیس لاکھ روپے ادا کرے گا۔ معاہدے کے مطابق بارہ لاکھ سالانہ ادا کرتا رہے گا۔

ہری پنت نے ان تجاویز کو رد کر دیا اور جواب دیا کہ صرف اس وقت صلح ہونے کا امکان ہے جب وہ ادھونی کو مہابت جنگ کے حوالے کر دے اور مرہٹوں کو وہ علاقہ واپس دے جو پیشوا ماماجورائے کے زمانے میں ان کے پاس تھا۔ شیپو نے یہ شرائط ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کے نزدیک وہ اپنے باپ کی ان فتوحات سے دست بردار ہو جائے جنہیں اس نے اپنی پہلے تسلیم کر چکا ہے، انتہائی غیر منصفانہ تھا۔ ایک مرتبہ پھر بحث کا آغاز ہو گیا۔ بہر حال کئی تراسیم کے بعد ایک مسودہ تیار ہو گیا جس پر دونوں فریقین نے اتفاق کیا۔

نظام علی خاں، مرہٹے اور سلطان شیپو اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ یہ تینوں اپنے اپنے علاقوں پر ہی حکمرانی کریں گے اور بالکل امن و اتحاد سے رہیں گے۔ اگر کوئی چوٹی طاقت ان میں سے کسی ایک پر حملہ کرے تو تینوں متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

اصلی کا قلعہ مہابت جنگ کو دے دیا جائے گا۔ رانچور، رانچور اور جالی کے قلعے بطور انعام پیشوائے پونا کو

تعداد کے علاوہ تمام فوجی سامان چھین گیا۔ ہری پنت کو شب خون کا خطرہ تھا اس لیے وہ اپنے آدمیوں کو لے کر پیچھے ہٹ گیا لہذا محفوظ رہا لیکن تھور جنگ اور رکھنا تھا کہ زبردست نقصان اٹھا کر بھاگنا پڑا۔

گرفتار شدہ مردوں اور عورتوں کو اتحادیوں کے حوالے کر دیا گیا لیکن مال غنیمت روک لیا۔ اس فتح کے بعد شیپو وارد اور ہنگامہ بھدر کے کنارے والی ناہموار زمین پر آگے بڑھتا گیا اور ”کولہ“ اور بہار بیڑا کے درمیان پڑاؤ ڈالا۔ بہادر بیڑا اس کے نشانے پر تھا۔ ہری پنت اسے فتح کر چکا تھا اور اب اس کے آدمی اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ مخالفی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن یہ دیکھ کر سردار کوئی امید نہیں جان کی امان اور مرہٹہ فوج میں جانے کی آزادی مانگ کر بھٹیا ڈال دیے۔ مرہٹہ فوج چار یا پانچ فرسخ کے فاصلے پر موجود تھی لیکن شیپو کا کھیرا توڑ کر مدد کے لیے نہ آ سکی۔

بہادر بیڑا پر قبضے کے بعد شیپو نے اتحادی فوجوں پر ناگہانی حملے شروع کر دیے۔ ان حملوں کا تو ارادہ کرنا یہی اس قدر بھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ زمین کا کوئی حصہ ان کے پاس نہیں رہ سکے گا اور شیپو ان کا پیچھا کرتے ہوئے پونا تک پہنچ جائے گا۔ مرہٹہ لشکر کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ وہ شام ہوتے ہی گھوڑوں اور گاڑیوں پر سامان لا دیتے تھے اور رات بھر اس انتظار میں رہتے تھے کہ کب ان پر حملہ ہو اور انہیں بھاگنا پڑ جائے۔ آئندہ دو ہفتوں تک وہ اپنا سامان لیے پیچھے پیچھے ہوتے رہے۔

ایک وقت وہ تھا جب شیپو نے نانا صاحب کے پاس اپنا وکیل بھیجا تھا اور جنگ بندی کی اپیل کی تھی اور نانا صاحب نے اس اپیل کو خطرات کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا لیکن اب وقت بدل گیا تھا۔ کارنوالس نے مدد دینے سے انکار کر دیا تھا اور اتحادی فوجیں سلطان کے رحم و کرم پر تھیں۔ انگریز چاہتے بھی نہیں تھے کہ دونوں قوتیں آپس میں لڑتی رہیں۔ نانا کو نظر آ رہا تھا کہ شیپو علاقے پر علاقے فتح کرتا چلا جائے گا۔ اس نے فوراً ہری پنت کو لکھا کہ شیپو سے صلح کر لو۔ اس کے قدموں کو آگے بڑھنے سے روکو۔ ہری پنت تو جیسے بھی انتظار کر رہا تھا۔ اس نے فوراً ایک قاصد شیپو کی طرف دوڑایا۔

”سلطان جی! ہمارا سردار ہری پنت نہیں چاہتا کہ جنگ جاری رہے۔ اس نے کہلا بھیجا ہے کہ آپ اپنے دو آدمی اس کے پاس بھیجیں تاکہ صلح کی شرائط طے ہوں۔“

”اس مرتبہ شرائط میری مرضی سے طے ہوں گی۔“ شیپو

حیدر آبادی فوج سے الجھا ہوا ہے تو وہ اہل و عیال کے ساتھ قلعے سے نکلا اور رائے چور کار خ کیا۔

شیپو نے اس کا تقابض ضروری نہ سمجھا اور واپس آ کر قلعہ ادھونی پر قبضہ کر لیا۔ ان توپوں اور گولہ بارود پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا جو اتحادی جاتے وقت چھوڑ گئے تھے۔

قطب الدین خاں کو ادھونی کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ شہر کے بازار اسی طرح کھلنے لگے جیسے کہ کھلتے تھے۔ شیپو کے کسی سپاہی کی مجال نہیں تھی کہ کسی شہری کو کوئی نقصان پہنچائے۔ برسات سر پر آئی تھی۔ اتحادی فوجوں نے سوچا قلعے پر قبضہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اب محاصرہ ہمیں کرنا پڑے گا۔ اس میں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے اور اگر ہنگامہ بھدر میں طغیانی آگئی تو کہیں پھنس کر نہ رہ جائیں لہذا مدخل علی خاں نے حیدر آباد کا رخ کیا اور باقی فوج بھندر گڑھ جا کر ہری پنت سے مل گئی کہ اسی نے اس فوج کو بھجوا تھا۔

اتحادی فوجوں کی طرح شیپو نے بھی یہی سوچا کہ موسم برسات یہاں گزارنے کے بجائے طغیانی آنے سے پہلے ندی پار کر جائے اور اتحادی فوجوں کو ان کی یورش کی سزا دے۔ وہ علاقے ان سے دوبارہ حاصل کر لے جن پر انہوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

ہری پنت یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طغیانی میں شیپو ہنگامہ بھدر کی ندی کو پار کرے گا۔ وہ میسور کے تمام علاقے پر قبضہ کرنے میں مصروف رہا۔ وہ بہادر بیڑا نامی قلعے پر دھاوا بولنے والا تھا کہ اسے شیپو کے پارا تر جانے کی خبر ملی۔ یہ خبر اس کے لیے پریشان کن بھی تھی اور حیرت ناک بھی۔ اس نے ہراول دستے کو محض یہ دیکھنے کے لیے بھیجا کہ اس خبر میں کتنی صداقت ہے اور یہ کہ شیپو نے کہاں پڑاؤ ڈالا ہے۔

رگھوناتھ میں ہزار کا دستہ لے کر روانہ ہوا۔ ہری پنت اس کا شہر تھا۔ بہادر بیڑا کا قلعہ اس کے قبضے میں آچکا تھا۔ رگھوناتھ نے آکر خبر دی کہ شیپو ہارے کے ایک اہم مقام پر خیمے ڈالے ہوئے ہے۔ ہری پنت نے ٹھکری میں پڑاؤ کیا جو شیپو کے کیمپ سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔

جھڑپوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ہری پنت کے ہمراہ ایک لاکھ سے زیادہ فوج تھی لیکن وہ مکمل میدان میں آکر پوری فوج کے ساتھ مقابلے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کو شیپو کے سپاہی ناکام بناتے رہے۔

شیپو نے شب خون مارنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ شب خون اتنا کامیاب رہا کہ دشمن کے لشکر میں افراتفری پھیل گئی، مرہٹوں کو ایسا سخت دھچکا لگا کہ مجروحین اور مقتولین کی بڑی

میسور کی طرف بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ تمام ہندوستانی ریاستوں میں میسور کی سلطنت سب سے زیادہ منظم تھی اور اس کا نظم و نسق بھی سب سے اچھا تھا۔ میسور کے حکمران نے مرہٹوں اور نظام کو شکست دے دی تھی۔ سفارتی وفد بھیج کر فرانس کے بادشاہ اور ترکی کے سلطان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کارنوالس کی نظر میں اس سے ہندوستان میں انگریز کی مفاد کو شدید خطرات لاحق ہونے کے امکانات تھے۔ اسے پختہ یقین تھا کہ ہندوستانی فرماں رواؤں میں ٹیپو غیر معمولی قابلیت اور بے پایاں حوصلے کا مالک ہے۔ اس نے اس حد تک وسیع علاقہ، دولت اور فوجی قوت حاصل کر لی ہے کہ اس سے کہنی کے کرنا تک کے مقبوضات کے لیے اور اس کے تمام ہمسایوں کے لیے شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس کے پیش نظر وہ سمجھتا تھا کہ ٹیپو کی قوت کو کم کیا جائے۔

اس کے علاوہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے مقبوضات کو وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے اس کی لچائی نظریں ٹیپو کی فکر و پرخصواس کے مالا باری مقبوضات پر پڑ رہی تھیں جہاں مسالے، صندل اور صنوبر کے درختوں کی کثرت تھی اور جہاں کالی کٹ اور کتا نور جیسی بندرگاہیں تھیں۔ امریکی نو آبادیاء انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل چکی تھیں۔ وہ اس کی تلائی ان مقبوضات سے کرنا چاہتے تھے۔ یہ غیر عام ہو گیا تھا کہ ٹیپو کو ختم کر دو اور سابق راجا کو بحال کر دو۔

انگریزوں کو کسی بہانے کی تلاش تھی تاکہ سلطان سے چھین چھاڑ کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اس کے لیے وہ سلطان کے حریفوں کی کمر تھپ تھپا رہے تھے تاکہ ٹیپو ان سے اچھے اور وہ اسے بہانہ بنا کر ٹیپو سے اچھے جائیں۔ ٹیپو کے علاقے میں بغاوت پھیلانے کی کوشش کی اور باغیوں کو پناہ دی۔ انگریزوں نے کوچین اور ٹرانکوور کے راجا کو اکسیا کہ وہ ٹیپو سے چھین چھاڑ کا سلسلہ شروع کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انگریزوں نے راجا ٹرانکوور سے معاہدہ کر لیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانی فوج کی دو بٹالیاں اس کی سرحد پر تعینات کر دیں اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اگر ضرورت ہوئی تو یورپین اور ہندوستانی فوج کی مزید امداد بھی اسے دی جائے گی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر اس نے مالا پار کے باغی تاروں کو بغاوت کے لیے اکسیا۔ اس نے مدراس کے گورنر سے بھی کہا کہ وہ مالا پار کے سرداروں کی مدد کرے اور ٹیپو سے ان کی سلطنتیں انہیں واپس دلانے۔ اس نے ٹرانکوور

کی ان فوجی چوکیوں کو مسمار کرنے سے بھی انکار کر دیا جس کے متعلق ٹیپو نے کہا کہ وہ کوچین کے راجا کے علاقے میں بنائی گئی ہیں جو میسور کا باج گزار ہے۔

ٹرانکوور کی سلطنت جزیرہ نما ہے ہند کے انتہائی جنوبی سرے پر تھی۔ اس کی مشرقی سرحدیں بلند مغربی گھاٹوں کے ڈھلانوں سے گھری تھیں۔ مغرب اور جنوب میں اس کی سرحد سمندر کو چھوتی تھی اس لیے سوائے شمال کے ہر طرف وہ جنگلی کے حلقے سے محفوظ تھی۔ سمت بھی گویا جڑی طور پر گھاٹوں کی پناہ میں تھی مگر کوچین کی طرف سے کھلی ہوئی تھی۔ ٹیپو کو اطلاع ملی تھی کہ تاروں نے پھر خرابا بھارا ہے اور اس بار ان کی پشت پناہی راجا کوچین اور ٹرانکوور کر رہے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی سلطان نے کوچین اور ٹرانکوور پر حملے کی تیاری شروع کر دی۔

وہ بھاری توپ خانہ لے کر مالا پار پہنچ گیا لیکن اس سے آگے راستہ نہایت ناموار تھا۔ راستے میں ایک دریا بھی پڑتا تھا دوسرا راستہ اختیار کیا جاتا تو بہت دیر ہو جاتی۔ اب ٹیپو نے کمال بہادری کا ثبوت دیا۔ اس نے اپنے لشکر کو متبادل راستہ اختیار کرنے کے لیے کہا اور خود جنس دو ہزار سپاہی لے کر روانہ ہوا اور چند روز میں کوچین پہنچ گیا اور حملہ کر کے ریاست پر قابض ہو گیا۔

وہ حیران تھا کہ اتنی جلدی قبضہ کیسے ہو گیا۔ وہ بھی دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ۔ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ وہ اس معمولی سی فوج کے ہمراہ کچھ دنوں تک راجا کو مصروف رکھے گا، اتنی دیر میں باقی ماندہ فوج بھاری سازوسامان کے ساتھ اس سے آگے کی جو دوسرے راستے سے آرہی تھی۔

مکار دشمن نے ایک اور ہی بلان تیار کر لیا تھا۔ جیسے ہی کوچین میں رات نے قدم رکھا، دشمن نے دریا کے بند توڑ دیے۔ پانی نے فرارے پھرے اور سلطانی لشکر چاروں طرف سے پانی میں گھر گیا۔ پانی کا گھیرا کوار چلانے سے نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔

اس کا لشکر پانی سے لٹکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دشمن کے سپاہی کوار میں سونت کر سرسوں پر آ گئے۔ اس شدت سے حملہ کیا کہ سلطان کا تمام لشکر وہیں کام آ گیا۔ اب سلطان کے چاروں طرف خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس کا وزیر قمر الدین زندہ بچ گیا تھا۔ اس نے سلطان کو کسی نہ کسی طرح دریا پار کر دیا۔

راستے میں باقی ماندہ فوج بھی اسے مل گئی۔ ٹیپو کو اس سے پہلے کسی نے اسے غضب میں نہیں دیکھا تھا۔ لشکر کو ختم دیا

شہید ہند

کہ وہ دریا پار کرے اور دشمن سے اپنے ساتھیوں کا انتقام لے۔ اس کی فوج قریب کے جنگل میں گھس گئی۔ جنگل سے لڑاؤ پا گیا۔ دریا پار کرنے میں ناکام اور دریا پار اتر گئی۔ دشمن کا لشکر مقابلے کے لیے تیار تھا لیکن اس کی طرف سے حملہ اس قدر شدید تھا کہ دشمن کو ہلاک ہوا۔ ٹرانکوور کی دیر میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

اب اسے ٹرانکوور کی طرف بڑھنا تھا۔ ٹیپو نے ٹرانکوور کے سرحدی مورچوں کے قریب جنگ کر اپنے وکیل کو راما دورما کے پاس ایک خط لے کر بھیجا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ میسور گورنمنٹ کے باغیوں کو اس کے علاقے لے کر دے۔ دوسرے یہ کہ ٹرانکوور اور راجے کوٹہ سے دست بردار ہو جائے اور تیسرے یہ کہ وہ مورچوں کے اس حصے کو مسمار کر دے جو کوچین کے علاقے سے گزرتے ہیں۔

ان مطالبات کے متعلق راما دورما کا جواب نہایت قریب لپٹا تھا۔ اس نے ہر مطالبے سے قطعاً انکار کر دیا۔ اپنے مطالبات منوانے میں ناکام ہو کر ٹیپو اس خیال سے مورچوں کی طرف بڑھا کہ ممکن ہے راما دورما اپنی معاندانہ روش اس کی موجودگی کے باعث بدلنے پر مجبور ہو جائے۔

انگریز ٹیپو کی اس روایت کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ کارنوالس نے ایک خط میں لکھا۔

”ٹیپو ہمارے ساتھ کیے گئے معاہدے کو توڑنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اس سے زیادہ اس کو روکی نہیں ہوگا۔“

ایک مرتبہ پھر ٹیپو نے اپنے وکیل کو راجا کے پاس کہا۔ اس مرتبہ پھر جنس و تیز جواب موصول ہوا۔ سلطان نے اس وقت ٹرانکوور پر حملے کا حکم دے دیا۔

کوچین اور ٹرانکوور کے راجا انگریزوں کے دوست بنے ہوئے تھے دوسری طرف جنرل میڈوز میسور کے راجا کے مندرجہ فائدان سے چپکے چپکے ساز باز کر رہا تھا جبکہ میسور کی سابقہ رانی اسے سرنگا پیٹ کی تمام اطلاعات بھیجتی رہتی تھی۔ ٹیپو جیسے ہی ٹرانکوور میں داخل ہوا میڈوز کا خط اس کے پاس پہنچا۔

”ریاست ٹرانکوور پر آپ کے حملے کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے ام پر حملہ کیا ہے کیونکہ راجا ٹرانکوور ہمارا دوست ہے۔“

اس خط کے بعد ٹیپو میں کما کی رو جاتی تھی کہ انگریز ہندوستان کا نام لے رہا ہے۔ اس نے میڈوز کو اس خط کا جواب لکھ کر دیا۔

”ہم حیران ہیں کہ معاہدہ منگور کے باوجود انگریز قوم ہم سے لڑنے پر کیوں آمادہ ہے۔ اگر دونوں حکومتوں میں کوئی دشمن پیدا ہوگئی ہے تو باہمی مفاہمت سے معاملہ طے ہو سکتا ہے۔“

میڈوز کی طرف سے اس کا جواب یوں آیا۔

”ٹرانکوور کی حکومت مدراس کی حلیف ہے اور اس کی سرحد پر جو واقعات ہو رہے ہیں ان سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔“

اپنے سخت جواب ٹیپو کو یہ بتانے کے لیے بہت تھے کہ اب انگریز اس سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اس کا اندازہ درست تھا، جنرل میڈوز سرنگا پیٹ کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ ٹیپو اس کا راستہ روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ کوچنور کے قریب اس کا آئنا سامنا جنرل میڈوز سے ہو گیا۔ سلطانی لشکر رخ یاب ہوا۔

ٹیپو کی اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب انگریزوں کے خیمے لوٹتے ہوئے بہت سی عورتیں ہاتھ آئیں۔ ان کا بہ ظاہر جنگ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان سب کو ٹیپو کے سامنے پیش کیا گیا۔

”یہ کیوں عورتیں ہیں؟“ ٹیپو نے پوچھا۔

”موجود، یہ وہ قاضی عورتیں ہیں جنہیں انگریز بدکاری کے لیے اپنے ساتھ ساتھ لے چھڑے ہیں۔“

”یہ تو سب ہندوستانی عورتیں لگتی ہیں۔“

”ہندوستانیوں کو ذلیل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ انگریز بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی ان نظروں میں کیا حیثیت ہے۔ ان میں سے بیشتر مسلمان ہیں۔“

ٹیپو نے ان کی حقیقت جان کر ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ ”یہ بد بخت عورتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ میرے سامنے کھڑی رہیں، لے جاؤ انہیں۔“

اس کے بعد ایک روایت کے مطابق ان سب کو سنگسار کر دیا گیا۔

جنرل میڈوز کو شکست ہوگئی تھی۔ ممکن ہے وہ اسی وقت فرار ہو جاتا لیکن بنگال سے ایک فوج اس کی مدد کے لیے آگئی، دونوں لشکروں نے متحد ہو کر ٹیپو کا مقابلہ کیا لیکن نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ انگریز تھرچانی کی طرف بھاگے۔ سلطان نے آگے بڑھ کر یہاں بھی ان کا راستہ روکا۔ انگریز چاروں طرف سے گھر گئے تھے۔ میسوری فوج نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ انگریز کی فوج کی کواریں زنگ آلود ہو گئیں۔

وہ پسپا ہونے لگے تھے کہ رات کے اندھیرے نے

کا قلعہ ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ یہ قلعہ اب بھی ناقابلِ تسخیر تھا، لیکن سلطان کے ایک مستشار نے راؤ نے غداری کی، وہ قلعے کے اندر کی خبریں انگریزوں کو پہنچاتا رہا۔ اس کی معلومات قلعہ فتح کرنے میں معاون ہوئیں۔

انگریزوں نے اپنی حاکمی فوج کو قلعہ ثابت میں چھوڑا اور دیون بلی بلی گئے۔ یہ شہر اس لحاظ سے اہم تھا کہ گنجا کی ولایت نہیں ہوئی تھی۔

دیون بلی کا قلعہ دار بھی کشن راؤ کی سازش میں شریک تھا لہذا یہ قلعہ بھی کسی جنگ کے بغیر انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔

ایک قریبی قصبے چک بالا پور پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ کارنوالس نے ایک چال چلی اور یہ علاقہ اس کے پرانے مالک کو لوٹا دیا۔ اس اقدام سے یہ ظاہر کرتا تھا کہ انگریز سلطان سے علاقے کے پرانے حاکموں کو واپس کر رہے ہیں۔ اس اقدام سے پرانے دارشین متاثر ہوئے اور سلطان کے خلاف اور انگریزوں کے حق میں آوازیں بلند ہونے لگیں چنانچہ جب سلطان انگریزوں کا تعاقب کرتا ہوا بالا پور پہنچا تو شہریوں نے مخالفتاں نعرے لگا کر اس کا استقبال کیا۔ ان کی اس حرکت نے ٹیپو کو غصے سے بے قابو کر دیا۔ اس نے لشکر کو حملے کا حکم دے دیا۔

سلطان ٹیپو ابھی تک کشن راؤ کی غداری سے بے خبر تھا۔ اس نے اس پر انتہائی اور حکم دیا کہ وہ سرنگا پٹم جائے اور وہاں کے انتظامات سنبھالے کیونکہ انگریزوں سے بعید نہیں کہ وہ کسی وقت بھی سرنگا پٹم کا رخ کریں۔

ٹیپو انگریزوں سے جنگ کرنے میں مصروف تھا۔ بالا پور پر قبضہ کرنے کے بعد آگے بڑھتا گیا اور انگریزوں سے مقابلے کے لیے وینٹ گری کوٹ کے مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ یہیں اس پر کشن راؤ کی غداری کا راز منکشف ہوا۔ وہ انگریزوں پر حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ سرنگا پٹم سے ایک قاصد لشکر میں داخل ہوا۔ وہ تھا کہ ہوا بھی تھا اور سخت گھبرایا ہوا بھی۔ اس نے سرنگا پٹم کے حالات سے ٹیپو کو آگاہ بھی کیا۔ ان حالات میں کشن راؤ کا نام بار بار آ رہا تھا۔

کشن راؤ نے سرنگا پٹم پہنچنے ہی اس نازک وقت میں انگریزوں اور مرہٹوں سے یک وقت سلسلہ جہانی شروع کر دیا تھا۔ وہ بیسویں ہندو ریاست قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا مگر اس کی بیوی ہندو ہونے کے باوجود اسے اس سازش سے روکتی رہتی تھی۔ دونوں میں جب اختلافات بہت بڑھ گئے تو اس کی بیوی کی طرح ٹیپو کی والدہ کے پاس پہنچ گئی جو ماہر ملکہ

ان سفارتی کوششوں کے باوجود کارنوالس پر ٹیپو کا رعب طاری تھا۔ اس نے اسے مزید کمزور کرنے کے لیے سازشوں کے جال بچھا دیے۔ اس نے سلطان کے امرا کو اپنی طرف بلانے کے لیے تھیلوں کے منہ کھول دیے۔ سلطان کے امرا انگریزوں کے ہاتھوں فروخت ہو گئے۔ سید امام جودار السلطنت میں مقیم تھا۔ سلطان کی تمام فوجی کارروائیوں سے انگریزوں کو مطلع کرتا رہتا تھا۔ اسی طرح اور بہت سے جنمیں انگریزوں کی دولت نے خرید لیا۔ کچھ کے بارے میں ٹیپو کو معلوم ہوا اور اس نے انہیں سزا دی لیکن یہ فتنے نہیں ختم نہیں ہوا۔ یہ نہر اتنا پھیل گیا تھا کہ علاج ممکن نہیں تھا۔ کتنے ہی ایسے چہرے تھے جو قافدار نظر آ رہے تھے لیکن انتظار میں تھے کہ کب وقت آئے اور کب وہ اپنا چہرہ بدلیں۔

یہ ان امیروں کی سازش ہی کا نتیجہ تھا کہ سید کی خبر ٹیپو کو اس وقت ہوئی جب کارنوالس کلکتہ سے مدراس پہنچ گیا اور ایک ہی مہینے کے اندر اس کی فوجیں سلطنتِ خدا داد کی حدود میں داخل ہوئیں۔

ٹیپو کو اس وقت بھی نہیں بتایا جا رہا تھا کہ انگریزوں کا اتحادی نظام علی خاں معاہدے کی پاسداری کرتے ہوئے حیدر آباد سے چل کر آنگل میں خیمہ زن ہو گیا ہے۔ کارنوالس کو اتنا وقت مل گیا تھا کہ مختلف علاقوں میں چوکیاں قائم کر کے وہ کرشنا راجپور پہنچ گیا جو منگور سے صرف تین میل دور تھا۔

سرنگا پٹم کی ایک ایک بات باہر جا رہی تھی لیکن ٹیپو کو یہ تک نہیں بتایا جا رہا تھا کہ انگریز فوج بنگلور پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ خبر ہوئی بھی کیسے میر صادق جیسا غدار ٹیپو کا وزیر اعظم تھا۔

سلطان کو خبر ہوئی اور وہ سرنگا پٹم سے نکلا اور ایک مقام تک پہنچ کر قیام کیا۔

انگریزوں نے جنگ کا یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جرنل میڈوز مرکزی فوج کے ساتھ پہلے کوجنور کے صوبے پر قبضہ کرے۔ دوسری طرف جرنل ایرڈرووے، گورنر بمبئی کو مالابار ساحل پر ٹیپو کے مقبوضات کو زیر کرنا۔ تیسری طرف ٹیپو کے حملے سے کرناٹک کو بچانے کے لیے کرنل کلک کو کارمنڈل کے قلعے سے گھس کر بارہ محال میں داخل ہونا تھا۔

کارنوالس اس وقت بنگلور سے تین میل دور تھا۔ کارنوالس کے ہمراہ اس وقت بے تحاشا فوج تھی۔ اس علاقے میں قلعہ بنگلور ٹیپو کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسے اس شہر کے چلے جانے کا بہت دکھ ہوا۔ ٹیپو کا دوسرا بڑا شہر تھا اور اس

تیار تھا لیکن کارنوالس صلح نہیں جنگ چاہتا تھا۔ اس نے خفیہ مینی کو مطلع کیا تھا۔

”ہماری فوجیں اس وقت جتنی منظم اور تربیت یافتہ ہیں اس سے زیادہ کبھی نہیں ہو سکتی ہیں۔“

اسی طرح اس نے میڈوز گورنر مدراس کو بھی لکھا۔ ”اس وقت ہمیں ملکی حکمرانوں سے مدد ملنے کی پوری امید ہے جبکہ ٹیپو کو فرانس سے مدد ملنے کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔“

ان فاسدارادوں کے بعد وہ اپنے ارادوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر مرہٹوں سے معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کی رو سے مرہٹوں اور نظام پر لازم تھا کہ وہ فوراً پچیس پچیس ہزار فوج کے ساتھ ٹیپو کے شمالی مقبوضات پر حملہ کریں اور اس کی سلطنت کے جتنے حصے پر قبضہ کر سکیں کر لیں۔

گورنر جنرل کو سوار فوج کی ضرورت پڑی تو ایک مہینے کے اندر دس ہزار سوار مہیا کرنے ہوں گے۔ ان سواروں کو انگریزی فوج کے ساتھ مل کر لڑنا ہوگا۔ جو علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی فتح کرے گی اس پر اتحادیوں کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

اہم ترین شرط یہ تھی جس نے اتحادیوں کو باندھ دیا کہ صلح تینوں مینی مرہٹوں، انگریزوں اور نظام کی مرضی سے ہوگی۔

اس اتحادی تلاش کے ساتھ ساتھ کارنوالس نے ٹیپو کے باج گزاردوں اور اس کی باغی رعایا کی مدد حاصل کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس نے حکومت بمبئی کو لکھا کہ مالابار کے سرداروں کو سلطان سے بغاوت کرنے پر آمادہ کیا جائے اور اس میں ان کی مدد کی جائے۔

ان کوششوں کے نتیجے میں کناٹور کی رائی اور کورگ کے راجا سے انگریزوں کا معاہدہ ہو گیا۔ اس معاہدے میں ٹیپو اور اس کے حلیفوں کو پناہ دینے سے انکار کیا گیا تھا۔ کمپنی نے اس کے صلے میں ”دورگ“ کی خود مختاری کی حمایت کرنے اور راجا کے مفادات کا خیال رکھنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔

کمپنی نے وعدہ کیا کہ ٹیپو سے اس کے علاقے کو خالی کرانے میں کمپنی اس کی مدد کرے گی۔

یہ ہندوستان کی بد نصیبی تھی کہ جن قوتوں کو ٹیپو کا ساتھ دے کر انگریزوں کو باہر نکالا تھا وہ انگریزوں کے گرد گھبھوں کی طرح بچھ بھتا رہے تھے۔ اپنے اپنے مفاد کے لیے ہندوستان کی آزادی کو داؤ پر لگا رہے تھے۔ ٹیپو کے ہاتھ مضبوط کرنے کے بجائے اسے کمزور کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

ان کی حفاظت کا سامان مہیا کر دیا۔ جنگ موقوف ہو گئی۔ انگریزوں کو جان بچا کر بھاگنے کی فرصت مل گئی۔ میڈوز نے حکم دیا اور انگریز جی بھی فوج اور مال و اسباب اٹھا کر بھاگے اور مدراس جا کر دم لیا۔

سلطان دریائے کلرون کو عبور کر کے آگے بڑھا۔ راستے کے ہر مقام کو فتح کرتا ہوا پاٹلی چری تک پہنچ گیا۔ پاٹلی چری فرانسیزیوں کے قبضے میں تھا۔ اس نے فریج گورنر سے درخواست کی کہ اسے چند ہزار فرانسیزی دے دیے جائیں تاکہ ان کی مدد سے وہ انگریزوں کو نکال باہر کرے۔ اس کی یہ درخواست شاہ فرانس تک پہنچا دی لیکن اس وقت فرانس کے دروازے پر انقلاب دستک دے رہا تھا لہذا شاہ لوئی اس درخواست پر توجہ نہ دے سکا۔

اس وقت جب سلطان کل جنوبی ہند کے سیاہ و سفید کا مالک تھا اور انگریز اس کے دم و کمر پر تھے اگر فرانس سلطان کی مدد کرتا تو ہندوستان کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ فرانس کی طرف سے خطرہ کارنوالس کو بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے مدراس گورنمنٹ کو خط لکھا۔

”اس ملک میں ہمیں اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ٹیپو سلطان سے نبرد آزما ہوں۔ موجودہ وقت سے بہتر موقع ہاتھ نہیں آئے گا کیونکہ ہندوستان کی دوسری طاقتیں اس وقت ہمارا ساتھ دینے کو آمادہ ہیں۔ اگر ٹیپو کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو وہ فرانس سے مدد کر کے ہمیں نکال باہر کرے گا۔“

کارنوالس، ٹیپو سے نبرد آزما ہونے کے لیے پختہ ارادہ کر چکا تھا اور اس کے لیے کسی بہانے کا منتظر تھا۔ یہ بہانہ اسے ٹراونکور پر ٹیپو کے حملے سے مہیا ہو گیا۔ میڈوز کی ٹیپو کے ہاتھوں شرمناک شکست نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس نے فوراً ٹیپو کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی کہ ٹراونکور پر حملہ کوئی جارحانہ کارروائی تھی یا صرف سرحدی جھگڑا تھا۔ میڈوز نے خود پہل کی تھی یا ٹیپو اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس نے ٹیپو کی ان تجویزوں کو بھی مسترد کر دیا جو اس نے لڑائی روکنے اور راجا سے پر امن طریقے پر اپنے جھگڑے چکانے کے لیے پیش کی تھیں۔ اس کے طرز عمل کی تبدیلی کا سبب یہ تھا کہ اب وہ اپنی فوجی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔

گورنر مدراس اور گورنر جنرل کو ٹیپو نے اس سلسلے میں جو خطوط لکھے ان سے یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ ٹراونکور کے راجا سے اپنے جھگڑے پر امن طریقوں سے طے کرنے کے لیے

کہلاتی تھیں اور انہیں کشن راؤ کے عزام سے آگاہ کر دیا۔
 ”مادرملکہ۔ سازش مکمل ہوئی ہے۔ محل کی رانیاں بھی اس میں شریک ہیں۔ یہی سب سے انگریزی فوج بس آنے ہی والی ہے۔ آپ کچھ کر سکتی ہیں تو کر لیں ورنہ سرنگا پٹم ہاتھ سے گیا۔“
 ”بے وقوف لڑکی۔ تو اب مجھے بتا رہی ہے۔ اتنے دن سے کیوں خاموش تھی؟“
 ”کشن غدار کی لیکن میرا پتی ہے۔ میں اسے سمجھا بھجا کر راہ راست پر لانا چاہتی تھی مگر اب اس نے میرا منہ بند رکھنے کے لیے مجھے مارنا پھینکا بھی شروع کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ اپنا ارادہ بدلنے والا نہیں۔ وہ کہتا ہے، اس میں برائی کیا ہے۔ ہم ہندو ہیں اور میسور میں ہندو ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ نہیں سمجھتا کہ اب انگریز بھی درمیان میں ہیں۔ وہ اسے ہندو ریاست کیوں بنانے دیں گے۔ کام نکلنے کے بعد پوچھیں گے بھی نہیں۔ سید حامد حاکم انگریزی راج قائم کر دیں گے۔ ہمارے سلطان نیچو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے لڑ رہے ہیں اور کشن راؤ ان کی محنت پر پانی پھیر رہا ہے۔ بس یہی سوچ کر آپ کے پاس آگئی ہوں۔“
 ”یہ تو، تو نے بری سنائی۔ سلطان تو نہ جانے کس ویرانے میں انگریزوں سے مصروف جنگ ہوں گے۔ ہر ایک پر بھروسہ کر کے یہ بات بتائی بھی نہیں جاسکتی۔ کون ان تک یہ پیغام پہنچائے گا۔ ان کا اس وقت آنا بہت ضروری ہے۔“
 ”آپ کہیں تو میں خود کھوج کے لیے نکلوں۔ کشن کی زبانی مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ سلطان نیچو اس وقت کہاں ہوں گے۔“
 ”باؤلی ہو گئی ہے۔ یہ تیرا کام نہیں ہے۔ میں خود کوئی بندوبست کرتی ہوں۔ تو اب ہر جا اور خبردار کشن کو یہ معلوم نہ ہو کہ تو نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔“
 ”بھگوان، میرے سلطان کی رکھشا کرنا۔“
 وہ لڑکی چلی گئی۔ مادرملکہ کافی دیر تک بیٹھی سوچتی رہیں۔ یوں ہی ایک شک سا گزر کر کہیں کشن راؤ کی بیوی کا آنا بھی اسی سازش کا حصہ نہ ہو۔ اس بہانے سے سلطان کو بلایا جا رہا ہو۔ سلطان کو خبر کروں یا نہیں؟ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ نیچو کو خبر کر دینی چاہیے۔ وہ خود کسی کو بھیج کر تحقیق کر لے گا۔ اس کے بعد ہی مادرملکہ نے نیچو کے پاس قاصد دوڑایا تھا۔
 نیچو نے سید حمید سپہ دار کو سرنگا پٹم بھیجا۔ کشن راؤ سوچ

بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی جان کو کوئی خطرہ ہو سکتا ہے یا اس کا راز منکشف ہو چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس وقت سرنگا پٹم میں گورنر کی حیثیت رکھتا ہے۔ سلطانی حکم سے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ اگر راز منکشف بھی کیا تو کوئی اس کا کچھ نہیں لگاؤ سکتا۔ سلطان یہاں سے ہزاروں میل دور ہے۔ وہ یہاں کیسے آسکتا ہے۔ وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا کہ سید حمید کے ساتھ آئے ہوئے فوجی دستے نے کشن راؤ کے محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ محل میں صرف ایک آنکھ تھی جو جاگ رہی تھی۔ یہ تھی کشن راؤ کی بیوی۔ اسے معلوم تھا کہ ایسی ایک رات ضرور آئے گی اور یہ رات آگئی تھی۔ وہ کشن راؤ سے نفرت کرنے لگی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کا شوہر تھا۔ اس کے انجام کے بارے میں سوچ کر اس کے آنسو بہنے لگے۔ تھوڑی دیر میں گزری تھی کہ پہرے دار کشن راؤ کی خواب گاہ پر دستک دینے پہنچ گئے۔ اس کی بیوی کا دل زور سے دھڑکا۔ اسے معلوم تھا کہ نا وقت کس کی دستک ہے لیکن پھر بھی اس نے برابر لیلے ہوئے کشن راؤ کو بھجوزا۔
 ”اچھے۔ دیکھتے تو، کون دستک دے رہا ہے۔“
 ”اس وقت کون ہوگا۔“ کشن راؤ نے کروت بدلے ہوئے کہا۔
 دروازے کو کوئی اتنی زور زور سے پھٹ رہا تھا کہ حویلی میں اس سے پہلے ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ آنکھیں ملے ہوئے اٹھا اور بڑبڑاتا ہوا دروازے پر پہنچ گیا۔ پہرے دار کھڑے کھڑے کانپ رہے تھے۔
 ”کوئی میسوری سردار ہے۔ کہتا ہے کشن راؤ کو باہر بلاؤ۔“
 ”بذخیر انسانو! کیا تمہیں کہا نہیں گیا ہے کہ جب ہم سو جائیں تو مت اٹھایا کرو۔“
 ”ہم نے ان سے کہا تھا کہ گورنر مہاراج آرام کر رہے ہیں لیکن وہ تو اندر گئے چلے آ رہے تھے۔“
 ”غصہ، میں چل کر دیکھتا ہوں۔“
 وہ باہر نکلا ہی تھا کہ کوئی موقع دے بغیر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسے بولنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اس کی بیوی کو مادرملکہ کے پاس بھجوا دیا گیا جہاں سید حمید موجود تھے۔ انہوں نے اس سے پوچھ چکھی۔ اس کی زبانی کشن راؤ کے ساتھیوں کے نام بھی معلوم ہو گئے۔
 ”تمہیں ان لوگوں کے نام کیسے معلوم ہوئے؟“
 ”مجھے جب کشن راؤ پر شک ہوا تو اس کے پاس جو لوگ آتے تھے میں نے ان کی باتیں چسپ کر سنی شروع

کر دیں۔ اس گفتگو کے دوران مجھے ان لوگوں کے نام معلوم ہوتے چلے گئے۔“
 ان میں سے کچھ لوگ سرنگا پٹم سے باہر کے تھے کچھ سرنگا پٹم ہی کے تھے۔ انہیں اسی رات گرفتار کر لیا گیا۔ انہوں نے ذرا سی سختی کے بعد سب کچھ اگل دیا۔
 صبح ہوئی تو کشن راؤ کو سید حمید کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ شروع میں بہت اڑد کھاتا رہا۔ اس سازش کو ہر زمانے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن جب اس کے ساتھیوں کو بلایا گیا تو وہ نرم کر گیا۔ وہ کچھ گویا کہ سازش بے نقاب ہو گئی ہے اب کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہیں۔
 ”کشن راؤ، اب تجھ سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر بھی میں تجھے ایک موقع دیتا ہوں۔ کیا تجھے اپنے جرم سے انکار ہے؟“ سید حمید نے پوچھا۔
 کشن راؤ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔
 ”تجھے چپ کیوں لگ گئی۔ بولنا کیوں نہیں۔ کم سخت، تجھے سلطان نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ سرنگا پٹم کا سارا انتظام تیرے سپرد کر دیا حالانکہ تو ان کا ہم قوم بھی نہیں اور تو نے ان کے احسانات کا بے بدلہ دیا۔“
 ”میں نے ایسا کیا کر دیا؟“
 ”تو نے یہی سب سے انگریزی فوج بلانے کی سازش تیار کی تاکہ وہ سرنگا پٹم پر حملہ آور ہوں۔“
 ”میں ہندو ہوں۔ میں نے میسور میں ہندو ریاست قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اسے جرم نہیں سمجھتا۔“
 ”اچھا ہوا تم نے اقبال جرم کر کے میرا کام آسان کر دیا۔ مجھے سلطان نے حکم دیا تھا کہ میں سرنگا پٹم پہنچ کر کشن راؤ کی تحقیق کروں اور اگر جرم ثابت ہو جائے تو مجرم کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔ اب تحقیق کی ضرورت نہیں۔ تم اقبال جرم کر چکے اب موت کی سزا کے لیے بھی تیار ہو جاؤ۔“
 ”سید صاحب، تم مجھے موت کی نیند سلاؤ لیکن جو فتنہ میں نے بیدار کیا ہے اسے تمہارا سلطان موت تو کیا نیند کی سزا بھی نہیں سنا سکتا۔ تمہارے سلطان کی باقی زندگی اس فتنے سے لڑتے ہوئے گزر جائے گی۔“
 اس کے یہ الفاظ آئندہ حقیقت بن کر سامنے آئے۔ کشن راؤ کی گردن مار دی گئی اور اس کی لاش بازار کے چوک میں لٹکا دی گئی تاکہ آئندہ کسی کی ہمت نہ ہو کہ لڑائی کرے۔
 کشن راؤ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دے دی گئی

لیکن ایسے ہزاروں فتنے تھے جو اس وقت خاموش ہو گئے لیکن آئندہ انہوں نے سلطنت خداداد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور نیچو کی شہادت کا باعث بنے۔
 کشن راؤ آنجہاں ہی ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ انہوں سے بھی غیروں سے بھی۔ یہ خبریں عام ہونے لگی تھیں کہ کشن راؤ کی خبری اس کی بیوی نے کی تھی۔ ہندوؤں میں غم و غصہ تھا۔ اس کے رشتے دار بھی اب اسے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں تھے۔ اس نے مادرملکہ سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ محل میں رہنے کی اجازت دے دے۔
 ”اب میں کہاں جاؤں۔ سب میری جان کے ہیری ہو رہے ہیں۔ مجھے یہیں رہنے دیں۔ آپ کی خدمت کروں گی دو روٹیاں کھا لوں گی۔“
 ”تو گورنر کی بیوی رہ چکی ہے اور پھر تیرا احسان ہم پر ہی نہیں پورے میسور پر ہے۔ تو یہاں رانیوں کی طرح رہ سکتی ہے۔ میں ایک جاگیر تیرے نام لکھ دوں گی جو میرے بعد بھی تیرا سہارا ہوگی۔“
 وہ مادرملکہ کے پاس رہنے لگی۔
 سید حمید کے سرنگا پٹم آجانے کے بعد نیچو نے میر قمر الدین کو سپہ سالار مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ انگریزوں سے مقابلے کے لیے آگے بڑھے۔
 میر قمر الدین نے انگریزوں کو دھوکا دینے کے لیے نہایت شاطرانہ چال چلی۔ اس نے اپنے لشکر کو حیدر آبادی لباس پہنا دیا۔ سب کو معلوم تھا کہ حیدر آبادی لشکر بھی نیچو سے لڑنے کے لیے میسور میں داخل ہو چکا ہے بلکہ انگریز تو اس لشکر کا انتظار کر رہا تھا۔
 میر قمر الدین اپنی فوج کو لے کر مالور کے راستے سے بنگلور کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی اس نے نصف راستہ طے کیا ہوگا کہ انگریزی فوج نظر آئی۔ انگریزی فوج نے قمر الدین کی فوج کو حیدر آبادی لشکر سمجھا اور اس کی مزاحمت نہیں کی لیکن جب وہ انگریزوں پر ٹوٹ پڑا تو سب کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ بے شمار انگریز مارے گئے۔ سلطانی فوج کے ہاتھ فٹلے سے لدے ہوئے پانچ ہزار تیل اور بے پناہ سامان آیا۔ انگریز لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔
 میر قمر الدین انگریزوں کے تعاقب میں لگا رہا۔ قمر الدین کی ان کامیابیوں سے منطقی ہو کر نیچو سرنگا پٹم کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت تک کشن راؤ کے قتل کو تین چار ماہ گزر چکے تھے۔

وہ عینوں بعد سرنگا پنم آیا تھا۔ اتنی بڑی سازش کے بعد اسے کچھ معلومات بھی حاصل کرنی تھیں۔ وہ سیدھا والدہ کے قدموں میں پہنچ گیا۔ دو سال پہلے اس کی ایک بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ دوسری بیوی اور شہزادے تھے، ان سے ملاقات بھی اس نے موخر کر دی۔

وہ ابھی والدہ کے کمرے تک پہنچا ہی تھا کہ ایک عورت کو اس نے والدہ کے کمرے سے نکلنے کو دیکھا۔ اسے جانی پہچانی شکل لگی ضرور تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے آنکھیں پٹی کر لی تھیں۔ اس عورت نے اسے نہایت ادب سے سلام کیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر نظریں اٹھائیں۔ اس عورت کو کہاں دیکھا ہے؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ عورت وہیں کھڑی رہ گئی اور وہ کمرے میں چلا گیا۔ ماں کی مشتاق آنکھیں اسے دیکھ کر پٹنے لگیں۔ وہ ماں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”تم محاذ چھوڑ کر آگئے؟“

”میر قمر الدین وہاں موجود ہیں۔ وہ تمام امور اچھی طرح سنبھال رہے ہیں۔“

”پھر کبھی وہاں ہونا چاہیے تھا۔“

”انگریز حکومت کھا کر ہمارے کمرے ہوئے ہیں۔“

”انگریز قوم بڑی دھوکے باز ہے۔ وہ پھر کسی وقت تمہیں مشکل میں ڈالے گی۔“

”ایک وہی تھوڑی ہیں۔ نظام اور برہنے الگ میرے علاقوں کو روندتے پھر رہے ہیں۔ میری فوجیں مختلف محاذوں پر لڑتی پھر رہی ہیں۔ میں سرنگا پنم چلا آیا۔ یہاں جو سازشیں ہو رہی ہیں ان کے پیش نظر میرا یہاں رہنا زیادہ ضروری تھا۔“

”ہاں بیٹا۔ سازشوں کا مت پوچھو۔“

”مجھے آپ کا شکریہ بھی ادا کرنا تھا کہ آپ نے مجھے بروقت اطلاع کر دی۔“

”شکریہ تو ہمیں کشن راؤ کی بیوی کا ادا کرنا چاہیے۔ اس عظیم عورت نے وہ کام کیا ہے کہ منور کی تاریخ ہمیشہ اسے یاد رکھے گی۔ اسی نے حب الوطنی کا حق ادا کیا اور کشن راؤ کی خبری کر دی۔“

”چھایہ تو بتائیے۔ ابھی میں آپ کے پاس آ رہا تھا تو ڈیوڑھی میں ایک عورت نظر آئی تھی۔ اس نے مجھے سلام بھی کیا تھا۔ وہ کون تھی۔ ملازمہ بھی نہیں لگتی تھی۔“

”تم اسے کیوں پہچاننے لگے تھے۔ وہ تو کشن راؤ کی بیوی تھی۔ اس کے رشتے دار اس کی جان کے دشمن بن گئے

تھے اس لیے میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔“

”یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ وہ آئے تو ہماری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا اور اس سے کہنا سلطان ٹیپو تمہارے اس احسان عظیم کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔“

”اس کے آنے کی کیا بات ہے۔ میں ابھی اسے بلائے لیتی ہوں۔ تم اپنی زبان سے اس کا شکریہ ادا کرو گے تو اس کا دل بڑا ہو جائے گا۔“

انہوں نے ٹیپو کا جواب سننا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ایک کنیز کو بلا لیا کہ اسے بلا لائے۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ آگئی۔

ٹیپو نے نظریں جھکائے جھکائے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”تم نے جو احسان ہماری سلطنت پر کیا ہے ہم اس کے لیے تمہارے شکر گزار ہیں۔ ہم تمہیں جایگر دینے کے احکام جاری کر دیں گے۔“

”آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ امی حضور یہ مہربانی فرما چکی ہیں۔“

ٹیپو کا کیا تھا۔ عورتوں کی طرف نظر اٹھانا بھی گناہ سمجھتا تھا لیکن اس عورت کی آواز میں ایسا درد تھا کہ وہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے سب کچھ یاد آیا گیا۔ یہ تو وہی ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن نے زور سے اسے آواز دے کر مخاطب کیا۔ اس کی پلکیں پھر جھک گئیں۔ وہ پھر چلی گئی۔

”اچھا امی، میں چلتا ہوں۔“

”ہاں بیٹا جاؤ۔ تمہاری بیوی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔“

وہ ریشمی پردوں کو ہٹاتا ہوا ڈیوڑھی میں آیا۔ نہ جانے کیوں اس کا دل جاہ رہا تھا کہ وہ پھر نظر آ جائے۔ اسے بہت کچھ یاد آنے لگا تھا لیکن اس وقت سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔

وہ اپنے خاص محل میں پہنچا جہاں دونوں شہزادے اور بیوی اس کے منتظر تھے۔ دن بھر محاذوں اور جنگوں کی باتیں ہوتی رہیں۔

سلطنت کے امرا ملنے آتے رہے۔ ان مصروفیات نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور نہیں کیا لیکن جب رات کو سونے کے لیے اس نے زمین کو بستر بنایا (اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نہیں نکال دے گا زمین پر سوتا رہے گا) تو اسے کشن راؤ کی بیوی کا خیال آیا جسے اب وہ پہچان چکا تھا۔

وہ جتنا جتنا سوچتا گیا اس پر یادوں کے دروازے

کھلے چلے گئے۔ اسے یاد آیا کہ اس کے زمانہ شہزادگی میں جب وہ سولہ سترہ سال کا نوجوان تھا، سر و شکار کے لیے جب بھی لڑا تھا ایک لڑکی اسے اپنے گھر کی کنویں سے دیکھا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ٹیپو کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اس اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ وہ شروع ہی سے لڑکیوں کے معاملے میں اناڑی تھا۔

کچھ دنوں بعد لڑکی شوخی پر رات آئی تھی۔ جب وہ گزرتا تو اس کی طرف پھول اچھال دیا کرتی تھی لیکن ٹیپو نے اس کی طرف بھی التفات نہیں کیا تھا۔ پھر حیدر علی نے ٹیپو کو محاذوں پر بھیجنا شروع کر دیا تو وہ لڑکی مایوس ہونے کے بجائے کیا کر گئی تھی۔

حیدر علی کے انتقال کے بعد جب ٹیپو کی تخت نشینی کی رسم ادا ہونے والی تھی تو وہ کسی نہ کسی طرح اس کے سامنے آگئی تھی۔ اس نے گلہ کیا تھا۔

”میں آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائے بچھائے جوان ہو گئی مگر آپ نے کبھی مجھ سے پریم کے دو بول نہیں بولے۔ جانتی ہوں آپ کے لائق نہیں پر میرا دل تو رکھ لیتے۔“

ٹیپو نے اس وقت بھی صرف اتنا کہا تھا۔ ”بس اب تم جاؤ۔ کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”میں صرف یہ بتانے آئی تھی کہ میرا بیاہ ہو رہا ہے، اگلے ماہ۔ اس کے بعد آپ کے پاس نہیں آ سکتی تھی سو چلی آئی۔“

”میں تمہاری شادی کی مبارک باد دیتا ہوں۔ فرصت ملی تو تمہاری شادی میں ضرور آؤں گا۔“

وہ لڑکی کشن راؤ سے بیاہ گئی ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تو کیا اس کے دل میں میری محبت ابھی تک ہے۔ کیا اس نے کشن راؤ کی خبری مجھے پہچاننے کے لیے کی ہے؟ وہ بڑی دیر تک ان سوالوں کے جواب ڈھونڈتا رہا۔

دوسری طرف کشن راؤ کی بیوی کا حال بھی اس سے غلط نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں بہت دن بعد سلطان کی دید سے ٹھنڈی ہوئی تھیں۔ اسے خوشی تھی کہ وہ سلطان کے کسی کام آئی لیکن یہ سوچ کر مایوس بھی ہوئی تھی کہ سلطان نے اسے کچھ یاد نہیں اور اگر پہچان لیا ہے تو ظاہر نہیں کیا۔

تیسری جانب ٹیپو کی ماں میں جنہیں ٹیپو کو دیکھ کر کچھ اور ہی خیال آیا تھا۔ وہ اس خیال کو غلطی جامہ پہنانے کے لیے

راہ ہموار کرتی رہی تھیں۔ ٹیپو کو سرنگا پنم میں رہتے ہوئے دو

احوال تھے۔ اس عرصے میں وہ ایک مرتبہ اپنی

لوہوں کا ہاتھ لینے کے لیے باہر بھی گیا تھا لیکن پھر آ گیا تھا۔ انہوں نے لپکھاتے ہوئے کشن راؤ کی بیوی کے اس کے دل کا حال جاننے کے لیے بات کی۔

”تم ابھی جوان ہو۔ تمہیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟“

”آپ مجھ سے اتنا کہتی ہیں؟“

”یہ تم نے کسے سمجھا لیا؟“

”اسی لیے تو نہیں سمجھے کی بات کر رہی ہیں۔“

”اگر تیری شادی کسی ایسی جگہ ہو جائے کہ تجھے جانا ہی نہ پڑے؟“

”یہ کبھی ہوا ہے؟ جو شادی کرے گا وہ لے کر بھی جائے گا۔“

”اگر شادی کرنے والا یہیں رہتا ہو۔“ مادر ملکہ نے کہا پھر اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سوچ رہی تھی کہ تیری شادی اگر سلطان سے ہو جاتی۔۔۔۔۔“

”وہ اتنے بڑے سلطان ہیں۔ میں کوئی ان کے لائق ہوں۔“

”یہ تو دل سے کہہ رہی ہے؟“ مادر ملکہ نے کہا۔ وہ خاموش تھی۔

”میرا مطلب تھا سلطان مجھے پسند نہیں کریں گے۔“

”اس کی مجال نہیں کہ انکار کر دے۔“

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے ٹیپو سے بات کی لیکن وہ ان شہنشاہوں کی طرح نہیں تھا جو

شادیوں پر شادیاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس نے اپنی مصروفیات کا تذکرہ نہیں کر کے بات کو ختم کرنا چاہا لیکن ماں کی دلیل یہ تھی کہ وہ ہماری وجہ سے بے سہارا ہوئی ہے۔ اس کے احسانوں کا بدلہ اسی طرح اتارا جاسکتا ہے کہ تم اس سے شادی کرو۔ وہ برابر انکار کر رہا تھا۔

وہ کہہ چکا تھا۔ ”شادی بیاہ کی مجھے فرصت نہیں۔“ لیکن ماں نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا۔ ”یہ ہمارا حکم ہے۔“ پھر یہاں تک کہہ دیا۔ ”وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ اپنا مذہب تک تبدیل کرنے کو تیار ہے۔“

وہ مجبور ہو گیا اور اس پر آشوب دور میں اس کو تیسری شادی کرنی پڑی۔

☆☆☆

مرہٹے اور نظام متحد ہو کر سلطان کے خلاف لشکر کشی کا سلسلہ شروع کیے ہوئے تھے، چنانچہ حیدر آباد کے بیٹنی خاں نے قلعہ کو بھی کوئٹہ پر قبضہ کر لیا اور دوسری طرف مرہٹوں نے وہاں واڈا پر قبضہ کر لیا۔

کارنوالس بنگلور پہنچ گیا اور فوجوں کی تنظیم نو میں مشغول ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے فراہمی رسد پر خاص توجہ دی۔

بنگلور میں رہ کر کارنوالس نے یہ کام بھی کیا کہ نظام اور مرہٹوں کی فوج کو بھی اپنے پاس بلایا۔ اب وہ تینوں افواج کے ساتھ مل کر سرنگاپٹم پر دوبارہ حملہ کرنا چاہتا تھا۔ تمام فوجوں کو مل کر ان کی تعداد اکیاسی ہزار بنتی تھی۔ اسی حساب سے جانور تھے اور بار برداری کے لیے جو لوگ تھے وہ الگ۔ تین لاکھ تیس ہزار افراد بار برداری کے لیے اور چار لاکھ جانوروں کے لیے موجود تھے۔

سلطان ٹیپو کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ اگر افواہ بھی اڑ جاتی کہ ٹیپو کا لشکر آتا ہوا دیکھا گیا ہے تو دوسرے لمحے پوری فوج حالت جنگ میں آ جاتی۔ پھر یہ خبر جھوٹی نکلتی تو سخت اٹھانی پڑتی۔ خوف و دہشت کے اسی عالم میں یہ متحدہ لشکر سفر کرتا رہا۔

دوسری طرف غداروں کی گرم بازاری تھی۔ سلطان کو ان سازشیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ اسے برابر یہ باور کرایا جا رہا تھا کہ حضور، سرنگاپٹم کے باہر سب خیریت ہے۔ انگریزوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب وہ اس طرف کارخ نہیں کریں گے۔ اتحادی فوجیں سرنگاپٹم کی فسیل کے باہر پہنچ گئیں۔ انہوں نے صرف چار میل کے فاصلے پر اپنا کیمپ بھی قائم کر لیا اور قلعہ کی دیواروں سے ایک توپ بھی نہیں چلی جبکہ ایک سو بھاری اور تین سو ہلکی توپیں موجود تھیں۔ سلطان کی چالیس ہزار فوج موجود تھی۔

کارنوالس نے جزل میڈوز، کرنل میکسول اور کرنل آر تھر کو حکم دیا کہ وہ شہر پر تین اطراف سے حملہ کر دیں۔ تینوں فوجیں الگ الگ روانہ ہوئیں۔ جب فوج کا ایک دستہ مشرقی دروازے کی طرف گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پہرے دار تک موجود نہیں تھے۔ یہی حال دوسری سمتوں کا بھی تھا۔

یہ ان ملک فروش غداروں کے منصوبے کا حصہ تھا جو ٹیپو کے نہیں انگریزوں کے وفادار تھے۔

سلطانی توپ خانے نے اس وقت آگ برسانی شروع کی جب انگریزی فوج تینوں راستوں سے معمولی سی مزاحمت کے بعد شہر میں داخل ہو چکی تھی۔

اس وقت سلطان کیا کر سکتا تھا۔ وہ قلعہ بند ہو گیا۔ سازشوں کا شباب تھا۔ ٹیپو کے دس ہزار جوان سرنگاپٹم سے فرار ہو گئے۔ ٹیپو اب اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے خلاف

سلطان کی فوجوں نے ہر جگہ پامردی سے مقابلہ کیا لیکن دشمنوں کی اکثر تعداد کے مقابلے میں ان کی پیش نہیں گئی۔ تیسویں کا سپہ سالار میر قمر الدین برابر انگریزوں کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس نے یہ طریقہ جنگ نکالا تھا کہ سامنے آئے کے بجائے اپنے لشکر کو انگریزی لشکر کے پیچھے رکھتا۔ انگریزی لشکر جب کسی جتنی کو لوٹتا ہوا آگے بڑھتا تو قمر الدین کے چھاپا مار دیتے اس پر شب خون مارتے اور لوٹا ہوا مال لوٹ لیتے۔ اسی طرح سامان رسد کو بھی لوٹ لیتے جو اس علاقے میں قافلوں کی شکل میں نظر آتے۔

کارنوالس نے دریائے کاویری پار کیا اور سرنگاپٹم سے نو میل دور آ کر ٹھہر گیا لیکن حالت یہ ہوئی تھی کہ لشکر میں سامان رسد بالکل ختم ہو چکا تھا۔ راستے میں نوں جگہ شب خون مارا گیا تھا۔ لشکر میں اجناس کا قحط پڑ گیا تھا۔ ہر طرف سے بھوک بھوک کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ یہ رات اس نے ان صداؤں کی گونج میں کاٹی۔ صبح ہوئی تو کارنوالس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے کرکٹ کی پہاڑیوں پر پیسوری فوج کو دیکھا۔ سید حمید نے رات ہی میں ان پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ قمر الدین بھی دھاوا مارا ہوا پیچھے چلا آ رہا تھا۔

جب رسد پہنچنے کا کوئی امکان نہیں رہا تو کارنوالس نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ اس نے بڑی بڑی توپیں زمین میں دبا دیں، گاڑیوں کو آگ لگا دی اور واپسی کا حکم دے دیا۔ اس کے فوجی لڑنے کے قابل نہیں رہے تھے اس لیے خوشی خوشی واپس ہونے لگے۔

سلطان ٹیپو نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کے پاس صلح کا خط بھیجا لیکن اس مشرور نے خط کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

سلطان ٹیپو کے امرانے سلطان کو مشورہ دیا تھا کہ اس وقت کارنوالس پر حملہ کر دینا چاہیے۔ حربی نقطہ نگاہ سے یہ صاحب مشورہ تھا۔

نظام دکن کی فوجیں اس وقت کڑیہ اور گرم کٹھہ میں مصروف تھیں اور کارنوالس چاروں طرف سے گھر چکا تھا لیکن ٹیپو نے حملہ کا مشورہ قبول نہیں کیا۔

یہ فیصلہ اخلاقی اعتبار سے کتنا ہی قابل تعریف ہو لیکن جنگوں میں اخلاق نہیں چلتا۔ اس کا نمایاں سلطان کو آئندہ جھگستا پڑا۔

کارنوالس کی فوجیں پسپا ہو کر یہ آسانی علاقے سے نکل گئیں۔ سلطانی لشکر کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی کہ حکم سلطانی یہی تھا۔

بہت بڑی سازش ہوئی ہے۔ اس نے ارد گرد بیٹھے ہوئے امرا کی طرف دیکھا۔ کس کس پر شبہ کیا جائے، کوئی جوت بھی اس کے پاس موجود نہیں تھا۔ اس کے وفادار اسے طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے لیکن اب وہ کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ان سازشوں کے ہوتے ہوئے متحدہ طاقتوں سے جنگ کرنا کوئی منسل مندی نہیں۔ اس نے کارنوالس کو صلح کے لیے خط لکھا۔

اب تک ٹیپو نے جتنے خط کارنوالس کو لکھے تھے، ان کا جواب دینا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا لیکن اب ٹیپو ایسی مصیبت میں گھر گیا تھا کہ کارنوالس اپنی شرائط کے مطابق صلح کر سکتا تھا لہذا اس نے خط کا جواب دیا اور اسے لکھا کہ دونوں طرف کے ویل جمع ہوں اور صلح کی شرائط طے کریں۔ شرائط طے کرنے والوں میں میر غلام علی بھی تھا جس کی غداری بعد میں کھلی۔ اس نے دوسرے ویل کی مخالفت کے باوجود ان شرائط کو تسلیم کر لیا۔

یہ شرائط سلطان ٹیپو کے حضور پہنچیں تو اتنی مایوس کن تھیں کہ سلطان برہم ہو گیا۔ اس نے امرا کی طرف دیکھا۔ سب کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ کوئی بھی ٹیپو کا ساتھ دینے کو تیار نظر نہیں آتا تھا۔ غداری کے اس جال سے بچنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ اس صلح نامے پر دستخط کر دیے جائیں۔ کارنوالس کی شرائط یہ تھیں۔

1۔ سلطان اپنے اتنے علاقے سے دستبردار ہو جائے جو تین کروڑ سالانہ محصول ادا کرتا ہو۔

2۔ آٹھ کروڑ اشرفیاں یا پگڈوڑوں (سکہ) کی شکل میں ادا کیا جائے۔

3۔ اس رقم کی ادائیگی تک سلطان اپنے دو بیٹوں کو بطور یرغمال انگریزوں کے قبضے میں دے دے۔

23 فروری 1792ء کو معاہدہ پر دستخط ہوئے اور اب دو شہزادوں کو یرغمال کے طور پر انگریزوں کے حوالے کرنا تھا۔ اس کے لیے عبدالمقلع عمر آٹھ سال اور معزالدین عمر پانچ سال کا انتخاب کیا گیا کیونکہ بڑا بیٹا فتح حیدر جس کی عمر اٹھارہ سال تھی، فوج کے ساتھ موجود نہیں تھا۔

26 فروری کو دوپہر کے قریب شہزادے توپوں کی سلامی کے ساتھ قلعہ سے روانہ ہوئے۔ قلعے کی پھاٹک کی تفصیل پر سلطان خود انہیں رخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔ ہر شہزادہ ہاتھی پر چاندی کے ہودے میں بیٹھا تھا۔ جلوس کے آگے آگے اونٹوں پر سوار ہر کارے اور سات نشان پر دار تھے جن کے ہاتھوں میں ہبز جھنڈے تھے۔ ان کے پیچھے نیزہ

بردار تھے۔ عقب میں دوسو پیادے اور سواروں کی ایک جمیعت تھی۔ محل سرا میں آہوں اور سکیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان شہزادوں کو مدراس بھیج دیا گیا۔ محاصرہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ صلح نامے کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ کارنوالس نے صلح نامے کی خلاف ورزی کی۔ اس نے سلطان سے مطالبہ کیا کہ کورگ کا حسین علاقہ بھی انگریزوں کے سپرد کیا جائے حالانکہ صلح نامے میں ایسی کوئی شرط نہیں تھی۔

انگریز جانتے تھے کہ سلطان اب جنگ کرنے سے قاصر ہے کیونکہ اس کے ایک ٹیپو دو بیٹے ہمارے قبضے میں ہیں اسی لیے کارنوالس ایسی بدیہاتی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ ٹیپو نے احتجاج ضرور کیا لیکن آخر سلطان کو کورگ بھی انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا۔ کارنوالس نے دھمکی دی تھی کہ اگر کورگ اس کے حوالے نہیں کیا گیا تو جنگ دوبارہ شروع کر دی جائے گی۔

کورگ کا علاقہ نکل جانے سے سلطان کے ہاتھ سے تقریباً آدھا ملک نکل گیا۔ ایک طرف دو بیچوں کے چھن جانے کا دکھ، ایک طرف خزانہ خالی ہو جانے کا رنج اور اب کورگ بھی چلا گیا۔

کارنوالس اور اتحادیوں کا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لیے کارنوالس کے لیے سرنگ پٹن میں مزید قیام کرنا بے سود تھا۔ اس نے روانگی کے لیے سامان باندھا۔ اتحادی اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے۔

کارنوالس نے سابق راجا کے خاندان کی وفادار یاں خریدنے کے لیے ان کی رانیوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ سلطان سے سلطنت چھین کر ان کے حوالے کر دے گا لیکن صلح کر لینے کے عمل سے مرے خوش نہیں ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی نہ کسی وقت سرنگ پٹن میں انگریزی فوجیں پھر داخل ہوں گی۔

سلطان ٹیپو بھی سمجھتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ اس ذلت آمیز صلح سے وہ مایوس نہیں ہوا بلکہ انگریزی فوجوں کے نکلنے ہی اس نے زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ اس لیے نہیں کہ اس کے ہاتھ سے وہ علاقہ نکل گئے تھے جو اس کے باپ حیدر علی نے بڑی جفاکشی سے حاصل کئے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی بار میں ہندوستان کے مستقبل کو گھٹانا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے علاوہ کسی حکمران میں اتنی سکت نہیں کہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکیں۔ میسور کے زوال کے ساتھ ہی کوئی علاقہ محفوظ نہیں رہے گا۔ انگریز

ایسی دھمکیوں کا قیام ہے جو مطلب نکل جانے کے بعد اپنے اتحادیوں کو بھی آزاد کر دے گی۔

کاش انظام اور مرے انگریزوں کے بجائے ٹیپو سے اتحاد کرتے۔

ٹیپو ان اتحادیوں کی طرف سے مایوس ہونے کے بجائے اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کی فکر میں تھا۔ چند ہی ماہ میں قلعوں کی از سر نو تنظیم کی گئی۔ جدید اسلحہ لگے لگے اور فوجی بھرتی کا کام تیز ہو گیا۔

سب سے بڑا کام انگریزوں کو تاون کی باقی اقساط کا قیام تھا۔ اب سلطان کے پاس آدھا ملک بھی باقی نہیں بچا تھا۔ آمدنی کے ذرائع محدود ہو گئے تھے۔ اتنی بھاری قسطوں کا ادا کرنا دشوار نظر آتا تھا۔ سوال شہزادوں کی واپسی کا تھا۔ جب تک شہزادے انگریزوں کے قبضے میں تھے، ٹیپو کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ٹیپو نے حسن تدبیر سے کام لیا۔ بے جا اخراجات سے گریز کیا۔ جو علاقے اس کے پاس رہ گئے تھے وہاں امن قائم کیا اور رعایا پر بوجھ ڈالے بغیر خزانہ بھر گیا۔ اس نے انگریزوں کی بھید ادا کر دیں۔

یورپ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی۔ حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ اسی دوران ٹیپو کے سب سے بڑے دشمن کارنوالس کو انگلستان واپس بلایا گیا۔

کارنوالس نے جنرل میڈوز کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خود انگلستان روانہ ہو گیا۔ اس آیا دھانی میں شہزادوں کی رہائی کا معاملہ رکا رہا حالانکہ قسطوں کی ادائیگی ہو چکی تھی۔ کارنوالس کی جگہ سر جان شوری ہندوستان کا گورنر جنرل بن کر آیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ مجبور تھا کہ ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے۔ اس نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کر لی۔ جب مرہٹوں نے نظام کی ریاست پر حملہ کیا تو نظام نے معاہدے کے مطابق انگریزوں سے امداد مانگی لیکن گورنر جنرل نے مدد دینے سے صاف انکار کر دیا۔

کمپنی کے خزانے بھرنے کے لیے سر جان شوری نے ہندی ہند سے ہٹ کر اودھ کے معاملات میں دخل دے کر لاکھ لاکھ مال کی حالت کو بہتر بنانے کی سعی کی۔

آصف الدولہ والی اودھ کی موت کے بعد اس کے بھائی سعادت علی کو تخت پر بٹھانے کے لیے سر جان شوری نے امداد کی درخواست کی۔ سعادت علی نے ہر شرط پر مہربت کر دی۔

اب گویا شمالی ہند میں بھی انگریزوں کے قدم پہنچے۔ دہلی پہلے ہی انگریزوں کا احسان مند تھا، اب لکھنؤ بھی ہو گیا۔ ان حکمرانوں میں کوئی بھی ٹیپو کی طرح نہیں تھا۔ صرف ایک دفعہ کی رو سے دس لاکھ روپیہ نقد اور الہ آباد کا قلعہ کمپنی کے پاس چلا گیا۔

سر جان شوری 1793ء میں ہندوستان آیا۔ ابتدا میں وہ عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل پیرا تھا (بعد میں اس نے اودھ کے معاملات میں دخل دیا)

1794ء میں اس نے ٹیپو کے دونوں شہزادوں کو مدراس سے جانے کی اجازت دے دی۔ شہزادے اپنے میزبان اور اتالیقوں علی رضا خاں اور غلام علی لنگڑا کے ہمراہ میسور کی طرف روانہ ہوئے۔

غلام علی لنگڑا دو سال تک شہزادے کے ساتھ مدراس میں رہے کی وجہ سے انگریزوں سے بہت قریب ہو گیا اور غالباً اسے لالچ بھی دیا گیا تھا کیونکہ آئندہ وہ ٹیپو سے غداری پر عمل پیرا رہا۔

شہزادوں کی یہ حفاظت واپسی کے بعد ٹیپو کی زندگی کا

Monthly Digest
SUSPENSE
SINER
ARGUZASHT
مرکز اشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama, Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
JD Group of Publications

میرا آباؤ نے انھار ہزار سپاہ بھیجی۔
 آگیا۔
 مرہٹوں کا پیشوا بھی راؤ بھی انگریزوں کی مدد کو آگیا۔
 جزل ہیبرس، جزل اسوارت اور آرتھر ویلزی کی
 کمان میں تین مختلف سمتوں سے فوجیں روانہ ہوئیں جنہیں
 بالآخر سرنگا پٹم میں مل جانا تھا۔
 انگریزی افواج ہر تین طرف سے سرنگا پٹم کی طرف
 بڑھ رہی تھیں۔ سلطان کے جزل ان کی مزاحمت نہیں کر رہے
 تھے، یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت ہو رہا تھا۔
 کچھ ملین پرست دہشتے تھے جو انگریزوں کا مقابلہ کر
 رہے تھے لیکن ان کی بساط کیا تھی۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ
 خود گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے جاں نثار اس کے ساتھ
 تھے۔ وہ بھاگ کر رہا ہوا نکلا اور ایک جگہ پہنچ کر انگریزوں کا
 راستہ روک لیا۔
 اس وقت پورنیا، میر معین الدین اور میر قمر الدین اس
 کے ساتھ تھے۔ یہ تینوں کے تینوں غدار تھے۔ انہوں نے
 جب دیکھا کہ ٹیپو کا لشکر غالب آنے لگا ہے تو وہ لشکر کو اس
 مقام پر لے گیا جو انگریزی توپ خانے کی زد پر تھا۔ سلطانی
 لشکر کو شدید نقصان پہنچا۔ ٹیپو نے ایک مرتبہ لشکر کو کھینچا کیا
 اور دشمن پر ہلا بول دیا۔ اس مرتبہ میر قمر الدین کی غداري سے
 پانسالٹ کیا۔
 سلطانی لشکر کے بہت سے سپاہی دشمن کی سمیٹ چڑھ
 گئے۔
 جزل اسوارت کے متعلق خبر پہنچی کہ وہ سرنگا پٹم کے
 قریب پہنچ گیا ہے۔ اسے سرنگا پٹم کی فکر ہوئی۔ اس نے
 تھوڑی سی فوج اس کاخ پر چھوڑی اور خود سرنگا پٹم پہنچ گیا۔
 وہ سرنگا پٹم پہنچا تو اس کے وفادار امرا اسے مشورہ
 دے رہے تھے کہ وہ سرنگا پٹم سے نہیں اٹھ چلا جائے اور کسی
 دوسری جگہ جا کر از سر نو اپنی قوت بڑھائے۔
 اس نے اس مشورے کو ٹھکرا دیا۔ ”نہیں، میں
 دارالسلطنت چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میسور کی
 تاریخ مجھے مفروہ کے نام سے یاد کرے۔“
 اسوارت کی فوج سرنگا پٹم تک آگئی تھی۔ انگریزی
 فوج کا دوسرا حصہ جزل ہیبرس کی سرکردگی میں آگیا۔ دونوں
 نے مل کر ایک گھنٹان باغ میں مورچے جمالے۔ یہ باغ قلعے
 کی فصیل سے بالکل نزدیک تھا۔ یہاں سے نہایت موثر گولہ
 باری کی جاسکتی تھی۔

بھی انہیں پریشان کر رہی تھی۔ ان کے جاسوسوں نے یہ
 اطلاع بھی دی تھی کہ وہ ایران سے بھی انگریزوں کے خلاف
 ساز باز کر رہا ہے۔
 میر غلام علی لکھڑا نے یہ اطلاع بھی پہنچا دی کہ دوسو
 فرانسیسی فوجی عہدے دار سلطان کی مدد کے لیے سرنگا پٹم پہنچ
 گئے ہیں اور ٹیپو کے کہنے پر وادی افغانستان، ہندوستان پر حملہ
 آور ہونے کے لیے پرتول رہے ہیں۔ وہ اگر دہلی پہنچ گیا تو
 مغل شہنشاہ کو سہارا مل جائے گا اور وہ انگریزوں کے خلاف
 اٹھ کھڑا ہوگا۔
 یہ تمام خبریں انگلستان پہنچ رہی تھیں۔ جو کچھ ہو رہا تھا
 اسے سر جان شوری کمزوری سمجھا گیا اور 1798ء میں لارڈ
 ویلزی ہندوستان کا گورنر جزل بنا کر ہندوستان بھیجا گیا۔ اس
 کا انتخاب شاید اس لیے کیا گیا تھا کہ اسے فرانسیسیوں کا سخت
 دشمن خیال کیا جاتا تھا۔
 اس نے مدراس کی سرزمین پر قدم رکھا ہی تھا کہ اسے
 معلوم ہوا اسی دن ٹیپو کے سفیر مارٹینس سے منگور پہنچے ہیں۔
 میرے اندیشے درست تھے، اس نے سوچا۔ ٹیپو فرانسیسیوں
 کے گھم جوڑ میں لگا ہوا ہے۔
 مدراس سے ٹیکٹک وہ ٹیپو کو شکست دینے کی تجویزیں
 تراشا رہا۔ ٹیکٹک پہنچتے تک وہ اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے ایک
 شاندار ترکیب وضع کر چکا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ٹیپو سے
 جنگ آزما ہونے کے لیے تباہ کنی کی فوجیں ناکافی ہیں۔ نظام
 اور مرہٹوں کو ساتھ ملائے بغیر یہ جنگ نہیں جیتی جاسکتی۔ اس
 نے نظام کو قابو کرنے کے لیے حکم نامہ جاری کیا کہ تمام
 ہندوستانی ریاستوں کو اپنی امداد کے لیے انگریزی فوج اپنی
 حدود ریاست میں رکھنی ہوگی۔ کوئی ریاست غیر برطانوی
 افسروں کو ملازم نہیں رکھ سکتی۔ جہاں جہاں فرانسیسی افواج
 ہیں انہیں نکال دیا جائے۔ ایسی ریاستوں کی کوئی مدد نہیں کی
 جائے گی جہاں فرانسیسی افواج ہیں۔
 اس حکم نامے کے پیچھے یہ مقصد پوشیدہ تھا کہ سلطان ٹیپو
 اس حکم کو ہرگز نہیں مانے گا اور اس کا یہی انکار اس پر حملے کے
 لیے بہانہ بنالیا جائے گا۔
 نظام بھی ابتدا میں تیار نہیں ہو رہا تھا لیکن بالآخر نظام اور
 انگریزوں کے درمیان معاہدہ ہو گیا۔ نظام نے انگریزی
 امدادی فوج اپنی ریاست میں رکھ کر اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا لیے۔
 مرہٹوں میں یہ افواہ پھیلا کہ مضطرب کر دیا گیا کہ وادی
 افغانستان، ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ شمالی ہندوستان
 میں جو مرہٹوں کے مقبوضات ہیں وہ خطرے میں ہیں۔

انگریزوں کو یہاں تک لانے والا غدار میر قاسم علی تھا۔ سلطان اس گوشے کا معقول انتظام نہ کر سکا تھا۔ میر قاسم قلعے کے اس کمزور پہلو سے واقف تھا۔ اس نے انگریزوں کو مخبری کر دی۔

اس وقت دار السلطنت میں صرف میر قاسم ہی نہیں تھا۔ ہر امیر اپنی جزیں کاٹنے میں مشغول تھا۔ امرا کے مکانات جاسوسوں کے ٹھکانے بنے ہوئے تھے جن میں انگریز جاسوس پہلے ہی سے آکر چھپ گئے تھے۔ یہ جنگ ہتھیاروں سے نہیں سازشوں سے لڑی جارہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی فوجوں نے چاروں طرف سے سرنگا پٹم کو گھیرے میں لے لیا۔

اپنی ہزیمت اٹھانے کے بعد اسے یقین آ گیا کہ ہر چہرے پر دوسرا چہرہ لگا ہوا ہے۔ جن لوگوں کو اس نے جاگیریں، زمینیں، مراعات بلند کیے، جاں نثار سمجھا وہی اس کی جان کے خواہاں ہیں۔ اس کے وفادار اس پر جان بچھاؤ۔ کرنے کی قسمیں کھا رہے تھے اور وہ اپنے قول میں صادق بھی تھے لیکن قلعے کے باہر سے گولہ باری ہو رہی تھی۔ اس طرف سے جو توپیں داغی جارہی تھیں ان توپوں میں روٹی بھری ہوئی تھی۔ ان غداروں کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ توپوں میں پھول رکھ کر انگریزوں پر پھٹاؤ کرتے۔

جزل میڈوز نے اپنی کتاب میں اس کا اعتراف کیا۔ ”ہمیں محفوظ راستے سے لا کر رہبری کرتے ہوئے عین قلعے کے سامنے جنوب مغرب کے گوشے تک لانے والا میر قاسم علی تھا۔“

سرنگا پٹم کا قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ اس کی کمزور ترین فصیل پر مسلسل گولہ باری کرنے کے باوجود قلعے میں داخل ہونے کے لیے بیس دن لگ گئے۔

مسلسل غیر موثر گولہ باری کو بھانپ کر اپنے فریج جزل موسیو کو طلب کیا۔

”آپ دیکھ رہے ہیں، جن کو میں اپنا سمجھتا تھا انہوں نے میرے ساتھ کیا دھوکا کیا ہے۔ میں ان کی دغا بازی پر بہت متعجب ہوں۔ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

موسیو، سلطان کی بے بسی پر آبدیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ”ہم آپ کے لیے کٹ مرنے کو تیار ہیں لیکن آپ کی زندگی بہت قیمتی ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ تمام نقد و جواہر اور نیکیات کو لے کر صوبہ سرایا چھٹیل وگ چلے جائیں۔ آپ کے بعد قلعے کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔“

یہ مشورہ نہایت معقول تھا۔ اگر وہ نکل جاتا تو انگریزوں کا محاصرہ اٹھا لیتے یا کم از کم یہ تو ہوتا کہ وہ دوبارہ سرنگا پٹم کو فتح کر لیتا۔

”میری ایک تجویز اور ہے“ موسیو نے کہا۔ ”انگریزوں کو ہم فرانسیسیوں سے پر غاش ہے۔ آپ ہمیں نکال دیں۔ انگریز آپ سے مصالحت پر آمادہ ہو جائیں گے۔“

”میری پوری سلطنت بھی تاراج ہو جائے تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔“

میر صادق کو معلوم ہوا کہ سلطان فرانسیسیوں کی باتوں میں آنے والا ہے تو اس نے سلطان کے پاس حاضری دی اور اسے بھڑکانے کی کوشش کرنے لگا۔

”حضور، ان کی باتوں میں نہ آئیے گا۔ فرانس اور انگریز دونوں یورپین قومیں ہیں۔ اگر آپ نے پیٹھ موڑی تو فریج سپاہ انگریزوں سے مل جائے گی اور ملک ہاتھوں سے چلا جائے گا۔“

”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”میری رائے تو یہ ہے کہ مساویانہ شرائط پر انگریزوں سے صلح کر لیں۔“

”مجھے یقین نہیں کہ اس وقت انگریز صلح کریں گے۔“ ”انگریز آپ کے نام سے کانپتے ہیں۔ وہ ضرور صلح کر لیں گے۔ اگر شرطیں حسب منشا نہیں ہوں تو ہم تسلیم نہیں کریں گے۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔“

سلطان نے اس کی بات مان لی۔

میر صادق نے دوسرے ہی روز انگریزی یکپ میں خبر پہنچا دی کہ سلطان صلح نامہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ آپ سخت سے سخت شرائط رکھیے۔

ٹیپو نے صلح کی تحریک چلائی اور نتیجہ حسب توقع نکلا۔ انگریزوں نے حسب ذیل شرائط رکھ دیں۔

1- تمام فرانسیسی سپاہ کو برطرف کر کے انگریزوں کے حوالے کیا جائے۔

2- سلطان کو انگریزوں کا باج گزار بن کر رہنا پڑے گا۔

3- سواحل کے قریب والے تمام علاقے انگریزوں کے حوالے کیے جائیں۔

4- سلطان کے بعد انگریز چاہیں تو تمام سلطنت پر قابض ہو جائیں گے۔

5- سلطان ضرورت کے وقت اپنا خزانہ بھی

انگریزوں کے حوالے کرے گا۔

6۔ سلطان اپنے چار لڑکے انگریزوں کی تحویل میں دے۔ شہزادوں کے ساتھ چار وکیل میر قمر الدین، میر صادق، پوریا اور سید غفار بھی انگریزوں کے حوالے کیے جائیں۔

ان میں سید غفار کے علاوہ باقی تین وہ تھے جو انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔ سید غفار سلطان کا سب سے وفادار سپہ سالار تھا۔ وہ اسے سلطان سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ تینوں ایجنٹوں کی طرف سے انہیں یہ خطرہ تھا کہ سلطان انہیں قتل نہ کر دے اس لیے اپنے پاس بلانا چاہتے تھے۔

کون فیروز مسلمان ان شرانڈہ کو تسلیم کر سکتا تھا۔ یہ تو میر صادق جیسے غداروں ہی کا شیوہ ہو سکتا تھا جو ایسی شرانڈہ معاہدے میں رکھوا دیں۔ ٹیپو نے ان شرانڈہ پر غور کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی اور ٹنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق انگریزوں پر گولے برسائے کا حکم دیا۔ توپ خانے پر بھی غداروں کی کئی چٹیں تھیں۔ توپوں کے اندرونی اور بیرونی بھر گرتوئیں چلائی جانے لگیں۔ سید غفار بھاگتا ہوا سلطان کی خدمت میں آیا۔

”حضور، اس غدار خانے میں کسی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے میری التجا پر جلد سے جلد یہاں سے نکل جائیے۔ میں اور میری سپاہ اس وقت تک مزاحمت کرتی رہیں گی جب تک آپ پتیلی درگ نہ پہنچ جائیں۔“

”میرے چند رفقاء کا بھی یہی کہنا ہے اور اب تم بھی یہی کہہ رہے ہو۔ اچھا مال و زر صندوقوں میں بھرواؤ۔ میں پتیلی درگ جاؤں گا۔ جنگ تو میں وہاں رہ کر بھی کر سکتا ہوں۔“

سب سے پہلے میر صادق کو سلطان کے اس فیصلے کی خبر ہوئی۔ وہ بدرائزماں کے پاس گیا۔ ”غضب ہو گیا۔ سلطان نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر وہ نکل گیا تو ہم انگریزوں کو کیا فائدہ کھا سکیں گے۔ فوراً سلطان کے پاس جاؤ اور اسے روکنے کی کوشش کرو۔ اگر میں نے کچھ عرض کیا تو اس کے دل میں شک پیدا ہو جائے گا کہ بار بار میں ہی کیوں روکتا ہوں۔“

”اگر وہ پھر بھی نہیں رکاوٹ“

”پھر ہم انگریزوں کو خبر کر دیں گے۔ مال و زر راستے ہی میں لٹ جائے گا۔“

بدرائزماں نے چند اور امرا کو ساتھ لیا جو سب کے سب انگریزوں کے ہاتھوں بک چکے تھے اور سلطان کے

حضور پہنچ گیا۔

”حضور والا اگر آپ تشریف لے گئے تو جاں نثاروں کی ہمتیں ٹوٹ جائیں گی۔ اس کے علاوہ یہ حضور کے شانہ شان بھی نہیں۔ ہم وفادار حق تمک ادا کریں گے۔ آپ پر کوئی گزند نہیں آئے دیں گے۔“

ٹیپو نے اس مناقق کے کلمات کو حیرت سے سنا۔ پھر اس نے وہاں موجود دوسرے امرا کی طرف دیکھا۔ سب کے سب بدرائزماں کی تائید کر رہے تھے۔

سلطان ٹیپو انہیں پہچان چکا تھا لیکن شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ بھی انسان ہیں۔ ہو سکتا ہے راہ راست پر آگئے ہوں۔ یا پھر یہ کہ خود اس کی غیرت بھی یہ گوارا نہ کر رہی ہو کہ وہ ان غداروں کے ساتھ ساتھ اپنے وفاداروں کو موت کے منہ میں دھکیل کر خود بھاگ جائے۔ ایک سردار بھر کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔

”اچھا اگر مشیت ایزدی یہی ہے تو نہیں جاتا۔“ دشمنوں کی سازش کا مایاب ہو گئی تھی۔ اب انہوں نے کھل کر انگریزوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا۔ فوج کے بخشی، میر صادق کی ہدایت پر انگریزوں کو قبل از وقت خبر دے دیے تھے کہ آج اس فیصلے سے گولہ باری ہوگی۔ فلاں جگہ اتنی فوج متین ہے۔ میر قاسم تو انگریزوں کی رسد روکنے کے بہانے سلطانی رسد ساتھ لے کر انگریزی کی یکپ میں پہنچ گیا تھا اور وہاں سے انگریزوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

میر قاسم علی غائب تھا۔ اس کا مطلب یہی لیا جاسکتا تھا کہ وہ انگریزوں کے پاس پہنچ گیا۔

شدید گولہ باری سے قلعے کی ایک دیوار منہدم ہو گئی۔ انگریزوں کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ تو ٹیپو کا رعب تھا کہ انگریزوں کے قدم اس طرف نہیں اٹھ رہے تھے۔

سلطان حیران تھا کہ اس تنظیم کے ساتھ گولیاں برسانے کے باوجود خاطر خواہ نتیجہ کیوں برآمد نہیں ہو رہا ہے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ اس کے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ اس کے سامنے بہت سے چہرے آگئے تھے جن پر لکھا تھا ”غداران وطن“

اس نے ایک پرچے پر ان غداروں کے نام لکھے اور میر معین الدین کے حوالے کر دیا۔ اس پر درج تھا ”ان غداروں کو آج رات قتل کر دیا جائے۔“

یہ سلطان کی بدلیبی تھی کہ وہ تمام چہروں کو پہچاننے کے باوجود یہ نہیں جان سکا تھا کہ میر معین الدین خود بھی ان غداروں میں شامل ہے۔ میر معین الدین نے منکراتے ہوئے

یہ چہرے کہیں میں رکھ لیا۔ پھر یہ پرچہ اس کی جیب ہی میں رکھ لیا۔

سلطان کو اس کے بعد اتنی فرصت نہ ملی کہ پوچھتا، غدار اب تک زندہ کیوں ہیں؟

اس نے یہ بھی حکم دیا کہ اس کے گرد خندق کھود کر اس میں بارود بھر دیا جائے تاکہ انگریز اندر آجائیں تو حفاظت ناموں کے لیے بارود میں آگ لگا کر سر اکاڑا دیا جائے۔ 4 مئی 1799ء کی صبح طلوع ہوئی۔ نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی ٹیپو نے دیوار کے شکاف کا معائنہ کیا اور اس کی مرمت کا حکم دیا۔

وہ یہ حکم دینے کے بعد محل میں آیا ہی تھا کہ دربار کے جومیوں نے اسے متنبہ کیا کہ آج کا دن اس کے لیے منحوس ہے۔ اس لیے صدمہ قدوے اور شام تک چھاؤنی میں رہے۔

میر صادق نے رات ہی کو انگریزوں کو بتا دیا تھا کہ قلعہ پر دوپہر کو حملہ کیا جائے۔ دوپہر تک میر صادق کو جو کرنا تھا اس کی سازش کی تیاری مکمل کر لی تھی۔

سلطان جیسے ہی شکاف کا معائنہ کرنے کے بعد وہاں پہنچا میر معین الدین اسی شدت دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ مرمت کا کام جاری تھا۔ میر معین الدین کا ماتحت سپہ دار سید غفار اپنی سپاہ کے ساتھ اس شکاف پر مستعد کھڑا تھا۔ اس کی بہادری ضرب المثل تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے انگریزوں کی مجال نہیں تھی کہ اندر داخل ہوتے۔ میر معین بڑی دیر تک غور کرتا رہا کہ سید غفار کو کس طرح وہاں سے ہٹایا جائے۔ اس نے

سید غفار کو کسی کام کے بہانے سلطان کے پاس بھیجا۔ سید غفار، میر معین کے حکم کو نال نہیں سکتا تھا۔ مورچے سے ہٹ گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس غدار میر معین نے فوج سے کہا کہ تنخواہیں تقسیم ہو رہی ہیں، اپنی تنخواہ لے لو ورنہ ایک مہینہ انتظار کرنا پڑے گا۔ سید غفار جو بھٹی واپس آیا تو پ کا

ایک گولہ گین سے آیا اور سید غفار کو شہید کر گیا۔ اس کے ہلاک ہوتے ہی غداروں نے سفید رومال ہلا کر انگریزی فوج کو حملہ کرنے کا اشارہ کیا۔ دشمن کی فوج پہلے ہی سے خندق میں چھپ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس اشارے کے ملنے ہی حرکت میں آئی۔ صرف چھ منٹ میں شکاف کے سرے پر برطانوی

حملہ انصاف کر دیا گیا۔

ٹیپو اس وقت دسترخوان پر بیٹھا ہی تھا کہ سید غفار کے مارے جانے کی خبر موصول ہوئی۔ وہ کھانا چھوڑ کر کھڑا ہوا۔ کھڑے پر سوار ہوا اور شکاف کی طرف چل پڑا۔

ان اس کے پیچھے سے پہلے ہی انگریز وہاں اپنا جھنڈا

نصب کر چکے تھے۔

منصوب یہ تھا کہ فیصل پر چڑھنے کے بعد فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ ایک حصہ بنگوری دروازے پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا اور دوسرا حصہ شمالی فیصل پر قبضہ کرے گا۔

فیصل پر چڑھنے کے لیے میر قاسم رہنمائی کر رہا تھا۔ سب سے پہلے میر قاسم فیصل پر چڑھا پھر ساری فوج اوپر پہنچ کر دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔

”اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔“

میر صادق نے ”آبی پھانک“ بند کر دیا کیونکہ ٹیپو اس وقت اس پھاٹک کے قریب تھا۔ میر صادق نے سوچا ہوگا کہ سلطان فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔ قلعہ دار نام خاں پھاٹک کی حیثیت پر کھڑا تھا لیکن اس نے اپنے آقا کو نظر انداز کیا۔ پھر وہ اس پھاٹک پر پہنچا جہاں سے قلعے کے اندرونی حصے کو راست جاتا تھا۔ یہ پھاٹک بھی بند ملا۔

انگریزی فوج اندرونی اور بیرونی دھموں سے میسوریوں پر تباہ کن گولہ باری کر رہی تھی جو بھاگنے کے لیے دروازوں پر ہجوم کر رہے تھے۔

میر صادق نے جہل بیرو کو اطلاع دی کہ سلطان قلعے کے فلاں گوشے میں ہے۔ انگریزی فوج اس طرف اٹھ آئی۔ ٹیپو کی وفادار سپاہ اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ معرکہ ایسا گرم ہوا کہ ہندو قسین بیکار ہو گئیں اور تیزی سے تلواریں چلنے لگی۔ تین گھنٹے تک گھمسان کی لڑائی ہوئی رہی۔ ٹیپو اس طرح چلے کر رہا تھا جیسے کوئی شیر گیدڑوں پر حملہ آور ہو۔ انگریزی فوج ہر طرف سے اٹھ کر آ رہی تھی۔ ٹیپو گھبراہٹ سے لگا تھا۔

دکھارہا تھا۔ اب شام ہونے کو آئی تھی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چھ سات گھنٹے سے مسلسل برسرِ پیکار تھا۔ زخمی بھی ہو چکا تھا اور پیاسا بھی تھا۔

ایک افسر نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ٹیپو کو مشورہ دیا۔

”حضور، اب مقابلہ فضول ہے آپ خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ ممکن ہے جاں بخشی ہو جائے، زندگی رہی تو مقابلے بہت۔“

یہ سنتے ہی ٹیپو نے یہ تاریخی جملہ کہا۔

”گیدڑ کی حد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔“

یہ کہتے ہوئے جیسے اس میں نئی زندگی دوڑ گئی ہو۔ شیریں کیف دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ اس بلا کارن پڑا کہ انگریزوں کے



کوئی کھیل ہوا مہم... ہمیشہ تمام ہتھیاروں سے لیس رہنے میں ہی کامیابی کا امکان ہوتا ہے... وہ بھی ایک ایسے ہی کھیل میں مشغول تھے، ایک ہی میدان میں یہ ظاہر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے والے مگر... ایک دوسرے کے ارادوں سے خبر... ایک ہی ڈگر پر گامزن لیکن... الگ الگ پڑاؤ ڈالنے والے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ویسا نہ ہوتا جیسا وہ چاہتے تھے۔ محبت اور جنگ میں تو ویسے بھی سب جائز ہوتا ہے۔

چند چھپرے رستوں کی عیاریوں کا احوال

طرف دیکھ کر کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ ان سب کی انفرجوں کی سوائے میرے۔
اُس وقت وہاں جو لوگ کھڑے تھے۔ دو کوئٹھن سینٹر کے گارڈز دو ہول سیکورٹی پر تعینات گارڈز میں اور پیلا ڈین۔ ”تم بتاؤ؟“ یہ سوال اُس نے مجھ سے کیا تھا۔

ہم ہول کے دوسرے فلور کی لابی میں دائرہ بنا کر کھڑے تھے۔ ہمارے سامنے ایک پر ایک، دوڑے رکھے تھے۔ ”تم بتاؤ؟“ پیلا ڈین نے اپنے دونوں بازو سینے پر رکھے تھے۔ اس کی نظریں بھی ان ڈیوٹ پر تھیں۔ ”تم بتاؤ؟“ یہ سوال اُس نے مجھ سے کیا تھا۔

”مجھے مت مارو۔ میں سلطان نہیں ہوں۔ سلطان کا ملازم راجا خاں ہوں۔“ مجروح زور سے چپتا۔
”تیرا آقا کہاں ہے؟“

اسی راجا خاں نے اس مقام کی نشاندہی کی جہاں نیپو مگر اتھا اور پھر اسے شناخت کرایا گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور جسم گرم تھا۔ اس نے جاذبہ کھائے تھے تین جسم اور ایک کنپٹی پر۔ اس کے جسم پر قبضے کرنے کی آستین دار صدری پھول دار ڈھیلا ڈھالا زیر جامہ، کمر کے گرد انگوٹھی رنگ کا سوئی کپڑے کا پٹکا تھا۔ سرنگھا تھا۔ غالباً پکڑی جنگ کی کشش میں گر گئی تھی۔ اس کے بازو پر ایک نمونہ تو بندھا تھا لیکن کوئی اور زور نہیں تھا۔ چہرے پر غیر معمولی وقار سیاق تھا۔

دوسرے دن سہ پہر محل سے جنازہ اٹھا۔ اس شام کا خاتمہ ایک بہت ناک طوفان پر ہوا جس کے جلو میں پارٹ تھی۔ گرج چمک اور بجلیاں تھیں جس سے بھی کی کیمپ کے دو انٹروں کی جانیں گئیں اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔

☆☆☆

میسوری افسروں کو انگریزوں نے بڑی فیاضی سے غداری کے انعام دیے۔ قمر الدین خاں کو گورام کنڈ کی جاگیر عطا کی گئی۔ پورنا کو نئے راجا کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ میر غلام علی لنگڑا کو تین ہزار پکڑے سالانہ تاحیات مقرر کیا۔ محل ہو جانے والے غداروں کے اہل و عیال کو وظیفے ملے۔ نمک حرام میر صادق اپنی غداری کا پھل کھانے کے لیے زندہ نہ رہ سکا۔ سلطان کی تدفین کے بعد وہ انعام وصول کرنے انگریزوں کے کیمپ کی طرف جا رہا تھا کہ ایک میسوری اس کے پیچھے لگا گیا۔ قریب پہنچ کر اسے گھوڑے سے نیچے گرا لیا اور اس کی ٹکا ہونی کر ڈالی۔

دفن کیے جانے کے بعد لوگوں نے اس کی لاش کھود نکالی اور کوئی دو ہفتوں تک لوگ لاش کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرتے رہے۔ بچے تماشا دیکھنے آتے اور اس پر کڑا کرکٹ چھیکنے۔

آج بھی نیپو کا احترام کرنے والے سرنگا پٹم جاتے ہیں تو اس مقام پر پتھر پھیکنے ہیں جہاں میر صادق مارا گیا تھا۔

دانت کھٹے ہو گئے۔ اس کے قدائی بھی ایک ایک کر کے اس پر قربان ہو رہے تھے۔ کہیں سے ایک گولی آئی اور اس کا گھڑا اس کی رانوں تلے دم توڑ گیا۔ دوسری گولی آئی جو اس کے سینے میں بیوست ہو گئی۔ چند انگریز سپاہی پچانک میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے نیپو کی تلوار کی تیز قیمت پٹی چھٹ لی۔ وہ اگرچہ حال ہو رہا تھا لیکن وہ اس ذلت کو برداشت نہ کر سکا۔ ایک گھوڑا قریب پڑی تھی، اٹھا کر سپاہی پر دار کیا جو اس کی دتی بندوق پر پڑا۔ ایک وار اس نے ایک دوسرے سپاہی پر کیا جو کاری ثابت ہوا۔ اسی اثنا میں ایک گولی اس کی کنپٹی میں لگی اور وہ ارد گرد بکھری ہوئی لاشوں میں سے ایک لاش بن گیا۔

میسوری حواس باختہ ہو چکے تھے۔ ہر طرف سے بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ سپاہیوں نے مشرقی دروازے سے نکل جانے کی کوشش کی لیکن اس مقام پر انگریزوں نے ان کا قتل عام شروع کر دیا۔ بہت سے سپاہی نڈر آتش ہوئے اور جو بچے وہ دشمن کے تیزوں کا شکار ہوئے۔

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ زنیوں اور متولیوں کی تعداد اتنی کثیر تھی کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ سلطان کہاں گرا اور زندہ بھی ہے یا مگر۔ دراصل وہ اس وقت بھی اپنے قدائیوں کی لاشوں کے درمیان ابدی تیز سو رہا تھا۔ نیپو چونکہ ایک عام سپاہی کی طرح دشمنوں سے لڑ رہا تھا اس لیے انگریزوں کو یہ پہچاننے میں سخت دشواری ہو رہی تھی کہ ان میں نیپو کی لاش کون سی ہے۔

مشعل کی تیز روشنی میں انگریز اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ محل سرا کی تلاشی لی گئی۔ یہاں چند انگریزوں کی لاشیں تھیں اور عفت ماب خواتین کی خون میں لست پت لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ غالباً کچھ انگریز محل سرا میں محسوس آئے ہوں گے جن سے ان خواتین نے مقابلہ کیا۔ خود بھی ختم ہو گئیں، دشمن کو بھی ڈھیر کر دیا۔

قلعے میں ایک مقام پر نیپو کی پاکی ملی۔ اس کے اندر کوئی مجروح لپٹا تھا۔ تلاش کرنے والوں نے سمجھا یہی نیپو ہے۔ انہوں نے ہندو قیں تان لیں۔

تاریخ نیپو سلطان، محب الحسن، دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، سی ای لارڈ۔

حیدر علی، نویندو کوشن سنہا، تاریخ میسور جلد نمبر 1، ولکس۔

نیپو شہید (ناول)، فیسی رام پوری، سلطان نیپو شہید (ناول)، الہاس ایم اے

ماخذات

انسانی زندگی میں دس صدی کے ادبی تجربے کے
کلاسیکی امریکی سرائرسوں کی طرح خاموش کھڑا غور سے
ان ایل کو دیکھتے ہوئے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
”ہیں ہم ڈسپوزل اسکوڈ کو بلا لیتا چاہیے۔“ قل نے
ہانے مانگے مشورہ دیا۔ وہ کنوینشن سینٹر پر تعینات تھا اور حال ہی
میں ہوٹل کے سیکورٹی عملے میں بھرتی ہوا تھا۔ ویسے بھی یہ ہوٹل
کئی مہینوں تک امریکی معاشی مندی کی وجہ سے بند رہنے کے
بعد دوبارہ کھلا تھا۔ اس لیے زیادہ تر عملہ نیا بھرتی کیا گیا تھا۔
ہوٹل کا سب سے بڑا مسئلہ برنس ہوتا ہے۔ یورپ و
امریکا سے شروع ہونے والی عالمی مندی کے دنوں میں جہاں
اور کاروبار ٹھپ ہوئے، وہیں ہوٹل برنس بھی بری طرح
متاثر ہوا تھا۔ کیپ کارن ہوٹل کو دوبارہ کھلے ہوئے ایک ہفتہ
بھی نہیں ہوا تھا۔ اگلی صبح کنوینشن سینٹر میں ایک پروگرام طے
تھا جس میں ایک معروف کینیڈائی گیتا کیپوٹریم لائچ جا رہا
تھا۔ یہ ہوٹل کا دوبارہ کھلنے کے بعد پہلا بڑا برنس تھا۔ ایسے
میں ان مشکوک ڈبوں کی موجودگی کسی بڑے خطرے سے کم
نہیں تھی۔ مہینوں بند رہنے کے بعد کھلنے والا ہوٹل پھر بند
ہوسکتا تھا۔ یہ بات لانی میں موجود سب اچھی طرح جانتے
تھے کہ ہوٹل بند ہونے کا مطلب سب کا قارخ ہونا تھا۔
میں بھگا اور کھٹنے کے بل فرش پر بیٹھ کر ان ڈبوں کو
دیکھنے لگا۔ یہ بہت خوبصورت تھے۔ انہیں نہایت مہارت
سے تیار کیا گیا تھا۔ ڈبے کے اوپر شیشے، سنگ مرمر کے ٹکڑوں
اور لکڑی کی مدد سے بہت عمدہ کندہ کاری کی گئی تھی۔ دلکش پس
منظر کے ساتھ، ڈبے کے تین وسط میں ایک دروازہ قائم ڈبلی
پتی دو شیزہ ذرا سی ترجمانی کھڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کے سنہری
بال خاصے لمبے اور ہوا میں اڑتے ہوئے دکھائی دے رہے
تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دو شیزہ کے جسم پر موجود پتلا سا گاؤن
ہوا سے لہرا رہا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ میں آرٹ کے نمونوں کا
دیکھنا ہوں مگر جتنی عمدہ دست کاری اُس ڈبے پر کی گئی تھی،
اس سے پہلے میں نے نہیں اور نہیں دیکھی تھی۔
میں نے نظریں اوپر اٹھا لیں۔ وہ سب لوگ خاموش
کھڑے تھے دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ
میں ڈبوں کو دیکھ کر یہ بتا چلائے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان کے
اندر کیا ہوسکتا ہے۔ کافی دیر بعد میں کھڑا ہوا۔ وہ سب میری
طرف دیکھ رہے تھے اور میں خاموش تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پیلا
ڈین بے پنی سے منتظر ہوئی کہ اس میں کیا کہتا ہوں۔
”اب تاہم ہمیں کیا کرنا چاہیے مسٹر اسپڈ؟“ ماروین
نے مجھے مخاطب کیا۔ اسپڈ میرا اصل نام نہیں ہے، البتہ سب

لوگ مجھے اسی عریت سے پکارتے ہیں۔ میرا اصلی نام
صرف وہی چند لوگ جانتے ہیں جن کا میں پچھلے ایک عشرے
سے بہت پرانا مددگار رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے
بڑے آدمی ضرور ہیں کہ کسی کی کتر دے گا جس ان کے من
سے میرا اصلی نام نہیں سن سکتا۔ یہ بات میرے لیے بھی
اطمینان کا باعث تھی۔
”میرا خیال ہے ہمیں ہم ڈسپوزل اسکوڈ کو طلب کر لینا
ہی چاہیے؟“ مجھے خاموش دیکھ کر قل نے ایک بار پھر اپنا پرانا
مشورہ دہرایا۔
میں بہ دستور خاموش تھا۔ پیلا ڈین نے مجھے گہری
نظروں سے دیکھا اور ڈبوں کی طرف ایک قدم اٹھایا۔
”نہیں میڈم۔۔۔ اسے مت چھو، یہ خطرناک بھی ہوسکتا
ہے۔“ اس سے قبل کہ وہ جھک کر ان ڈبوں کو ہاتھ لگاتی، ایک
سیکیورٹی گارڈ نے اونچی آواز میں اسے آگے بڑھنے سے
روکنا چاہا مگر وہ فرش پر کھٹنے کے بل جھکتی چلا گئی۔
”میرا خیال ہے، اسے ہاتھ مت لگائیں۔“ یہ دیکھتے
ہوئے ایک اور گارڈ نے اسے روکنا چاہا۔
”جانتی ہوں۔“ وہ گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھی تھی۔
”مجھے اچھی طرح معلوم ہے یہ ہے چنانچہ پزل باکس نہیں ہے۔“
اس نے طنز پر لکھے میں جواب دیا اور ایک بار پھر ان ڈبوں پر
نظریں گاڑ دیں۔
پیلا ڈین کہنے کو تو عورت تھی لیکن کئی مردوں پر بھاری
تھی۔ وہ جسمانی لحاظ سے ہم سب سے زیادہ مضبوط تھی۔ پتہ
قائم تھا کہ پیلا ڈین خوبصورت بھی تھی لیکن میں اُسے عورت نہیں
کہہ سکتا۔ اس کے بازوؤں کے ڈولے اچھے خاصے مردوں
سے بھی زیادہ بڑے تھے۔ اس وقت بنانا بازوؤں کی ٹی شرٹ
میں اس کے بھرپور ڈولے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ ریسلر
تھی اور کئی برس تک رنگ میں فری اسٹائل کشتیاں لڑتی رہی
تھی۔ کم از کم وہاں موجود ان چار مخالفوں میں وہ سب زیادہ
مستعد اور طاقت ور نظر آ رہی تھی۔ ویسے یہ اور بات تھی کہ وہ
جب بھی خواتین کے جاؤں نظر لباس میں ملبوس ہوتی تو مجھے
اچھی لگتی تھی۔
”مجھے تو یہ قرون وسطی کے زمانے کے لاک باکس لگ
رہے ہیں۔“ پیلا ڈین نے کچھ دیر تک ان کا پر غور جائزہ لینے
کے بعد کہا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ان ڈبوں کی طرف اپنا
ہاتھ بڑھایا۔
”مت چھو۔“ قل نے جیانی انداز میں چلاتے ہوئے
اسے روکا۔

”مجھے خطرناک نہیں لگتا۔“ پیلا ڈین نے سراپہ
کرتے ہوئے کہا۔ ”تو لگتا ہے کہ ہم خواہ مخواہ پریشان ہو
چکے ہیں۔“ اس کے ہاتھ ڈبے سے صرف چند انچ کے فاصلے
پر تھے۔
”ہیں ہم ڈسپوزل اسکوڈ کو فوراً فون کرنا چاہیے۔“
ہاں والی کی آواز خوف سے تھر تھرائی ہوئی محسوس ہوئی۔ پیلا
ڈین نے بے غن کر اسے گھورا۔
”پیلا ڈین۔۔۔“ بھلی بار میں کچھ بولا تھا۔ ”کھڑی
ہو جاؤ، میں نے ہم ڈسپوزل اسکوڈ کو فون کر دیا ہے، وہ بھیجنے
والے ہیں۔“
”کیا۔۔۔“ اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔
”ہاں۔۔۔ کھڑی ہو جاؤ۔ بہتر ہے کہ اچھی طرح تسلی
ہو جائے، پھر انہیں دیکھ لیں۔“ میں نے ڈبوں کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ کہنے کے بعد میں نے قل کی
طرف دیکھا۔ پولیس کی آمد کا سن کر اس کے چہرے پر
اطمینان جھلکنے لگا تھا۔
☆☆☆
میں ایک پرائیویٹ سرانچر ساں تھا اور پیلا ڈین نے بھی
پولیس میں خدمات سرانجام دی تھیں۔ ہم دونوں نے کئی سال
اچھے کام کیا تھا۔ کئی خطرناک کیس اچھے حل کر چکے تھے۔
پیلا ڈین نے کئی سال پہلے پولیس کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اس
کے پچھلے عرصے کے بعد میں نے بھی نوکری چھوڑ کر پرائیویٹ
سرانچر ساں کا لائسنس حاصل کر کے کام شروع کر دیا تھا۔
سرانچر ساں میری پچان تھی لیکن پولیس کے زمانے سے
ای میری انڈر ورلڈ میں بڑی اچھی جان پہچان تھی۔ ملازمت
بھڑکنے کے بعد بھی شائستگی برقرار رہی۔ اکثر میں ان کے
کیس لیتا رہتا تھا۔ ان کے کاموں میں ایک فائدہ تو یہ تھا کہ
مال لہاں جاتا تھا وہ سیدھی سادی سراغ رسانی کچھ زیادہ
لاکھ کے کارڈ نہیں تھا۔
امریکی معاشی مندی نے تو ہر طرح کا دھندھا ٹھپ کر دیا
تھا۔ بے روزگاری بہت بڑھ گئی تھی۔ اس مندی کا اثر ہر طرح
کے برنس پر ہوا تھا۔ میں بھی کئی مہینوں سے ہاتھ پہ ہاتھ
دھرے گھوم رہا تھا۔ ان دنوں میرا زیادہ تر وقت یہ سوچنے
میں گزرتا تھا کہ ایسا کون سا کاروبار کیا جائے جو بتا بیسوں
کے شروع ہو جائے۔ اتفاق کی بات ہے کہ بہت جلد مجھے دو
کام اکٹھے ملے۔ ایک کام انڈر ورلڈ کا تھا۔
انڈر ورلڈ کے کاموں میں میرا ایک اصول تھا۔ میں ایسا
کوئی کام نہیں کرتا تھا جو قانون کی نظر میں جرم ہو۔ قانون

”کل صبح نو بجے ہوئی استقبال پر آ کر ملو۔“
 ”تو تلے ہیں مگر...“ میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
 ”ٹھیک کیا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔
 ”بڑے دن ہوئے فائو اسٹار ہوٹل کا پرنٹ کلف ناشتا نہیں کیا ہے۔“
 ”کل صبح ساڑھے آٹھ بجے۔“ وہ میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔
 ”وہ بے ہمارے درمیان پرانے تعلقات تھے۔ وہ میرا مزاج اچھی طرح جانتی تھی۔“
 ”آج کا دن بڑا اچھا ہے، کام کے ساتھ...“ میں نے خود کلامی کی اور ایک بار پھر پارک میں ٹہلنا شروع کر دیا۔
 میری ایک عادت ہے۔ لوگ سوچتے ہوئے کافی پیٹے ہیں، کمرے کی لائٹ آف کر کے بیٹھ جاتے ہیں، تنہائی میں خود کو قید کر لیتے ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ مجھے تنہائی لوگوں کے درمیان ملتی ہے اور جب خوش رہتا چاہوں تو پھر خود کو گھر میں قید کر لیتا ہوں۔ آج میں کئی مہینوں کے بعد پارک میں آیا تھا۔ چلتے کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنی صحت کی طرف سے کوئی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ دو پہر کو رابرٹ کا فون ملنے کے بعد میں نے اسے صاف صاف جواب نہیں دیا بلکہ رضامندی ظاہر کی تھی۔ میں اس کام کے ہر پہلو کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میری منصوبہ بندی ہی کام کی کامیابی کی ضمانت بنتی ہے اور میں جلد بازی میں بھی کسی کام کی ہائی نہیں بھرتا، اس لیے اب تک کوئی ایسا کلائنٹ نہیں ملے گا جو یہ کہے کہ ان کا کام مناسب طریقے سے نہیں ہو سکا۔
 رابرٹ بھی میرا پرانا گاہک تھا۔ وہ مافیا کا سرگرم کارندہ تھا۔ معمولی پورے لے کر سان فرانسسکو میں مافیا کے نشانات کے دھندے کا جیسے دار بننے تک اس نے بڑے پائے پہیلے تھے۔ وہ مجھے پولیس کے زمانے سے جانتا تھا۔ آج صبح اس نے جس کام کے لیے کہا تھا، اس پر غور کرنے کے لیے میں نے شام تک کا وقت مانگا تھا۔ میں پارک میں چلتے ہوئے اسی معاملے پر غور کر رہا تھا۔ عجیب اتفاق کہ اسی دوران پینلا ڈین کا فون آیا۔ اس سے بات کر کے میں نے صرف فون بند کر کے ہی جیب میں نہیں رکھا بلکہ رابرٹ کے کیس پر بھی سوچنا بند کر دیا۔ ویسے بھی اب اس پر مزید کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا کام کس طرح ہوتا ہے۔ ایک بندہ، چند روز، دو کام..... اور مجھے دونوں کا ایک دوسرے کے متوازی کرنا تھے۔
 ”ہیلو...“ میں پارک سے نکلنے والا تھا کہ فون کی گھنٹی

گئی۔ دوسری طرف رابرٹ تھا۔
 ”سوچ لیا؟“ اس نے چھوٹے ہی مطلب کی بات کی۔
 ”اچھی طرح۔“
 ”تو کب تک؟“ اس نے سوال کیا۔ میں جانتا تھا کہ میری ہاں سن کر وہ حد سے زیادہ خوش ہو گیا ہوگا، سچی اس کی آواز پر جوش تھی۔
 ”جیب خرچ کے لیے معقول رقم جو ہزاروں میں ہوئی چاہیے۔“
 ”بھول گئی۔“ اس نے جوش میں آ کر پوری بات سنے بغیر ہاں کر دی۔
 ”تم نے قطع کلامی کی ہے، کوئی بات نہیں۔ اگلا جملہ سن لو۔“
 ”جلدی سے کہو۔“ رابرٹ نے بے صبری سے کہا۔
 ”کام ہونا سو فیصد یقینی ہے، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ تمہارا نیا کاروبار اوڈیروں منافع۔“
 ”بالکل ٹھیک...“
 ”اتنے بڑے کاروبار میں نوے فیصد تمہارا اور صرف معمولی سادس فیصد میرا۔ بطور سلیپنگ پارٹنر۔“
 ”بڑے ہی کہتے ہو۔“ میں نے سننے ہی رابرٹ نے کہا۔ ”مگر سلیپنگ پارٹنری کیوں، سلیپو رٹی کے معاملات سنسٹیل لینا۔“
 ”قطعاً نہیں...“ میں نے زبان پھٹاتے ہوئے کہا۔
 ”اب عمر کام کی نہیں مروجہ مستی کی ہے۔ تم نے سنا نہیں، مرد پر چالیں کے بعد حقیقی جوانی آتی ہے۔“
 ”معاملہ جوانی کا ہے اور وہ بھی تمہاری۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“
 ”تم کہہ سکتے ہو مجھے منظور ہے۔“
 ”مجھے منظور ہے۔“ رابرٹ نے جس کر جواب دیا۔
 ”کاغذات تیار کروالو۔“ میں نے خوش گواری موڈ میں جواب دیا۔
 ”کام مکمل ہونے سے پہلے ہی معاہدے پر دستخط کر لیں گے۔“
 ”کل شام ڈیز میرے ساتھ کرو اور دستخط بھی۔“
 میں سمجھا کہ اب وہ فون بند کرنے والا ہے لیکن اچانک اس نے کہا۔ ”سنو... کچھ اعزاز ہے کہ کام کتنے دن میں ہو جائے گا؟“
 ”یہ میں کل شام کو ڈیز پر بتا دوں گا۔“
 ”بہت بہتر...“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
 رابرٹ کے کئی کام میں نے نمٹائے تھے۔ وہ زبان کا سچا اور وعدے پر پورا اترنے والا مرد تھا۔ میں نے انڈر ولڈ

کے کئی کئی کام میں وہ برابر بھی بے ایمانی کی ہو۔ بے ایمانی کے تمام کام سولہ ایماڈاری سے کرتا تھا۔
 ☆☆☆
 دوسرے دن صبح کے سوا آٹھ ہو رہے تھے جب میں کپ کارن ہوٹل کی پارکنگ سے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ پینلا ڈین استقبال پر میری منتظر تھی۔ میں نے اسے دور سے ہاتھ ہلایا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھی اور مجھے جیچے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ رہی تھی۔
 ”تو تم کب سے یہاں ہو؟“ بڑے دنوں کے بعد ڈائننگ ہال نشا کرنے سے آنکھیں میچ معنوں میں کھل گئی تھیں۔
 ”دو ہفتے ہو گئے۔“ اس نے میرے کپ میں مزید کافی اڑا دیتے ہوئے کہا۔ ”چیف سیکوریٹی افسر ہوں۔“ اس نے گریہ انداز میں کہا۔
 ”وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔“ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”جس طرح وینر تمہارے آگے جیچے پھر رہے ہیں، اس سے تو پتا چلتا ہے کہ تم بڑی توپ چیز ہو یہاں پر۔“
 ”خیر چھوڑو ان باتوں کو۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دنوں کیا مصروفیات ہیں؟“
 ”خالص بے روزگاری۔“ میں جان بوجھ کر رابرٹ والے کام کی بات ٹال گیا تھا۔ میرا اصول ہے کہ رازداری کامیابی کی پہلی منزل ہے۔
 ”تو کڑی کرو گے؟“
 ”نہیں۔“ میں نے دونوں جواب دیا۔ ”اب تو کڑی کی عمر نہیں البتہ کوئی کام ہوتا۔“
 ”چلو یو پنی کر لیں گے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”ناشتا تم ہو گیا تو کمرے میں چلیں؟“
 ”بس دو منٹ...“ میں نے بیٹھ ہی سمجھتے سے کہا۔
 ”اور ایک کپ کافی اور ہو جائے تو پھر چلتے ہیں۔“
 ”بات کافی کی ہے تو میرے کمرے میں چل کر پی لیا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 یہ سننے ہی میں نے گلے سے پنک اتار کر ہاتھ منہ صاف کیا اور ٹائی کی ٹاٹ درست کرتے ہوئے اس کے جیچے جیچے کال دیا۔ وہ سیدھی لابی کی لفٹ کی طرف بڑھی۔ کچھ دیر بعد میں اپنی منزل پر واقع اس کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔
 ”دو منٹ تو بہت خوبصورت ہے۔“

”ٹھیک ہے؟“ اس نے آہستہ سے سر کو جھکا کر کہا۔ ”میں نے تمہیں کسی خاص وجہ سے بلایا ہے۔“
 ”ہاں کسی ناخیر کہہ ڈالیے، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔“
 ”یہ ہوٹل کی مہینوں کی بندش کے بعد چند روز پہلے کھلا ہے۔“ اس نے کام کی بات شروع کی۔ اس کا لہجہ خاصا سنجیدہ تھا۔ ”چند روز بعد یہاں ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کی دو روزہ ورکشاپ شروع ہونے والی ہے جس میں دنیا بھر سے سیکڑوں افراد شرکت کر رہے ہیں۔ سبکی ٹیس، امریکا کی مختلف ریاستوں سے بھی بڑی تعداد میں مندوبین شریک ہوں گے۔ یہ تعداد دو ہزار سے اوپر ہے۔ ورکشاپ انتظامیہ نے پورا ہوٹل بک کر لیا ہے۔“
 ”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ وہ دوبارہ کھلتے ہی اتنا بڑا برنس۔“ میں نے قطع کلامی کی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا۔
 ”پوری بات سن لو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ اسی بات پر آگئی۔ ”ہوٹل انتظامیہ کی خواہش ہے کہ اس موقع پر سکیورٹی کے فول پروف انتظامات ہونے چاہئیں۔ ہم اس بات کو یقینی بنانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے کل انتظامیہ کو درخواست کی تھی کہ ہمیں ایک سرائیوں کو کل وقتی نہ کسی تو کم از کم اس کا نفرنس کے لیے تو ضرور ایک ہفتے کے لیے ملازم رکھ لیتا چاہیے۔ انتظامیہ نے میری بات مان لی اور اب مجھے تمہاری خدمات چاہئیں۔“
 ”بہت خوب۔“ میں نے کہا۔ ”مگر اس کام کے لیے میں ہی کیوں؟“
 ”اس لیے کہ میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں اور دوسری بات یہ کہ ہمیں ایسا آدمی چاہیے جسے لوگ ہوٹل ملازم کے طور پر نہیں جانتے ہوں...“ مجھے میری بات۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔
 ”تجویز اچھی ہے۔ معاہدے کی بات کر لی جائے تو بات اور زیادہ مناسب ہوگی، ابھی میں کچھ سوچ سکوں گا۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
 اگلے پچیس تیس منٹ تک تمام معاملات طے پا چکے تھے۔ ورکشاپ تین دن جاری رہنا تھی اور مجھے کانفرنس سے تین دن پہلے یعنی کل سے کام پر ہونا تھا۔ میری ڈیوٹی چوبیس گھنٹے کے لیے تھی۔ رہنے کے لیے کمرہ بطور گاہک بک کر دیا گیا تھا۔ معاہدے کے مطابق مجھے کل صبح نو بجے ہوٹل میں چیک این کرنا تھا۔ کل چھ دنوں کا کام تھا اور ان چھ دنوں میں کھانے

پہنے اور مروج مسی کے تمام لوازمات مفت تھے۔ معاوضہ ایڈوانس میں تھا اور وہ بھی میری توقعات سے بہت زیادہ۔
 ”اگر کام تمہیں پسند آیا تو عارضی ملازمت کئی بھی ہو سکتی ہے اور اگر تم چاہو تو ابھی سے یکے ملازم بن سکتے ہو۔“ جب میں معاہدے کے بعد ایڈوانس میں ملنے والے نوٹ گن رہا تھا، تب پیلا ڈین نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”بہت بہت شکریہ۔“ میں نے نوٹ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھے اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”نی الحال تو یہی کچھ بہت ہے۔ میں تو تھوڑے میں ہی خوش ہو جاتا ہوں۔“
 ”اچھی طرح جانتی ہوں تمہارے تھوڑے کو۔“ میری بات سن کر وہ ہنس پڑی اور طنزیہ لہجے میں کہی۔
 ”صرف جانتی ہو، یہی بہت ہے۔ بھی مجھے کی کوشش مت کرنا ورنہ بگڑ جاؤ گی۔“ میں نے بھی مذاق کے لہجے میں جواب دیا۔
 ”کافی لوگ؟“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔
 یہ درکشاپ نہ صرف ہوٹل کا بہت بڑا بزنس تھا بلکہ انتظامیہ کو امید تھی کہ درکشاپ کے کامیاب انعقاد کے بعد انہیں مزید بزنس ملے گا اور پھر سے ہوٹل کی مشہوری الگ ہوگی۔ درکشاپ میں مختلف سکلوں سے نائی گرامی مندوب شرکت کرنے والے تھے، جس کی وجہ سے ملکی وغیر ملکی میڈیا نے بڑے پیمانے پر کوریج کے انتظامات کیے ہوئے تھے۔ اگرچہ ہوٹل انتظامیہ نے پیلا ڈین کے توسط سے عارضی بنیادوں پر بہ طور سرائرساں میری خدمات حاصل تو کر لی تھیں لیکن خود میرے خیال میں انہیں میری کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

پیلا ڈین سے ملنے کے بعد میں نے سپر مارکیٹ جا کر کچھ خریداری کی اور بیچ کے بعد گھر لوٹ آیا۔ شام کے سوا پانچ بجے رہے تھے جب رابرٹ کا فون آیا۔ اس نے شام سات بجے بیچ گزری ہوئی میں ڈنر کی دعوت دی۔ میں نے اس دعوت کے جواب میں اسے خوشخبری سنائی کہ اگلے ہفتے اس کا کام بھی ہو جائے گا۔

☆☆☆

”مجھے بڑی خوشی ہوگی جب یہ کام مکمل ہو جائے گا۔“ ڈنر کے بعد جب ہم اس کی بوٹ کی طرف بڑھ رہے تھے، تب اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”یہ میرا سپنا ہے۔ یہ سپنا میں نے انتہائی غربت کے ایام میں دیکھا تھا۔ اب اس کوچ کر دکھاؤ۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”سمجھ لو، سب کچھ سچ ہو گیا۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھمتھپاتے ہوئے کہا۔ ”بس! صرف چند روز اور انتظار کر لو۔ کم از کم اس سلسلے میں جو کام مجھے کرنا ہے، وہ تو ضرور ہو جائے گا۔“ تمہارا کام ہو گیا تو کچھ باقی نکل گیا۔ اس کے بعد تو پوچھ ہی باقی رہ جائے گی۔“ میری بات سن کر وہ مزید خوش ہو گیا تھا۔
 ساحل سے کافی دور آنے کے بعد رابرٹ نے بوٹ رکوائی اور مجھے لے کر نیچے بے کمرے میں آ گیا۔ ”یہ لو معاہدہ پڑھ لو اور یہ چیک خیر سگالی کے طور پر۔“ اس نے دونوں چیزیں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور خود صوفے پر بیٹھ گیا۔

”بہت مناسب۔“ یہ کہہ کر میں نے قلم نکالا اور پھر باری باری ہم دونوں نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔
 ”اب اپنا منصوبہ بتاؤ پانشر۔“ ہم دونوں نے دستاویزات کی اپنی اپنی فائل سنبھال لی اور صوفے پر آنے سے پیٹھ گئے۔

”بات یہ ہے کہ کل تو میں کیپ کارن ہوٹل جو ان کر رہا ہوں۔“ میں نے بتانا شروع کیا۔ ”صرف چھ دن کے لیے۔ وہاں سے فارغ ہوا تو کچھ تمہارا کام بھی مکمل۔“
 ”تفصیل سے منصوبہ بتاؤ۔“

”بات یہ ہے کہ...“ میں نے اسے منصوبہ سمجھانا شروع کر دیا۔
 ”ویل ڈن...“ میری بات مکمل ہوئی تو اس نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگا میری پلاننگ نے اسے چمکا دیا ہے۔“ جیسے ہی تم نے اپنا کام مکمل کیا، سمجھو اس کے دوام کے اندر اندر ہمارا کاروبار شروع۔“

”ہمارا...“ میں نے جان بوجھ کر چہرے پر حیرت کے آثار طاری کرتے ہوئے کہا۔
 ”ظاہر ہے، تم اب دس فیصد کے پانشر ہو اس نئے کاروبار میں۔“
 ”اوہ...“ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ ”میں نے مصنوعی خفت سے کہا۔

”تم واقعی اعلیٰ نسل کے کہتے ہو۔“ یہ دیکھ کر رابرٹ ہنستے ہوئے بولا۔

”میرے خیال میں اب واپس چلے ہیں۔ صبح مجھے کیپ کارن پہنچنا ہے۔“ میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ اب یہاں مزید ٹھہرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ ویسے بھی گھر پہنچ کر مجھے ہفتہ بھر ہوٹل میں بسر

کرنے کے لیے پینک کرنا تھی۔

☆☆☆

جب تک میں ہوٹل میں خدمات انجام دیتا، تب تک میری رہائش کا انتظام فرسٹ فلوور پر، ڈانس ہال اور بار کے بالکل اوپر ہی کمرے میں کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ بہت عمدہ تھا مگر میرے لیے سب سے اچھی بات یہ تھی کہ چند سیز حیاں اترتو میری پسندیدہ جگہ نظروں کے سامنے تھی۔ سمجھ گئے ہوں گے، میرا مقصد بار اور ڈانس ہال سے تھا۔ موج متی، پینا پلانا میرا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کم از کم ایک ہفتے کے لیے تو یہ سب کچھ بہ آسانی میرے تصرف میں تھا۔

میں تین دن سے ہوٹل میں تھا۔ معاہدے کے تحت مجھے پانچ گھنٹے ڈیوٹی پر رہنا تھا۔ یہ کڑی شرط تھی لیکن ایک تو معاوضہ بہت ہی اچھا، دوسرا یہ کہ کام بھی بہت تھوڑے عرصے کا تھا۔ اسی لیے میں بغیر کسی پریشانی کے بڑے مزے سے وقت گزار رہا تھا۔

تین دن اور دو راتیں تو بڑے سکون سے گزریں لیکن تیسری رات میرے لیے بے آرامی بن کر سامنے آئی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ اُس رات آسٹریلیا سے آنے والے نو جوان پاپ گلوکاروں کا ایک جینز بار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والا تھا۔ جینز کو دو روز بعد سائفرانسکو کے شہر پارک میں بھی پروگرام کرنا تھا۔ اسی وجہ سے وہ یہاں آئے اور اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہوٹل انتظامیہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور انہیں بھاری معاوضہ دے کر اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ وہ ہوٹل کے بار میں اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ بار بہت کشادہ تھا اور سینڈ فلوور کی لابی پر مینہ ہم کی موجودگی کی اطلاع ملنے سے پہلے میں وہاں موسیقی کے مزے لے رہا تھا۔ ڈانس فلوور پر بڑی تعداد میں نو جوان لوگ لڑکیاں ہانپوں میں ہانپیں ڈالے تھرک رہے تھے۔

انتظامیہ نے مقامی ٹی وی چینل پر ایک اشتہار کے ذریعے اس ”میوزیکل ٹائٹ“ کا دوروز پہلے اشتہار دیا تھا، اس لیے بڑی تعداد میں لوگ کنٹ خرید کر یہاں پہنچ گئے تھے۔ رنگ، خوشبو اور جوانی کے اس گرما گرم ماحول میں ہر طرف گلاس اور بوتلیں ٹھک رہی تھیں۔ میں بھی کئی گلاس چڑھا چکا تھا اور اب لود لود دیرے پاؤں بھی تھرک رہے تھے۔ ہال کچھ بھرا ہوا تھا۔ میں بھی ضرور کے عالم میں موج متی کر رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرا موبائل وائبریت کر رہا ہے۔ اب میں یہاں آیا تو مجھے اندازہ تھا کہ کسی ایمر جیسی کی صورت میں مجھے فون کی کھنٹی تو کسی طور سنائی نہیں دے گی، اسی

لیے میں نے فون کا وائبریشن آن کر دیا تھا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ میں ڈیوٹی پر تھا اور لوگوں سے کچھ بچ بھرے اس ہال میں اگر کوئی مجھے ڈھونڈنا چاہتا تو اس کے لیے یہ کام آسان نہیں ہوتا۔

”اے اسپید... کہاں ہو تم؟“ میرے فون اٹھا ہے ہی پیلا ڈین نے چلاتے ہوئے کہا۔
 ”کون؟“ نسوانی آواز سن کر میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ جلدی میں، میں اسکرین پر یہ دیکھنا بھول گیا تھا کہ فون کس کا ہے۔

”خیریت تو ہے، میں پیلا بول رہی ہوں۔“
 ”اوہ... معاف کرنا، یہاں بہت شور ہے۔ میں باہر نکل رہا ہوں۔“
 ”اوکے“ اس نے جواب دیا۔

”ہاں اب بولو۔“ میں لابی میں پہنچ گیا جہاں ہال کے مقابلے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔
 ”میں پچھلے آدھے گھنٹے سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ دس بار فون کر چکی ہوں مگر نہ تم مل رہے ہو اور نہ موبائل اینٹینڈ ہو رہا ہے۔ کمرے میں گئی، وہاں بھی تم نہیں تھے۔“
 ”کیا ہوا ہے؟ پوری بات بتاؤ۔“
 ”تم اس وقت کیا کر رہے ہو؟“
 ”میوزک کی متی میں تھا۔“ میں نے لہکتے ہوئے جواب دیا۔

”مستی چھوڑو... کمرے میں پہنچو، دس منٹ کے اندر! میں وہیں پہنچ رہی ہوں۔“ پیلا ڈین کے لہجے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔
 ”اوکے...“ میں نے جواب دیا۔ ”روم سروس کو فون کر کے میرے کمرے میں ایک بلیک کافی بھجوا دو اگر تم بھی پینا چاہو تو پھر دو۔“

”تم کمرے میں پہنچو فوراً سے پیشتر۔“ اس نے قطع کلامی کی اور دانت کچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون منقطع کر دیا تھا۔

ڈور بتل بجی تو میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے پیلا ڈین کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میرے لیے کافی کا گگ بھی تھا۔ اس نے مجھے ایک طرف ہٹایا اور اندر داخل ہوتے ہی کرسی پر ڈھیر ہو کر بولی۔ ”بتا کر تو جایا کرو کہاں ملو گے؟“
 ”کیا ہوا؟“ اسے پریشان دیکھ کر میرا فکر مند ہونا یقینی تھا۔

”یہ لو...“ اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔

”کچھ دیر پہلے ہی یہ ای میل موصول ہوا ہے۔“

”شیطان پرواز کر چکا ہے۔ تمہارے لیے یہ چھوڑے جا رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم اسے دھمکی نہیں بچ سکو گی۔“

تمہارے اعزاز میں، میں نے آج ہوں کے اندر بم نصب کر دیا ہے۔ یہ شیطان کی طرف سے تمہارے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے۔“

”یہ دھمکی نہیں اطلاع ہے۔“ میں نے ای میل پڑھ کر سراپر اٹھا لیا اور پیلا ڈین سے کہا۔ اس کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ وہ خاموش تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر میری پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔

”کب ملایہ؟“ میں نے ای میل والا کاغذ اس کی نگاہوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

”تقریباً بیس منٹ پہلے۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

”پولیس کو اطلاع کر دی ہے؟“

”ابھی نہیں۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”سوچ رہی ہوں کہ پولیس سے کیا کہوں گی۔ کیا یہ کہیں ایک ای میل ملا ہے جس میں ہوں کے اندر بم نصب کرنے کی اطلاع ہے اور یہ اطلاع دی ہے اس نے، جس نے بم نصب کیا یا کروایا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی۔ ”جانتے ہو اس بات کا پتلا رکھ لیا ہوگا۔ کل ہونے والی ورکشاپ منسوخ ہو سکتی ہے اور اس صورت میں ہوں کی ساکھ کا رونا ہونے لگا۔“ یہ کہہ کر اس نے استفسار یہ لہجے میں میری طرف دیکھا۔ ”اگر کوئی عام دن ہوتا تو ہم آسانی سے پولیس کو بلوا سکتے تھے مگر تم جانتے ہو کہ اس وقت کیا حالات ہیں۔ ہوں مہمانوں سے کچھ بچا ہوا ہے۔ کل ورکشاپ ہوئی ہے۔ دنیا کے کئی ممالک سے مندوب پہنچ چکے ہیں۔ اب اگر یہ خبر ذرا بھی باہر نکلتی ہے تو یہاں ہفتی بڑی افراتفری پھیلے گی۔“

”تم درست زاویے پر سوچ رہی ہو۔“ اس کی باتیں سن کر میں بھی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”ممکن ہے کہ یہ دھمکی نہ ہو۔“

”ہوسکتا ہے کہ دھمکی ہی ہو۔“ یہ سنتے ہی میں نے جواب دیا۔

”صورت کوئی بھی ہو۔ ہمیں سوچنا ہے کہ کس طرح اس معاملے کو پینڈل کریں کہ ہوں کی ساکھ اور ورکشاپ پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے۔“

میں نے جواب دینے کے بجائے کافی کا کپ اٹھا کر

گھونٹ بھرا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ہر فلور کے عقبی کوریڈور پر پرانے طرز کا مائیکرو ویو اوون لگا ہوا ہے۔ جس کا مقصد گاہکوں کو وقت بے وقت چیزوں کو از خود گرم کرنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو ان پرانی مشینوں کے اندر بم آسانی بم نصب کر سکتا ہے۔ ”ہمیں مائیکرو ویو اوون چیک کر لینے چاہئیں؟“ میں نے مشورہ دیا۔

”کوئی فائدہ نہیں۔“ پیلا ڈین نے سر دلچھے میں کہا۔

”میرا ذہن بھی سب سے پہلے اسی طرف گیا تھا۔ جب میں تمہیں تلاش کر رہی تھی، اس دوران ہی انہیں بھی چیک کروالیا تھا۔“

”سیکیورٹی کیسے...“

”میں نے ان پر بھی سرسری نظر ڈالی ہے مگر ان سے بھی کسی قسم کی مشکوک سرگرمی کا اندازہ نہیں ہو پا رہا ہے۔“ اس نے میری بات کا منہ ہونے کہا۔

”جس نے بھی یہ ای میل بھیجا ہے وہ ہوں کی ساکھ کو تباہ کرنا چاہتا ہے یا پھر ورکشاپ کو سبوتاژ۔“ اس کی بات سن کر میں نے خودکامی کی۔

”ممکن ہے۔“ پیلا ڈین نے کہا۔

”یہی ای میل تمہارے ہوں کی آئی ڈی پر بھیجا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بھیجے والا تم سے بھی واقف ہے۔ حالانکہ ہوں اسٹاف کی آویزاں فہرست میں تمہارا نام درج نہیں۔“

”یہ بات مجھے بھی حیران کر رہی ہے۔“ اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

”صاف ظاہر ہے کہ دھمکی دینے والا تمہیں بھی نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔“ یہ سنتے ہی اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ وہ اندر کی معلومات تک بھی رسائی رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم نے ہوں جوائن کیا ہے۔ یہاں سیکیورٹی کے حوالے سے کوئی بڑا واقعہ رونما ہونے کا مطلب ہے تمہاری ناکامی اور نتیجہ تو کرسی سے چھین بھی ہو سکتا ہے۔“ میں تفصیل سے اسے سمجھانے لگا۔ ”یوں دھمکی دینے یا بم نصب کرنے والے کا یہ بہ ظاہر تیسرا مقصد ہے۔ اب اگر یہ تیسرا نکتہ ہی اس کا ہدف ہے تو پھر ایک بات طے ہے کہ یہ صرف دھمکی نہیں۔ بم نصب کیا گیا ہے اور وہ پھنسے گا بھی ضرور۔۔۔“

”اگر ہم نے اس کا پتا چلا کر تار کارہ نہیں بنایا تو۔“ پیلا ڈین نے میری بات کاٹ دی۔ ”یہ میری اور تمہاری آزمائش

نے اسکرین پر دیکھا۔ پیلا ڈین کا ہی نمبر تھا۔ ”کیا ہوا؟“ میں نے فون اٹھانے پر ہی پوچھا۔

”سیکنڈ فلور کی لابی میں چھینو فوراً۔“ اس کی آواز میں گھبراہٹ کی جھلک تھی۔ ”یہاں دو مٹھلک ڈبے لاوارث حالت میں پڑے ہیں، ممکن ہے۔۔۔“

”سمجھ گیا۔“ میں نے قطع کلامی کی۔ ”تم کوشش کرو کہ وہاں زیادہ ہجوم جمع نہ ہونے پائے۔ دو چار سے زیادہ سیکیورٹی گارڈ بھی نہ ہوں ورنہ افواہ پھیل سکتی ہے۔“

”اوکے۔“

”ہوں کے دوسرے حصوں میں تلاشی کا عمل جاری رکھو۔ وہ رکنے نہ پائے۔“ میں نے اسے فوری ہدایت دی۔

”ایسا ہی ہوگا تم فوراً پہنچو۔“

”سمجھو پہنچ ہی گیا۔“ یہ کہہ کر میں نے لائن منقطع کی اور سان فرانسسکو پولیس ڈیپارٹمنٹ کا نمبر ملانے لگا۔

کسی بھی ایسے ہوں میں جو کئی میٹروں کی بندش کے بعد صرف چند روز پہلے کھولا گیا ہو، بم کی موجودگی کی اطلاع برٹس کے لیے بہت خطرناک تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر پولیس سے یہ کہا جاتا کہ ہوں میں بم کی موجودگی کا شبہ ہے تو پھر ان کے پہنچنے ہی سارے کمرے، ڈائننگ ہال اور ڈانس فلور خالی کر والے جاتے، خطرے کا الارم بجتا اور یہ کسی طور بھی مناسب نہیں ہوتا۔ ہوں میں اس وقت دو ہزار سے زیادہ مہمان ٹھہرے ہوئے تھے جن میں دنیا کے مختلف ممالک کی کئی مشہور شخصیات بھی شامل تھیں۔ ایسے میں یہ اطلاع میڈیا کو ملتی تو پھر دنیا بھر کے ٹیلی ویژن چینلز کو اس کے ٹھنڈوں کے لیے چٹ پٹی خبر کا مسالامل جاتا۔ ایسی صورت میں جب ایک طرف بم کی افواہ ہے دو ہزار مہمانوں میں افراتفری پھیلے ہو، دوسری طرف ٹی وی پر خبریں چل رہی ہوں اور ہوں کے سامنے میڈیا کا ہجوم کھڑا ہو تو پھر ساکھ اور برٹس، دونوں کا پتلا مشکل نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ پولیس کو فون کرتے ہوئے یہ سب باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ سان فرانسسکو پولیس ڈیپارٹمنٹ میں، میں کئی سال رہ چکا ہوں وہاں آج بھی میرے کئی پرانے دوست سینئر پوزیشن پر کام کر رہے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو فون کر کے مدد کی درخواست کی۔

”یہ ڈیپٹی پولیس چیف آؤتھر تھا۔“

میں نے آؤتھر سے نہیں کہا تھا کہ ہوں انتظامیہ کو بم کی دھمکی دی گئی ہے یا پھر دو مٹھلک ڈبوں میں بم نصب ہونے کا خطرہ ہے۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ وہ ایک چیک کر لیں کہ کہیں یہ ڈبے خطرناک تو نہیں۔ میں نے یہ بھی درخواست کی

تھی کہ یہاں روزمرہ کے امور نمٹانے والوں کے بجائے پولیس کا خصوصی دستہ بھیجا جائے جو یہ بات جانتے ہوں کہ اس طرح کے معاملات میں پولیس کی موجودگی کے باوجود انواہوں کو ختم لینے سے کیسے روکا جاسکتا ہے۔

میں نے آرتھر کو اپنا موبائل اور ہوٹل انتظامیہ کی سکیورٹی ڈیپارٹمنٹ بھیج دیا تھا۔ میں نے آرتھر سے کہا تھا کہ سب سے سینئر افسر کو بھیجا جائے اور اسے ہدایت کردی جائے کہ وہ صرف اور صرف مجھ سے ہی رابطہ میں رہے۔ میں نے اسے یاد کروادیا تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی کے باعث صرف ہوٹل نہیں پولیس ڈیپارٹمنٹ کی بھی دوڑ لگ سکتی ہے۔ وہ بھی یہ سن کر پریشان تھا کہ ہوٹل میں دو ہزار سے زائد مہمان موجود ہیں اور کوئی بھی انواہ کتنی بڑی خبر بن کر پولیس کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتی ہے۔

”تم بے فکر ہو، میں معاملے کی نزاکت سمجھ گیا ہوں۔ خود اس معاملے کی نگرانی کروں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور میں سیکنڈ فلور کی لابی کی طرف چل دیا۔ پولیس کو اطلاع دینے کے بعد میری آدمی مشکل ختم ہو چکی تھی۔

میرے سوا کوئی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ پولیس کو اطلاع دی جا چکی ہے۔ اس لیے جب پیلا ڈین نے ان مشکوک ڈبوں کے بارے میں میری رائے جاننا چاہی تو میں اسی لیے خاموش رہا کہ پولیس تو آتی ہی ہوئی اور مشکوک ڈبوں کی موجودگی کے باعث وہ ہم ڈسپوزل اسکواڈ کو لے کر ہی آئیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سکیورٹی عملے بالخصوص فل کو بیجان میں دیکھا تو اس وقت میں دلی ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

مشکوک ڈبوں کی موجودگی کی اطلاع ابھی تک پہنچی نہیں تھی۔ پولیس کو بھی پچھلے حصے سے داخل ہو کر سیز جیوں کے ذریعے سیکنڈ فلور تک پہنچنا تھا تا کہ انہیں ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھ کر کسی کو انواہ پھیلانے کا موقع نہ ملے۔ اس وقت چار میں سے صرف ایک محافظ ایسا تھا جو ان ڈبوں کو دیکھ دیکھ کر شدید خوفزدہ ہو رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ خشک تھے اور وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ یہ فل تھا، اس کی حالت دیکھ کر مجھے یقین تھا کہ اگر یہ یہاں سے باہر گیا تو پھر ہم کی انواہ بہت جلد ہوٹل میں پھیل جائے گی۔ بہت کم وقت میں بڑا ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس کی نظریں ڈبوں پر ہی جمی تھیں۔

میرے برابر پیلا ڈین کھڑی تھی۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اور اپنے قریب کیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا مگر کچھ نہ بولی۔ ”جب تک سارا معاملہ صاف نہ ہو جائے فل کو یہاں سے نکلنے نہ دینا ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔“ میں نے

رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔

”سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے نہایت آہستہ سے کہا۔ میں نے سر موڑ کر فل کی طرف دیکھا۔ اس کے ماتھے پر پینا نمودار ہو چکا تھا۔ ٹائٹل بھی آہستہ آہستہ کاپ رہی تھیں۔

”ہیلو... کچھ ملے؟“ پیلا ڈین کے کانوں سے بیڈ فون لگا ہوا تھا۔ سکیورٹی کے کسی کارکن نے اسے فون کیا تو اس نے پوچھا۔ ”تلاش جاری رکھو۔“ یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا اور فنی میں سر ہلا دیا۔ میری ہدایت اور اُس کے حکم پر ہر طرف ہم کی تلاش جاری تھی۔ اب تک کامیابی نہ ہونے سے مجھے یقین آنے لگا تھا کہ اگر ہم کہیں نصب کیا گیا ہے تو پھر اب تک نہ ملنے کا مطلب ہے کہ ان ڈبوں میں ہم بھی ہو سکتا ہے۔ یہ میرا شک تھا۔ ہم ڈسپوزل اسکواڈ کے آنے تک ہر بات غیر یقینی اور ہر چیز مشکوک تھی۔

پچھلے دن تک خاموش کھڑے رہنے کے بعد وہ ایک بار پھر جھپک کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اچانک اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مجھے لگا کہ وہ ابھی ڈبے کو چھو لگی۔ ”رکو“ میں چیخا۔ ”اسے ہاتھ مت لگانا تم نے سنا نہیں کہ بعض دھماکا خیز مواد انسانی جسم کی حرارت یا اسے چھونے پر بھی پھٹ سکتے ہیں۔“ میرے چیخنے پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تب میں نے کہا۔ ”تم سمجھ رہی ہو۔ ابھی یہ مشکوک ہے۔ ہمیں سخت احتیاط برتنی چاہیے۔“ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ان مشکوک ڈبوں کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ یہ سن کر وہاں کھڑے لوگوں کے چہرے پر کچھ بھرم کے لیے خوف کے سائے لہرا گئے تھے۔

”کوئی ان ڈبوں کو ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کرے۔“ میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ پولیس اب تک نہیں پہنچی تھی اور سکیورٹی عملے کی سر تو ڈکوشن کے باوجود اب تک کہیں بھی ہم نہیں ملا تھا۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ یہ ڈبے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اسی دوران سیز جیوں پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ میں نے گردن موڑی۔ ایک جھٹکے سے پیلا ڈین اٹھی اور جلدی سے سیز جیوں کی طرف بڑھی۔ میں سمجھا کہ شاید عقی راستے سے پولیس آگئی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی بڑھا۔ اسی دوران ایک ہلکا دھماکا ہوا۔ یہ قریب ہی ہوا تھا۔ ایسا لگا کہ کسی کمرے کا دروازہ بڑی زور سے توڑا گیا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا پیلا ڈین سیز جیوں کی طرف دوڑ گئی۔

”بھاگو سب، میں نے ان ڈبوں کو چھوا تھا۔“ وہ چلائی۔ یہ سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے مگر میرے قدم بڑھانے سے پہلے ہی ایک اور دھماکا ہوا۔ اس بار آواز ٹھوڑی

”اوہ جی۔“ دوسرے دھماکے کے ساتھ ہی ہوٹل میں خطرے کا مارن بج اٹھا۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ خراب ہو گیا ہے، اب اس کا ہی بہتر ہے۔ پیلا ڈین سیز جیوں کی طرف گئی مگر مجھے لگا کہ اس کا خطرے کا مارن بیٹھے ہی سیز جیوں پر لوگوں کا مارا دوڑ پڑے گا۔ میں نے لفٹ کا رخ کیا اور بین دبا دیا۔ مارا فلور پر دھواں پھایا ہوا تھا۔ بھگدڑ بچ گئی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ان ڈبوں میں ہم ہی تھا۔ سکیورٹی عملے کا کیا بنا، یہ سوچنے اور جا کر دیکھنے کا وقت میرے پاس نہیں تھا۔

میں نے چند سیکنڈ تک لفٹ کا انتظار کیا اور پھر سیز جیوں کی طرف دوڑ پڑا۔ ہوٹل میں بھگدڑ بچ چکی تھی۔ میرے آگے پیلا ڈین تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں دوڑتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ ”تم نے ڈبے کو چھوا تھا؟“ میں نے چلتے چلتے پوچھا۔ ”ہاں...“ اس نے جواب دیا۔ اس کی سانس چھوٹی ہوئی تھی۔

”میرا خیال درست تھا۔“ یہ سنتے ہی میں نے منہ اس کے کان کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں سنسر ڈیوائس تھی۔ یہ سنسر انسانی حرارت کو محسوس کرتے ہی تیس سیکنڈ کے اندر اندر دھماکا کر سکتا ہے۔“

”اوہ میرے خدا... میں بچ گئی۔“

”کم از کم ہم دو تو بچ ہی گئے مگر...“

”سکیورٹی عملے کا کیا ہوا؟“ یہ سنتے ہی اس نے قطع گامی کی۔

”اوپر والا جانے؟“

ہم ہوٹل سے نکل کر پارکنگ میں پہنچ چکے تھے۔ میرا دم تیزی سے دھمکی آمیز ای میل کے مندرجات پر غور کر رہا تھا۔ اس میں ہم کی اطلاع دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ایک پورا سا حلقہ اس کا مطلب ہے کہ کوئی دوسرا بڑا حلقہ بھی ممکن ہے۔ اس لیے سب سے محفوظ جگہ پارکنگ ہو سکتی تھی۔ باہر لگتے ہی میں نے پارکنگ پر نظر ڈالی۔ اس کا بڑا حصہ خالی تھا۔ میں نے پیلا ڈین کو بازو سے پکڑا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ بڑی تعداد میں لوگ باہر نکل رہے تھے۔ اس دوران میں نے گلیاں اشارت ہونے کی آوازیں نہیں۔ میں سمجھ گیا کہ اسے باہر نکل ہی ہے۔

اسی دوران فون کی کھنٹی بجی۔ ”ہیلو، اسپید بول رہا

”پولیس سر اغراساں ہیرا ڈیول رہا ہوں۔“ ایک اجنبی آواز آئی۔ ”ہم ہوٹل پہنچ چکے ہیں۔“

”بہت خوب۔“ میرا لہجہ طرزی تھا۔ ”میں نے امیر جنسی میں فون کیا تھا اور آپ لوگ تب پہنچے جب امیر جنسی ہنگامے میں تبدیل ہو رہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میری نگاہیں پیلا ڈین کے چہرے کی طرف تھیں۔ میری بات سن کر اس نے بھی ہاں میں سر ہلایا۔

”اس وقت تم کہاں ہو...؟“ سر اغراساں نے میری بات کا جواب گول کرتے ہوئے کہا۔

”بلڈنگ کے شمالی حصے کی طرف پارکنگ ہے، وہاں پہنچو۔“

”ابھی پہنچ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ جہاں ہم دونوں کھڑے تھے، وہاں سے ہوٹل کا داخلی دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لوگوں کی بڑی تعداد باہر نکل کر جمع ہو رہی تھی۔ ہر طرف سوالیہ چہرے نظر آرہے تھے۔ ہم دونوں تو یہاں کھڑے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ اس وقت ہوٹل کے ناک پر جوگز رہی ہوگی، اسے قیامت سے کم ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ بے چارے کے ساتھ وہی ہو رہا تھا کہ کھایا پینا کچھ نہیں مگر سب کچھ برباد کر ڈالا۔

ہوٹل کا ناک ایک آئرش تھا۔ وہ مدتوں پہلے امریکا آیا تھا۔ اس نے یہاں مختلف کاروبار میں بہت پیسا کمایا اور پھر سب کچھ بیچ باج کر یہ ہوٹل خرید لیا۔ وہ دس سال سے یہ ہوٹل چلا رہا تھا مگر عالمی کساد بازاری کے باعث اس کا دھندا بڑی طرح متاثر ہوا۔ اس نے مزید نقصان سے بچنے کے لیے ہوٹل بند کر دیا تھا۔ صرف ہفتہ دن دن ہوتے تھے کہ جب اس نے دوبارہ ترمیم و آرائش پر بھاری رقم خرچ کر کے اسے دوبارہ کھولا لیکن جو حالات چیل آئے، اسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اب تو اس کا سب کچھ چوٹ ہو گیا۔

”بہت نقصان ہوا ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے پیلا ڈین سے کہا۔

”بہت ہی زیادہ۔“ اس کے لہجے سے مایوسی جھلک رہی تھی۔ ”میری تو نوکری گئی۔“ اس نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”ہیلو۔“ ایک دراز قامت ادیب عرصہ ہماری طرف آکر بولا۔

”مسٹر اسپید۔“ اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے سر کے اشارے سے ہاں میں جواب دیا۔

”سر اغراساں ہیرا ڈیول...“ اس نے دایاں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب کچھ کیسے ہوا؟“

”بتاتا ہوں، ذرا ادھر چلیے۔“ میں نے پارکنگ کے

ایک کوٹنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں بچہ پر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

”پولیس صورت حال کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔“ اس نے آگے بڑھتے ہوئے بتایا۔ ”سیکنڈ فلور پر بم ڈسپوزل اسکواڈ جائزہ لے رہا ہے۔ ہمیں مزید دھماکوں کا خطرہ ہے۔ اس لیے ہوں تو مکمل طور پر خالی کروا کر تلاشی لینے کا حکم ہے۔“

”تلاشی میں کتنی دیر لگ سکتی ہے؟“ پیلا ڈین نے چوکتے ہوئے کہا۔

”کچھ کم نہیں جاسکتا۔“

”سب ختم۔“ سرائرساں کی بات سن کر پیلا ڈین نے افسوس سے ہاتھ ملے ہوئے خود دکھائی کی۔

اگلے دس منٹ کے اندر ہم دونوں پولیس سرائرساں کو ساری صورت حال تفصیل سے آگاہ کر چکے تھے۔ وہ نہایت غور سے ہماری بات سن رہا تھا۔

”وہ ای میل ہے آپ کے پاس؟“

”ہاں... یہ جیسے۔“ میں نے دھمکی آمیز ای میل کا پرنٹ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ کچھ دیر تک اسے غور سے پڑھتا رہا اور پھر اسے اپنی نوٹ بک میں رکھ لیا۔

”پلیے... دھماکے کی جگہ پر چلتے ہیں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اگرچہ دھماکے سے سیکنڈ فلور پر کچھ خاص نقصان تو نہیں ہوا البتہ اس کی آواز اور لابی میں بھرجانے والے دھویں کے باعث آؤٹریک طور پر فائر الارم بج جانے سے بری طرح بھکڑ مچ گئی تھی۔ ہم جیسے ہی ہول کے اندر داخل ہوئے، بھکڑ کے آثار نمایاں نظر آ رہے تھے۔ ہم تینوں بیڑھیوں کے راستے سیکنڈ فلور پر پہنچے۔ فل اور کی اور سکیورٹی گارڈز وہاں کھڑے تھے۔ البتہ اس جگہ سے کافی دور تھے جہاں کچھ دیر پہلے دو مشکوک ڈبے اوپر تلے رکھے ہوئے تھے۔ فرش پر جگہ جگہ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ اُن مشکوک ڈبوں کے ہی ٹکڑے تھے۔ ہم ڈسپوزل اسکواڈ جانے دو بعد سے شاید اُدھر آئے کر رہا تھا جبکہ اسکواڈ کے کئی اہلکار اس وقت ہول کی بھرپور تلاشی لینے میں مصروف تھے۔ انہیں شبہ تھا کہ ہلکی طاقت کا دھماکا ممکنہ طور پر کسی بڑے دھماکے کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔

میں نے لابی کی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ نیچے بڑی تعداد میں پولیس والے موجود تھے جو میڈیا کے نمائندوں کو

اندر آنے سے روک رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ کئی دیوار دھماکے کی خبر کو بریکنگ نیوز کے طور پر نشر کر رہا ہوگا۔

”میرے خیال میں یہ دھماکا کسی جانی نقصان کے بجائے صرف دھمکی کے طور پر کیا گیا ہے۔“ اسی دوران سرائرساں ہیرالڈ میرے قریب آ کر بولا۔ ”لگتا ہے کہ دھماکا کرنے والا کسی کو مارنے کے بجائے صرف خوف و ہراس پھیلانا چاہتا تھا۔“

”اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔“ پیلا ڈین نے جلدی سے کہا۔

”فی الوقت یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے کہ دھماکا کرنے والے کا مقصد کیا تھا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تخمینہ کے انداز میں کہا۔ ”جب تک مقصد کا پتا نہیں چلتا تب تک ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کامیاب ہو گیا ہے۔“

”بالکل درست کہا تم نے۔“ ہیرالڈ نے لقمہ دیا۔ ”ہم ڈسپوزل اسکواڈ کے ماہرین کا فوری خیال ہے کہ بم میں صرف دھماکا خیز مواد اور دھواں پیدا کرنے والا کیمیکل استعمال کیا گیا ہے جس کے باعث کسی جانی نقصان کا خطرہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے، جب کوئی شخص اس کے انتہائی قریب ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ”خوش قسمتی سے کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔“

”نقصان بہت بڑا ہوا ہے۔“ پیلا ڈین نے تلملا کر کہا۔

”کیا مطلب؟“ ہیرالڈ چونک گیا۔

”ہول میں دھماکا ہوا ہے، یہی بات کافی ہے اس کا بزنس چھوٹ کرنے کے لیے۔“ اس نے کٹ کٹے کچھ میں جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو اس دھماکے کے نتیجے میں کیا کچھ ہو سکتا ہے؟“ اس نے ہیرالڈ سے استفسار کیا اور پھر خود ہی بتانے لگی۔ ”بزنس تو گیا، اب لوگ ہم پر مقدمہ بھی کر سکتے ہیں کہ ہول کا سکیورٹی نظام شکستہ نہیں۔ اس جواز پر مالک کس کس کو ہر جانے ادا کرنا پھرے گا؟“

”تم شکستہ ہی ہو۔“ ہیرالڈ نے تائید کی۔

”ہاں بے چارہ۔“ میں نے افسوس سے کہا۔ ”ایسا ہوا تو بے چارے کے پاس خودکشی کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں بچے گا۔“

یہ سن کر پیلا ڈین نے مجھے کھانجانے والی نظروں سے گھورا۔ ”موقع کل دیکھ لیا کرو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

کیپ کارن ہول انتظامیہ میں چھ دن اور چھ راتوں کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اب شاید اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ پولیس، بم ڈسپوزل

اسکواڈ کی نہیں پورے ہول میں دندناتی پھر رہی تھیں۔ دھمکی آمیز ای میل کے باعث پولیس نے تفتیش کے لیے ہول کے تمام لیپ ٹاپ اپنی تحویل میں لے لیے تھے۔ اس اٹھن چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور فی وی ہول کر ملک لیڈ جینیل بدل بدل کر دیکھنے لگا۔ ہر جینیل پر یہی خبر تھی۔ لگتا تھا کہ امریکی میڈیا کے لیے اس وقت اس سے بڑی کوئی اور خبر تھی ہی نہیں۔ میں کافی دیر تک کمرے میں رہا۔ نہ تو پولیس اور نہ ہی پیلا ڈین نے مجھ سے رابطہ کیا۔

فی وی سے پتا چلا کہ پولیس نے کنوینشن سینٹر کے قریب صوبہ دو طاقت ور ٹائم بم دریافت کر لیے تھے۔ جنہیں کل صبح ساڑھے نو بجے ایک وقت پھنسا تھا۔ فی وی پر یہ خبر بریک ہوتے ہی ایک اور ہنگامہ کھڑا ہوا۔

کل صبح کنوینشن سینٹر میں کمپیوٹر پروگرام کی تقریب رونمائی اور دو روزہ ورکشاپ کا پروگرام انعقاد کرنے والی انتظامیہ نے فوراً منسوخ کر دیا۔ پروگرام میں شرکت کے لیے پہنچنے والے مندوبین کو ہدایت کی گئی تھی کہ جیسے ہی پولیس ہول کو گھیر کرے، وہ اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیں۔ میں سمجھ گیا کہ اب کھل ختم۔

رات گئے پولیس نے ہول کو گھیر کر دیا۔ اس کے بعد لوگ دھڑا دھڑا انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے گھٹے ری شیڈول کروانے میں لگ گئے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو ہول چھوڑ دے۔

صبح کے چار بجے تھے۔ میں ہول کی مرکزی لابی میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ لوگ واپس جا رہے تھے اور صبح کے سات بجے تک ہول پوری طرح مہمانوں سے خالی ہو چکا تھا۔

”کیا کر رہے ہو؟“ اسی دوران مجھے پیلا ڈین کا فون ملا۔

”میرے یا تمہارے کرنے کے لیے اب کچھ بھی نہیں بچا۔“

”میرے دفتر میں پہنچ جاؤ۔“ عام طور پر یہ وقت سونے کا ہوتا ہے مگر رات بھر جو یہاں ہنگامہ تھا، اس میں کس کجبت کو نیند آسکتی تھی۔ میری آواز سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں بھی دوسروں کی طرح جاگ رہا ہوں۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ خاصی مشکل نظر آرہی تھی۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اس صورت حال نے اس کے اعصاب بری طرح توڑ پھوڑ دی ہے۔



”اگر کوئی آدمی راستہ کاٹ جائے تو یہ خوش قسمتی کی نشانی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تم بھی واپس لوٹ جاؤ۔“ کافی پیٹے ہوئے اس نے کہا۔ اس کی آواز کمزور پڑ چکی تھی۔

”تمہارا کیا پتا؟“

”میری لیڈو سے بات ہوئی ہے۔“ پیلا ڈین نے بتانا شروع کیا۔ وہ اس ہول کا مالک تھا۔ ”اس کی حالت بہت بری ہے۔ وہ بوڑھا آدمی ہے، اس واقعے نے اس پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔“

”ہول کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا وہ؟“ میں نے سوال کیا۔

”بہت ہی پریشان ہے۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”کہہ رہا تھا کہ وہ ہول بند کر رہا ہے۔ پولیس انکوائری ختم ہوتو وہ اسے بیچ دے گا۔“

”اور تمہاری نوکری؟“

”آج نہیں توکل فارغ ہو جاؤں گی، دوسرے اساتذہ کی طرح۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پریشان نظر آرہی تھی۔

”خیر اب جو ہوا سو ہوا۔“ میں نے کافی کا کپ میز پر رکھا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اس سارے معاملے میں نہ تمہاری غلطی ہے اور نہ ہی میرا کوئی دوش۔“

یہ سن کر پیلا ڈین نے سر اٹھایا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ جب میں نے ایک شاندار ریستوران میں ناشتا کیا اور پھر گھر پہنچ کر جو سویا تو شام کے سات بجے آنکھ کھلی۔

میں نے کافی بنائی اور ٹی وی کھول کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر اب تک اس واقعے کے مختلف پہلوؤں پر خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ ایک خبر میں بتایا گیا کہ ہول کے مالک نے انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ فوری طور پر ہول بند کر رہا ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ وہ بہت جلد ہول فروخت کر کے واپس اسکاٹ لینڈ چلا جائے گا۔

میں نے ٹی وی بند کیا اور بیڈروم میں آکر موبائل اٹھا کر اس کی رینگ لون آن کرنے لگا۔ سونے سے پہلے میں نے اس کی ٹیل آف کر دی تھی۔ ”اودہ خدایا“۔ اچانک میرے منہ سے نکلا۔ ستانوے مس کالز تھیں اور یہ سب ایک ہی نمبر سے تھیں۔ نمبر تھا رابرٹ کا۔ ”نہا دھولوں تو پھر فون کرتا ہوں اُسے۔“ میں نے خود کھائی کی مگر اس سے پہلے کہ فون کو واپس میز پر رکھتا، اس کی گھنٹی ایک بار پھر بج گئی۔ رابرٹ کال کر رہا تھا۔

”سوری باس۔۔۔“ میں نے فون اٹھاتے ہی کہا۔

”سور ہاتھا، ابھی ابھی جاگ ہوں۔“

”ہو سکے تو کل صبح مل لو۔“

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

کیپ کارن ہول کے واقعے کو دو ماہ گزر چکے تھے۔ پولیس ملزمان کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔ بوڑھے ڈیوڈ نے ہول فروخت کر دیا اور واپس چلا گیا۔ ادھر میرے شب و روز بھی شاہانہ انداز میں بسر ہو رہے تھے۔ اس دوران پیلا ڈین سے ایک بار بھی ملاقات نہیں ہوئی۔

اُس روز شام کے سات بج رہے تھے۔ میں نہایت اہتمام سے تیار ہو رہا تھا۔ آٹھ بجے مجھے اسکاٹ لینڈ کیسینو کی افتتاحی تقریب میں شرکت کرنا تھی۔ یہ تقریب میرے لیے بہت اہم تھی۔ بڑے بڑے لوگ شریک ہو رہے تھے۔ کئی معروف فلم اور ٹی وی اسٹار بھی آ رہے تھے۔ اسی لیے میں نے بھی شرکت کے لیے بڑے تپاک سے مہنگا بلیک ڈزموٹ سلوایا تھا۔ نئے بلیک شوئز خریدے تھے۔ میں تیار ہو کر آئینے میں اپنا جائزہ لے رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے نمبر دیکھا۔ ”اودہ!“ میرے منہ سے نکلا۔

”تم کب نکل رہے ہو؟“ اُس نے چھوٹے ہی سوال کیا۔

”اگلے دو منٹ میں، وہیں ملتے ہیں۔“ میں نے فون بند کر کے جیب میں رکھا اور کار کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا۔

☆☆☆

کار پارکنگ کھینچ بھری ہوئی تھی۔ ہر طرف قیمتی اور جدید ماڈل کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کافی دیر بعد مجھے جگہ مل ہی گئی۔ میں پارکنگ سے نکلا تو سامنے داخلی دروازہ تھا جہاں بڑی تعداد میں ٹی وی کیمرے لگے ہوئے تھے۔ ہر طرف آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ سب کچھ ویسے کا دیا تھا۔ وہی عمارت تھی، وہی داخلی دروازہ اور وہی پارکنگ لیکن عمارت کی آرائش میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ پہلی نظر پڑتے ہی کیسینو کا تصور ذہن میں ابھرے۔ اسکاٹ لینڈ کیسینو کی چکا چوند کے نیچے گزرے کل کا کیپ کارن ہول دفن تھا۔

تقریب بہت شاندار تھی۔ کیسینو کا اصل مالک رابرٹ تھا لیکن اس نے ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی قائم کر کے اکیاون فیصد شیئر خود لے لیے تھے۔ تقریب جو بین پر تھی جب رابرٹ نے مائیک تھام کر سب کو۔ ایک منٹ کے لیے خاموش ہونے کا کہا۔ ”اب میں آپ کو ملاتا ہوں کمپنی کے پارٹنرز اور ڈائریکٹرز۔“

کچے بعد دیگرے اس نے کئی لوگوں کو متعارف کروایا۔ میں انہیں جانتا تھا، وہ سب رابرٹ کے کارندے تھے۔ اس نے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے یہ چال چلی تھی۔

”اور یہ ہیں مسٹر پاسکل ایڈی عرف اسپنڈ۔“ یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ”یہ ہیں دس فیصد کے شراکت دار۔“

رابرٹ جب میرا تعارف کروا رہا تھا، اسی دوران میری نظر سامنے بڑی مہمانوں میں پیلا ڈین کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی میکسی چینی پہنی ہوئی تھی۔ وہ بڑی دلکش نظر آ رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ ابھی میری حیرانی ختم نہیں ہوئی تھی کہ رابرٹ نے اگلے پارٹنر کا تعارف شروع کر دیا۔

”یہ ہیں مس پیلا ڈین، تین فیصد کی شراکت دار۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ مکرار رہی تھی۔ میں سخت حیران تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ یہاں کیسے؟

رابرٹ نے تعارف ختم کر لیا تو میں غیر محسوس انداز میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ میرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ ”ہائے پیلا ڈین۔“

انتشی نادید

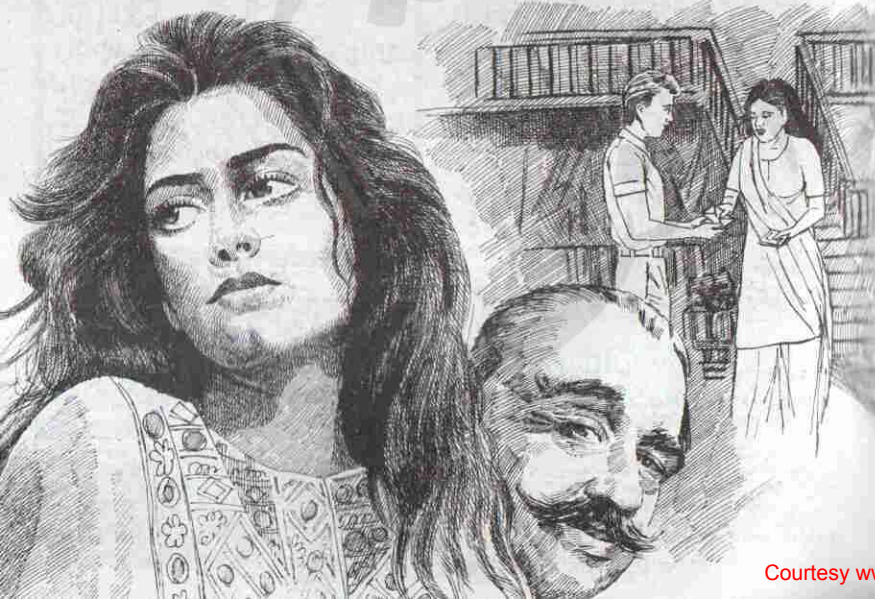
ڈاکٹر عرب الاربہٹی

کچھ لوگوں کے لیے یہ عشق تو واقعی آگ کا دریا ثابت ہوتا ہے جس میں نہ چاہتے ہوئے بھی ڈوبنا پڑتا ہے... چاہے منزل ملے نہ ملے۔ مگر اس کا عشق تو بہت عجیب تھا... جسے نہ تو جان کی پروا تھی نہ بدنامی کا احساس... بس وہ اسے اپنی ذات کے حصار میں قید رکھنا چاہتی تھی۔

ایک وفا شعار و شیرازی کی زندگی کا احوال

سے جلنے والا دم لب رکھا ہوا تھا اور روشنی پھیلانے کی مقدور بھرکوش کر رہا تھا۔ اس کی ناکانی روشنی میں رادھا کی پتلی پتلی بدھیت ناگنیں لرزتی نظر آ رہی تھیں۔ اگر روشنی تیز ہوتی تو رادھا کے چہرے کے وحشت زدہ تاثرات بھی صاف دکھائی دیتے۔ اسی کی ماں نے وہ چٹون میز پر بیچ دی جس کی وہ مرمت کر رہی تھی۔ اس نے رادھا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کون ہے وہ؟ کس نے تمہارا بیچھا کیا ہے؟“ ”موہن نے۔“ رادھا نے آبدیدہ ہو کر اپنے خشک

رادھا اتنی تیزی سے باورچی خانے میں داخل ہوئی کہ اس کے ماں باپ بری طرح چونک اٹھے، وہ سخت گھبراہٹ میں جلتا تھی۔ اس کے ہاتھوں میں موجود دودھ کی بائی گرت گرت پڑی۔ وہ میز کے ایک کونے سے ٹیک لگائے گھرے گھرے سانس لیتے تھی۔ رادھا کے ماں باپ حیران تھے کہ وہ خوف زدہ انداز میں بولی۔ ”وہ... وہ میرا بیچھا کر رہا تھا۔“ باورچی خانے کی ایک بھدی سی میز پر مٹی کے تیل



”آئی ایم سوری۔“ وہ اس وقت کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا اور میری طرف چلی۔ ”مبارک ہو مسٹر پارنٹر۔“ اس نے میری طرف دابھا ہاتھ بڑھایا۔ ”مگر تم...“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”میں بتاتا ہوں۔“ میرے کانوں میں آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو رابرٹ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”تم دونوں میری شطرنج کے کھلاڑی تھے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”کیا...!“

”ہاں۔“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔ ”مگر کیسے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم نے ڈیوڈ کو ہونٹ بچتے پر مجبور کیا اور پیلا ڈین نے سافٹ ویئر کمپنی کو ڈیوڈ کو لایا۔“ اس نے قطع کلامی کی اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”پوری بات بتاؤ۔“ ”پہلے ایک تھا اور ڈاکٹر دو اور تم دونوں ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے مگر ایک دوسرے کی حقیقت سے بے خبر تھے۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہم میں نے نصب کروائے تھے، دھکی والی ای میل میرے آئی نے بھیجی تھی اور وہ واقعی سنرگی ڈیوائس کے ہم تھے۔ اگر پولیس پہنچ جاتی تو ہم ناکارہ بنا دیے جاتے۔ اسی لیے پولیس کے چہچہے سے پہلے ہی پیلا ڈین نے ان ڈیوڈ کو چھو کر آن کر دیا۔ ویسے میرے کہنے پر ہی پیلا ڈین نے جہیں فون کر کے بلوایا تھا۔“

”مگر میری ضرورت کیا تھی اس کھیل میں؟“ ”آپس کی بات ہے تمہاری بہت بڑی ضرورت تھی۔“ وہ کہنے لگا۔ ”سراغ رساں، چیف سکیورٹی افسر... ان سب کی موجودگی کے باوجود ہم دھماکا صرف دہشت گردی کا واقعہ تھا۔ اس لیے کوئی شخص ہونے کے خلاف مقدمہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو پھر ہونے پر گاہک مقدمہ کر سکتے تھے اور قانون کے تحت اگر کسی جانکاد پر مقدمہ چل رہا ہو تو وہ فروخت نہیں کی جاسکتی۔“ یہ کہہ کر اس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ ”منصوب تو تم نے ہی بنایا تھا کیوں بھول گئے۔“ ”ارے ہاں... یاد آیا۔“ میں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”مگر وہ کمپیوٹر گیم...“ ”اگر وہ لایا ہو جاتا تو میری کمپنی کا اسی طرح کا تیار کردہ پروگرام فیل ہو جاتا... سمجھے۔“

بال ایک جھگڑے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”آج تو میں بڑی مشکل سے بچی ہوں ماں! اس نے..... اس نے مجھے پکڑ لیا تھا اور..... اور.....“ رادھا کے رخساروں پر سرخی سی چھا گئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مدھم روشنی میں چمک رہی تھیں۔

”کیا اس نے.....؟“ ماں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ شدید بے چینی کے عالم میں کرسی سے اٹھ گئی تھی۔ ”نہیں ماں!“ رادھا نے نفی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اگر میں زور لگا کر خود کو چھڑا نہ لیتی تو.....“

رادھا کا باپ دیر سے ایک تھوڑے کا معائنہ کر رہا تھا، اس نے اسے نیچے رکھ دیا اور رادھا کو گھورنے لگا۔ اس کی ڈانٹنی ایک ہفتے سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ متحکم اور بد نظر آ رہا تھا۔ اس نے نجف آباد میں کھلی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”اس گڑبڑ میں تم نے سارا دودھ بھی گرا دیا ہوگا؟ کیوں.....؟“

”نہیں بابا!“ رادھا نے جلدی سے بالٹی اٹھا کر اس کے نزدیک لے جاتے ہوئے کہا۔ ”سارا دودھ نہیں گرا البتہ تھوڑا سا ضرور گر گیا تھا۔“

”یہ تھوڑا سا کرا ہے؟“ اس کے باپ نے بالٹی میں جھانکتے ہوئے اسی لہجے میں کہا۔ ”یوں ہو کہ تھوڑا سا باقی بچا ہے۔ دودھ دوسنے میں بھی تم نے گھنٹوں لگا دیے۔“

”میں کیا کرتی بابو؟“ رادھا نے منہ بورتے ہوئے کہا۔ ”زنجیرم جو جانے کی وجہ سے ہمیں قابو میں آتی ہی نہیں، بار بار اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہے۔“

”اچھا..... اچھا.....“ رادھا کی ماں نے بیزار کیساتھ اپنے شوہر سے کہا۔ ”تم دودھ کے متعلق بعد میں چتا کرتے رہنا، اس سے یہ سوچو کہ اس ڈیل نے کتنی گھناؤنی حرکت کی ہے؟ جاؤ بندوق اٹھا کر ابھی اس کیسے کو تلاش کرو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ رادھا کا بھی وہی حشر کڈالے جو اس نے کماری کا کیا تھا؟“

”یہ سب فضولیات ہیں، ہر بات بے سوچے سمجھے آنکھ بند کر کے مت مان لیا کرو۔“ رادھا کے باپ نے بے پردائی سے کہا۔ ”یہ لڑکیاں جب بالغ ہونے لگتی ہیں تو دیوانی ہو جاتی ہیں۔ عجیب عجیب خیالات ان کے ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ ہمیشہ یہی سمجھی ہیں کہ مردان کا پیچھا کر رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر

اس نے دوبارہ اپنا تھوڑا اٹھالیا اور رادھا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ذرا اس کم بخت کی شکل تو دیکھو۔ بالکل چوبہا جیسی لگتی ہے۔ نہ رنگ نہ روپ، دق زدہ سی مرل لڑکی۔ بھلا کون پائل اس کا پیچھا کرے گا؟ میں کہتا ہوں موہن جذباتی

ہو کر بھی کم از کم اتنا ذہین ضرور ہے کہ اس جیسی بد صورت لڑکی کی طرف توجہ نہیں دے گا۔ میں یقین ہی نہیں کر سکتا کہ اس نے اس کا پیچھا کیا ہوگا۔“

رادھا نے بھی بڑی بے باکی سے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ اس کی زرد زرد آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگیں۔ اس نے کہا۔ ”یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اچھی صورت ہی تلاش کرے، دنیا میں بد صورت لڑکیاں بھی تو ہوتی ہیں آخر۔“

”کیوں بند کرو۔“ اس کا باپ دباؤا۔ ”تمہاری زبان قہقہی کی طرح چلنے لگی ہے۔ شرم نہیں آتی اس طرح کہتے ہوئے؟“ اس نے تھوڑے کو ایک جھجکا دیا۔ صرف دستہ اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ ”تمہاری ماں نے تمہیں یہی سکھایا ہے؟“ رادھا کی ماں نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ”یہ باتیں چھوڑو، باہر جاؤ اور اس حرام زادے کو تلاش کرو، ایسا نہ ہو کہ کماری کی طرح رادھا بھی کسی روز باڑے کے پیچھے مردہ حالت میں پائی جائے اور اس کے کپڑے بھی کماری کے کپڑوں کی طرح پیسے ہوئے ہوں۔“

رادھا کے باپ نے تھوڑا اٹھک کر تے ہوئے کہا۔ ”چھوڑو بھی، ضروری نہیں ہے کہ کماری کو موہن نے ہی ہلاک کیا ہو، یہ کام کسی اور کا بھی ہو سکتا ہے۔“

”ہرگز نہیں، یقیناً یہ موہن ہی کا کام ہے، تم خواہو اور اس کی وکالت کر رہے ہو۔ حالانکہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کی ٹوپی کماری کی لاش کے قریب پائی گئی تھی۔ اس کا چاتو بھی وہیں پڑا تھا اور پھر اس پوروانی (گاؤں) میں اس کے سوا کوئی اور شخص ایسا نہیں ہے جس پر قل کا شب کیا جاسکے۔ تم اچھ کر اسے تلاش کرتے ہو یا نہیں؟“ رادھا کی ماں نے عین رخ کر کہا۔

رادھا کے باپ نے بڑی مشکل کے ساتھ زمین سے پیر بلند کر کے لیسپ کی روشنی میں اسٹول پر رکھا۔ پاؤں پر میلے اور پرانے پڑے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے لیے زیادہ چلنا مشکل ہے۔ میں اس زخمی پاؤں کے ساتھ کہاں تک گھسنا پھروں گا۔“

”ہائے تمہارا پاؤں!“ رادھا کی ماں نے طنز یہ انداز میں کہا۔ ”کیوں باتیں بنا رہے ہو، بلی سی سوجن ہی تو ہے، ٹوٹ تو نہیں گیا پاؤں تمہارا.....“

”مگر میرے لیے تو اسے ہلانا بھی ایک عذاب ہے۔ معلوم نہیں کیوں اتنی زیادہ تکلیف ہونے لگی ہے۔“ ”شاید وہ ابھی زیادہ دور نہ گیا ہو۔“ رادھا نے کہا۔ وہ

اتنی دیر سے بڑے قہقہے کے ساتھ بھولی بھالی لڑکیوں کی طرح اپنے ماں باپ کی نوک جھوک سن رہی تھی۔ ”ہو سکتا ہے وہ اب بھی مونہنے کی تاک میں کہیں آس پاس ہی موجود ہو۔“

”جائے گا کہاں؟ ایک دودن میں پکڑ لیا جائے گا۔“ رادھا کے باپ نے اس بار تالے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت باہر جانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ ”سنا ہے کماری کے معاملے میں پولیس ابھی تک سرگرمی سے اسے تلاش کر رہی ہے۔ پرسوں اسے تھانیدار نے کھلایا میں پکڑ لیا تھا مگر وہ کمینڈا سے دھکا دے کر بھاگ نکلا۔“

”میں کچھ نہیں جانتی..... اس وقت پولیس والوں کی پٹیاں نہیں بلکہ ہماری بیٹی خطرے میں ہے۔ رادھا! تم لائین جلا کر لاؤ.....“ اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ”اوجی..... تم..... تم بندوق اٹھاؤ اور باہر جا کر ایک نظر ڈالو، ممکن ہے وہ موہن..... نہیں دکھائی دے جائے۔“

رادھا نے جلدی سے لائین جلائی۔ پرانی لائین کی بتی سے دھواں نکل کر شیشے کا ایک حصہ سیاہ کرنے لگا۔ رادھا کے باپ نے بیوی کی حکم عدولی مناسب نہ سمجھی۔ اس نے بادل ناخواستہ اٹھ کر نکلڑا تے ہوئے اپنی بندوق تلاش کی اور اس میں ایک کاٹوس ڈالا۔ یہ بوسیدہ سی بندوق عموماً جنگلی سورا اور گیدڑ جھگانے کے کام آتی تھی۔

رادھا کی ماں نے اس کی پتلون کی مرمت ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”لو اسے پہن کر باہر جانا۔“

رادھا کے باپ نے اپنی میلی چپکے سی دھوئی دیکھی پھر اس نے اپنے پاؤں کی پٹیاں دیکھیں اور منہ ہناتے ہوئے ہنسی سے بولا۔ ”چنانچہ کیوں تم مجھے پتلون پہننے کو دیتی ہو جسے پہننے کے لیے مجھے یہ پٹیاں اتارنی پڑتی ہیں۔ میں اب اپنی دھوئی ہی پہنے رکھوں گا، اس موہن کو میری پتلون کی نہیں، بندوق کی فکر ہوگی۔“

رادھا لائین اٹھا لے اپنے باپ کے ساتھ ساتھ تھی۔ باپ نے مشکل سے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، اب اتنا اس نے کس جگہ تمہیں پکڑنے کی کوشش کی تھی؟“

”باڑے کے بالکل پاس..... میں جیسے ہی باہر نکلی، اس نے مجھے پکڑ لیا۔ پھر وہ مجھے اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔“ رادھا نے لگتے سے کہا۔

”بہت ہی بد ذات ہے وہ۔“ باپ نے ناک چڑھا کر کہا۔ ”وہ بار بار اپنی بندوق اس طرح سنبھال لیتا تھا جیسے اس کی ضرورت پڑنے ہی والی ہو۔“

بالا مکان کے سامنے ہی تھا۔ رادھا کی ماں مکان کے

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی

کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور

مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری غیر

زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ

اعصابی قوت دینے والی لوبوب مقوی

اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ

کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر

لوبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور

اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف

دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں

کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی

قوت والی لوبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون

کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی

VP منگوائیں فون نمبر 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دبئی یونانی دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

آپ صرف فون کریں آپ تک

لوبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

دروازے پر کھڑی تھی اور ان دونوں کو باڑے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اسے صرف لائین کی حرکت سے پتا چلا رہا ہوگا کہ وہ دونوں آگے بڑھ رہے ہیں، پھر جب وہ باڑے کے اندر چلے گئے تو اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

باڑے کے اندر ان کی بھینس بڑی بے نیازی سے بیٹھی تھی، بھینس نے لائقیت سے لائین سمیت دو حرکت سائے اندر آتے دیکھے اور بدستور چمکی کرتی رہی۔ قریب ہی وہ ساڈھ بھی بندھا ہوا تھا جس نے زور سے پاؤں مار کر رادھا کے باپ کو ڈھکی کر دیا تھا۔ اس نے بھی ان پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ شاید وہ اپنے مالک کے پاؤں پر پٹیاں بندھی دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رادھا نے لائین ذرا اونچی کر کے چاروں طرف دیکھا۔ ”باپو! یہاں تو کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کوئی چھپ سکے۔ کیا خبر وہ کہاں چھپا ہوگا؟“

”ہوں، واقعی یہاں تو کوئی چڑیا کا بچہ بھی نہیں چھپ سکتا۔“ رادھا کے باپ نے تائیدی۔ پھر اس کی نظر لکڑی کی سیڑھی سے ہوتی ہوئی اوپر اس نیم چھتی پر پڑی جہاں چارہ سنبھال کر رکھا جاتا تھا۔ ”ہوسکتا ہے وہ مورکھ! وہاں چھپا ہو،“

اف میرا پاؤں بہت دکھ رہا ہے۔

”باپو! تو اوپر چڑھ کر اڑم دیکھ تو لے۔“ رادھا نے اس کے پاؤں کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے تجویز پیش کی۔ ”نہیں، میرے لیے یہ بڑا مشکل ہے۔ تم ایسا کرو کہ خود لائین لے کر سیڑھی پر چڑھو اور اچھی طرح اسے تلاش کرو، اگر وہ اوپر موجود ہے تو یقیناً آج میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جاسکتا۔“ رادھا کے باپ نے دانت پیس کر کہا۔

”اگر..... اگر باپو! وہ ہیں تو مجھے پھر نہ پکڑ لے۔“

رادھا نے خوف زدہ سی آواز میں کہا۔

”اس وقت وہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں یہاں موجود ہوں۔“

رادھا سیڑھی پر چڑھ رہی تھی، اس کا باپ ہندوق تھا بے بالکل تیار کھڑا تھا۔ رادھا نے لائین کی روشنی میں اچھی طرح ادھر ادھر دیکھا۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے باپو!“

پھر وہ سیڑھیاں اترنے لگی جب وہ نیچے اتر آئی تو اس کا باپ اپنا بیٹا والا پاؤں زمین پر رگڑ کر صاف کر رہا تھا۔

”یہ بھینس باڑے میں چاروں طرف مزگشت کرتی رہی ہے، اس کی زنجیر پوری نہ ہوتی ہوئی تو ہر طرف گوبرتو نہ پھیلا ہوتا۔“ پھر وہ دونوں باپ بیٹی واپس گھر کی طرف جانے لگے۔ تھوڑی دور جا کر رادھا کے باپ نے کہا۔

”بیٹی! کل تم چارہ کاٹ کر نیم چھتی میں سنبھال کر رکھ دینا، بارشوں کا موسم سر پر ہے، برف باری بھی ہوتی ہے۔ میں زخمی پاؤں کی وجہ سے فی الحال کسی کام کے قابل نہیں ہوں۔“

☆☆☆

باڑے میں چارہ کاٹنے وقت رادھا کو کچھ گرمی محسوس ہوئی۔ دھوپ بھی بہت تیز تھی اور وہ سخت محنت کرنے کی وجہ سے سارے بدن پر ایک خوشگوار سی نمی محسوس کر رہی تھی، اس کے دبلے پتلے بازوؤں میں خاصی طاقت تھی اس لیے دیر تک کام کرنے کے باوجود وہ کھکی نہیں تھی۔ سہ پہر کے وقت اس نے دیکھا کہ اس کی ماں انڈوں کی ٹوکری اٹھا کر بازار کی طرف جا رہی ہے۔ بازار کا راستہ باڑے ہی کی طرف سے گزرتا تھا۔ جب ماں غریب بیٹھی تو رادھا باہر نکل آئی۔ ماں نے کہا۔

”آج تمہاری جگہ میں بازار جا رہی ہوں، رادھا! کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ وہ بخت موہن تمہیں آج پھر نہ ڈھونڈ رہا ہو۔ تمہارا باپ ہندوق لیے کھڑکی سے دیکھ رہا ہے۔ اگر آج موہن باڑے کی طرف آ گیا تو اس کی خیر نہیں ہوگی، تم چٹانہ کرنا۔“

”لیکن ماں! کہیں وہ راستے میں تمہیں پریشان نہ کرے؟“

”اس کی کیا مجال ہے؟“ رادھا کی ماں نے آنکھیں نکال کر کہا اور ٹوکری سے ایک لمبا چھرا نکال کر رادھا کو دکھایا۔ ”میں اس کا قیہ بنا دوں گی۔“

جب رادھا نے ماں کو دور سوک کے آخر میں غائب ہوتے دیکھا تو اس نے اپنے ہاتھ کا ٹوکرا زور سے زمین پر پھینکا۔ اسے یقین تھا کہ ماں بازار پہنچے ہی دوسری عورتوں سے باتیں کرنے میں ایسی مہمک ہوگی کہ اندر آہونے سے پہلے اسے واپس آنے کا خیال تک نہیں آئے گا۔ رادھا نے سوچا میرا باپ اب تک کھڑکی کے باپ کر سی پر بیٹھا اٹکھ رہا ہوگا۔ اس عالم میں بھلا وہ مستعدی سے باڑے کی طرف کیا توجہ دے سکتا ہے؟ اور اگر وہاں بیٹھا لگا تار دیکھتا بھی رہے تو اسے باڑے کے دروازے کے سوا اور کیا نظر آ سکتا ہے؟

رادھا نے چارے کا گھٹا بنایا اور اسے ایک لمبی رسی کے سرے پر باندھ دیا۔ پھر کسی خیال سے اس کی مضیاں سمجھ گئی اور بدن میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ اس کی لمبی کی سی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ وہ چارے کا گھٹا گھٹ کر سیڑھی کی طرف لے گئی اور پھر نیم چھتی پر جا پہنچی۔ نیم چھتی کا فرش گھاس کے ایک ڈھیر کے سوا بالکل خالی تھا۔ یہاں بہت کم روشنی تھی، رادھا چارے کے گھٹے پر

بٹھ گئی۔ اس نے پسینا خشک ہونے کا انتظار کیا۔ گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ایسی وقت گھاس کے ڈھیر میں حرکت پیدا ہوئی اور سربراہٹ کی آواز کے ساتھ ہی ایک چہرہ وہاں سے ابھرا۔

چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا مصوم چہرہ، پھر اس کی گردن نمودار ہوئی پھر سینہ باہر نکلا۔ رادھا کی نظریں اس کے چوڑے شانوں اور فراخ سینے پر جم گئیں۔ نوجوان نے خوف زدہ آواز میں پوچھا۔

”کیا ابھی تک وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہیں؟“

”ہاں! موہن! وہ انتہائی جوش و خروش سے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں، انہوں نے تمہاری تلاش میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ چچا چچا جان مارا، میرے باپ بہت مشتعل ہیں۔“

ان کا کہنا ہے کہ وہ تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔“

”ماں! میں نے خود انہیں کل رات یہ کہتے سنا تھا لیکن..... لیکن..... رادھا! میں بے تصور ہوں..... بالکل بے گناہ ہوں، میں بھگوان کی سونگد کھانے کو تیار ہوں..... کہ میں نے..... میں نے کماری کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“ وہ پریشانی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ”تم تو جانتی ہی ہو رادھا! کہ کماری پھری محبوبہ تھی، میں اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ بھلا کوئی شخص اپنی محبوبہ کو مار سکتا ہے؟ اتنی پیاری اور فادار محبوبہ کو.....“

آہ..... کتنی خوب صورت اور نیک تھی کماری..... ٹھنڈے دل سے سوچو، میں اسے کیسے ہلاک کر سکتا ہوں؟ اسے تو کوئی ایسا آدمی ہلاک کر سکتا تھا جو اس سے شدید متنفر ہو۔“

”لیکن تمہاری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا، سب تمہی کو مجرم سمجھ رہے ہیں۔ پولیس کو بھی کامل یقین ہے کہ کماری کو تمہی نے مارا ہے۔ اس کی لاش کے پاس تمہاری ٹوپی بھی ملی تھی اور تمہارا چاقو بھی دستیاب ہوا تھا۔ یہ چیزیں تمہارے جرم کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔“

”لیکن..... لیکن میں نے اسے نہیں ہلاک کیا۔ وہ تو محض مذاق میں کماری نے میرا چاقو پھینک لیا تھا اور میں نے اپنی ٹوپی اسے پہنا دی تھی، میری ٹوپی اس پر کسی قدر جرج رہی تھی، آہ.....“

”لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی موہن!“ رادھا نے تلخ لہجے میں کہا اور اٹھ کر موہن کے پاس گھاس پر جا بیٹھی۔ ”اب وہ بہت دور جا چکا ہے، تم کب تک اسے یاد کرتے رہو گے؟ اب تو صرف میں تمہارے پاس رہ گئی ہوں، اب تمہیں مجھ سے محبت کرنی چاہیے۔ میری طرف دیکھو، میری آنکھوں میں جھانکو، چراغ لے کر ڈھونڈو گے تو

مجھ جیسی محبت کرنے والی لڑکی تمہیں کہیں نہیں ملے گی۔“ اس نے چہرہ ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیا اور کھٹکے لگے۔ چند لمحوں بعد اس نے حسرت سے موہن کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لو موہن! جس طرح تم کماری کو.....“

موہن نے جھکا ہوا چہرہ اٹھا یا اور غور سے رادھا کی طرف دیکھا۔ وہ اب سوالیہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی کوئی اچھن دور ہوئی ہو اور جیسے اس نے کوئی اہم مسئلہ حل کر لیا ہو۔

”رادھا! ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں..... کہو۔“

”کیا تمہی نے کماری کو ہلاک کیا ہے؟ میرا خیال ہے، جیسا ایسا کر سکتی تھیں۔“ موہن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”بالکل یہی بات ہے، تمہیں کماری سے سخت نفرت تھی..... تم اس کی خوب صورتی کی وجہ سے تم اس سے حسد کرتی تھیں۔ تم نے ہی اسے قتل کر کے قتل کا الزام مجھ پر لگا دیا ہے اور اب سب لوگ مجھے مجرم سمجھ رہے ہیں۔“

رادھا چند لمحوں تک تاثرات سے عاری چہرے کے ساتھ موہن کو گھورتی رہی۔ پھر بولی۔

”موہن! تم جتنا نہ کرو، تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔“ رادھا نے اس کے اوپر قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ”جب تک میں اپنی زبان نہ کھولوں، کوئی یہ نہیں جان سکتا کہ تم یہاں چھپے ہوئے ہو۔“

”اس طرح تم انہیں اور زیادہ یقین دلارہی ہو کہ میں ہی مجرم ہوں۔“ موہن نے کہا۔ ”تم نے کل مجھے دودھ پلایا اور اپنے باپ کو شاید کوئی اور کہانی سنا دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوق لے کر یہاں آ پہنچا تھا۔ آج تمہاری ماں بھی چھرا لیے میری تلاش میں گھوم رہی ہے۔ تم قتل کی عیار ہو۔“

”آج رات میں تمہارے لیے سیب کا مر با بھی لاؤں گی اور کھانے کو جو بھی اچھی چیزیں میں لے آؤں گی، تمہیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔“

موہن بہت دیر تک خاموش رہا پھر ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ”کاش..... میں کسی طرح یہاں سے فرار ہو کر اتنی دور چلا جاؤں کہ مجھے جان کا خطرہ نہ رہے۔ رادھا! تم کب مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دو گی؟“

رادھا نے موہن کی کانٹک میں ہندھی ہوئی زنجیر..... کی طرف غور سے دیکھا۔ ”جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔“ اس نے چھتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ کر کہا۔ ”لیکن ابھی کئی دن تک نہیں، بناؤ تم مجھے چاہتے ہو نا.....؟؟؟“

سسپنس ڈائجسٹ 79 مارج 2012

سسپنس ڈائجسٹ 78 مارج 2012

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

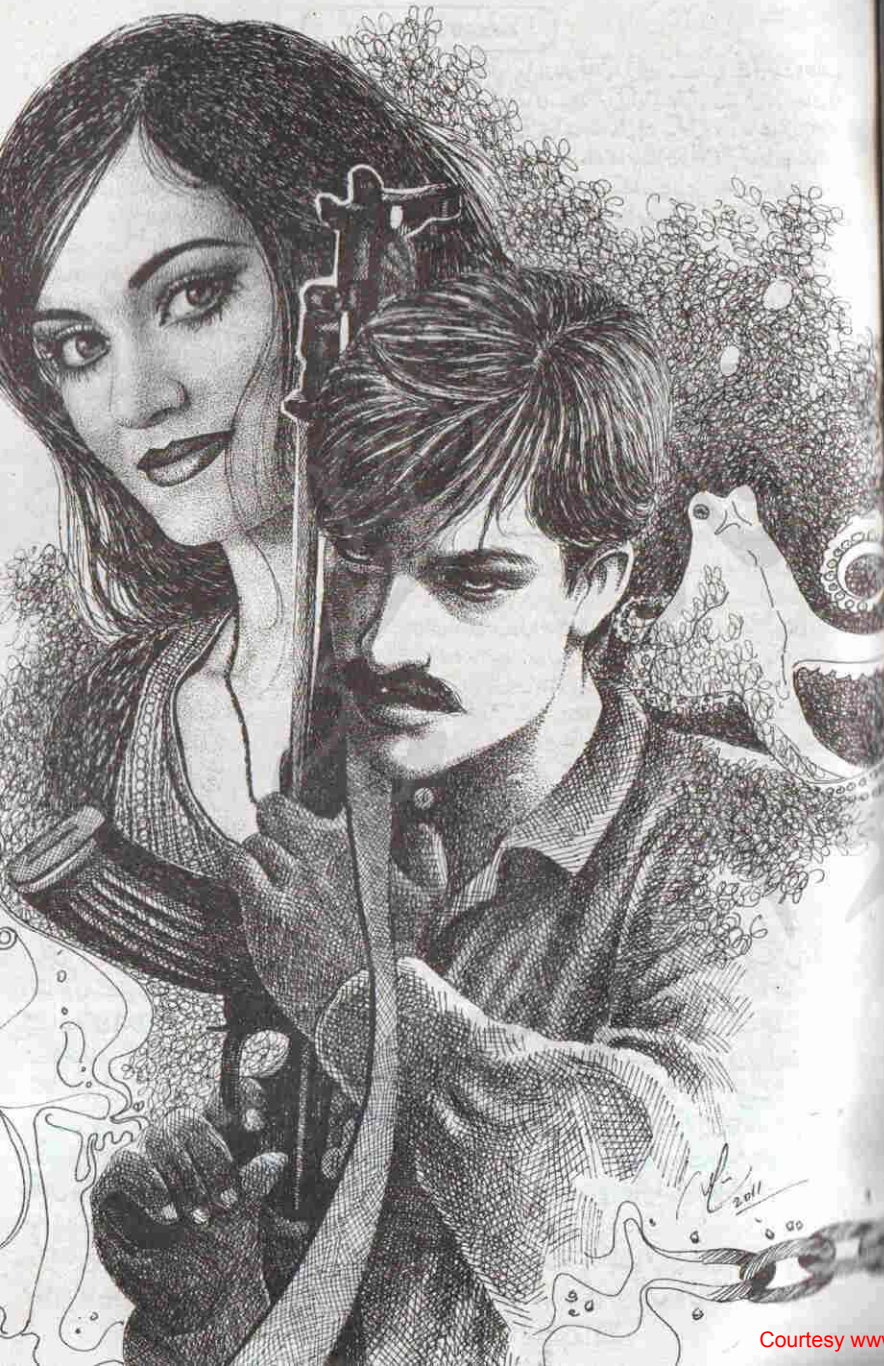
کشکول

انوار سدیقی

آٹھویں قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برقعے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں پوش رہا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پہوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جراتم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ ساز یوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

اسرار اور حیر کے پردے میں لپٹا ایک مقرر طویل سلسلہ



اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہسپتال سے ڈسچارج کیے جانے کے بعد اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ وہ بگ باس کے ہاتھ سچاپنے کے بعد زندگی کی کیشیوں سے تھکسروم وچکا ہے جبکہ وہ قسمت کے ہاتھوں بد نصیبی کا شکار ہوا تھا۔ بگ باس کے حکم کے عین مطابق وہ میڈم کو مرپ کرنے میں نہ صرف پوری طرح کامیاب ہو گیا تھا بلکہ انتہائی دور اندیشی سے پلاننگ کرنے کے بعد میڈم کو خواب آور شراب پلانے میں بھی سخر و ہو گیا تھا۔

اس کے بعد..... بگ باس نے اپنی پوزیشن بچانے کی خاطر جو پلاننگ کی تھی وہ افضل خان کے حق میں تباہی کا

”ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہو لیکن.....“

”میرا خیال ہے کہ تم نے ناؤ دانستگی میں ایک اساقم

”ایسا نہیں ہوگا۔“ شبنم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”مگر اس وقت کہاں جاؤ گے؟“

وقت میری جیب میں کوئی معمولی زہر خریدنے کے لیے بھی

”تمہیں کتنے روپے درکار ہیں؟“ شبیم نے اٹھ کر اس

Courtesy

”آئی ایم سوری باس۔ لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔
 ک..... مجھے..... میں..... معافی کا خواستگار ہوں۔“

گیارہواں دن نہیں ہوگا..... آئی ایم تھینک فل پاس۔“

سأس لیا جیسے پستول سے لگی ہوئی کوئی کوئی اس کے کان کے قریب سے سننا تھی ہوئی گزر گئی ہو۔

سوال کیا۔

میرے اپارٹمنٹ میں موجود ہو۔“ سقیم نے دوبارہ اطمینان کا طعنے مارا، ”اس کے چاروں طرف تمہیں دیکھو۔“

”اس کے بعد.....؟“

موت کے سرد ہاتھ ایک بار پھر اصل خان کو اپنا حلقہ

اپنی خاطر وہ شہنشاہ کو بھی کسی دشواری میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا تھا،

”میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن ہو سکتا ہے کہ دس روز

2014

سہ ہسپتالس ڈائجسٹ

8 مئی 2012ء

اللہ چست کیے جاتے، حقارت آمیز تشبیہات سے نوازا

سجیدگی طاری ہوئی۔ اپنے اغوا اور لیاقت حسین کی بروقت

مذاہقت کا تصور کر کے وہ بھی پھر بھری لیے بغیر نہ رہ گی۔ کچھ دیر تو قوت کے بعد اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔
”میرا مشورہ ہے کہ سب سے پہلے آپ اس اہم ترین دستاویز کی دو تین فوٹو کاپی کر انہیں پھر اسے اپنے یا میرے لاکر میں محفوظ کر دیں۔“

”مرنے والی نے ایک بڑے اور خطرناک مگر مجھے کے بارے میں جو تفصیل درج کی ہے اس کے تین چار کردار آج بھی زندہ ہیں جو قانون کا تحفظ ملنے کے بعد اگر اپنی زبان کھول دیں تو سرنے والی کی آخری خواہش بھی پوری ہو سکتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ قدرت نے آپ کو ایک اہم فرض سونپ دیا ہے جس کی تکمیل آپ کے لیے ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔“ الماس سنجیدگی سے بولی۔ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کی ایک نقل نقل عظیم احمد صاحب کو ضرور پہنچا دیں۔“
”تمہاری تجویز معقول ہے لیکن وہ تو ریٹائر ہو چکے ہیں۔“

”تاہم سرنے کے بعد بھی سوالا لکھ کا ہوتا ہے۔“ الماس نے برجستہ جواب دیا۔ ”عظیم احمد صاحب حافظ قرآن بھی ہیں جنہوں نے بھی اس ڈرنی ڈاک سے سمجھوتا نہیں کیا جو اپنے تعلقات اور دولت کے ذمے میں بے قابو ہو چکا ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی عظیم احمد صاحب کو مرکز اور صوبے کے اکثر بڑے عہدیدار اب بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایک آسان طریقہ اور بھی ہے اس باتیں کے تکرار کو خاک میں ملانے کا۔“ آخری جملہ الماس نے بڑے جذباتی انداز میں ادا کیا۔

”وہ کیا۔۔۔؟“
”مجھے صرف آپ کے اشارے اور اجازت کی ضرورت ہوگی۔“ الماس نے مٹھیاں سمجھ کر کہا۔ ”میں اس درندے کو اس کے دفتر میں کھس کر موت کے گھاٹ اتار دوں گی۔ پھر جو ہو۔۔۔ سو ہو۔“

”ٹیک اسٹ ایزی۔۔۔“ سراج نے الماس کے تیور دیکھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں تمہیں یہ نیک کام کرنے سے منع نہیں کر سکتا لیکن اس کے بعد ہماری نئی بنائی عزت اور شہرت کو جو نقصان پہنچے گا وہ میرے لیے بھی ناقابل برداشت ہوگا۔ تمہارے بعد میں بھی اپنی جان پر پھیل جانے سے گریز نہیں کروں گا۔“

کچھ دیر اسی قسم کی جذباتی باتیں ہوتی رہیں، پھر سراج نے الماس سے عہد کیا وہ مرحومہ صاحبہ کی آخری خواہش کو پورا کرنے کی خاطر کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرے گا۔

”مجھے آپ پر اعتماد ہے لیکن نیک کام کی تکمیل میں۔۔۔“
الماس اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی، سراج کے خاص موبائل کی مخصوص آواز ابھری تو اس نے جلدی سے اسے آن کیا۔ سنجیدگی سے کہا۔ ”ہیلو۔۔۔ سراج دس اینڈ۔“

”میں بول رہی ہوں۔۔۔“ دوسری جانب سے میڈم کی آواز ابھری تو سراج نے الماس پر نظر ڈالتے ہوئے شوشی سے کہا۔

”میں اس وقت آپ سے کھل کر بات نہیں کر سکوں گا۔ اس لیے کہ میرا ویک پوائنٹ میرے سامنے موجود ہے۔“

”گلد۔۔۔“ میڈم نے جواب دیا۔ ”آج میں الماس سے بھی ضرورت بات کروں گی لیکن اس سے پہلے آپ کو اہم اطلاع دینی ضروری ہے۔“

”وہ کیا۔۔۔؟“
”مگ باسٹرڈ کے اشارے پر افضل خان کو اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس وقت افضل خان ایسی معاشی سمیڑی کا شکار ہے کہ اس کے پاس خود کشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا لیکن اب اسے غنیمت اپنے اپارٹمنٹ میں لے لی ہے۔ یقیناً اس میں بھی بگ باسٹرڈ کی کوئی خطرناک چال ہوگی ورنہ شبنم افضل خان کو پناہ دینے کی غلطی بھی نہ کرتی۔“

”آپ کس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں؟“ سراج ایک سخت سنجیدہ ہو گیا۔ الماس فریب کھڑی اسے دھتکتی رہی۔ ”خطرے کے کھیل میں کھوڑے کی چالیں وزیر سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ اکثر شاطر کھلاڑی کھوڑا بچانے کی خاطر وزیر کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اس وقت گھوڑا چاروں طرف سے مایوس ہو چکا ہے۔ اس کے پٹے سے پیشتر بگ باسٹرڈ اسے اپنے کسی بھی دشمن کے خلاف بہ آسانی استعمال کر سکتا ہے۔“

”آئی سی۔۔۔“ سراج نے ہونٹ چباتے ہوئے پر خیال انداز میں کہا۔ ”میں آپ کی اس اطلاع کو فراموش نہیں کروں گا۔“
”ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ شبنم پر کوئی آج نہ آنے پائے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“
”مجھے آپ سے کچھ شکوے اور شکایتیں بھی لاحق ہوئی ہیں۔“ میڈم نے سنجیدگی سے کہا۔

”کسی دشمن نے کان بھرے ہوں گے۔“ سراج نے بے پروائی سے جواب دیا۔
”فی الحال آپ الماس کو موبائل دے دیں، باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔“

”جو حکم آپ کا۔۔۔“ سراج نے سعادت مندی سے کہا پھر ہونٹوں کی جھنجھ سے میڈم روٹی کا نام لینے کے بعد موبائل الماس کے حوالے کیا اور خود لمبے لمبے قدم اٹھاتا اپنی اسٹڈی میں چلا گیا۔ الماس کے مشورے پر وہ صاحبہ بیگم کی اس آخری تحریر کو اپنے کمپیوٹر کے ٹاپ سکرین فوٹو میں مخصوص پاس ورڈ کے ساتھ محفوظ کر دینا چاہتا تھا۔

الماس ری تعارف کے بعد میڈم روٹی سے بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگی۔



لودھی کو معمولی زخم آئے تھے لیکن پھر بھی اس نے اندرونی تکلیف کا بہانہ کر کے اسپتال میں ایک دو دن مزید قیام کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، صبح حامد کی وجہ سے اسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے اسے یہ خوشی اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس قیام کا تعلق لودھی کی کسی تکلیف سے نہیں تھا۔ اصل وجہ نرس ڈور تھی کی وہ حسین پیشہ دارانہ مسکراہٹ بھی جو اکثر مریضوں کو پسند تھی، لودھی سے چند شہر کچھ متوسط طبقے کے پیٹ بھرے افراد بھی غلط فہمی کا شکار ہو چکے تھے لیکن انہیں بھی مایوسی ہوئی۔ ڈور تھی نرس ہونے کے باوجود اچھے، بلند کردار اور اخلاق کی مالک تھی۔ حسب معمول وہ اس روز بھی دوائینے کی غرض سے لودھی کے قریب آئی تو اس کے ہونٹوں پر وہی دل آویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو مریضوں کو وقتی سکون دیتی تھی۔ ویسے بھی وہ حسین نقوش اور گلداز جسم کی مالک تھی۔ ”نرس۔۔۔“ لودھی نے اس کی آنکھوں میں دورنگ جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“
”ڈور تھی۔۔۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کل بھی میرا نام پوچھ چکے تھے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ لودھی نے شوشی سے جواب دیا۔ ”لیکن سبق نئی بار دہرایا جائے تو ابھی طرح یاد ہو جاتا ہے۔“
”اوہ۔۔۔ گویا آپ کو بعد میں بھول جانے کی عادت ہے؟“ ڈور تھی کے لیے میں بڑی الطیف طرز تھا۔ ”اگر آپ کہیں لوگھ کر دے دوں تاکہ آپ کو یاد ہے۔“

”لکھنے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔“ لودھی نے اعلانی سے ایک قدم بڑھانے کی کوشش کی۔ ”جو بات یا صورت دل پر نقش ہو جائے وہ زیادہ دیر پا ثابت ہوتی

”ہے۔۔۔“
”لوٹی۔ سی۔۔۔“ ڈور تھی نے مسکرا کر اسے دوبارہ نچل کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ شاید ایک پائری ڈیٹ پر دھیان دینے کے عادی ہیں؟“

”آپ کی باتیں بھی آپ کی طرح حسین اور دلکش ہیں۔“ لودھی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”یو آر لی بیوٹی فُل اینڈ چارمنگ!“

”پلیز مسٹر لودھی۔“ وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے سنجیدہ ہو گئی۔ ”دوا لیجیے۔“ مجھے آپ کے علاوہ جزل وارڈ میں دوسرے مریضوں کو بھی اینڈ کرنا ہے۔“

”میں یہاں سے جانے کے بعد بھی آپ کو یاد رکھوں گا۔“ لودھی نے رومانٹک لہجہ اختیار کیا۔

”دوا۔۔۔ اور علاج ضروری ہے۔“ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا گلاس اور گولیاں پھر لودھی کی طرف بڑھا کیں، پہلے کے مقابلے میں وہ کچھ اور سنجیدہ ہوئی تھی۔

”آپ شاید میری بات کا برامان نہیں؟“
”پلیز مسٹر لودھی۔۔۔“ وہ تلخ انداز میں بولی۔ ”میں اپنے فرائض اور آپ کے آفیشل عہدے سے بخوبی واقف ہوں لیکن انسان اپنی کمٹ کر اس نہ کرے تو سب کے لیے مناسب ہوتا ہے۔“

پولیس کے ٹکے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے کے علاوہ لودھی کو کچھ حامد کا منظور نظر ہونے کا گھنڈ بھی پہلے ہی وہ کئی موقعوں پر اپنی مراعات کے سبب میز می اکیوں سے بھی نکال چکا تھا۔ نرسوں کے بارے میں اس کی ذاتی رائے بھی اس کے مزاج کے عین مطابق کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔

اس نے ایک سخت سنجیدگی اختیار کر لی، جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم ایک بات بھول رہی ہو مس ڈور تھی۔۔۔ پولیس والوں سے عداوت بھی اکثر بڑی مہنگی ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے وسیع اختیارات بڑے بڑے طرے خاںوں کو بھی۔۔۔“

لودھی اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ اس کی نظر دروازے کی جانب اٹھی تو وہ ایک دم سنبھل گیا۔ خلاف توقع اس نے اورنگ زیب کی آمد نے اسے ڈسٹر کر دیا تھا۔ لودھی کی نظروں کے تعاقب میں ڈور تھی نے بھی پلٹ کر دروازے کی سمت دیکھا تو اس کے اندر اٹھتا ہوا طوفان اور پھر گیا۔ اس نے خاموش انداز میں اپنی نفرت اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے دواؤں کی گولیاں ڈسٹ بن میں پھینکیں پھر۔۔۔

جھلاتی ہوئی اورنگ زیب کے قریب سے گزر کر باہر چلی گئی۔ اورنگ زیب نے پوچش کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ سنجیدگی سے قدم اٹھاتے ہوئے لودھی کے بستر کے

قریب آپ آکر بڑے پرکار انداز میں ایڑی چیر پر بیٹھ گیا۔
 ”آپ نے کیوں تکلیف کی سر.....؟“ لودھی نے
 لیے لیے ہی بڑے خوشامد انداز میں کہا۔ ”میں ایک دو
 روز میں دس چار بج ہو جاؤں گا۔“
 ”اس کا مشورہ ڈاکٹروں نے دیا ہے یا یہ آپ کا ذاتی
 فیصلہ ہے؟“ ایس بی نے چستے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔
 ”ڈاکٹروں کا.....“ لودھی نے دل ہی دل میں تملاکر
 جبراً اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔
 ”اس وقت آپ کبسا محسوس کر رہے ہیں؟“
 ”پہلے سے بہت بہتر ہوں سر..... کچھ اندرونی چوٹیں
 باقی رہ گئی ہیں۔“
 ”کیا میں اس وقت آپ سے اہم موضوع پر کچھ گفتگو
 کر سکتا ہوں؟“ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر بنجیدگی
 اختیار کر لی۔
 ”غیریت تو ہے سر.....؟“ لودھی اس اچانک سوال
 پر گھبرا گیا۔
 ”فی الحال ابھی کسی کو آفیشلی انکوائری آفیسر مقرر نہیں کیا
 گیا لیکن..... بحیثیت علاقہ دار ایس بی، میں ذاتی طور پر تھانے پر
 ہونے والے تباہ کن حملے اور انسپکٹر دائش کی موت کے بارے
 میں کچھ ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“
 جواب میں لودھی کسمسا کر رہ گیا۔
 ”سمنر لودھی..... کسی انسپکٹر کی آن ڈیوٹی موت اور
 جرائم پیشہ عناصر کا اس طرح دھڑلے سے کسی تھانے پر حملہ
 کرنا یقیناً ہمارے لیے باعث شرم ہے۔ کیا اس بات سے
 اتفاق کریں گے؟“
 ”جی ہاں سر.....“
 ”کیا آپ کی ایسے شخص یا گروپ کا نام نہیں جانتے
 ہیں جو کھلے عام اُنی جرائم کا مظاہرہ کر گیا اور ابھی تک صرف
 مشتبه افراد کے علاوہ کسی قابل ذکر مجرم کی گرفتاری عمل میں
 نہیں آسکی۔“ اورنگ زیب کے لب و لہجے میں نفی تھی۔
 ”علاقے کا ڈی ایس بی ہونے کی حیثیت میں آپ کے پاس
 ایسے افراد کی کوئی لسٹ ضرور ہوگی جو.....“
 ”فی الحال میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا سر.....“
 لودھی نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”ویسے یہ ظاہر نہیں تاثر مٹا ہے
 کہ اس واردات میں بدنام نوٹو گرافر فرنانڈس کے واقف کار
 شامل ہوں گے۔ ایسے موقع پر شری چندنا سر بھی لوٹ مار اور
 جلاوطنی میں شریک ہو جاتے ہیں اس لیے.....“
 ”ون منٹ.....“ اورنگ زیب نے اس کی بات کاٹ

دی۔ ”یہی سب سے اہم بات ہے کہ جب فرنانڈس پولیس
 لاک اپ میں تھا تو وہ وہاں سے نکل کر باہر کس طرح گیا.....؟“
 ”میں سمجھا نہیں سر.....؟“ لودھی نے بڑی دیدہ دلیری
 سے جھوٹ بولا۔ ”میری معلومات کے مطابق تو حملہ آوروں نے
 اسے لاک اپ میں ہی جلا کر رکھ دیا تھا۔“
 ”وہ بڑا.....“ اورنگ زیب نے تیز بدل کر لودھی کو
 گھورا۔ ”گویا آپ کے خیال کے مطابق وہ لوگ فرنانڈس کے
 دوست تھے اور تھانے کی تباہی کے وقت فرنانڈس کو پولیس
 حویل سے نکال کر لے جانے کا اصل مقصد بھول گئے تھے؟“
 لودھی بری طرح شپٹا گیا۔ کوئی جواب بن نہ پڑا تو
 ساٹ لہجے میں کہا۔
 ”میں حادثے کی اطلاع ملتے ہی جانے دو قہر پر گیا
 تھا لیکن زخمی ہونے کے سبب مجھے اسپتال پہنچا دیا گیا تھا
 اس لیے.....“
 ”شاید آپ کو اس بات کا علم بھی نہ ہوگا کہ تھانے پر
 حملہ ہونے سے پیشتر مرحوم انسپکٹر دائش نے کسی مخبر کی اطلاع
 ملنے پر فرنانڈس کو کسی اور اسپاٹ سے گرفتار کیا تھا جہاں وہ
 کچھ بلیک میلنگ فوٹو گراف بنانے کے لیے جیل سے نکال کر
 لے جایا گیا تھا۔ فرنانڈس کی رنگے ہاتھوں گرفتاری کا آؤٹ
 ڈور مشیر نامہ اور قانونی دستاویز بھی تیار کیے گئے تھے؟“
 ”جی..... ہم..... میں.....“ لودھی، اورنگ زیب کی
 معلومات سن کر بھگانے لگا پھر بڑی مصحوبیت سے پوچھا۔
 ”سر..... کیا ایسی کوئی دستاویز ملی ہے جو.....“
 ”سوری.....“ اورنگ زیب نے تیزی سے جواب
 دیا۔ اس کے لہجے میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ ”فی
 الحال میں آپ کی اس مظانہ مصحوبیت کے اظہار پر خاموشی
 کو ہی ترجیح دوں گا۔“
 ”سر.....“ لودھی نے اپنی دلی بھلاہٹ پر قابو پا
 ہوئے پھر جوتوں سمیت ایس بی کی آنکھوں میں گھسنے کی
 کوشش کی۔ ”اگر آپ کے پاس کوئی ایسی اطلاع ہے تو میں
 یہاں سے فارغ ہوتے ہی شری چندنا کو کیفر کردار تک
 پہنچانے میں دیر نہیں کروں گا۔“
 ”گڈ.....“ ایس بی نے زہر خند سے جواب دیا۔
 ”لیکن ایسے سنگین معاملات کی تفتیش کے لیے ضروری نفری
 کے بجائے اگر سرغریہ پد جال ڈالا جائے تو امن وامان کی
 صورت زیادہ دیر پا ہوتی ہے۔“
 ”آپ بجار مار رہے ہیں سر لیکن سرغریہ.....“
 ”میں نے آپ کے سلسلے میں پوری معلومات حاصل

کرنے کے بعد ہی فوری طور پر آپ سے ملنا ضروری سمجھا
 تھا۔“ ایس بی اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ
 میری اطلاع کے مطابق بہت ندر، دور اندیش اور بولڈ آفیسر
 ہیں۔ کسی نے اس بات کی تائید بھی کی ہے کہ آپ کی معلومات
 کا ذخیرہ دوسرے ہم پل افسران سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ
 اٹھتے ہوئے لودھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے
 دہنگ لہجے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے آئندہ
 تعاون کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔
 آپ کی پرنسپل انفارمیشن کے لیے ایک اہم بات اور بتا
 دوں۔ میں اپنے فرض کی ادائیگی کے وقت سوائے اللہ کے
 کسی اور بات سے نہیں ڈرتا.....“
 اورنگ زیب اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد تیزی سے
 پٹا اور لیے لیے قدم اٹھاتا کرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے
 لب و لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے لودھی کو بگ
 باس کے حاقی ہونے کے باوجود بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر
 دیا تھا۔ فرنانڈس کے سلسلے میں ایس بی کی معلومات بھی اس
 کے لیے کچھ کم پریشان کن نہیں تھیں۔ ”وہ معلومات ایس بی کو
 کہاں سے ملیں؟“ یہ سوال بڑی دیر تک لودھی کے ذہن میں
 کسی بگولے کے مانند گردش کرتا رہا۔
 فتح حامد اس وقت اپنے خاص بیڈروم میں ایک غیر ملکی
 اور بے باک، کمن حسین کے گداڑ جسم سے گھاسی اور ہی دنیا
 کی حسین وادیوں میں ہچکولے کھا رہا تھا، جب اس کے
 موبائل کی مدد مصروفی گنگنائی، فتح حامد کو ایسا ہی لگا جیسے خوش
 واقف نوالے کے سچ کوئی ننگری آگئی ہو۔
 ”واٹ ٹان سنس۔“ حسین نے تملاکر اپنی خشکی کا
 اظہار کیا۔ ”ہواؤ ڈسٹر بنک؟“
 ”ڈونٹ وری سویٹ ہارٹ.....“ اس اڑ بی
 ارجنٹ۔ فتح حامد نے پہلو بدل کر حسین کو اپنے ہاتھوں کے
 حصار میں کھینچ لیا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھا لیا۔
 ”کون ہے؟“ اس کے لہجے میں جلاہٹ تھی۔
 ”سوری سر..... میں بلیک ٹائیگر بول رہا ہوں، آپ کو
 ایک اہم اطلاع دی جی وی ورنہ.....“
 ”بکو..... کیا بات ہے؟“
 پھر دوسری طرف سے اورنگ زیب اور ڈی ایس بی
 لودھی کے بارے میں جو تفصیل بیان کی گئی اسے سن کر فتح
 حامد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔
 ”گلمت کرو..... میں اس کو بھی جلدی ہی ڈیپوز

کردوں گا۔“ اس نے موبائل کو یاور ڈ آف کرنے کے بعد
 حسین کو بڑی وحشت کے عالم میں بھینچوڑنا شروع کر دیا۔
 ”کیا بات ہے ڈارلنگ؟“ یہ..... تم ایک دم اتنا
 وحشی کیوں ہو گیا.....؟“ حسین نے احتجاج کیا۔
 ”شٹ اپ.....“ اس نے غصے میں جواب دیا پھر
 اپنی ہوس کی تش سرد کرنے کے بعد تیزی سے اٹھا اور دبیز
 قاتلین پر پڑا اپنا گاؤن پہنتے ہوئے خواب گاہ سے باہر نکل
 گیا۔
 ”سیلفش..... سن آف اے فچ۔“ غیر ملکی حسین نے فتح
 حامد نے شاید فتح منجھدار میں چھوڑ دیا تھا، تملاکر اٹھی
 پھر..... بڑی دیر تک وہ کسی پھری ہوئی زخمی شیرنی کی طرح
 فتح حامد کی شان میں اپنی نفرت کے اظہار کے طور پر فرش اور
 مغلطہ گالیاں بکتی رہی۔ وہ اپنی تہذیب کا مکمل مظاہرہ کرنے
 میں حق بجانب بھی تھی۔
 لیاقت حسین لباس تبدیل کر کے ناشی کی میز پر آیا تو
 فرحین پہلے سے اس کی منتظر تھی، خلاف توقع وہ اس وقت
 بہت خوش نظر آ رہی تھی، چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی تھا۔
 لیاقت حسین نے اسے بڑی توجہ سے دیکھا پھر دوسری کرسی
 پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
 ”کیا بات ہے جان لیاقت، آج تو صبح کچھ بدلی
 بدلی نظر آ رہی ہے؟“ اس کا اشارہ ہلکے میک اپ کی طرف تھا۔
 ”آج صاحب کے جانے کے بعد میں اور بیگم صاحبہ
 شاپنگ پر جا گئیں گے۔“ فرحین نے اسے چھینٹنے کی خاطر
 پوچھا۔ ”جی ہاں، ایسی لگ رہی ہوں؟“
 ”دونہری کی میم نظر آ رہی ہے۔“
 ”جل گیا ناں.....“ فرحین روٹھ گئی۔
 ”مجھے تجھ کو منانے کا بہنر بھی آتا ہے لیکن.....“
 ”لیکن کیا.....“ فرحین اس کے مکمل جملے پر تملاکر
 کر رہ گئی۔ ”چپ کیوں ہو گیا؟ کہہ دے کہ بندر یا لگ
 رہی ہوں۔“
 ”وہ بھی دونہری۔“ لیاقت حسین نے دل کی بات کہہ
 ڈالی۔ ”دیکھ فرحین..... خوبصورتی وہی بھلی لگتی ہے جو قدرت
 نے عطا کی ہو، تھو پاتھا بی کر کے اس میں ردوبدل کرنا مجھے
 تجھے زیب بھی نہیں دیتا۔“
 ”اور بیگم صاحبہ جو.....“
 ”میں نے اپنی اور تمہاری بات کی تھی۔ بیگم صاحبہ کی
 بات اور ہے۔ ان کے لیے اس لیے جائز ہے کہ اول تو

صاحب کے پاس دولت کی کی نہیں ہے۔ صاحب نے انہیں منع بھی نہیں کیا۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں شرکت کرنے کے علاوہ خود ہی صاحب بھی ایک آپ نہیں کرتیں اور اس چہرے میں زیادہ بھلی نظر آتی ہیں جو ادھر والے نے بنا دیا ہے۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں جانے کے لیے ایک ایک انفرادی فیشن بن گیا ہے۔

”کیا تجھے میرا میک اپ ٹیک اپ کرنا بھلا نہیں لگا؟“ فرحین نے پیٹ لہجے میں شوہر سے سوال کیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے صاف گوئی سے کام لیا، ”ادرتو مجھے سرفی پوڈر کے زیادہ خوبصورت اور تروتازہ لگتی ہے۔ گلابی گلابی سی، مہکتے پھول کی طرح۔۔۔۔۔“

فرحین نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے ناشتا کرنے لگی۔ لیاقت حسین کو ڈیوٹی پر جانے کی دیر ہو رہی تھی اس لیے اس نے بھی جلدی جلدی ناشتا کیا پھر حسب دستور اس نے کمرے سے باہر جانے سے پہلے فرحین کے گداز ہونٹوں سے اپنے دن بھر کی پیاس کا کچھ حصہ ضرور حاصل کر لیا تھا۔ فرحین نے کسی ہنگامہ پر کامظاہرہ نہیں کیا۔ تاہم میک اپ پر تبصرے والی بات اس کے دل کو اچھی نہیں لگتی تھی۔

لیاقت حسین ٹھیک وقت پر سیٹھ عثمان کے پورٹیکو میں پہنچ کر ان کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ روزمرہ کے معمول کے مطابق سیٹھ عثمان ٹھیک نو بجے راحیلہ بیگم کے ساتھ باہر آئے۔ لیاقت حسین نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سیٹھ عثمان کے پیچھے کے بعد وہ تیزی سے اپنی سیٹ کی طرف جانے کو لپکا تو۔۔۔۔۔ راحیلہ بیگم نے اسے آواز دے کر کہا۔

”لیاقت، آج میں اور فرحین شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں۔ تمہیں کسی چڑکی ضرورت ہو تو بتا دو۔“

”شکریہ بیگم صاحب۔۔۔۔۔ خدا اور آپ کی عنایت سے سب کچھ ہے ہمارے پاس۔“

گاڑی ہینکے سے نکل کر کھلی شاہراہ پر آئی تو سیٹھ عثمان نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”لیاقت حسین۔۔۔۔۔ اس روز رات کو سراج تمہیں اپنے ہینکے پر کیوں لے گئے تھے۔۔۔۔۔ کیا کوئی خاص کام روز پیش تھا؟“

”مجھے صرف اتنا یاد ہے صاحب کہ ڈپٹی صاحب مجھے رات گئے گھر سے لے گئے تھے پھر مجھے اپنے گھر سے واپس آ کر چھوڑ گئے۔“

”کام کیا تھا؟“

”میں نیند میں تھا، مجھے یاد نہیں ہے کہ۔۔۔۔۔“

”مجھے تمہاری بات کا سو فیصد یقین ہے۔“ سیٹھ عثمان

نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہارے کئی احسانات ہمارے اوپر بھی ہیں اور اب سراج پر بھی تم نے جو احسان کیا ہے وہ بھی قابلِ فخر ہے۔“

”کیسا احسان صاحب۔۔۔۔۔؟“ لیاقت حسین نے معصومیت سے کہا۔ ”مجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں۔ ڈپٹی صاحب نے آپ کو کیا بتایا ہے؟“

”اس رات الماس سے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“

”ڈپٹی صاحب کے ہینکے پر۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین الجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ”میں نے ان کے ڈرائنگ روم میں بیگم صاحب کو دیکھا تھا۔ وہ بھی کچھ پریشان نظر آ رہی تھیں۔“

”میں ایک شرط پر تمہیں بتا رہا ہوں لیکن تم اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرو گے، سراج یا فرحین سے بھی نہیں۔“ سیٹھ عثمان نے قدر سے توقف سے بات جاری رکھی۔ ”اس رات تم نے الماس کو ایک بڑی معصیت سے عین وقت پر بچا لیا تھا۔“

لیاقت حسین کی بے چینی اور بڑھتی۔۔۔۔۔ یہی بات سراج نے بھی کبھی نہیں لیکن اس وقت بھی اس کے ذہن میں دھندہ ہی طاری رہی تھی۔ وہ ایسے کسی سانچے کے بارے میں قطعی واقف نہیں تھا۔ ”صاحب۔۔۔۔۔ اس نے پوری ایمانداری سے

سیٹھ عثمان کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے ایسی کوئی۔۔۔۔۔“

”قسم مت کھاؤ۔ مجھے تمہاری بات کا یقین ہے کہ تم غلط بیانی نہیں کر رہے۔“

”صاحب۔۔۔۔۔ ایک درخواست کروں گا۔“ لیاقت حسین نے اداس انداز میں درخواست کی۔ ”آپ مجھے دماغی علاج کرنے والے کسی ماہر کو ضرور دکھا دیں۔ ہو سکتا ہے کہ شہر آنے کے بعد میری یادداشت۔۔۔۔۔“

”اس وہم کو اپنے دماغ میں بھول کر بھی جگہ نہ دینا۔“

سیٹھ عثمان نے بڑے خلوص و محبت سے کہا۔ ”تم ذہنی طور پر مکمل صحت مند ہو لیکن۔۔۔۔۔ ایک دو باتیں ہیں جو تم نے مجھے بھی کھل کر نہیں بتائیں۔“

”میں سمجھا نہیں صاحب؟“ سیٹھ عثمان کے جملے سے اس کے دل کو گھس لگی۔ ”میں نے آپ سے بھی کوئی بات۔۔۔۔۔“

”مجھے معلوم ہے کہ تم نے مغلطاً خاموشی اختیار کر لی ہوگی۔“ سیٹھ عثمان نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ ”میرا تجربہ

کہتا ہے کہ تم ایک ذہین اور بے حد خوددار انسان ہو۔ شاید اسی لیے تم نے مجھے اپنے والد کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

لیاقت حسین لا جواب ہو گیا پھر اس سے پیشتر کہ وہ کوئی مناسب جواب دیتا ایک سنگین بند ہونے کے سبب اس نے گاڑی روک دی، اسی لمحے دو آدمی گاڑی کے قریب آئے اور دروازے کھول کر بڑی سرعت سے عین پشتوں پر بیٹھ گئے۔

”کوئی حماقت کرنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ ہمارے خاموش پتھول تم دونوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیں گے۔“ سرد لہجے میں کہا گیا، اس کے ساتھ ہی لیاقت حسین کی گردن پر کسی پتھول کا دباؤ بھی ڈالا گیا۔ لیاقت حسین کو بڑی شدت سے اپنی حماقت کا احساس ہوا، فرحین کے میک اپ اور سیٹھ عثمان کی باتوں میں الجھ کر وہ دروازوں کو لاک کرنا بھول گیا تھا۔ اب یاد آیا تو دیر ہو چکی تھی لیکن اس نے دل میں نشان لپی تھی کہ آخری سانس تک کسی نہ کسی طرح وہ سیٹھ عثمان صاحب پر کوئی آج نہیں آنے دے گا۔

سنگین کھلا تو وہ گاڑی دوبارہ حرکت میں لانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا، فوری طور پر اس کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی۔ وہ انخواب رائے نادان کی خاطر سیٹھ عثمان کو ساتھ لے جانے کی کوشش کریں گے۔

”تم لوگوں کو ہم سے کیا دشمنی ہے؟“ سیٹھ عثمان نے ہمت کر کے ان افراد سے پوچھا جو عین پشتوں پر براجمان تھے۔

”خاموش بیٹھے رہو۔۔۔۔۔“ سرد اور سفاک لہجے میں جواب ملا۔ ”ہم تمہیں اس پر عمل کرتے رہو، اس میں تمہاری

شرکت ہے۔“

”کتنی رقم درکار ہے؟“

”تم کو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔“ دوسری آواز ابھری۔ ”ہم اٹھائی گیرے نہیں ہیں اور۔۔۔۔۔ فی الحال تم سے ہمیں کوئی سروکار بھی نہیں ہے۔ ہم صرف تمہارے

اس جیلے ڈرائیور کی کھوپڑی کا چپک اپ کرانے کے لیے ساتھ لے جائیں گے۔“

”میں گلے گلے تیار ہوں۔“ لیاقت نے دلیری سے جواب دیا۔ ”تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گا لیکن

صاحب پر۔۔۔۔۔“

”گاڑی اگلے راؤنڈ لباؤٹ سے بائیں ہاتھ پر موڑ

۔۔۔۔۔ عقب سے اس کی بات کاٹ کر ٹھکانے لہجے میں کہا گیا۔

لیاقت حسین نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں کسی گام کا انکار نہیں کیا۔ اسے قلم تھا کہ وہ رات ایک تفریحی

گام کی طرف جاتا تھا جہاں پیک آؤرز (Peak Hours) میں ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ حکم کی

مطابق وہ پتھول اس کے پاس موجود تھا جو سراج

نے دریافت کیا۔ سیٹھ عثمان جواب میں وہ لوکیشن بتانے

سے دریافت کیا۔ سیٹھ عثمان جواب میں وہ لوکیشن بتانے

نے دیا تھا۔ سیٹھ عثمان ساتھ نہ ہوتے تو وہ جان پر کھیل کر بھی اپنا پلٹنے کی کوشش ضرور کرتا۔ راؤنڈ لباؤٹ سے بائیں ہاتھ مڑھونے کے بعد کچھ آگے ایک سفید دین کھڑی تھی۔ لیاقت حسین کو اسی دین کے پیچھے گاڑی روکنے کا حکم ملا پھر ایک شخص اسے پتھول سے گور کرنا ہوا دین کے اندر تک لے گیا۔ سیٹھ عثمان نے دین کے نمبر نوٹ کرنے کی کوشش کی جس پر غیر علائقہ کا نمبر نظر آ رہا تھا۔ دوسرا شخص ان کے سر پر مسلط تھا، وہ درمیانے قد کا مالک تھا لیکن اس وقت اس کا چہرہ بڑی چابکدستی کے ساتھ کسی ماہرانہ انداز میں تیار کردہ اسکن کلر ماسک میں قریب سے صاف نظر آ رہا تھا۔ دین کی نمبر پلیٹ بھی یقیناً بجلی تھی ہوگی۔

”تمہیں میرے ڈرائیور سے کیا دشمنی ہے؟“ سیٹھ عثمان نے ایک اور کوشش کی۔

”ہمیں اس کا علم بھی نہیں ہے۔“ سرد لہجے میں جواب ملا۔

”جو رقم تمہیں دی گئی ہے یا ملے گی کتنی ہے میں تمہیں اس کا دو گنا۔۔۔۔۔“

”بکواس بند کرو۔“ حقارت سے کہا گیا۔ ”تم غلط

اندازہ لگا رہے ہو۔ ہم کا ڈال نہیں ہیں۔“

اسی وقت دین کی طرف سے اشارہ ملا تو وہ سیٹھ عثمان کو

قبر آلود نظروں سے گھور کر بولا۔ ”تم میرے جانے اور دین کے نظروں سے اوجھل ہوجانے کے بعد تک ڈرائیور تک سیٹ

پر جانے کی غلطی نہیں کرو گے۔ ہمارے دوسرا بھی ہیں جو تمہیں نظر نہیں آ رہے لیکن۔۔۔۔۔ اگر تم نے میری ہدایت پر عمل

نہ کیا تو پھر تمہاری زندگی کی بھی ضمانت نہیں دی جاسکتی، دیکھی

ساخت کا ایک معمولی بزم بھی تمہیں اور تمہاری گاڑی کو تباہ کر

دینے کے لیے بہت کافی ہوگا۔“ اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد وہ بھی لے لے بے قدم اٹھا تا دین میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے ہی

وین تیزی سے حرکت میں آئی اور اسپینڈر بڑھانے لگی۔

سیٹھ عثمان نے دین کے نظروں سے اوجھل ہوجانے تک اپنی سیٹ نہیں بدلی پھر۔۔۔۔۔ انہوں نے سب سے پہلے

سراج سے موبائل پر رابطہ قائم کیا۔

”خیریت۔۔۔۔۔ دوسری جانب سے سراج کی آواز

ابھری۔ ”اس وقت کیسے یاد آیا؟“

”میں اس وقت مشکل میں ہوں۔“ سیٹھ عثمان نے مختصر آ رہا۔ ”دونا معلوم پیشور بد مدحاش لیاقت حسین کو کون

پوائنٹ پر انخواب کر کے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“

”تم اس وقت کہاں ہو۔۔۔۔۔؟“ سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ سیٹھ عثمان جواب میں وہ لوکیشن بتانے

لے جہاں وہ موجود تھے۔ اس وقت تک انہوں نے اپنی سیٹ تبدیل نہیں کی جب تک سراج نہیں آگیا۔ انہیں اپنی جان کو کوئی موقع پیش آنے والے خطرے سے بھی نہیں زیادہ لیاقت حسین کی فکر تھی۔

”اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ سراج نے پوری تفصیل دریافت کرنے کے بعد سوال کیا۔

”لیاقت حسین ہم دونوں کے لیے کتنا اہم اور انمول ہے اس کا اندازہ تمہیں بھی ہوگا۔“ سیٹھ عثمان نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”اس وقت میں ایسی اعلیٰ کیفیت سے دوچار ہوں کہ دفتر کے بجائے سیدھا گھر واپس جاؤں گا۔“

”ڈنٹ وری مانی ڈیئر۔۔۔“ سراج نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ لیاقت حسین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ تم گھر جاؤ، میں فوری طور پر اسٹون کی ناکابندی کرانے کی بھرپور کوشش کرتا ہوں۔“

سیٹھ عثمان نے سراج کو پر امید نظروں سے دیکھا پھر گاڑی میں بیٹھ کر گھر لوٹ گئے۔ فرحین اور راحیلہ بیگم گھر پر تھیں، دونوں بازار جانے کو تیار نظر آ رہی تھیں۔ راحیلہ بیگم نے شوہر کو خلاف توقع اتنی جلدی واپس آتے دیکھا تو چونکے بغیر نہ سکیں۔ سیٹھ عثمان کے چہرے پر موجود تاثرات بھی بتا رہے تھے کہ وہ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ راحیلہ بیگم بے چین ہو کر ان کے قریب چلی گئیں۔

”کیا بات ہے؟ آپ اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے۔ خدا خواست آپ کی طبیعت تو خراب نہیں؟“

”اندھ کرے میں چلیے۔“ سیٹھ عثمان نے فرحین کی وجہ سے مدھم لہجے میں کہا پھر کمرے میں پہنچ کر اصل صورت حال سے آگاہ کیا تو راحیلہ بیگم بھی تڑپ اٹھیں۔ لیاقت حسین انہیں بھی بہت عزیز تھا۔ فرحین کا خیال بھی انہیں پریشان کر رہا تھا۔ اسے شوہر کے انکوائیوں نے خیر ملی تو وہ بھی یقیناً مضطرب ہو جاتی۔

”آپ سراج بھائی کو دوبارہ فون کریں، میں فرحین کا خیال رکھتی ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ ایسی غلطی بھول کر بھی نہ کیجیے گا۔“ سیٹھ عثمان نے بیوی کو سمجھایا۔ ”فی الحال جب تک سراج کی طرف سے کوئی اطلاع ملے، فرحین کو اصل صورت حال کا علم نہ ہوتو بہتر ہے، آپ اسے یہی بتادیں کہ میں نے اسے کسی ضروری کام سے بھیجا ہے۔ میری طبیعت راستے میں بگڑ گئی تھی اس لیے واپس آگیا۔“

”خدا غارت کرے ان لوگوں کو جو ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں۔“ راحیلہ بیگم نے دل سے بدعادی۔

”میں بھی یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ لوگ خاص طور پر لیاقت حسین کو کیوں لے گئے ہیں؟“

”اللہ اس غریب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔“ راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین کے لیے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا پھر فرحین کی طرف چلی گئیں۔

سیٹھ عثمان ایک صوفے پر بیٹھ دروازہ ہو کر سراج کو موبائل پر ٹریس کرنے لگے جس کا نمبر مستقل الجھجھل رہا تھا۔

سفید وین میں ڈرائیور اور ایک گن مین پہلے ہی سے موجود تھے۔ لیاقت حسین کو پوری طرح گھیرنے اور وین کے حرکت میں آ جانے کے بعد اگلی نشست پر بیٹھے رائل برادر نے جوان کا سرغز لگتا تھا لیاقت کی طرف دیکھ کر نفرت اور حقارت سے کہا۔

”آج چوہا بچھ گیا جال میں۔۔۔ میں نے تو سنا تھا کہ تو کوئی اونچی شے ہے۔“

لیاقت نے کوئی جواب نہیں دیا، ابھی تک اس کی تلاشی نہیں لی گئی تھی۔ سراج کا پتہ تو لی اس کے پاس تھا۔ اسے ایسے کسی شہری موقع کی تلاش بھی وجہ بساط کا رخ پلٹ سکتا۔

”اب تو یہ بالکل بھیگی بلی بنا بیٹھا ہے۔“ دوسرے نے بھی مذاق اڑایا۔ ”میں بتا گیا تھا بڑا پختہ خاں ہے، آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”جب تک پہاڑ کے نیچے نہ آئے، اونٹ خود کو سب سے زیادہ قدار وری سمجھتا ہے۔“ تیسرے نے تنقید کی۔

”کوئی جواب نہ دینا لیاقت حسین۔“ لیاقت حسین کو خود اپنی ہی آواز کہیں دوسرے آتی محسوس ہوئی۔ اس نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا، وہ سمجھ گیا کہ اس کا ہم زار اس سے مخاطب تھا۔

”میں ان لوگوں کو تمہاری تلاشی سے باز رہی رکھوں گا۔“

”ان کی پشت پر کون لوگ ہیں؟“

”بھول جاؤ۔۔۔ تم صرف اتنا یاد رکھو کہ کچھ دور جا کر ان کی وین کی وجہ سے رک جائے گی اس کے دوبارہ حرکت میں آنے تک یہ سب تمہاری جانب سے بالکل خاں ہوں گے۔ تمہیں خاموشی سے گاڑی سے اتر جانا ہے، اس کے بعد میں مادی شکل میں تمہاری جگہ لے لوں گا۔“

”لیکن۔۔۔“ لیاقت حسین نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی بات درمیان سے اچک لی گئی۔

”تم یہاں سے سیدھے گھر جاؤ گے، میرے تمہارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں، وہ تمہیں یاد نہیں رہیں گی۔ تم سے

کاشی سوال کیا جائے تو بس ایک ہی بات پر ڈٹے رہتا۔ سیٹھ عثمان نے انہیں کسی کام سے بھیجا تھا جو نہیں ہو سکا۔ خود وہ طبیعت خراب ہونے کے سبب واپس لوٹ گیا تھا۔ میری بات کو ابھی طرح ذہن نشین کرلو۔“

”کیا تم ہی مجھے ان دشمنوں کا نام نہیں بتا سکتے جو۔۔۔“

”میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔“ پھر بات در کر کے جواب ملا۔ ”لیکن جتنی اجازت ہے اس حد کو پہلانے کی کوشش کی تو بھل کر خاکستر ہو جاؤں گا۔ ہم سب کسی کی لازوال قوت کے تابع ہیں جسے نہ نیند آنے ہی نہ آگ۔“

لیاقت حسین نے پھر کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

”کیا بات ہے تیس مار خان۔“ اگلی نشست والے نے پھر اسے تاؤ دلانے کی کوشش کی۔ ”ہم نے تو تمہارے بڑے بڑے کارنامے سن رکھے تھے۔ اس وقت نالی کیوں مر گئی؟“

لیاقت حسین تھلا کر رہ گیا۔ تینوں دشمن اس کی بے بسی کا مذاق اڑاتے رہے، اسٹیک کے زور پر۔۔۔ اگر وہ نہیں ہوتے تو شاید لیاقت حسین ان سے دو دو ہاتھ کر گزرنے میں کسی بڑی کامیاب رہ بھی نہ کرتا۔ وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑتا رہا۔ پھر وین جو برق رفتاری کا مظاہرہ کر رہی تھی، ایک ویران جگہ پہنچ کر روک دی گئی۔

”کیا بات ہے؟“ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے سرغز نے لیاقت حسین کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”مجھے شبہ ہے کہ پچھلے پیسے کی ہوا کم ہو گئی ہے۔ ایک منٹ میں دیکھ کر آتا ہوں۔“

ڈرائیور نیچے اتر گیا۔ ہزار کی آواز بہت قریب سے سنائی دی۔ ”تم اب نیچے اتر جاؤ لیاقت حسین، میں نے ان تینوں کو بے حس کر دیا ہے۔ وقت کم ہے، جلدی کرو۔“

لیاقت حسین نے یہ مشکل جگہ بنا کر دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا، اسے بائیں جانب پیٹھے ہوئے شخص سے ٹکرا کر اترنا پڑا تھا لیکن وہ خبر بیٹھا رہا۔ ایسا ہی لگا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو، لیاقت حسین کے باہر نکلنے کے دس

لکڑی بعد وین دوبارہ حرکت میں آگئی۔ لیاقت حسین واپسی کے راستے پر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ تقریباً چالیس منٹ تک وہ چلتا رہا۔ اسے کوئی ٹیکسی یا رکشا نظر نہیں آیا۔ ایک دو

لکڑی سے رکے بغیر گزر گئیں۔ پندرہ منٹ بعد اسے ایک

نالی مل گئی۔ اس نے نیچے ڈرائیور کو سیٹھ عثمان کا پتا بتا کر

تھکے تھکے انداز میں سیٹ سے ٹپک لگی۔ اس کو اپنا ذہن بالکل خالی خالی لگ رہا تھا۔ چہرے کے تاثرات غمازی کر رہے تھے کہ وہ کسی خاص بات پر غور کر رہا تھا۔

فون کی کھنٹی بجتی ہی شیخ حامد نے اس طرح ٹپک کر ریسپونڈ اٹھا جیسے اسے کسی متوجہ کال کا منتظر ہو۔

”بلیک ڈائنگ بول رہا ہوں۔“ دوسری جانب سے ضروری کوڈ اور پاس ورڈ بتانے کے بعد کہا گیا۔ ”جن افراد کو ضروری کام سونپا گیا تھا وہ ہماری مطلوبہ شے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ اسے مطلوبہ مقام پر پہنچا کر دوبارہ اطلاع کریں گے۔“

”سیٹھ عثمان کو تو نہیں چھیڑا گیا؟“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔

”نوسر۔۔۔ آپ نے جو ہدایتیں دی تھیں، کام اس کے عین مطابق ہوا ہے۔“

”اپنے آدمیوں کو دوبارہ تاکید کر دو کہ جو مال حاصل ہوا ہے اس میں زیادہ ٹوٹ پھوٹ نہیں ہونی چاہیے لیکن اس کی اتنی حرمت ضروری ہے کہ پانچویں بار کی کام کا نہ رہ سکے۔ میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو؟“

”ییس ہاس۔۔۔ سمجھ گیا، اور کوئی حکم۔۔۔؟“

”میں نے آج وہ شیڈر حاصل کر لیا ہے جس کی خاطر سیٹھ عثمان کے راستے سے بھیگی بلی کی طرح ہٹ جانے کے بعد اب رستم علی آغا خانی مقابلے پر آنے کی غلطی کر رہا ہے۔“

”اجازت ہو تو کسی جماعت خانے میں اس کے لیے بھی دفنانے کا بندوبست شروع کر دو؟“

”جلد بازی نہیں لیکن۔۔۔ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”میری معلومات کے مطابق وہ بھی کچھ ایسے جرائم پیشہ بدعاشوں کی

پشت پناہی کر رہا ہے جو قانون کو سنگین جرائم میں مطلوب ہیں۔ میں چہل کرنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔“

”ایک بات عرض کرنا چاہوں گا۔“

”دشمن کو سر اٹھانے سے پیشتر ہی پکچل دیا جائے تو اندیشہ باقی نہیں رہتے۔“

”نہیں۔۔۔ اس کا لہجہ حتمی نہ ہو گیا۔“ جتنا کہا جائے صرف اتنا کرو۔۔۔ میں نے نمبر نو کو بھی ضروری ہدایت کر دی

ہی، انہی انجلی زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

شیخ حامد نے ریسپونڈ رکھ کر کشمکشی کی طرف دیکھا جو اس

وقت اس کے ساتھ پروف کمرے میں موجود تھی۔ میک اپ میں اس کا حسن پہلے کے مقابلے میں زیادہ گھبراہٹا تھا۔ ”گڈ“..... شیخ حامد نے اسے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔ ”اب تم نے جینے کا جو نیا انداز اختیار کیا ہے وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ سودمند، چارمنگ اور گڈ لکنگ ہے۔ دوبارہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش بھی نہ کرنا، یہ میرا ذاتی مشورہ ہے۔“

”میں آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کروں گی۔“ وہ سعادت مندی سے بولی۔

”فائن“..... اس نے شبنم کو یہ دستور لپٹائی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ ”جانتی ہو میں نے تمہیں افضل خان کے بارے میں کیوں رعایت دی تھی؟“

”بے کوئی شخص جو بہت زیادہ سراہا جانے کی کوشش کر رہا ہے۔“ شبنم نے دبی زبان میں بگ باس کو خوش کرنے کی خاطر کہا۔ ”اے موقع پر افضل خان کے پاس کوئی دوسری چوائس بھی نہیں ہوگی۔ تخت یا تختہ والی صورت حال ہے۔“

”وڈرفل“..... خطرناک مگر مجھے نے شبنم کو سنا سنی نظروں سے دیکھا۔ ”تم اب سمجھ دار ہوتی جا رہی ہو۔ اسے اس طرح اسکاٹا کہ وہ اس بات کا اندازہ نہ کر سکے کہ پشت پر میری مرضی بھی شامل ہے۔“

”ڈونٹ وری سر..... میں ایسا ہی کروں گی۔“

”وش یو آل دی بیٹ..... میں باقی باتیں تمہیں موبائل پر سمجھا دوں گا۔“ شبنم بگ باس کا اشارہ پا کر اٹھی اور تیزی سے باہر چلی گئی تو شیخ حامد اپنے مخصوص موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر بے حد خشک اور سنجیدہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ ”اپنے کچھ کارندے رسم علی کی نقل و حرکت پر تعینات کر دو لیکن..... میری طرف سے اشارہ ملے بغیر کوئی حماقت نہ کرنا۔“

”رائٹ سر.....“ دوسری جانب سے مختصر آگیا۔

”مجھے ہر دو گھنٹے بعد حالات اور مطلوبہ شخص کی ذاتی نقل و حرکت سے آگاہ کرتے رہنا..... دیٹ ازل۔“ بات مکمل کر کے شیخ حامد علی نے موبائل آف کر دیا۔ اس کی نگاہوں میں اس ذمہ خوردہ ناگ کی چمک ابھرتی جس کی تاگن اسے منہ چھو جا رہی وہ خدائے کے ساتھ چھوڑ گئی ہو۔

❖❖❖

سیٹھ عثمان کے علاوہ راجیلہ بیگم بھی لیاقت حسین کی طرف سے بے حد گھر مند تھیں، سراج کا فون دوبار آچکا تھا لیکن اس طرف سے بھی کوئی خاص خبر نہیں مل سکی۔ سفید وین

لیکن دستاب میں کھڑے ہوئے۔ متعلقہ جگہ کے ذمہ داروں نے بھی اس نمبر کو جلی کر ادرے دیا جو وین پر دیکھا گیا تھا۔ راجیلہ بیگم نے فرحین کو شوہر کی طبیعت کا بہانہ کر کے ٹال دیا تھا اس کے بعد سے وہ شوہر ہی کے ساتھ لاؤنچ میں بیٹھی لیاقت حسین کی زندگی اور سلاستی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

دو گھنٹے زور رکھے تھے۔ دو فون کی توثیقیں برقی جارہی تھیں۔

”آپ کا شیپ کن لوگوں پر ہے؟“ راجیلہ بیگم نے خود کو بہلانے کی خاطر پوچھا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....“ سیٹھ عثمان کسمسا بولے۔ ”اگر انہوں نے افوا کا کامیاب پروگرام بنایا لیا تھا تو پھر مجھے صحیح دسلامت کیوں چھوڑ گئے؟“

”خدا کے لیے ایسی بات منہ سے نہ نکالے۔“ راجیلہ بیگم نے شوہر کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری عقل بھی کام نہیں کر رہی کہ ان کی لیاقت حسین سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“

”ہوسکتا ہے کہ یہ پرانی دشمنی کا شاخسانہ ہو جس کا ذکر لیاقت حسین نے ہم سے کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔“

”ایسی کوئی بات ہوتی تو کم از کم فرحین مجھے ضرور بتا دیتی۔“

”پھر آپ کیا نتیجہ اخذ کر رہی ہیں؟“

”آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ لیاقت حسین کی گاڑی کو لکر کیوں ماری گئی تھی؟ دشمنوں کا مقصد ہم سب کو ایک ساتھ ختم کرنے کا تھا۔ شاید انہیں ہمارے راستے میں پھر اسٹور پر اتر جانے کی اطلاع بروقت نہ ملی ہو۔“

”میرے ذہن میں بھی سب سے پہلے شیخ حامد ہی کا نام ابھرا تھا لیکن اگر بات وہی ہے جو آپ سوچ رہی ہیں تو پھر اس بار مجھے کیوں نظر انداز کر دیا گیا؟“

”اس لیے کہ آپ نے اب اس کے مقابلے پر آنا تم کر دیا ہے۔“ راجیلہ بیگم نے یہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن دودھ کے جٹ کو کچا چھڑ بھی پھونک پھونک کر پینے سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔“

”ہوسکتا ہے آپ کا اندازہ درست ہو۔ فی الحال یہ دعا کریں کہ لیاقت حسین خیر و عافیت سے گھر آجائے ورنہ ہم فرحین کو کیا منہ دکھائیں گے۔“

”میرا دل کہتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ حدیث میں بھی یہی لکھا ہے کہ جو شخص دنیا میں کسی کی پریشانی میں کام آئے یا کسی مومن کی دنیا میں تکلیف رنہ کرے گا تو خداوند قدوس

اس کے روز اس کی نگلیوں کو فروغ فرمائے گا۔ لیاقت حسین عادت گزار ہے اور سب کے کام آتا ہے۔ اس مشکل وقت میں میرا دل کہتا ہے کہ خدا بھی غیب سے اس کی مدد کرے گا۔“

سیٹھ عثمان کچھ جواب دینا چاہتے تھے کہ ایک ملازم آکر اطلاع دی کہ لیاقت حسین دروازے پر موجود ہے اور صاحب سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔

سیٹھ عثمان کے علاوہ راجیلہ بیگم بھی اس طرح چونکیں گے۔ کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ لیاقت حسین کے بارے گھر میں کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اسے دو ڈھائی گھنٹے پہلے افوا کر لیا گیا تھا۔ سیٹھ عثمان نے بیوی کی طرف حیرت سے دیکھا جو خود ہی حیران و پریشان نظر آ رہی تھیں پھر..... وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے پر آئے تو انہیں لیاقت حسین کو پرسکون حالت میں سامنے کھڑا دیکھ کر اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔

”تم!.....“ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔ انہیں بہ دستور اپنی قوت پینا پڑی رہی ہو رہا تھا۔

”صاحب.....“ لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ”آپ نے مجھے جس کام سے بھیجا تھا وہ نہیں ہو سکا۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

سیٹھ عثمان نے موبائل آف کر دیا لیکن ان کے ذہن میں مختلف پریشان کن خیالات بڑی تیزی سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ راجیلہ بیگم کے دماغ میں بھی وسوسے سراٹھانے لگے تھے۔

❖❖❖

اس وقت رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ شیخ حامد شراب و شباب سے فارغ ہو کر اپنی خواب گاہ میں گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا جب اچانک وہ کچھ خلاف معمول آواز اور شور وغل سن کر اس طرح ہڑبڑا کر اٹھا جیسے قیامت آگئی ہو۔ کمرے کی لائٹ آن کرنے کے بعد اس نے کال بتل بجائی، ٹائٹ ڈیوٹی ملازم دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا، وہ بھی بوکھلا یا ہوا لگ رہا تھا۔

”یہ شور وغل کیا ہے؟“ اس نے ملازم سے جھلا کر سوال کیا۔

”سر ہم پر حملہ ہو گیا ہے۔“ ملازم گھبرا یا ہوا تھا۔

شیخ حامد کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے منگٹے کے دونوں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا، تیز تیز قدم اٹھاتا عقبی کھڑکی کی طرف بڑھا، دبیز پردے کو زور سا پٹا کر اس نے باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی قسمت اچھی تھی جو بال بال فٹج کیا۔ کھڑکی میں روشنی کی جھری نظر آتے ہی باہر سے دو منگٹے فضا میں برقی رفتار سے لپکے۔ کھڑکی کا شیشہ چور چور ہو کر فرش پر بکھر گیا۔ شیخ حامد اچھل کر دیوار سے چپک گیا پھر اس نے جیب سے اپنا موبائل نکال کر بلیک مائیکر کے نمبر

”تم اس وقت کہاں سرے ہوئے ہو؟“ وہ کسی شیر کی طرح دہانے لگا۔ ”میرے ہنگامے کو دونوں طرف سے گھیر کر لارنگ ہو رہی ہے۔“

”میں ہنگامے سے زیادہ دور نہیں ہوں سر۔۔۔۔۔“

”یہ سوز کے بچے کون ہیں جنہوں نے اپنی موت کو دعوت دی ہے؟“

”ابھی اس کا علم نہیں ہوا۔ ہمارے گارڈز انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ بلیک ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”حملہ آور تین مختلف گاڑیوں میں وقفے وقفے سے آئے تھے اس لیے ہمارے آدمیوں کو کچھ دشواری ہو رہی ہے۔“

”یکومت۔۔۔۔۔“ شیخ حامد گرجا۔ ”میں ان حرامیوں کو کیا مفت میں پال رہا ہوں جو ان کی غفلت سے ایک سنسناتی ہوئی گولی نے میری خواب گاہ کا شیشہ بھی چکنا چور کر دیا۔ میں اگر فائرنگ کی زد میں آ جاتا تو۔۔۔۔۔“

”مجھے افسوس ہے سر لیکن۔۔۔۔۔ حملہ اس قدر منظم طریقے سے۔۔۔۔۔“

”نان سنس۔“ اس کے منہ سے پھر گالیوں کا طوفان اٹھنے لگا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہ دشمنوں کو حملہ کرنے سے پیشتر تمہیں اور تمہارے حرام خور محافظ دستے کے افراد سے باقاعدہ انویٹیشن کارڈ لے کر آنا چاہیے تھا؟“

”سوری سر، میں خود آگے جا کر دیکھتا ہوں۔“

”رہن۔۔۔۔۔ ابھی تک کس بات کا انتظار کر رہے تھے۔۔۔۔۔“ شیخ حامد نے جھلکار فون آف کر دیا پھر کچھ سوچ کر اس نے فون اٹھایا اور ایس پی اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ اورنگ زیب بول رہا ہوں۔“

”تم اس وقت غالباً غفلت کی نیند سے بیدار ہوئے ہو۔“ شیخ حامد نے نفرت کا اظہار کیا۔

”کون کیواس کر رہا ہے؟“ جواب بھی اسی لب و لہجہ میں دیا گیا۔

”میں شیخ حامد بول رہا ہوں۔“ اس نے بڑے تکبر سے اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”اس وقت کیا تکلیف لاحق ہوگئی۔۔۔۔۔؟“ دوسری جانب سے پلے پروائی سے سوال کیا گیا۔

”تم ملائے کے ایس پی ہو اور ابھی۔۔۔۔۔“

”پلیز شیخ حامد۔ تمیز سے بات کریں، میں آپ کا ماتحت نہیں ہوں۔“ اس بار اورنگ زیب کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔

”میرے گھر پر کچھ شہرپندوں نے حملہ کر دیا ہے آپ کے کارندے اس وقت کہاں ہیں؟ کیا حسب دستور مجرموں کے فرار ہونے کے بعد اپنی شکلیں دکھانے کی خاطر آئیں گے؟“

”میں نیا آیا ہوں مسٹر حامد۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب۔ سرد لہجے میں جواب دیا۔ اس کے لہجے میں طنز بھی شامل تھا۔ ”آپ کے شہر کا یہ پرانا دستور ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں بھی مرکز کے کسی وزیر سے بات کرنی چاہیے تاکہ پرانے دستور بدلے جاسکیں اور پولیس اور عوام دونوں اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی حماقت نہ کریں۔“

”میں نے آپ کو بچھرنے کی خاطر فون نہیں کیا۔“ شیخ حامد بری طرح تھلا گیا لیکن اس بار اس نے ”تم“ کا صیغہ نہیں استعمال کیا تھا۔

”بچھرنے نہیں۔۔۔۔۔ میں اصول کی بات کر رہا ہوں شیخ صاحب، ویسے آپ کی اطلاع کے لیے بتا دوں کے تھانے کی پولیس پارٹی موقع واردات پر موجود ہے۔ میں خود بھی نکل رہا تھا کہ آپ کا فون آ گیا۔ آپ کے اکثر پڑوسیوں کے فون بھی آرہے ہیں۔“

”میں آپ کا منتظر رہوں گا۔“ شیخ حامد نے مصلحت جواب دیا۔ وہ دریا میں رہ کر پھیلیوں سے بھر بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

”سوری، میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ پویشن کو فوری کنٹرول کرنا میرے لیے زیادہ اہم ہوگا۔ رہا ملاقات کا سوال تو ابھی میرے تہاڑے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ایک ہی شہر میں ہیں تو ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں گی۔“ دوسری جانب سے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

”باسنڈ۔۔۔۔۔“ شیخ حامد بری طرح تھلا کر رہ گیا۔ تہاڑے کے حوالے سے ایس پی نے جوڈھکا چھپا طنز اور ملاقاتوں کا ذکر کیا تھا وہ پگ باس کے منہ پر بھر پور طمانے سے زیادہ کاری ثابت ہوا۔ ”ڈونٹ وری ایس پی۔۔۔۔۔ میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔“

باہر سے گولیوں کی ترتر اہٹ میں کچھ کی ضرور آگئی تھی لیکن فائرنگ تھوڑے تھوڑے وقفے سے جاری تھی، خطرناک مگر کچھ کسی بھوکے درندے کے مانند نہیں رہا تھا۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر مخالفین کے کئی چہرے بار بار ابھر رہے تھے پھر یک نخت اسے رستم علی آغا خانی کا خیال آیا۔ ٹینڈر میں ناکامی کے بعد اس نے جس انداز میں شیخ حامد سے ہاتھ ملا کر مبارکباد دی تھی اس میں کھلا چیلنج بھی موجود تھا۔ وہ

عورت کی عزت اور عصمت بچانا ایک مسلمان کا فرض بھی ہے۔ ”لیاقت حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔“

”اس وقت تمہارے ساتھ اور کون موجود تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”تجوت بول رہے ہو۔“ سرغنہ نے گرج کر کہا۔

”تمہارے ساتھ ڈپٹی پرنسٹنٹ سراج بھی تھا۔“

”جب تمہیں یقین ہے تو پھر مجھ سے کس بات کی تصدیق کر رہے ہو؟“

”سیٹھ عثمان اور اس کی بیوی کو سپر اسٹور میں اتار کر تم اکیلے گاڑی لے کر کیوں چلے گئے تھے؟“ جیسے ہوئے سرد لہجے میں اگلا سوال پوچھا گیا۔

”اس وقت میں بے ہوشی کی حالت سے دو چار تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ شاید دعوت میں مجھے جو کھانا ملا تھا وہ زہر آلود تھا۔“

”پھر تم جی کس طرح گئے؟“

”خدا کی مرضی۔“

لیاقت حسین کے جواب پر سوال کرنے والے کے ایک ساتھی نے لپک کر اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اتنی شدت سے کھینکا کہ وہ چیخا لیکن فوراً ہی خاموش ہو گیا۔

”اس وقت تم نے اگر ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا تو تمہاری موت بھی خدا کی مرضی سے بڑی المناک ہوگی۔“ سرغنہ بل کھا کر آلود لہجے میں بولا۔

لیاقت حسین ہونٹ چپا نہ لگا۔ اس کا چہرہ اندرونی جذبات کی ترجمانی سے بکسر عاری تھا۔

”فرخین اور گل خان کی بیوی، زریزہ کو تم نے کس کی فراہم کردہ معلومات پر بازیاب کیا تھا؟“

”اس میں بھی مشیت ایزدی کا دخل تھا۔“

”کنجش۔“ سرغنہ غصے سے کانپتا ہوا اٹھا پھر اس کے حکم پر لیاقت حسین کو کرسی کے کناروں سے نکال کر کچھت سے الٹا لٹکا دیا گیا، اس کے سر کے نیچے ایک اگلیٹھی رکھ دی گئی جس کا ایک سوچ آن کرتے ہی لوہے کے کوئلے نما ٹکڑے بڑی تیزی سے سرخ ہونے لگے۔

”ہم تم سے پھر وہی سوال کریں گے۔“ سرغنہ نے بل کھاتے ہوئے سوال دہرایا۔ ”فرخین اور زریزہ کو کہاں رکھا گیا تھا اس کا علم کون کس روٹیے سے ہوا۔؟“

”مم۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ میں وہاں کس طرح پہنچ گیا تھا۔“ لیاقت حسین کے چہرے پر پہلی بار اذیت کے تاثرات نمایاں ہوئے۔

”میزڈم کو دوسری بار سراج نے کسی نہ کسی کی اطلاع عین وقت پر بچالیا تھا۔ تم اس کے بارے میں کیا کہو گے؟“

”مجھے اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔“

”جس نے بھی ہماری خدمات تمہاری خاطر مدارات کے لیے حاصل کی ہیں اس کے پینل پر حملہ کرنے والے کے آدی تھے؟“

”یہ بات میں پہلی بار تمہاری زبان سے۔۔۔۔۔“

”لیاقت حسین کا جملہ مکمل نہ ہوسکا، سرغنہ اشارے پر اس کے سیدھے ہاتھ پر کھڑے ہوئے آدی کے بعد دیگرے دو فائر کیے لیکن دونوں نشانے شاید ہو گئے تھے۔ اس نے جھلاہٹ میں پورا پتول خالی کر لیا لیکن نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ سرغنہ غصے سے دانت پسینے وہ جانتا تھا کہ جس نے گولیاں چلائی ہیں وہ بڑا ناچار نشانے تھا پھر لیاقت حسین کس طرح محفوظ رہا۔۔۔۔۔ اگلیٹھی کو ابھڑکا دو کہ اس۔۔۔۔۔ کے قدم کا بچھا پھل کر قطرہ قطرہ بن چکے تھے۔“ سرغنہ نے غصے سے کانپتے ہوئے حکم دیا۔

فائر کرنے والا ابھی تک اپنی ناکامی پر ششدر تھا۔ لیاقت کو جبرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس کی حویلی دیکھ کر دوسرا آدی لپک کر دیوار کے قریب گیا، اس نے ایک سوچ آن کیا تو اگلیٹھی میں آگ بھڑک اٹھی، وہ پورے قریب دیوار پر لگی ایک چرچی کو آہستہ آہستہ بائیں جانب گھمانے لگا، بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے آہستہ آہستہ بلند ہونے لگے۔ جب وہ لیاقت حسین کے سر سے ڈیڑھ فٹ دور رہ گئے تو اس نے چرچی روک دی۔

سرغنہ کی نظریں لیاقت حسین کے وجود پر مرکوز تھیں جس کا پورا وجود شعلوں کے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ دیکے گولے کے مانند سرخ ہونے لگا تھا لیکن اس کے چہرے پر کرب یا اذیت نام کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی البتہ اس کی نظریں قہر آلود انداز میں سرغنہ کے چہرے پر مرکوز تھیں اس کی پلکوں نے جھپکنی موقوف کر دیا تھا۔ دوسری جانب سرغنہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل و دماغ پر برف سی جیسے گلی ہو، ایک لمحے تک وہ گم سم گھڑا ہوا پھر اس نے اپنے آدیوں کو کسی روٹوت کی طرح حکم دیا۔

”اس کو نیچے اتار کر دوبارہ کرسی سے باندھ دو۔ میں سارا قصہ ہی پاک کر دوں گا۔“

”میں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔“ چرچی کے قریب کھڑے ہوئے شخص نے احتجاج کیا۔ ”اگر یہ سر گیا تو ہماری آدی رقم ڈوب جائے گی۔ ہم سے یہی کہا گیا تھا کہ اسے

کشکول

گیا تھا۔ سراج خود بھی اس کا گواہ تھا کہ لیاقت حسین نے اسے انہو ادلی رات بارہ بج کر چالیس منٹ پر فون کیا تھا۔ اس وقت اس نے سراج کو اپنے کمرے میں کھانا کھا رہا تھا۔ لیاقت حسین نے اس کی کاربھی لیاقت حسین نے ڈرائیو کی لیاقت حسین نے سراج کے استفسار پر یہی کہا تھا کہ اسے کسی خاص جگہ بچھنا ہے جس کے بارے میں اس کے ذہن میں سوتے وقت اچانک غصہ کھلبلیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کچھ یاد نہیں تھا پھر الماس کو ایک مکان سے بازیاب کرانے کے بعد وہ دوبارہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ واپسی پر اس نے بڑی مصیبت سے سراج سے دریافت کیا تھا کہ اسے وہ اپنے کمرے کیوں لے گیا تھا؟

جہاں تک ان باتوں کا تعلق تھا، سراج کو یہی شبہ ہوا تھا کہ کوئی غیبی طاقت لیاقت حسین کی رہنمائی کرتی ہے۔ تین سلاخ آدمیوں کا لیاقت حسین کو زبردستی انہو کرنا اور پھر بغیر کسی تشدد کے واپس کر دینا تعجب خیز ہی تھا۔ یہ بات بھی اسے ابھرا رہی تھی کہ لیاقت حسین نے خاص طور پر وہی جملہ کس طرح دہرایا جو اس کی بیوی کو قتل طور پر لے دینے کی خاطر سیٹھ عثمان نے راجیلہ ٹیم سے کہا تھا۔

”صاحب۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے سراج کو گم سم اور سنجیدہ دیکھ کر دلی زبان میں پوچھا۔ ”کیا آپ کو میری بات پر اعتماد ہیں؟“

”یہ بات نہیں ہے لیاقت۔“ سیٹھ عثمان نے کہا۔

”میں صرف یہ بات پریشان کر رہی ہے کہ تمہیں کن لوگوں نے انہو کرنے کی حماقت کی تھی اور پھر اتنی آسانی سے۔۔۔۔۔“

”میں نہیں سمجھا صاحب۔“ لیاقت حسین نے عجیب الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے کسی نے انہو نہیں کیا تھا۔ آپ نے مجھے دفتر جاتے وقت راستے میں کسی کام سے اتار دیا تھا اور خود واپس آ گئے تھے۔ شاید آپ کی طبیعت خراب تھی۔“

”فرخین اب کیسی ہے۔۔۔۔۔؟“ سراج نے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

”بھلی چلتی ہے صاحب۔“

”خیک ہے تم جاؤ لیکن ایک منٹ۔۔۔۔۔“ سراج نے فوری طور پر کچھ سوچ کر کہا۔ ”میں نے تمہیں اس وقت ایک اور کام سے بلا دیا تھا۔“

”حکم دیں صاحب۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے سعادت مندی سے پوچھا۔

”ہوسکتا ہے مجھے ایک ہفتے یا دس روز کے لیے تمہاری ضرورت پڑے۔“

جواب میں لیاقت حسین نے سیٹھ عثمان کی طرف دیکھا تو انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”میری طرف سے تمہیں ہر بات کی اجازت ہے۔“
”خزین سے خاص طور پر پوچھ لیتا۔“ سراج نے معنی خیز گردوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”کیوں اسے کوئی۔۔۔“

”وہ بھی میری طرح آپ کی بہت احسان مند ہے صاحب۔ وہ بھلا کیا اعتراض کرے گی۔“
”مجھ دیر بعد لیاقت حسین کو رخصت کر دینے کے بعد سراج نے سیٹھ عثمان سے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ لیاقت حسین جو کہہ رہا ہے وہ غلط نہیں ہوگا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ”ہوسکتا ہے کہ اس میں بھی کسی روحانی طاقت کا دخل ہو۔“

”پھر بھی۔۔۔ یہ تو معلوم کرنا چاہیے کہ جن لوگوں نے سرعام اغوا کیا، وہ کون تھے؟ کس کی ایما پر انہوں نے بیک آؤر میں اتنی دلیری کا ثبوت دیا اور۔۔۔ اتنی شرافت سے چھوڑ کیوں دیا۔۔۔؟“

اسی وقت باہر سے راجیلہ بیگم کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی تو سراج نے کہا۔

”عثمان۔۔۔ پلیز، الماس کے بارے میں، میں نے تمہیں اس وقت جو تفصیل بتائی ہے وہ بھائی کے سامنے زبان پر نہ لانا۔“

”آئی نو۔۔۔“ سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ”عورتیں رازداری کے معاملے میں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔“

راجیلہ بیگم نے شوہر کے ساتھ سراج کو لان پر بیٹھا دیکھ کر گاڑی پور ٹیکو سے پہلے ہی رکوئی اور اتار کر سیدی ان کی طرف آگئیں۔

”آپ کب آئے؟“ انہوں نے قریب جا کر سراج سے پوچھا۔

”ایک گھنٹے سے بغیر چائے کافی کے بیٹھا آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔“ سراج نے حسب معمول سیٹھ عثمان کو پھیرا۔

”خدا کے اس نیک بندے نے ایک گلاس شٹلے پانی کو بھی نہیں پوچھا۔ یہی کہتا رہا کہ اپنی بھائی کو آجانے دو پھر سب ساتھ مل کر گولڈ کافی پیئیں گے۔“

”اور آپ کیوں میرے بغیر ہی ناشتا کرنے کا سوچ رہے تھے۔۔۔؟“ راجیلہ بیگم نے مسکرا کر جواب دیا تو سراج نے آسمان کی سمت نظر اٹھا کر کہا۔

”قرب قیامت کی دلیلیں ہیں۔ آج پہلی بار گھنٹا دیور کے بجائے شوہر کی طرف جھک رہا ہے۔“

راجیلہ بیگم سرگرمی پر بات بناتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو ہمارا خوش کرنے کی خاطر کہہ رہی تھی ورنہ بھائی تو بھائی ہوتا ہے۔“
سراج نے بچوں کی طرح سیٹھ عثمان کی طرف دیکھ کر تالی بجاتی پھر وہ کچھ قہر بھی چست کرنا چاہتا تھا کہ اس کا موبائل گھٹناتے لگا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ ایس پی اورنگ زیب کا نام دیکھ کر اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ ”سراج بول رہا ہوں۔“
”مصرف نوٹ ہوں تو کچھ دیر کے لیے غریب خانہ۔“
تقریب لے آئیں۔“ دوسری جانب سے اورنگ زیب کی آواز ابھری۔

”سرسر۔۔۔ خیریت تو ہے؟“
”آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں جو قطعی نجی اور ذاتی نوعیت کی ہیں۔“

”رائٹ سر۔۔۔ پندرہ منٹ کے اندر حاضر ہوں۔“ سراج نے کہا پھر اٹھتے ہوئے راجیلہ بیگم سے شوڈ سے کہا۔

”عثمان کی دعا قبول ہوگئی۔ یہ شخص نہیں چاہتا تھا کہ میں رات کا کھانا بھی کھا کر جاؤں اس لیے ایس پی کی کال آگئی۔“

”آپ واپسی پر آج صبح۔۔۔ میں اتنی دیر میں آپ کے پسند کی ڈشیں بھی تیار کر لوں گی۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری تندرتی کا خیال رہتا ہے لیکن یہ آپ کے شوہر نام دار۔۔۔“ سراج نے سیٹھ عثمان کی طرف دیکھا پھر مسکراتا ہوا چلا گیا، اس نے واپسی کے لیے معذرت کر لی تھی۔

راجیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان بھی سراج کے جانے کے بعد خاصی دیر تک ایسی باتیں کرتے رہے۔

ایس پی اورنگ زیب نے بڑے پر تپاک انداز میں سراج کو اپنے ڈرائنگ روم میں خوش آمدید کہا۔ سراج نے بات خاص طور پر محسوس کی کہ دفتر اور گھر کے دکھ رکھاؤ میں اس کے انداز میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ گھر میں وہ کسی ملنسار دوست کی طرح ملا تھا۔ دفتر میں وہ اس کے برخلاف سنجیدہ اور محتاط رہنے کا عادی تھا۔

”میں نے اس وقت آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ اس کی گفتگو کے بعد ایس پی نے بے لگتی ہی سے دریافت کیا۔ ”جی نہیں۔۔۔ اس وقت میں اپنے کلاس فیلو اور دوست سیٹھ عثمان کے کھلے لان میں بیٹھا آرام کر رہا تھا۔“

کھشکول

”گڈ۔۔۔ ہم پولیس والوں کو عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ فیشن رجیم ہے اس لیے ہمارے لیے ریلیکس ہونا اکیلا ضروری ہے۔“

”میں آپ کے خیال سے متفق ہوں سر۔“
”بائی داؤے۔“ ایس پی نے صوفے پر پہلو بدل کر اندر سے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”آپ کے یہ سیٹھ عثمان وہی تو ہیں جن کی گاڑی میں ہم نصب کر دیا گیا تھا اور آپ نے انہیں دو مہینے کے لیے باہر جانے کا مشورہ بھی دیا تھا۔“
سراج چونکا۔ ”آپ کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی؟“

”مجھے اس کے علاوہ بھی آپ کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔“ ایس پی نے اس کا تجسس بڑھاتے ہوئے زیر لب مسکرا کر اضافہ کیا۔ ”مثلاً یہ کہ آپ نے کسی خاص وجہ سے انتہائی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے فتح حامد سے اس کے دفتر جا کر ایک کثیر رقم بھی وصول کی تھی۔“

سراج ہکا بکا رہ گیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے غور کرنے لگا کہ ایس پی نے اس وقت اسے کس مقصد سے بلایا تھا؟ پہلے دوستانہ انداز میں اس کا غیر مقدم کیا اور اب آہستہ آہستہ اسے لگا کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے؟ وہ سچیل کر محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی حیرت ملا وجہ نہیں تھی، فتح حامد سے لین دین کا اصل مقصد کیا تھا اس کی وجہ سوائے ریٹائر ہونے والے ڈی آئی جی جی کر ائمہ تعلیم احمد کے کسی اور کے علم میں نہیں تھی۔ ایس پی اورنگ زیب اس وقت دوسرے شہر میں تعینات تھا۔

”اس جاڑ یا نا جاڑ لین دین کے موقع پر آپ نے بڑی عقلندی سے اپنے حساس اور خفیہ کمرے سے اس کی عکس لے لی بھی کی تھی۔“

سراج کے ذہن کو دوسرا اچھٹکا لگا، اسے اس بات کا شہر شروع سے تھا کہ بگ باس نے بھی اسے بلیک میل کرنے کی خاطر خفیہ کیمروں سے اس کی ویڈیو ضرور تیار کی ہوگی۔ ”تو کیا۔۔۔ اس خطرناک مگر مجھے نے ایس پی اورنگ زیب کو وہ ویڈیو دکھا کر اس سے تحفہ کرنے کی کوشش کی تھی۔۔۔؟“

ان کے ذہن میں یہ خیال بڑی سرعت سے ابھر لیکن اس کی بات کا اکتہار نہیں کیا۔ اس کی نظریں بہ دستور ایس پی کے کمرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس ذاتی طور پر آپ کو ایک ایماندار، نڈر، بے خوف اور اعلیٰ درجہ پولیس آفیسر سمجھتا ہوں لیکن۔۔۔“ ایس پی نے پہلو پر لکھ کر سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”حیرت اس بات پر ہے کہ فتح حامد جسے گرگ باراں دیدہ اور خطرناک دشمن تک رسائی

حاصل کرنے کی خاطر افضل خان جیسے تھرڈ ریٹ بد معاش کو آپ نے کیا سوچ کر استعمال کیا؟“
”سرسر۔۔۔“ سراج نے کسمسا کر انکار یا اقرار کرنے کے بجائے پہلو تہی اختیار کرنے کا درمیانی راستہ اختیار کیا۔ ”ضروری تو نہیں کہ جو باتیں آپ تک پہنچی ہوں ان میں صداقت بھی ہو۔۔۔ یہی عین ممکن ہے کہ سچیلی ملاقات میں میرے اور آپ کے درمیان ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی جو گفتگو ہوئی تھی اس کی بہک دوسروں کو مل گئی ہو یا۔۔۔ کسی نے دور دراز کر اندازہ قائم کیا ہو اور اب اس نے ہمارے درمیان تلخ پیدا کرنے کی خاطر ایک فرضی کہانی۔۔۔“
”نہیں۔۔۔ میں آپ کے اس مفروضے سے قطعی متفق نہیں ہوں۔“ ایس پی نے روکے لہجے میں جواب دیا۔
”اگر آپ نے تمام باتوں پر یقین ہی کر لیا ہے تو پھر میں کیا صفائی پیش کر سکتا ہوں؟“ سراج نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

”مائی ڈیئر مسز سراج۔“ ایس پی نے دوبارہ پہلو بدل کر سراج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”جو کثیر رقم آپ نے فتح حامد جیسے خراٹہ جرم سے وصول کی تھی۔ اگر میں اس کا کوئی دستاویزی ثبوت پیش کر دوں تو آپ کیا بہانہ بنانے کی کوشش کریں گے؟“

”میں اب اجازت چاہوں گا سر۔۔۔“ سراج نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ نے اس وقت مجھے آف دی ریکارڈ باتوں کے لیے۔۔۔“
”پلیز سٹ ڈاؤن۔۔۔“ اورنگ زیب نے پھر بڑے مہذب انداز میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”ابھی کچھ باتیں رہ گئی ہیں جنہیں سننے کے بعد شاید آپ اسے آف دی ریکارڈ سمجھنے کے بجائے آئندہ میرے اوپر زیادہ اعتماد کر لیں۔“

بات سراج کی سمجھ میں نہیں آئی پھر بھی وہ بادل ناخواستہ بیٹھ گیا۔

”آپ نے دو موقعوں پر میڈم رونی کو تحفظ دینے میں جو کردار ادا کیا، اس کا علم ان دشمنوں کو بھی ضرور ہوگا جو مجھے اور آپ جیسے آدمیوں کو خریدنے کی خاطر کسی بھی گناہ کرنے کے لیے استعمال سے گریز نہیں کرتے۔“

”میں میڈم کے سلسلے میں آپ کی معلومات سے انکار نہیں کروں گا۔“ سراج نے سچیل کر جواب دیا۔ ”ان کے بارے میں مجھے بہت ساری ایسی باتوں کا علم ہے جو شاید کسی اور کو نہ ہو۔“

”ممکن ہے آپ کا اندازہ درست ہو لیکن..... اگر ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں تو عوام و خواص دونوں کو بہتر طور پر تحفظ فراہم کر سکتے ہیں۔“

”میں اس سے انکار نہیں کروں گا سر۔“ سراج نے دہلی زبان میں جواب دیا۔ ابھی تک تو وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس وقت اسے بلانے کا اصل مقصد کیا تھا۔ ”اس مقصد کے لیے ہمیں ایک دوسرے پر مکمل اعتماد بھی کرنا ہوگا۔“ اس نے کچھ توقف سے کہا۔

”مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔“ ایس بی نے غصوں لہجے میں اظہار کیا۔ سراج کو اس کے جواب میں کوئی نصیحت یا بناوٹ نہیں محسوس ہوئی لیکن شیخ حامد کے ساؤنڈ پروف کمرے میں ہونے والی لین دین کے معاملے میں اس کا ذہن بہ دستور الجھ رہا تھا۔

”شبنم اس وقت جو کردار ادا کر رہی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا ذاتی خیال کیا ہے؟ میری معلومات کے مطابق اس نے افضل خان کو بھی اپنے اپارٹمنٹ میں پناہ دی ہے جبکہ شیخ حامد نے اس کی سرپرستی سے منہ موڑ کر اسپتال سے ڈسچارج کر دیا تھا۔ کیا شبنم اس بگ کرمل کی مخالفت مول لینے کی پوزیشن میں ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ شبنم بغیر شیخ حامد کے اشارے پر اتنا بولڈ اسٹیپ اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔“

”میں سمجھا نہیں.....؟“ ایس بی نے متقی خیر انداز میں کہا۔ ”کیا وہ شبنم کے ذریعے ایک پٹے ہوئے مہرے کو کسی خاص محاذ پر استعمال کرنے پر غور کر رہا ہے؟“

”وہ محاذ ہم دونوں میں سے بھی کوئی ایک ہو سکتا ہے۔“ سراج نے دیدہ و دانستہ ایس بی کا نام لینے کی غلطی نہیں کی ورنہ میڈم نے اسے کچھ ایسا ہی اشارہ دیا تھا۔

”میں تاؤ اوقت نہیں ہوں مسٹر سراج.....“ ایس بی نے اس بار بڑے غصوں لہجے میں کہا۔ ”وہ محاذ آپ نہیں..... میں یا پھر رستم علی آغا جانی بھی ہو سکتا ہے جو آپ کے دوست مسٹر عثمان کے درمیان سے کنارہ کش ہو جانے کے بعد شیخ حامد کا ب سب سے بڑا کاروباری حریف بن کر سامنے آ رہا ہے۔“

سراج حیرت سے اچھل پڑا۔ رستم علی کا نام وہ پہلی بار شیخ حامد کے حریف کی حیثیت سے سن رہا تھا۔

”آپ کو شاید یہ بھی سن کر تعجب ہو گا کہ شیخ حامد پر وہ مجھے بھی اپنا سب سے بڑا مخالف سمجھ رہا ہے۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا پھر مسکرا کر بولا۔ ”اب میں مناسب محول گا کہ ان باتوں سے بھی پردہ اٹھا دوں جو آپ

کشکول

کالی کی کڑواہٹ بھی اس میں شامل تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ اسے سات گھنٹے گزار جانے کے باوجود جملہ کرنے والوں کے بارے میں کوئی خاص اطلاع نہیں ملی تھی۔ ان تمام تر پیشانیوں کو نظر انداز کر کے اس نے کنول کے اس جیتے ہاتھ سے ہتھکڑیوں کو دیکھا تو ذہن پر ہلکے ہلکے نشے کی ترنگ کا احساس ہوا۔ اس کا غصہ جھاک کی طرح بجھنے لگا۔

کنول نے اس وقت تیل باغ ٹائپ لباس پہن رکھا تھا۔ اس چست لباس نے اسے دو آنسو بہا کر رکھا تھا۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز چست لباس سے سرکشی کرتے نظر آ رہے تھے۔ شیخ حامد نے کنول کو صرف ”آخری حربے“ کے طور پر استعمال کرنے کے لیے بہت سنہنیا کر رکھا ہوا تھا۔ کسی کاروباری معاملے میں سودا نہ بننے کی صورت میں ہی وہ اسے پارٹی کے سامنے لاتا تھا اور..... کنول جس انداز میں اس کی آؤ بگٹ کرتی تھی وہ پارٹی کو ”بگلا بگٹ“ بنادیتا۔ وہ رانی کی مہنگی شراب کی طرح رنگوں میں سرایت کر جاتی پھر..... سامنے والی پارٹی..... گویا ”عمل ختم“ کے زیر اثر آکر معمولی رد و بدل کے بعد ڈیل پر دستخط کرنے پر آمادہ ہو جاتی..... اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتوں کو تنگ لگ جاتا۔ کاروباری کام تو سو بھر بوجھ اور دور اندیشیاں بھی کنول کی بلوری آنکھوں سے چھلکتی شراب کی مستیوں میں غرق ہو جاتیں۔ شیخ حامد بدلت ہو جی کچھ ایسی ہی کیفیتوں سے دوچار ہو گیا۔

کسی آدم خور شیر کی کچھار پر ایک ذرا خطرہ محسوس ہوتا وہ جب تک خطرے کے اسباب نہ معلوم کر لے، سکون سے بیٹھ نہیں لیتا، شیخ حامد کو بھی اس وقت سکون کی ضرورت تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی ذہنی سکون کی خاطر خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ دل بہلانے کا عادی تھا، یہی وجہ صابن گیم کی حرام موت کا سبب بنی تھی جس نے اس کے ذہن کو اس حد تک جھکا کر ڈال دیا تھا کہ وہ ایس بی اور اورنگ زیب جیسے اثر و رسوخ رکھنے والے سے بھی اچھے لگتا تھا۔ اب کسی نامعلوم دشمن نے براہ راست اس کے بیٹھنے کو نشانہ بنا دیا تھا۔ اس وقت اسے ذہنی انتشار کو دور کرنے کی خاطر سکون کی ضرورت تھی۔ سکون کے لیے عورت کا چٹکا مل کھانا جسم اس کے لیے ہمیشہ بڑی موثر طاقت ہوتی تھی۔ کنول بھی ایک ایسی سیل بند بونل تھی جس کو اس نے اپنے کاروبار کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ اس کے اپنی انتشار کو دور کرنے کا ذریعہ بھی بن سکتی تھی۔ اس کی

”کیا بات ہے سر.....؟“ کنول نے کسی مہیا کی طرح

”ہاں..... کچھ ایسی ہی بات ہے۔“

شیخ حامد خاموشی سے جا کر اپنی رپوالنگ چیز پر بیٹھ گیا۔ وہ کنول کے سلسلے میں خلاف عادت بڑے صبر اور احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”آپ کچھ پینا پسند کریں گے.....؟“ کنول اس کے قریب آکر کھڑی ہوئی۔ اس کا قریب شیخ حامد کے لیے کڑی آزمائش تھی، پہلے وہ ہمیشہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر گفتگو کرتی تھی۔ آج اس کی چہرے کے بالکل قریب آئی تھی، اس کے جسم کی مہک اور پیش کا احساس شیخ حامد کو گدگدائے لگا۔

”نہیں.....“ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

”میں دفتر میں پینے کے اصول کے خلاف ہوں۔“

”آپ نے اپنی پریشانی کی وجہ نہیں بتائی۔“ کنول نے ایک ہمدردی حیثیت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟“

جواب میں شیخ حامد نے کنول کی طرف دیکھا تو اس کی سحر آلود آنکھوں کا نقشہ خود کر گیا، غیر اختیاری طور پر اس نے سیدھا ہاتھ کنول کی کمر میں ڈال کر ایک ذرا اشارہ دیا تو وہ کسی کیے ہوئے پھل کی طرح اس کی آغوش میں آگری۔ ایک لمحے کو فطری شرم کے احساس نے کنول کو بولکھل دیا۔ اس نے پچھپچھا کر ایک مرد کی آغوش سے دور جانے کی کوشش کی لیکن شیخ حامد کے ہاتھوں کے حصار سے نہ نکل سکی۔

”اس وقت صرف تم مجھے سکون پہنچا سکتی ہو۔“ اس کا ہاتھ پکڑنے لگا۔

”سر..... یہ دفتر ہے اور میں.....“ ایک مرد کی ہنسی ہوئی گرم تپش خود اس کے سینے میں بھی پھیل چاری تھی۔ اس نے پھل کر کہا۔ ”یہ گناہ ہے سر، جس کی دلدل سے ابھی تک میں محفوظ رہی ہوں..... پلیز.....“

”پریشان مت ہو، میں تمہارے اعتماد کو خدشہ نہیں پہنچاؤں گا۔“ شیخ حامد نے خلاف توقع اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ کنول کسی پھل کی طرح تڑپ کر اس کے جال سے نکل گئی۔ اس کے سینے کا زبردی ابھی تک اس کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔ ”فی الحال تم اپنے کمرے میں جاؤ، ضرورت ہوئی تو تم سے انٹرکام پر رابطہ کروں گا۔“

”آ..... آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں سر.....؟“ اس نے سبے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ملازمت سے چھٹی مل جانے کا احساس اس کے کمزور وجود میں اترنے لگا، وہ وہ جانتی تھی کہ بدن کا معاوضہ اسے موجودہ تنخواہ سے کہیں زیادہ مل سکتا تھا لیکن وہ تنخواہ عزت کے ساتھ نہیں اور نہیں مل سکتی تھی

صلۂ احسان

کاشف زبیر

کبھی انسان اپنی فطرت کے مطابق نیکی کرتا ہے اور کبھی کبھی حالات کے تحت ایسا کام کر گزرتا ہے جو شاید پرسکون زندگی میں سوچ بھی نہ سکے۔ بہر حال کسی کو نتائج کی پروا ہو یا نہ ہو قدرت کب کسی کی منتشا کے مطابق لوٹاتی ہے۔ وہ تو بس مکافات عمل پر کار فرما رہتی ہے۔ ان کے حصے میں بھی ویسی ہی فصل آئی جیسا انہوں نے بویا تھا... اور ایسا تو ایک دن ہونا ہی تھا۔

مشاد احساسات کے درمیان کشش کا دلچسپ ماجرا

ڈین مارکس اس وقت بڑی مشکل میں تھا۔ وہ اس کی بیوی مارشا اور دو چھوٹی بیٹیاں ریٹا اور لیزا دو طرف سے گھرے ہوئے تھے اور ان پر فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ دریائے کولور یڈو کے جنوب میں یہ سارا علاقہ تنگ پھنچی ہوئی چٹانوں پر مشتمل تھا اور ان سے گزرنے کا راستہ بھی تلاش کرنا پڑتا تھا۔ صرف تین دن پہلے ڈین اور اس کا خاندان کولور یڈو کے شمال میں ایک سرسبز وادی میں سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔ 1798ء میں ڈین کا دادا آئر لینڈ سے



وقت بھی اس نے کئی بار کنول کو نظر بھر کر دیکھا تھا پھر خود مصروف رکھنے کی خاطر اس نے موبائل اٹھا کر بلیک ٹائیگر کے نمبر ملائے، کنول سر جھکائے کافی پینے میں مصروف تھی۔ ”کوئی سرائے ملا؟“ اس نے رابطہ قائم ہونے کے بعد سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”جن دو آدمیوں کی لاشیں ملی ہیں وہ ایک مقامی بد معاش گینگ کے آدمی تھے۔“ دوسری سمت سے جواب ملا۔ ”میں نے بذات خود اس بد معاش کے اڈے پر جا کر اسے کھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ دو روز پہلے ان دونوں مرنے والوں نے کسی وجہ سے ایک دن کی چھٹی باگی تھی۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ شیخ حامد کی پیشانی پر شکنیں ابھرنے لگیں۔ ”میرے اندازے اور دوسری اطلاعات کے مطابق حملہ کرنے والے دو سے زیادہ کی تعداد میں تھے۔“

”میں یہی بتانا چاہتا تھا کہ حملہ کرنے والے افراد نے ہمیں دھوکا دینے کی خاطر دوسرے مقامی آڈوں سے بھی کچھ آدمی کرائے پر حاصل کر لیے تھے۔“

”اور کوئی خاص رپورٹ؟“

”آپ کے ساتھ اس وقت کوئی اور ہے؟“

”ہاں۔“ شیخ حامد نے کنول پر نظر ڈالی جو بہ دستور کافی پینے میں مصروف تھی۔

”رستم علی آغا خانی کل شام سے ابھی تک اپنی کوشی کے اندر ہی ہے۔ میرے آدمی اس کی نگرانی پر مامور ہیں۔ جیسے ہی کوئی کام کی بات معلوم ہوئی، آپ کو فوری اطلاع دوں گا۔“

”مجھے اطلاع نہیں۔ رزلٹ چاہیے۔“ اس نے

نچلا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”مخالفوں کو زیادہ ڈھیل دینا بھی میرے اصول کے خلاف ہے۔“

”آپ صرف اشارہ کر دیں۔“ دوسری جانب سے جواب ملا جس طبقے سے ہمارے مشتبہ شخص کا تعلق ہے وہ زیادہ

جید نہیں ہوتے۔ معمولی سختی ہی سے ان کی زبان فر فر چلنے لگتی ہے۔ حکم ہوتا ہے تو دو گھنٹے کے اندر اندر اٹھالیا جائے۔“

”ابھی نہیں۔ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

شیخ عابد نے موبائل آف کیا تو کنول نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کچھ سہمے انداز میں بولی۔ ”سر۔۔۔۔۔ آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں؟“

”کیوں۔۔۔۔۔ تمہیں اس کا اندازہ کیسے ہوا؟“

اس پر اسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

جو حامد ایسوی ایش میں مل رہی تھی۔

”ٹھیک ہے تم دو کپ کافی بتاؤ۔“ شیخ حامد نے اسے محبت سے دیکھا۔ ”آج میں تمہارے ساتھ کافی پیوں گا۔ آنے سامنے۔۔۔۔۔ دور دور پیٹھ کر۔“

کنول نے اسے ممنونیت سے دیکھا پھر اگلے قدموں اپنے مختصر آفس میں چلی گئی۔ شیخ حامد کے ذہن میں پھر رستم علی آغا خانی کا نام گردش کرنے لگا لیکن ابھی اس کے شہرے کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی جس کے سبب وہ کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں موبائل ٹنگنا پیا۔ اسکرین پر لوڈی کا نام دیکھ کر اس کی پیشانی ٹھن آلود ہو گئی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے موبائل آن کر کے خشک لہجے میں سوال کیا۔

”میرے۔۔۔۔۔ میرے آدمی برابر سرائے لگانے میں مصروف ہیں لیکن۔۔۔۔۔“

”اور کوئی خاص بات۔۔۔۔۔؟“ اس نے اچھے کلمات کاٹی۔

”میں نے ایک اور پرانے شکار پر اپنے اعتماد کے کچھ

لوگ لگا رکھے تھے۔ آج وہ ہمارے قبضے میں آ گیا تھا۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“

”سیٹھ عثمان کا ڈرائیور لیاقت حسین جو چار مرتبہ ہمارا

راستہ کاٹ چکا ہے۔“

”ریش۔۔۔۔۔“ شیخ حامد تھملا اٹھا۔ ”تمہیں اس کام کے

لیے کس نے اجازت یا حکم دیا تھا؟“

”آپ کا پرانا تنگ خوار ہوں سراس لیے۔۔۔۔۔“

”لیاقت حسین اس وقت کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“ اس نے

لوڈی کی بات سے بغیر جھلا کر پوچھا۔

”وہ میرے آدمیوں کے قبضے میں آ گیا تھا سر لیکن

حیرت انگیز اور پراسرار طور پر مسلح آدمیوں کو موت کے گھاٹ

اتار کر صاف نکل گیا۔“

لوڈی جیسے جیسے تفصیل بیان کر رہا تھا، شیخ حامد کا چہرہ غصے

سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ ”لوڈی۔۔۔۔۔ پوری بات سننے کے بعد اس

نے بے حد سرد انداز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اسپتال میں علاج

کے دوران تمہارا کوئی دائمی اسکر وڈر ہلچا چھوڑ دیا ہے۔“

”میری بات کا یقین کریں سر۔۔۔۔۔ اس شخص کے اوپر

یقیناً کسی جنت کا سارہ۔۔۔۔۔“

”جو اس بند کرو۔۔۔۔۔“

شیخ حامد کا ذہن لوڈی کی بات سن کر اور کندھ ہو گیا۔۔۔۔۔

کنول۔۔۔۔۔ کافی کے ساتھ آگئی تھی اس لیے اس نے موبائل آف

کر کے اپنے غصے پر بڑی حد تک قابو پا لیا تھا۔ کافی پیتے

اگر اس وادی میں آباد ہوا تھا، اس وقت تک حملہ آور سفید فاموں نے اس علاقے سے مقامی انڈین قبائل کا صفحہ پاک کر دیا تھا۔ نصف صدی سے جاری خون ریز جنگوں میں رخ جدید آتشیں اسلحے کی ہوئی تھی۔ تیر کمان سے مسلح انڈین قبائل کولورڈو کے جنوب مغربی علاقوں کی طرف پلپا ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ڈین کے باپ اور دادا نے محنت کر کے یہ فارم بنالیا تھا اور ڈین ان کی محنت کا پھل کھا رہا تھا۔ اس علاقے کی سب سے بہترین مٹی، آلودہ ترین اوس کی زمین پر پیدا ہوتا تھا اور بیویاری منہ مانگے داموں اس کی فصل لے جاتے تھے۔ دولت آئی تو ڈین نے پرانے مکان کو گرا کر دو منزلہ شاندار گھر تعمیر کیا اور اس علاقے کی سب سے حسین لڑکی مارشا سے شادی کی۔ خود ڈین بھی وجہ تھا لیکن مارشا واقعی بے مثال تھی۔ اس شادی نے کتنوں کے سینوں پر سانپ لونا دیے تھے جن میں ایڈگر کا بھی شامل تھا۔ ایڈگر عرف ایڈی کا شمار اس علاقے کے نامی گرامی بدعاشوں میں ہوتا تھا۔ وہ مارشا کو پسند کرتا تھا لیکن مارشا اسے سخت ناپسند کرتی تھی۔ ایڈگر مارشے کے باپ جو مائیکل خوف زدہ تھا جو بھڑین نشا نے بازو تھا اس لیے ایڈی اپنی حد میں رہا۔

پھر مارشا نے ڈین کو چن لیا تو معاملہ ہی ختم ہو گیا لیکن ایڈی کے اندر کہیں ایک آگ جلتی رہتی تھی۔ وہ موقع کا انتظار کر رہا تھا اور پھر اسے موقع مل گیا۔ مارشا کا باپ ایک غیر متوقع لڑائی میں مخالف کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ جس کی نشا نے بازی سے ایڈی سمیت اس کے تمام حریف خوف کھاتے تھے اس لیے حریف نے اسے اچانک دھوکے سے مارا تھا۔ مارشے کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا تو ڈین کے لیے بھی فکری بات تھی۔ ڈین لڑنے بھڑنے والا شخص نہیں تھا۔ وہ ایڈی کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ ایڈی صرف جو کے خوف سے خاموش تھا لیکن اب جو نہیں رہا۔ شادی کے پانچ سالوں میں ان کی دو بیٹیاں ہو گئی تھیں۔ ریٹا چار سال کی اور لیزا دو سال کی۔

جو کی تدفین کے بعد ڈین نے مارشا سے اپنے خدشات کا اظہار کیا اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”اس بات کو پانچ سال گزر چکے ہیں اور اب میں دو بچیوں کی ماں ہوں۔“ ”ایڈی جیسے لوگ اپنی شکست نہیں بھولتے۔“ ڈین نے کہا۔ ”اب اسے تم سے کوئی غرض نہیں ہوگی وہ بس اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہے گا۔“ ”تب ہم کیا کریں؟“ مارشا بھی فکرمند ہو گئی۔

ڈین کے پاس رقم تھی، اس نے دو اچھے نشانے باز پیکاک اور میٹش رکھ لیے۔ وہ فارم اور اس کے گھر کی حفاظت کرتے تھے۔ ڈین بھی اسلحے کا استعمال جانتا تھا لیکن اس کا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا دوسرے وہ جنگ وجدل کو پسند نہیں کرتا تھا جبکہ ایڈی کے لیے اس سے زیادہ لذت انگیز کام کوئی نہیں تھا لہذا اگر مند ہونا درست تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جلد یا بدیر ایڈی اپنے آدمیوں سمیت اس کے فارم کا رخ کرے گا اور اس کے بعد نہ جانے کیا ہوگا۔ اس کا اندیشہ بہت جلد درست ثابت ہوا۔ ایک رات جب وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک ہی اس کے فارم پر چاروں طرف سے گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ مارشا چلانے لگی اور بچیاں روئے نکلیں۔ ڈین نے جلد ہی انہیں بیڈ کے نیچے ایک چھوٹے سے محفوظ خانے میں منتقل کیا اور خود اپنی رائفل اور گولیوں کی پٹی سمیٹتے ہوئے مکان کے اوپر کی جھ سے اپنے آدمیوں کے پاس آ گیا۔

پیکاک نے اسے بتایا۔ ”ہم نے دو حملہ آور مار گرائے ہیں لیکن وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔“ واقعی حملہ آور بہت تھے۔ کم سے کم بھی نصف درجن افراد باہر سے اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے جبکہ دوارے جا چکے تھے۔ ڈین بھی مدافعت میں شامل ہو گیا مگر وہ تین تھے۔ حملہ آور رفتہ رفتہ اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ پیکاک نے ڈین سے کہا۔ ”تم اپنے بیوی بچوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔“ ”وہ کیسے؟“ ڈین نے پوچھا۔ ”یہ چاروں طرف موجود ہیں۔“

”انہوں نے تھپے کی طرف گھیرا سخت کیا ہوا ہے تاکہ کوئی نکل کر تھپے کی طرف نہ جاسکے لیکن کولورڈو دریا وادی کی طرف گھبراہٹ سے تم اپنی بیوی اور بچیوں کو کبھی میں لے کر نکل جاؤ۔“ پھر ڈین بہ مشکل مارشا اور بچیوں کو لے کر اپنی بھٹی میں وہاں سے نکل گیا۔ ان پر گولیاں برس رہی تھیں اور ڈین کو لگ رہا تھا کہ ان میں شاید ہی کوئی زندہ بچے لیکن حیرت انگیز طور پر وہ سب سلامت رہے تھے۔ ڈین کو صرف جان بچانے کا خیال تھا اسے یہ خیال نہیں آیا کہ وہ گھر سے رقم اور دوسری قیمتی اشیاء اٹھا لائے۔ یہ کام مارشا نے کیا تھا جسے ان حالات میں بھی یہ خیال رہا تھا۔ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر وہ فارم سے دور نکل جانے میں کامیاب رہے تھے لیکن جب صبح ہوئی تو انہوں نے خود کو دریا کے نزدیک ایک ویران علاقے میں پایا۔ یہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ بھوکے تھے۔ بھی میں چنوں کا ایک تھیلہ پڑا تھا، وہی ان کے

کام آیا۔ ساری رات جاگنے کے بعد بچیاں تھک کر سو گئیں۔ لیکن مارشا اور ڈین کی نیند بہ دستور غائب تھی۔ ”مجھے یقین ہے وہ پیچھے آئیں گے۔“ مارشا سسکی۔ ”نہ جانے انہوں ہمارے گھر کا کیا ہتھکڑیا ہوگا؟“ ”گھر کو چھوڑ دو اپنی فکر کرو۔“ ڈین نے کہا۔ ”ہم ہیں تو سب ہے ورنہ سب بیکار ہے۔“ ”میرا خیال ہے رات بھر میں ہم بہت دور نکل آئے ہیں اب وہ ہمارے پیچھے نہیں ہوں گے۔“ مارشا نے امید سے کہا۔

لیکن ڈین کا خیال تھا ایڈی اس وقت تک ان کا پیچھا کرے گا جب تک وہ انہیں مار نہیں دیتا۔ وہ اسی قسم کا کینہ پرور شخص تھا۔ اس لیے وہ ابھی محفوظ نہیں تھے۔ پھر بھی ہمیں آگے سفر کرنا چاہیے۔ اب ہم اس ریاست میں نہیں رہ سکتے ہیں۔“

”پھر کہاں جائیں گے؟“ ”کیلینوینیا۔“ ڈین نے فیصلہ کر لیا۔ ”میں نے سنا ہے وہاں زرخیز زمینیں بہت کم داموں میں مل رہی ہیں اور حکومت لوگوں کو آباد ہونے میں مدد بھی دیتی ہے۔“ کچھ دیر آرام کے بعد وہ دوبارہ روانہ ہوئے۔ ایک جگہ سے انہوں نے دریا عبور کیا اور ڈینے سے بال بال بچے کیونکہ بارشوں کا موسم تھا اور دریا میں پانی خاص تیز تھا۔ دریا کے دوسری طرف آنے کے بعد ڈین نے کسی قدر اطمینان محسوس کیا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ ایڈی اور اس کے آدمی دریا کے پار تک اس کا پیچھا نہیں کریں گے لیکن یہ اطمینان اس وقت ختم ہو گیا جب دوسرے دن وہ تنگ چٹانوں میں راستہ تلاش کر رہے تھے اور اچانک ہی ان پر ایک بار پھر گولیاں برسنے لگیں۔ پہلے تو ڈین کو خیال آیا کہ وہ رنرزوں کے ترنچے میں آگئے ہیں لیکن جلد ہی چٹانوں کے اوپر سے ایڈی نے اسے پکارا۔

”ڈین تم چاروں طرف سے گھر چکے ہو۔ ان چٹانوں سے زندہ واپس نہیں جاسکتے اس لیے میرے ساتھ بھجوا کر لو۔“ ”کیسا بھجواتا؟“

”مارشا کو میرے حوالے کر دو، ایک بار میں اسے۔۔۔۔۔۔ اسے آگے ایڈی کے منہ سے صرف گندگی اگل رہی تھی اور ڈین نے اس کا جواب فائر سے دیا۔ ایڈی نے تہہ نہ لگایا۔ ”ڈین تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اس لیے بہتر یہ بات مان کر اپنی اور اپنے خاندان کی جان بچاؤ۔“

ڈین مارشا اور بچیاں ایک چھوٹی سی چٹان تلے تھے اور وہ ہمیں محفوظ تھے اس سے ذرا سا باہر نکلے پر وہ ایڈی اور اس کے ساتھیوں کے نشانے پر آ جاتے۔ شام ہو رہی تھی اور صبح ہونے پر وہ بالکل واضح ہو جاتے۔ پھر دن میں یہ چٹانیں دھوپ میں تھیں لہذا چٹانوں اور ان کے پاس پانی نہیں تھا۔ رات تو جیسے جیسے گزر جاتی لیکن دن گزرا تا مگر نہ تھا، وہ بھی دو چھوٹی بچیوں کے ساتھ۔ وقت گزر رہا تھا اور ڈین چونکا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا اور اسے اپنے سارے خاندان کی موت قبول تھی لیکن ایڈی کا مطالبہ قبول نہیں تھا۔

+++

اپوچی ایک جنگجو انڈین تھا۔ اس کا قبیلہ صدیوں سے دریائے کولورڈو کے شمال مشرقی کنارے پر آباد تھا لیکن غاصب سفید فاموں نے ان کی زمینیں ہتھی کر انہیں جنوب اور مغرب کی طرف دھکیل دیا۔ اس طرف بے آب و گیاہ چٹانوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس در بدری میں قبیلے کے بہت تھوڑے سے لوگ زندہ بچے تھے اور جو بچے تھے وہ بھی زندگی کے آخری سالیں گن رہے تھے کیونکہ ان کے پاس زمین نہیں رہی تھی اور نہ ہی کھانے کو کچھ تھا۔ اپوچی اپنے لوگوں کو بھوکا مرنے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت نکلا کر کہیں سے خوراک کا بندوبست کرے لیکن خوراک کیا ملتی البتہ ان کا سامنا ایک فوجی دستے سے ہو گیا جو خاص طور سے انڈین قبائل کے صفائے کے لیے اس علاقے میں موجود تھا۔ فوجی دستے نے انہیں دیکھتے ہی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اپوچی اور اس کے ساتھیوں نے مدافعت کرنا چاہی لیکن ان کے پاس اسلحہ محدود اور پرانا تھا جبکہ فوجی جدید ترین اور زیادہ اسلحے سے لیس تھے۔ میں منٹ کی اس مختصر جھڑپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف اپوچی بچا تھا اور بھی وہ زخمی حالت میں فرار ہونے پر مجبور تھا۔ ایک گولی اس کے بائیں شانے میں اتر گئی تھی۔ زخم کاری نہیں تھا لیکن گولی اندر رہ گئی تھی اور اسے بے پناہ تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے کسی طرح تعاقب میں آنے والوں سے جان چھڑائی تھی اور گھوڑے پر دریا عبور کر کے دوسری طرف آ گیا۔ درحقیقت دریا درمیان میں آنے سے اس کی جان بچی تھی اور فوجی واپس چلے گئے تھے۔

اب تک اپوچی ہمت سے کام لے رہا تھا لیکن دریا عبور کرنے کے بعد وہ نڈھال ہو گیا اور اپنے گھوڑے کی گردن سے چمٹنے کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ گھوڑا خود اسے لے کر چلا رہا تھا۔ وہ رات بھر اسی طرح سفر کرتا رہا پھر فائرنگ کی آواز نے اس کے حواس کو بھجوا دیا اور وہ جاگ اٹھا۔ کہیں پاس

فی فائزنگ ہو رہی تھی۔ وہ چٹانوں کے درمیان تھا۔ اس نے گھوڑا ایک جگہ بنا دھا اور خود راغلل سے لڑوٹا ہوا چٹانوں پر چڑھنے لگا۔ اوپر چڑھتے بغیر وہ صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ایک چٹان پر چڑھتے ہی اسے وہ چار آدمی دکھائی دیے جو نیچے فائزنگ کر رہے تھے اور ان کا انداز بتا رہا تھا انہوں نے کسی کو گھیر لیا ہے۔ وہ سفید فام تھے۔ اپنی کوئیال آیا کہیں انہوں نے اس کے کسی ساتھی یا قیدی والے کو تو نہیں گھیر لیا ہے۔

مگر فوراً ہی یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ اوپر والے کسی آدمی سے بات کر رہے تھے اور وہ بھی انگریزی بول رہا تھا گو یا سفید فاموں نے کسی سفید فام ہی کو گھیر رکھا تھا۔ اسے کسی قدر انگریزی آتی تھی اور اس نے محسوس کیا کہ اوپر والے نیچے والے شخص سے کسی چیز کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بہر حال اسے ان کے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ جس طرح خاموشی سے آیا تھا اسی طرح نیچے اترنے والا تھا کہ چاک بتی اسے کسی نیچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ خود اپنی کئی نیچے تھے اور اسے اندازہ تھا کہ نیچے کی عمر دو تین سال سے زیادہ نہیں تھی۔ آواز نیچے سے آ رہی تھی جس طرف یہ اوپر موجود چار سفید فام فائزنگ کر رہے تھے۔ نیچے نیچے موجود تھے اور ان لوگوں کو ان کا بھی خیال نہیں تھا۔ اپنی کو غصہ آنے لگا۔ نیچے والا شخص چیخ چیخ کر فائزنگ روکنے کو کہہ رہا تھا اور اوپر والوں نے قہقہہ لگانا شروع کر دیے تھے۔

++++

ڈین کا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا اور اس تنگ سی جگہ میں وہ زیادہ دیر محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ ایڈر فائزنگ کر رہا تھا اور ڈین اپنے بیوی بچوں کے سامنے ڈھال بنا ہوا تھا لیکن نہ جانے کیسے ایک گولی اچٹ کر رہا کہ پیر کو چھوٹی گزری، اسے زخم آیا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ بارش اس کے پاؤں سے خون روکنے کے لیے اسے ہاتھ سے دبا رہی تھی۔ دین کا کا خون دیکھ کر ڈین پاگل ہو گیا تھا۔ اگر مارشا اسے نہ روکتی تو وہ شاید آڑے نکل جاتا اور فوراً ہی مارا جاتا۔

”خدا کے لیے نہیں اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا ہو گا؟“

”یہاں بیٹھے رہنے کی صورت میں بھی تو مارے جائیں گے۔“

مارشا اب تک خاموش تھی لیکن اپنی بیٹی کا خون دیکھ کر اس سے رہنا نہیں گیا تھا۔ اس نے ڈین سے کہا۔ ”سنو میں ایڈی کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ ڈین تندہ لہجے میں بولا۔

مارشا رو دی تھی۔ ”ڈین اگر میری بیٹیوں کو کچھ ہوا تو میں بھی مر جاؤں گی اس لیے ہمیں یہ کڑوا گھونٹ پینا ہوگا۔“

ڈین اس کے لیے تیار نہیں تھا لیکن مارشا کے زور دینے پر وہ مان گیا، اپنی بیٹیوں کو مرنے دیکھنا اس کے بس سے بھی باہر تھا۔ اس نے مجبوراً ایڈی سے کہا۔ ”میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں لیکن تم مارشا کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔“

ایڈی اور اس کے ساتھی ہنسنے لگے پھر ایڈی نے کہا۔ ”تم مجھے تو تم سے بہت پیار سے رکھیں گے۔“

ایڈین ہنس رہے ہوش تھا، اس کی آنکھیں نیم وا تھیں لیکن وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ جب تک ڈین بھی تلاش کر کے لایا۔ مارشا نے اپنے لباس سے ایک پٹی پھاڑ کر ایڈین کا زخم صاف کیا۔ گولی اندر ہی تھی اور اس نے زخم کو خراب کرنا شروع کر دیا تھا۔ گولی نکالنا لازمی تھا۔ ڈین بھی سے مرہم پٹی کا سامان نکال کر لایا۔ پھر اس نے ٹکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی مارشا نے بیٹیوں کو ڈین کے سپرد کیا اور خود ایڈین کے شانے سے گولی نکالنے کی تیاری کرنے لگی۔ اس نے آگ پر جا تو تیار کیا پہلے اسے صاف کیا اور پھر ڈین سے کہا۔ ”اسے مضبوطی سے پکڑو میں گولی نکالتی ہوں۔“

چند منٹ میں وہ ایڈین کے شانے سے گولی نکال کر زخم کو گرم چاقو سے داغ چکے تھے۔ پھر مارشا نے ریٹا کے پاؤں کی مرہم پٹی کی۔ ڈین، ایڈین اور ایڈی کے مارے جانے والے ساتھیوں کے گھوڑے بھی لے آیا تھا۔ ایڈی فرار ہو گیا تھا اور ڈین کو اس کا افسوس تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کینہ پرور شخص دوبارہ اس کے پیچھے آئے گا۔ تین دن میں اس کے پانچ ساتھی مارے جا چکے تھے لیکن اس کے پاس بد معاشرہ کی کسی بھی نہیں تھی۔ شانے سے گولی نکل جانے کے بعد ایڈین سکون سے سو گیا تھا۔ مارشا نے اسے کچھ پانی بھی دیا تھا۔ ڈین پانی کی تلاش میں نکلا تو اسے کچھ دھری دیار کی ایک اندر تک آتی شاخ مل گئی۔ وہ پانی لے کر آیا تو ٹھکن اور بھوک سے نڈھال مارشا نے کھا کر سو گئی تھی پچاس اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ ڈین نے اسے اطمینان جمع کر لیا، اس وقت اسے اسے کی اشد ضرورت تھی۔ اس نے مارشا اور بیٹیوں کو اٹھا کر کھمبے میں بٹھج دیا، وہاں وہ آرام سے سو سکتے تھے۔ خود وہ الاؤ اور ایڈین کے پاس بیٹھا رہا۔ اپنی دو گھنٹے بعد بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے ڈین کی طرف دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔

”میرے شانے سے گولی نکال دی ہے؟“

ڈین نے سر ہلایا۔ ”میری بیوی نے نکالی ہے۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔ اگر تم ان بد معاشرہ کو نہ مارے تو وہ تمہیں مار دیتے۔“

”اگر میں تمہاری بیٹی کے رونے کی آواز نہ سن لیتا تو اس معاملے میں دخل نہ دیتا۔“ اپنی نے انگاروں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاس پانی ہے؟“

مغرب کی طرف دھکیل دیا تھا جہاں نہ پانی تھا اور نہ زرخیز زمینیں۔ پانی کی کرپوچی نے ڈین کو اپنی داستان سنائی۔ وہ جانتا تھا کہ کرپوچی نے اس میں ایک لفظ جھوٹ کا نہیں کہا ہوگا۔ ڈین نے اس بارے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی لسل کے لوگ ان مقامی لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں لیکن اس وقت وہ خود اس تجربے سے گزر چکا تھا جس سے مقامی لوگ آئے دن گزرتے تھے۔ جس طرح انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا جاتا تھا اسی طرح ڈین اور اس کے خاندان کو ان کی زمین سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ صرف جان بچانے کے تھے اور ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔

”میرے قبیلے کے بچے کچھ لوگ ایک خشک وادی میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں ان کے لیے خوراک لینے گیا تھا لیکن.....“ اپنی خاموش ہو گیا، اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ ”میرے ساتھ جانے والوں میں سوائے میرے کوئی نہیں بچا۔“

”مجھے تم سے ہمدردی ہے دوست۔“ ڈین نے کہا۔ ”کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا۔“

اپنی نے اٹھ کر اپنے شانے کا جائزہ لیا۔ وہ خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا، اس نے ڈین سے کہا۔ ”یہاں خطرہ ہے۔ اگر وہ شخص جو بیوی کو لے آیا تو ہم مارے جائیں گے۔“

ڈین چونک گیا وہ اپنی ایڈی جیسے کھنٹے شخص سے کچھ بعید نہیں کہ وہ فوج کو لے آئے اور ڈین کو بھی اپنی کا ساتھی ثابت کر دے۔ جو سفید فام ایڈین قابل کا ساتھ دیتا یا ان کی حمایت کرتا اسے بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اپنی سے پوچھا۔ ”یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم چھپ سکیں؟“

”وہ وادی ہے جہاں میرے لوگ چھپے ہیں۔ اس میں جانے کے راستے سے بس ہم ایڈین واقف ہیں۔ وہاں ایک غار میں پانی کا چشمہ بھی ہے۔ لیکن ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔“

ڈین، اپنی کے ساتھ اس وادی تک جانے کو تیار ہو گیا۔ وہ فی الحال ایڈی کی نظروں سے دور رہنا چاہتا تھا۔ مارشا کو معلوم ہوا تو اس نے دے لہجے میں اس کی مخالفت کی۔ ”ڈین، ہم نہیں جانتے یہ کس قسم کے ایڈین ہیں۔“

”اس شخص نے ہماری جان بچائی تھی۔“

”اس نے بچائی تھی لیکن اس کے قبیلے والے ہمیں اس طرح نہیں دیکھیں گے۔ وہ سفید فاموں کے ہاتھ سے زخم کھا چکے ہیں اور اس وقت غصے میں ہوں گے۔“

”مجھے یقین ہے اپنی ہماری حمایت کرے گا اور

دیکھ بھی اس کے قبیلے میں صرف عورتیں، بچے اور بوڑھے رہ گئے۔ اپنی کا کہنا ہے کہ لڑنے والے جوان آدمی اس کے ساتھ گئے تھے اور مارے گئے۔

”پھر بھی ہمیں اس کے ساتھ جانے کے بجائے سفر جاری رکھنا چاہیے۔“ مارشا نے اصرار کیا۔

”ایڈی سانپ کی طرح پلٹ کر وار کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ وہاں آئے گا۔ وہ ہمیں تلاش کر سکتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ضروری ہے، ہم کچھ عرصے تک روپوش رہیں۔“

”ان کے پاس خوراک بھی نہیں ہے۔ ہم کہاں سے کھا رہے ہیں؟“

”اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔“ ڈین نے جھنجھلا کر کہا۔ ”سب سے پہلے ہمیں کسی پناہ گاہ کی ضرورت ہے۔“

مارشا خاموش ہو گئی۔ شام کو وہ سب روانہ ہوئے۔

اپنی کا کہنا تھا کہ رات میں سفر مناسب رہے گا کیونکہ صبح سے چیلے ان کی تلاش شروع ہو جاتی، اس سے پہلے وہ وادی تک پہنچ جائیں تو بہتر ہے۔ ڈین نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ وہ صبح

ہوئے تک سفر کرتے رہے اور روشنی ہونے سے پہلے ہی وادی تک پہنچ گئے تھے۔ اس کے اندر جانے کا راستہ ایک

نہایت تنگ درے سے شروع ہوتا تھا جس میں آدمی اور کھوڑے بھی بے مشکل جا سکتے تھے، بھی جانے کا تو سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہلے اپنی اندر گیا اور اپنے ساتھ کچھ لوگ لے کر آیا جو سامان اور کھوڑوں کو اندر لے گئے تھے۔ ڈین

اپنی بھی لے لیے فکر مند تھا۔ وہ اندر نہیں جا سکتی تھی اور اگر کوئی ان کے پیچھے آتا تو کبھی سے وادی کا سراغ پا سکتا تھا۔ جب

ڈین اور مارشا وادی میں پہنچے تو حیران رہ گئے۔ اس علاقے اور پہاڑوں کی ویرانی سے قطع نظر وادی سرسبز تھی اور یہاں

جھاڑیوں کے ساتھ بڑے درخت بھی نظر آ رہے تھے۔

”ہم اس علاقے میں سفر کے دوران اس وادی کو پڑاؤ کے لیے استعمال کرتے تھے۔“ اپنی نے کہا۔ ”اب یہ ہماری پناہ گاہ ہے۔“

وادی میں اپنی کے قبیلے کے کوئی تین درجن افراد تھے اور جب اپنی نے بتایا کہ اس کے ساتھ جانے والے

مارے جا چکے ہیں تو ان کے لواحقین آہ و بکا کرنے لگے تھے۔ مارشا کا خدشہ غلط لگا تھا۔ ان میں سے کسی نے تو

انہیں نفرت سے دیکھا اور نہ ہی ان کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ البتہ وہ ان سے دور رہے تھے۔ قبیلے میں کوئی

بڑا نہیں تھا اور ایک طرح سے اپنی ہی ان کا سر ملے تھا۔ جیسے

ہی ڈین اس سے دوبارہ ملا اس نے بھی کے بارے میں اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں بھی کھول کر اندر لے آنا چاہیے۔“

”وہ کھل جائے گی؟“ اپنی نے پوچھا۔

”بالکل۔۔۔۔۔۔ بس دو تین آدمی جائیں۔“

اپنی نے چند آدمی اس کے ساتھ کر دیے اور وہ ان کے ساتھ جا کر بھی کے کھلنے کے لیے آیا۔ انڈینز کے

پاس خوراک بچ بچ بہت تھی۔ اپنی کی غیر موجودگی میں ان کی عورتوں نے وادی میں کچھ بودے دریافت کیے تھے جن

کی جڑیں کھاٹی جا سکتی تھیں۔ فی الحال وہی ان کی خوراک تھی۔ ڈین نے وادی کا جائزہ لیا۔ یہ خاصی بڑی تھی اور یہاں

پانی بھی تھا۔ ایک غار سے قدرتی چشمہ نکل رہا تھا اور اس کا پانی ایک تالاب کی صورت میں جمع ہوتا تھا۔ زمین ہموار تھی

اور ڈین کے خیال میں بہت زرخیز بھی تھی۔ اس نے اپنی سے کہا۔ ”اگر اسے کاشت کیا جائے تو بہت اچھی فصل ہو سکتی ہے

لیکن افسوس یہاں بچ نہیں ہیں۔“

”نہیں، بچ ہیں۔“ اپنی نے جوش سے کہا۔ ”ہم انڈین بچ ہمیشہ محفوظ رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کی طرح ان کی

حفاظت کرتے ہیں۔“

ان کے پاس کئی، آلو اور سبز یوں کے بچ تھے۔ اگلے دن سے ڈین نے اپنی اور اس کے ساتھیوں کی مدد سے

زمین جھاڑیوں سے صاف کر کے ہموار کرنا شروع کر دی۔ ان کے پاس اوزار نہیں تھے اس لیے سارا کام ہاتھوں اور

لکڑی کے معمولی اوزاروں سے کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ لوگ جیخوں میں رہتے تھے، اس لیے وہ اب تک کھلی جگہ پر رہتے تھے۔

ڈین نے اپنی کو قائل کیا کہ انہیں چٹانوں میں بنے غاروں میں رہنا چاہیے اور وادی کی زمین کو صرف کاشت کے لیے

استعمال کرنا چاہیے۔ خوش قسمتی سے ڈین کے پاس بھی میں کچھ اوزار تھے جیسے کھانڈی اور آری وغیرہ۔ ان کی مدد

سے انہوں نے ایک درخت کاٹ کر اس کی لکڑی سے مل اور دوسرے زرعی آلات تیار کیے۔ جوان مرد نہ ہونے کے برابر

تھے اس لیے عورتوں اور بوڑھوں کو بھی کام کرنا پڑا تھا۔

مارشا حیران تھی کہ ڈین اپنا راستہ لینے کے بجائے یہ سب کیا کر رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ دو تین دن بعد وہ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے لیکن دو ہفتے گزر جانے کے بعد بھی وہ

لگے لگے تو مارشا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک رات اس نے ڈین کو لیا اور وادی کے سب سے دور دراز حصے میں لے گئی جہاں ان کی گفتگو کوئی اور نہ سن سکے۔ مارشا نے کہا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو، اب ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

ڈین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ان لوگوں کو اس حال میں چھوڑ کر یہاں سے نہیں جا سکتا۔“

”کیا مطلب؟“

”دیکھو مارشا، اپنی ہمارا محسن ہے اس نے نہ صرف میری جان بلکہ تمہاری عزت اور ہماری بیٹیوں کی زندگیاں بھی

بچائی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے، ایڈی ایک بار ہم پر قابو پالیتا تو ہمیں چھوڑ دیتا۔ نہیں وہ اپنا مطلب نکال کر سب کو مار کر ان

چٹانوں میں کہیں دفن کر دیتا تا کہ اس کے جرم کا کوئی سراغ باقی نہ رہے۔ اب اپنی اور اس کے قبیلے والوں کو میری مدد

کی ضرورت ہے تو میں ان کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔“

”ہم ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“

”فی الحال تو جو کر رہے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے۔ ایک بار ان کی خوراک کا مسئلہ حل ہو جائے تو یہ اپنے

باقی مسائل سے خود نمٹا سکتے ہیں۔“

”کیا یہ اس علاقے میں محفوظ رہیں گے؟ اگر حکومت کو پتا چل گیا تو وہ انہیں یہاں سے بھی نکال دے گی۔“

اس کی بات سن کر ڈین سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”مارشا یہ بات بھول جاؤ کہ ابھی ہمیں یہاں سے جانا

ہے ہم یہیں رہیں گے اور دوسری بات یہ کہ ان کی عورتوں سے محمولو اور ان کی مدد کرو۔ تمہارا اس طرح الگ رہنا

اچھی بات نہیں ہے۔ یہ بہت محصور اور محبت کرنے والے لوگ ہیں، کیا تم نے ان کے انداز میں ذرا سی بھی نفرت

محسوس کی ہے؟ جبکہ ہمارے ہم قوموں نے ان کے ساتھ ظلم کی انتہا کر دی تھی۔“

مارشا نادم ہو گئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں اب خیال رکھوں گی اور میں تم سے شفیق ہوں کہ ہمیں ان کی

پوری مدد کرنا چاہیے۔“

ڈین نے سکون کا سانس لیا۔ ”فکر ہے تم میری بات سمجھ گئیں۔“

ان کے پاس کل ایک درجن کھوڑے اور گھوڑیاں تھیں۔ اپنی زخموں سے کام لیتا تھا اور مادوں کو اس نے

ذریعہ تھے۔ جو جڑیں وہ ابھی خوراک کے لیے استعمال کر رہے تھے ان کی تعداد محدود ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی چاہتا تھا کہ وہ وادی سے باہر جا کر خوراک تلاش کرے لیکن ڈین نے اسے منع کر دیا۔ ”اس میں خطرہ ہے۔ اگر ایڈی نے حکام کو تمہارے بارے میں بتایا ہو گا تو علاقے میں فوجی دستے

موجود ہوں گے۔“

”ہم ساری عمر تو اس وادی میں بند ہو کر نہیں رہ سکتے۔“

”میرے دوست تمہیں صبر سے کام لیتا ہو گا۔“ ڈین نے نرمی سے کہا۔ ”ابھی وادی سے باہر جانے کا موقع نہیں ہے

بلکہ وادی میں آنے والے راستے کو بھی بند کر دیا جائے تو بہتر ہو گا تا کہ کوئی اتفاق سے بھی اس راستے کو دریافت نہ کر سکے۔“

اپنی، ڈین سے شفیق نہیں تھا لیکن اس نے مخالفت بھی نہیں کی تھی۔ ڈین اور اس کے ساتھیوں نے مل کر راستہ

اس طرح بند کر دیا کہ باہر سے کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ دروازے کے جا کر کسی وادی میں کھلتی ہے۔ چاروں طرف اتنی

اونچی چٹانیں تھیں کہ وادی کی جگہ سے نظر نہیں آتی تھی حالانکہ اس کا قریب ایک مربع کلومیٹر سے ذرا کم ہو گا۔ خوراک رفتہ رفتہ

کم ہو رہی تھی اس لیے بھی اپنی اور اس کے ساتھی زیادہ فکر مند تھے۔ ابھی کئی، آلو اور سبز یوں کی فصل تیار ہونے میں

وقت تھا۔ اپنی یہاں سے کچھ دور ایک ایسی جگہ سے واقف تھا جہاں جنگلی پھینے ملتے تھے۔ سفید فاموں نے ایک پلاننگ

کے تحت جنگلی زمینوں کو ختم کیا تھا کیونکہ ہزاروں برس سے یہ جنگلی پھینے انڈین قبائل کی خوراک کا اہم حصہ تھے۔ یہ ختم

ہوئے تو انڈین قبائل کی خوراک کم ہو گئی تھی اور وہ بھوکوں مرنے لگے۔ ان کی زمینیں پھین کر انہیں بنجر علاقوں میں دھکیلنے

کا مقصد ان کی منظم کشتی کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک صدی کے اندر صرف کوکورو یڈوں میں دس لاکھ سے زیادہ انڈین مر چکے

تھے اور اب ان کی تعداد ہزاروں میں رہ گئی تھی۔

ڈین اس لیے بھی اپنی اور اس کے ساتھیوں کے باہر جانے کی مخالفت کر رہا تھا کہ اگر وہ پکڑے جاتے تو اس وادی کا پتا بتا سکتے تھے اور پھر ان میں سے کوئی نہیں چھٹا۔ فوج ڈین

اور اس کے بیوی بچوں کو بھی ختم کر دیتی اور اگر وہ فوج سے بچ جاتے تو ایڈی جیسا بد معاش انہیں نہ چھوڑتا۔ اس لیے وہ

اپنی کو سمجھا رہا تھا کہ وہ غلط سے کام نہ لے۔ ڈین نے زمین پر کام کے لیے کارکن تیار کر لیے تھے۔ یہ زیادہ تر

عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے۔ اپنی سمیت جوان جن کی تعداد نصف درجن بھی نہیں تھی۔ محنت والے کاموں اور

پہرے پر مامور تھے۔ اپوچی نے داخلی حصے میں ایک بلند جگہ گران چوکی بنادی تھی جہاں اس کے آدمی چوبیس گھنٹے اس پاس نظر رکھتے تھے تاکہ کوئی اس طرف آ رہا ہو تو وہ بروقت خبردار ہو جائیں۔

دو مہینے بعد ان کے پاس خوراک تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ بڑے بھوک سے نحیف اور نڈھال ہو رہے تھے اور بچے روتے رہتے تھے۔ ابھی کئی کئی فصل پکے تھے ایک مہینے سے زیادہ وقت تھا، آلو اس سے بھی زیادہ وقت لیتا البتہ کچھ سبزیاں جلد پک جاتیں مگر اس میں بھی کم سے کم دو ہفتے کا وقت چاہیے تھا۔ اگر انہیں خوراک نہ ملتی تو وہ اسے دن زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ڈین نے وادی میں ایسی جگہوں پر جہاں فصل نہیں لگائی جاسکتی تھی وہاں جنگلی گھاس کے بیج ڈال دیے تھے اور ان جگہوں پر بھی باقاعدگی سے پانی دیا جاتا تھا۔ اس سے وہاں بہت تیزی سے جنگلی گھاس اگ آئی تھی۔ گھوڑوں کو بھی گھاس کھلائی جاتی تھی، اس سے ان کی صحت برقرار رہی بلکہ کوئی خاص کام نہ کرنے کی وجہ سے وہ خاصے موٹے تازے ہو رہے تھے۔ ڈین نے اپوچی کو تجویز پیش کی۔

”ہم ایک دو گھوڑے کاٹ کر کھا لیتے ہیں۔“

اپوچی یہ سن کر پہلے تو دیکھ گیا تھا کیونکہ اس کے نزدیک یہ گھوڑے ان کی دولت تھے لیکن اگر وہ زعمہ اور مضبوط رہتے تب ہی گھوڑوں سے کام لے سکتے تھے۔ اگر وہ نہ رہتے تو گھوڑے کس کے کام آتے۔ اس لیے مجبوراً وہ ڈین کی تجویز سے متفق ہو گیا۔ انہوں نے ایک تقریباً بوڑھا ہو جانے والا گھوڑا کاٹ لیا اور وہ سب اسے تین دن تک کھاتے رہے۔ اس میں سے اچھا خاصا گوشت نکالا تھا۔ وہ اسے تین دن سے زیادہ کھا سکتے تھے لیکن اس کے بعد گوشت خراب ہو جاتا گھوڑے کا گوشت سوکھ کر اپنی توانائی کو دیتا ہے۔ اس لیے انہوں نے جلدی ختم کر لیا، اس سے ان کی توانائی آنے والے کئی دن کے لیے بحال ہو گئی مگر ایک ہفتے بعد انہیں دوسرا گھوڑا بھی کاٹنا پڑا۔ اس سے بھی آنے والے ایک ہفتے کی خوراک کا انتظام ہو گیا۔ موسم سرد اور خشک ہو رہا تھا اس لیے وہ اس بار چار دن تک گوشت بچانے میں کامیاب رہے تھے۔

اس کے بعد بزیوں کی فسطیوں کے بعد دیگرے پکے لگتی تھیں۔ یوں خوراک کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا اور جب مکئی اور آلو پکے تو خوراک ضرورت سے زیادہ ہو گئی تھی جسے اپوچی اور اس کے ساتھیوں نے اپنے طریقے سے محفوظ کر لیا۔ کئی مہینوں بعد ان کی زندگی میں خوشیاں آئی تھیں اور وہ خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ ایک رات انہوں نے اس کا جشن

منایا تھا جس میں انہوں نے جی بھر کھینچی سے کشید کی ہوئی شراب پی لی تھی۔ انڈین مورخین اپنے روایتی انداز میں رقص کر رہی تھیں۔ وہ مارشا کو بھی گھنچ کر اپنے ساتھ لے گئیں، وہ جیتے ہوئے ان کے انداز میں رقص کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈین اور اپوچی ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اچانک اپوچی نے کہا۔

”دوست میں تمہارا شکر گزار ہوں تم نے بہت دانش مندی سے ہمیں یقینی موت سے بچایا ہے۔ لیکن اب ہم کیا کریں؟“

”کیا مطلب؟“

”جب سفید فاموں کو اس وادی کا پتا چلے گا تو کیا وہ ہمیں یہاں سے بھی بے دخل نہیں کر دیں گے؟“

ڈین سوچ میں پڑ گیا۔ اپوچی کا خدشہ درست تھا اگر مقامی انتظامیہ کو ان انڈینز کا پتا چل جاتا تو وہ فوج بھیج کر انہیں یہاں سے بھی مار بھگاتے۔ حکام زرعی زمینوں پر انڈینز کو برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس نے اپوچی سے کہا۔ ”اگر میں مقامی حکام سے بات کروں اور تمہاری طرف سے ضمانت دوں کہ تم لوگ اب بھی فوج یا سفید فاموں پر حملہ نہیں کرو گے تو امکان ہے کہ تمہیں یہاں آباد ہونے کی اجازت مل جائے۔“

”امکان ہے۔“ اپوچی نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”یعنی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ انکار ہو جائے اور پھر ہمارے خلاف فوج کو بھیجا جائے یا ہمیں یہاں سے کہیں اور جانا پڑے۔“

”ایسا ہو سکتا ہے۔“ ڈین نے بے بسی سے کہا۔ ”میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں۔“

اپوچی نے سوچا اور سرد آہ بھری۔ ”ہاں دوست، تم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ تم دیے ہی ہمارے لیے بہت کچھ کر چکے ہو۔ بہتر ہو گا تم یہاں سے چل جاؤ تاکہ اگر ہم پر کوئی مشکل آئے تو تم اس سے محفوظ رہو۔“

ڈین بھی اب یہی سوچ رہا تھا۔ اس کے بس میں جو تھا وہ اس نے اپوچی اور اس کے قبیلے کے لیے کر دیا تھا، اب اسے اپنی بیوی اور بچیوں کے ساتھ کیلیفورنیا کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ وہاں اسے نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم بھی کہ وہ زمین خرید کر اسے آباد کر سکتا تھا۔ ڈین نے اپوچی سے کہا۔ ”تم شیک کبہ رہے ہو، میں کل تیاری کروں گا اور پرسوں ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

اگلے دن اپوچی اور اس کے ساتھیوں نے وادی میں آنے والا راستہ کھول دیا۔ ڈین نے بھی کے حصے وادی سے اپنا بیٹا لے کر انہیں جوڑنے لگا۔ شام تک اس نے بھی جوڑ لی گی اب وہ کل صبح یہاں سے روانہ ہو سکتے تھے۔ اس رات تمام قبیلے والوں نے ان کے اعزاز میں مشترکہ ضیافت دی تھی وہ ڈین اور مارشا کے احسان مند تھے جنہوں نے اس مشکل دور میں ان کا ساتھ دیا اور انہیں پھر سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ الاؤ روشن تھے اور ابھی کھانے پینے کا درجہ مل رہا تھا کہ نگرانی کرنے والے نے مخصوص آواز نکال کر خطرے کا سگنل دیا۔ ان میں افراتفری مچ گئی۔ ”الاؤ بھجا دیئے گئے۔ عورتوں اور بچوں کو غاروں میں بھیج دیا گیا اور مرد صبح ہو کر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد راستے سے نصف درجن کے قریب افراد نمودار ہوئے۔ جیسے ہی وہ سامنے آئے اپوچی نے بلند آواز سے کچھ کہا اور آنے والے رک گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ کچھ دیر اپوچی اور اس کے درمیان گفتگو ہوتی رہی پھر وہ آئے سامنے آ گئے اور مشعلیں روشن کر لی گئیں۔ یہ بھی انڈین تھے اور ان کے نقوش اور حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ اپوچی کے قبیلے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ابھی تک پرسکون تھے لیکن جیسے ہی ان کی نظر ڈین پر پڑی وہ ہلکے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار تان لیے۔

”یہ سفید فام یہاں کیسے آیا؟“ اپوچی سے بات کرنے والا پوچھ کر بولا۔

ڈین نے اپوچی کی طرف دیکھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”یہ ہمارے برادر قبیلے کا چچا کارپو ہے۔“ اپوچی نے تعارف کر لیا اور کارپو سے کہا۔ ”ہتھیار نیچے کر لو، یہ ہمارا دوست ہے اور اس نے ہماری جان بچائی ہے۔“

”تم ایک سفید فام کو دوست کہہ رہے ہو۔“ کارپو کا انداز خطرناک تھا۔ ”اس کا مطلب ہے تم بھی غدار ہو گئے ہو۔ اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ مارے جاؤ گے۔“

اپوچی اور اس کے ساتھی مطمئن ہو گئے تھے اور ان کے ہتھیار ان کے شانوں پر تھے جبکہ کارپو اور اس کے ساتھیوں کے ہتھیار ان کے ہاتھوں میں تھے۔ اگر وہ عزت کرتے تو جی جی مارے جاتے۔ ایک منٹ میں ان سب کے ہتھیار لے لیے گئے اور کارپو کے آدمی ان کے ہاتھ پٹ پر باندھ رہے تھے۔ اپوچی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اس نے کارپو سے کہا۔ ”تم مجھے میرے مہمان کے سامنے ہتھ پڑ کر کے اچھا نہیں کر رہے ہو۔“

”تم اسی سلوک کے متبع ہو تم ایک سفید فام کی حمایت کر رہے ہو۔“ کارپو بولا۔ اس کے آدمیوں نے انہیں میدان میں بٹھادیا اور اب قبیلے والوں کو دیکھ رہے تھے انہیں شک تھا کہ شاید ان کے درمیان مزید سفید فام موجود ہیں۔ اپوچی اور ڈین ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اپوچی نے سرگوشی میں کہا۔

”کارپو کمینہ آدمی ہے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ میرے قبیلے پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ اس وقت بھی باہر سے کچھ کر کے آیا ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”جب فوج نے ہمارے خلاف کارروائی کی تو میرے قبیلے کے ساتھ اس کے قبیلے کو بھی علاقے سے نکال دیا گیا تھا اور کارپو اپنے قبیلے والوں کو مغرب کی طرف کہیں لے گیا تھا۔ اس کے بعد سے میں اب اسے دیکھ رہا ہوں۔ میں کارپو کے انداز میں خون کی بو محسوس کر رہا ہوں، یہ کہیں خونریزی کر کے آیا ہے۔“

اپوچی کی بات سے ڈین کے اندر ایک خدشہ ابھرا۔ ”میں یہ فوج یا سفید فاموں سے لڑائی کر کے تو نہیں آیا ہے اور پناہ لے کے یہاں آ گیا ہو۔“

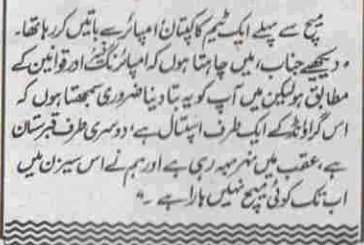
اپوچی نے سر ہلایا۔ ”مجھے بھی یہی خیال آیا ہے۔“

”اس صورت میں فوج اس کے پیچھے ہو کی اور اگر انہوں نے اپنے نشان چھوڑے ہوں گے تو فوج یہاں وادی تک بھی آ سکتی ہے۔“

”اگر ایسا ہوا تو ہماری باقی بربادی بھی مکمل ہو جائے گی۔“

ڈین پریشان ہو گیا تھا۔ فوج آنے کا مطلب تھا قتل و غارتگری، جس میں اس سمیت کوئی بھی نہ بچتا۔ کارپو اور اس کے ساتھی ان پر قابو پا کر کھانے اور شراب پر نوٹ پڑے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک مستقل ان کی نگرانی پر مامور تھا اور اس نے شراب پینے سے گریز کیا تھا۔ باقی سب جلد نشے میں دھت ہو گئے۔ ڈین پیٹھے پیٹھے اگڑا گیا تھا۔ اچانک وہ کسی کی کراہ سن کر چونکا۔ الاؤ بھجا دیا گیا تھا اور وہاں نیم تاریکی تھی، پھر کوئی ڈین کے پیچھے آیا اور اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”یہ میں ہوں، آرام سے بیٹھو تمہارے ہاتھ کھول رہا ہوں۔“

آواز اپوچی کی تھی اس نے ڈین کے ہاتھ کھولے اور خاموشی سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے وادی سے باہر جانے والے راستے پر آئے۔ ڈین، مارشا اور



ڈین کو احساس تھا کہ ایڈی بات کرے اس کا وہ جان
تا رہا ہے، اس دوران میں اس کے ساتھی یقیناً کسی ایسی جگہ
نہاں ہو چکے تھے جہاں سے اسے گولی کا نشانہ بنا سکیں۔ مگر
ان کا اندازہ غلط تھا۔ ایڈی اور اس کے ساتھی اسے مارنا
نہیں چاہتے تھے، وہ اسے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ ایڈی کا
ایک ساتھی دائیں طرف سے پتھر اور اور چٹانوں کی آڑ لیتا
ایک ایسی جگہ آگیا تھا جہاں سے اسے یہ آسانی نشانہ بنا سکتا
تھا۔ اس نے گولی چلائی جو ڈین کے بازو پر لگی اور اسے
کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا پستول
کھینچ لائے، ایڈی اور اس کے ساتھیوں نے اسے گھیر کر بے بس کر
دیا۔ ایڈی نے اس کے زخم کی پروا کیے بغیر اس کے منہ پر
گھونسا مارا۔

ایڑی نے پھول نکال لیا۔ ”ذین، تم جانتے ہو میں نے دشمنوں کو کس طرح مارتا ہوں۔ میں انہیں ایک گولی سے قتل نہیں کرتا۔ پہلے میں ان کے ہاتھ اور پیروں کے جوڑوں میں گولی مارتا ہوں اور جب وہ جاں بے لب ہوتے ہیں تب ان کے سر میں گولی مارتا ہوں۔ میں دس تک گولی گا، اس کے بعد پہلے تمہارے منہ میں گولی ماروں گا اور اس کے ہر دس کے بعد ایک گولی مارتا رہوں گا۔“

آواز اور انداز فوجی تھا۔ ایڈی اور اس کے ساتھیوں نے اپنے ہتھیار چھین کر لیے اور فوراً ہی چاروں سے مسلح فوجیوں نے انہیں لے لیا۔ ڈین پہلے ہی ہاتھ اٹائے مگر تھا۔ وہ ہی فوجی دستہ تاجرواوی کو گھیرے ہوئے تھا۔ اور بعد ان چاروں کو دسٹے کے کپتان کے سامنے

لیکن ایڈی نے بھی شاید بھانپ لیا تھا کہ وہ انہیں اس کے پاس پہنچنے کے لئے جارہا ہے اس لیے چٹانوں کے پاس پہنچنے کے لئے انہوں نے اپنے گھوڑے تیز کیے اور اس کے نزدیک آنے کے لئے ڈھکے۔ ڈھکے نے بھی رفتار تیز کی لیکن ایڈی اور اس کے ساتھیوں کے گھوڑے نہیں تیز تھے، انہوں نے اسے چٹانوں کے پاس لایا اور پھر ڈھکے کو مجبوراً ایک جگہ رکتا پڑا۔ ورنہ وہ اسے عقب سے گولی مار دیتے۔ فائرنگ انہوں نے شروع کر دی تھی لیکن ڈھکے نے ڈھکے کی پہنچنے کے بارے میں ایک مورے نما چٹان میں سے چٹانوں کی پناہ لی اور اپنا گھوڑا اس کے پیچھے چھوڑ دیا۔ ایڈی اور اس کے ساتھیوں نے بھی چٹانوں کی آڑ لے لی تھی اور زرادیر مددوں طرف سے فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک کے بالے میں تین تھے اور یہ کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ ڈھکے جانتا تھا کہ وہ اس طرح زیادہ دیر مدافعت نہیں کر سکے گا۔ وہ اپنی قوت پر انہوں کو رہا نہ تھا۔ اسے ان پر نظر پڑتے ہی بھاگ چاہیے تھا اور وہ ایک بار چٹانوں کے اندر چل جاتا تو پھر ان کے پیچھے چھڑتا آسمان تھا لیکن اب وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔

کاٹھانہ اتنا جانتا نہیں تھا جبکہ ایڈی اور اس کے ساتھی بھینٹا بھینٹا نے بازو کیسے تھوکتے ان کی چٹائی ہوئی گولیاں اس کے پاس لگ رہی تھیں۔ اسے جوابی فائر کا موقع بھی مشکل ملتا تھا۔ ایڈی نے چلا کر کہا۔

”فکرم تو کرنا وہوں نے فائزنگ کی آواز سن لی ہوگی
 وہ آ رہے ہوں گے۔“ ڈین نے چلا کر کہا لیکن اسے شک
 نہ وادی تک فائزنگ کی آواز پہنچی کی اور اگر پہنچے گی بھی تو
 اور اس کے ساتھ اس کی مدد کو آئیں گے کیونکہ انہیں کیا
 ڈین ایک بار پھر مصیبت میں پڑ گیا ہے۔ اسے خود بھی
 اس مقابلہ کرنا تھا۔ ایڈی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”مارشا اور
 کوک نے کہاں رکھا ہے؟“
 ”یہ تم قیامت تک نہیں معلوم کر سکتے۔“

اب بھی فوج وادی سے زیادہ دور نہیں تھی اور وہ کسی وقت بھی وادی میں آنے والے راستے کو دریافت کر سکتی تھی۔ اگلے دن ایسا ہی ہوا، کئی فوجی نے دراڑ دریافت کر لی جو وادی میں داخلہ کا راستہ تھی اور جب اس نے اس میں آگے بڑھنے کی کوشش کی تو کارپور کے ایک جلالت پسند ساتھی نے اس پر گولی چلا دی۔ فوجی وہیں ڈھیر ہو گیا لیکن اس کے رستے کو پتا چل گیا کہ دراڑ میں کوئی ہے اور آناً فاناً دراڑ کا حاصرہ کر لیا گیا۔ دراڑ اُپری اور چھوٹی تھی اس وجہ سے فوجیوں کو پیش قدمی میں دشواری ہو رہی تھی۔ دوسری طرف وادی میں محصور رائیڈز بھی باہر نہیں نکل سکتے تھے اور فوجی دہشت کو مستقل روک بھی نہیں سکتے تھے جو ست روئی سے بھی لیکن دراڑ میں آگے بڑھ رہا تھا۔

ڈین کی خوش فہمی اس وقت دور ہو گئی جب اس نے
وریڈ وریا عبور کیا اور ایڈی کو اپنے دوستیوں سمیت
نئے علاقہ میں پایا۔ اسے ڈین کے بارے میں پتا چل گیا
وہ ورور شاید دور سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ البتہ ڈین کو نظر

غیر نام

ڈاکٹر شیر شاہ سید

جب معاشرے کی خوبصورتی اور معصومیت کو بے غیرتی کی دیمک چاٹ لے اور کھوکھلی رسمیں مہکتی مٹی کو خون آلود کر دیں تو ایسے میں کسی کے پیروں تلے زمین کیسے رہ سکتی ہے... یونہی تو کوئی اپنی مٹی سے جدا نہیں ہوتا... آنکھوں سے خواب اور حسین چہروں کو تصور سے نہیں مٹاتا... اور اگر کوئی ایسا کرے تو اس کے پس منظر میں کسی بڑے طوفان کا گڑبڑا ہوتا ہے۔

انہایت کے نام پر وحشت و بربریت کی دلخراش تصویر

سروں سے خون فوارے کی طرح بہہ نکلتا ہے۔ سرفراز ہمارے شہر کا گہرو جوان تھا۔ لانا، بڑے بڑے ہاتھ، چوڑے شانوں کے اوپر خوب صورت چہرہ۔ وہ سب کے سب کاٹ کاٹ کر الگ الگ ڈال دیے گئے تھے۔ قدرت کا بنا یا ہوا پورا انسان اتنی آسانی سے الگ ہو جاتا ہے۔ انسان، انسان کو اس بے دردی سے مار سکتا ہے، کھڑے کھڑے کر سکتا ہے۔ پھر بونٹو تو میں بچپن سے جانتا تھا۔ ساتھ

”ان لوگوں نے سرفراز کو قتل کر ڈالا۔ قبرستان لے جا کر پہلے اس کے ہاتھوں کو کاٹا پھر کھڑکی سے دونوں پیر کاٹ ڈالے۔ وہ یکا یک ہی مر گیا ہوگا۔ پھر انہوں نے بونٹو کی گولی مار دی۔ ان دونوں کے مرنے کا مجھے شدید افسوس ہے۔ وہ آج بھی میرے سامنے چلے آتے ہیں۔ دونوں زندہ طاقت جلتے پھر میری نظروں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں۔ بولتے ہیں، ہنستے ہیں، پھر یکا یک ان کے کٹے ہوئے

کبھی فوج یا ریاست کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے۔ ڈین نے اسے یقین دلایا کہ وہ ان لوگوں کو اپنے ملازمین کی حیثیت سے رجسٹر کرائے گا اور ان کی طرف سے ضمانت بھی دے گا۔ فوجی دستے نے روانگی سے پہلے زخمی کارپو اور اس کے تین ساتھیوں کو پھانسی دیدی اور ان کی لاشیں اپوچی کے قبیلے کے حوالے کر دیں۔ وہ ایڈی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے گئے تھے۔

اپوچی اور دوسرے انڈین کارپو اور اس کے ساتھیوں کے لیے دہی تھے لیکن انہیں یہ خوشی بھی تھی کہ ان کی جان بچ گئی ہے اور اب انہیں در بدر پھرتا نہیں پڑے گا۔ یہ وادی مستقل طور پر انہیں مل گئی ہے۔ کیونکہ فوج کے جاتے ہی ڈین نے اپوچی سے کہا۔ ”معاف کرنا دوست، تمہاری جان بچانے کے لیے مجھے یہ ظاہر کرنا پڑا کہ تم لوگ میرے ملازم ہو اور یہ وادی میری ملکیت ہے۔ بے شک کاغذات پر یہ چھری ملکیت ہے اور میں مقامی حکام کو دکھانے کے لیے بھی بھی یہاں آتا ہوں گا لیکن یہ جگہ حقیقت میں اب تم لوگوں کی ملکیت ہے اور اگر ممکن ہو تو میں اسے تمہارے قبیلے کے نام منتقل کر دوں گا۔“

اپوچی، ڈین کے گلے لگ گیا۔ ”میرے دوست! میں اور میرا قبیلہ کبھی تمہارا یہ احسان نہیں بھولے گا۔“

”اگر میں نے کوئی احسان کیا ہے تو یہ تمہارے احسان کا بدلہ ہے جو تم نے دو بار میری اور میرے بیوی بچوں کی جان بچا کر ہم پر کیا ہے۔“ ڈین نے کہا۔ ”لیکن میرے دوست، اب تمہیں بھول جانا ہوگا کہ تم لوگ جنگجو تھے اور سفید فاموں سے تمہاری لڑائی ہے۔ اس وادی سے باہر کی دنیا بھول جاؤ اور اپنے قبیلے والوں کے لیے کام کرو۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو میں اسے دیکھ لوں گا۔“

ڈین خوش تھا کہ بہت مشکل نظر آنے والا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا۔ اسے فوراً واپس جانا تھا لیکن اپوچی اور اس کے قبیلے والوں نے اسے اتنی جلدی واپس جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اپوچی نے اس سے کہا۔

”جلد ہم تمہارے اور تمہارے خاندان کے لیے یہاں ایک گھر بنائیں گے اور جب تم یہاں آؤ گے تو اس گھر میں ٹھہرو گے۔“

”میں اور میرے گھر والے یہاں آیا کریں گے۔“ ڈین نے اس سے وعدہ کیا اور واپس ڈیوڑ روانہ ہو گیا جہاں اس کے بیوی بچے اس کا انتظار کر رہے تھے۔



کھانسی کا کھانسی جیسا تھا جو آزادانہ قبائل کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ جو ان کی تان، اس نے ڈین سے کہا۔ ”اگر یہ تمہارے آدمی ہیں اور تمہارے کہنے پر ہتھیار ڈال دیں تو میں اپنے آدمیوں کو روک لوں گا۔“

”یہ میرے ہی آدمی ہیں تم خود وادی میں چل کر دیکھ سکتے ہو، وہاں باقاعدہ کاشت کی جاتی ہے۔“

”مگر ان میں یقینی طور پر کچھ بد معاش انڈین ہیں اور انہوں نے میرے آدمیوں پر حملہ کیا تھا۔ ہم انہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔“

”اگر ایسے انڈین موجود ہیں تو تم انہیں پکڑ سکتے ہو۔“ ڈین نے کہا۔ ”لیکن پہلے مجھے جا کر ان سے بات کرنے دو۔“

کپتان کے حکم پر اس کے آدمیوں نے فائرنگ روک دی اور ڈین آخری مورچے تک گیا، وہاں سے اس نے اپوچی کو پکارا۔ ”اپوچی! میں آ گیا ہوں۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ تم سب میرے ملازم ہو۔ کیا یہاں باہر سے انڈین آتے ہیں؟“

”ہاں یہاں باہر سے کچھ لوگ آتے ہیں۔“ اپوچی نے کہا۔

”مجھے اندر آنے دو، فائرنگ مت کرنا۔“

”کوئی فائر نہ کرے۔“ اپوچی نے حکم دیا اور ڈین آرام سے اندر پہنچ گیا۔ وہاں کارپو زخمی حالت میں موجود تھا اور قریب المرگ تھا، گولی اس کے سینے میں اتر گئی تھی۔ اس کے تین ساتھی پہلے ہی مارے جا چکے تھے۔ ڈین نے اپوچی کو بتایا کہ کارپو اور اس کے ساتھی فوج کو طلب تھے اور وہ ان کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ اپوچی نے سر ہلایا۔ ”جی یہ لڑنے مرنے پر تھے ہوئے تھے میں نے انہیں سمجھا یا بھی تھا کہ ہم اتنی بڑی فوج سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

”تم سب ہتھیار ڈال دو۔ میں تمہیں اپنے ملازم بنا چکا ہوں اور یہ فارم اب میری ملکیت ہے۔ میں نے ریاست سے اس کے کاغذات بنوائے۔ میرے ملازم ہونے کی وجہ سے تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ کارپو اور اس کے ساتھیوں کو فوج لے جائے گی۔“

اپوچی ہچکچا رہا تھا لیکن پھر ڈین کے زور دینے پر وہ مان گیا۔ اس کے ساتھیوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ کارپو اور اس کے بچ جانے والے تین ساتھیوں کو فوج نے گرفتار کر لیا البتہ اپوچی اور اس کا قبیلہ بچ گیا تھا۔ پھر بھی کپتان نے واپسی سے پہلے ڈین کو وارننگ دی تھی کہ اسے ان انڈینز کی رجسٹریشن کرانی ہوئی اور ان کی ضمانت دینی ہوگی کہ آئندہ وہ

قصہ ہے، وہاں سے پڑھنے آتا تھا ہمارے کالج میں اور وہاں ہی بنو سے ملاقات ہو گئی تھی اور وہ دونوں ہی چاہتے تھے ایک دوسرے کو۔ مجھے پتا ہے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں ہوتی تھیں، نہ کوئی وعدے بیان ہوئے تھے، نہ کوئی قصیں کہانی کہی تھیں اور نہ ہی گھر چھوڑنے کی باتیں کی تھیں۔ نہ گھر سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ بس معصومی دوستی سے بات شروع ہوئی تھی اور دونوں نے یہی سوچا تھا کہ بزرگوں سے بات کر کے شادی کی بات چلائی جائے گی۔

”اس میں تو کوئی بری بات نہیں ہے۔“ میں نے سوال کی طرح جواب دیا تھا۔

”نہیں، بری بات تو نہیں ہے مگر گجرات چھوٹا سا شہر تھا اس وقت۔ نہ جانے اب کتنا بڑا ہو گیا ہوگا؟“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”بات پچھل گئی تھی بلکہ پھیلا دی گئی تھی اور پھیلائے والوں میں سب سے آگے غفور تھا۔ غفور بہت دنوں سے کالج میں پڑھ رہا تھا، اس کا باپ ایک سیاسی پارٹی کا لیڈر تھا اور وہ خود بھی سیاسی جماعت کے اسٹوڈنٹ لیڈر کا بندھن تھا۔ بعد میں کسی اور سیاسی پارٹی کا لیڈر بن گیا۔ ایک دن اس نے سرفراز کو بلا کر پوچھا کہ اس کے اور بھوکے درمیان کیا چل رہا ہے؟ سرفراز نے کہا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہے، ابھی تو دوست ہیں مگر وہ اپنے مال باپ کو ان کے گھر بھیجنے والا ہے۔

”بومیری ہے۔“ غفور نے سرفراز کو صاف صاف کہہ دیا تھا۔ یہ بات مجھے سرفراز نے اسی دن بتائی تھی۔ جس پر سرفراز نے غفور سے کہا تھا کہ کوئی بھی کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ وہ اور بھوکے دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں اس میں کیا بری بات ہے۔ وہ اپنے مال باپ کو بھوکے کے مال باپ کے گھر بھیجے گا اگر وہ راضی ہوئے تو شادی ہو جائے گی۔ وہ چاہے تو اپنے مال باپ کو بچہ دے۔ تھی نامقول بات؟“

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تھا۔

میں نے آنکھوں سے اپنے ختم ہوتے ہوئے گلاس کو دیکھ کر کہا۔ ”ہاں، بات تو معقول ہے مگر پاکستان میں معقول باتیں کون سننا ہے۔ اگر معقول باتیں سن رہے ہوتے تو میں نیویارک ٹھوڑی جا رہا ہوتا، تم زیورچ میں ٹھوڑی ہوتے، یورپ اور امریکا میں شہریت کی تلاش میں وہ سب کچھ نہیں کرتے، جو کر رہے ہیں۔ یورپ کے ویزے کے لیے ہزاروں ڈالرز خرچ کرتے ہیں لالچوں اور کشتیوں میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ چلتی ٹرینوں سے کود جاتے ہیں۔ انجینئریوں کے سامنے بھوکہ ہڑتال کرتے ہیں اور اپنے آپ کو آگ لگا دیتے ہیں۔ معقول باتیں صرف کتابوں میں ہوتی

ہیں۔ چلو اب ایک گلاس میری طرف سے بھی ہو جائے۔“ کہہ کر میں نے ویزس کو اشارہ کیا۔

زیورچ کی خوشبو دار ٹھنڈی ہواؤں میں بھوکے کنارے بیٹھ کر پینے سے مزہ دو بالا ہو گیا تھا، ایک سکون ایک طرح کی قناعت تھی وقت میں۔ کوئی بھی بھاگ نہیں رہا تھا، مجھے ایسا لگتا جیسے کسی سوئس کینڈر کے کسی ایک صحنے پر وقت ختم کیا ہے۔ پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ میں نے صحیح وقت کراچی چھوڑ دیا ہے۔ پاکستان میں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ نوکریاں تو پہلے بھی نہیں ملتی تھیں مگر انسان مل جاتے تھے۔ پچھلی پتلون میں بھی کراچی میری ہی لگتا تھا، مگر اب تعلیم دولت، گاڑی، مکان ہونے کے باوجود کراچی اجنبی ہو گیا تھا۔ شہر ایسا پچھل گیا تھا، ہر گھر طریقے سے کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ پرانا شہر کھاردار جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا کنکریٹ کا جنگل بن کر رہ گیا تھا۔ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی پرانی عمارتوں پر کے ایم ایس اور کے ڈی اے کی بدولت ایسی بے ہنگم اور بے ترتیب عمارتیں کھڑی کر دی گئی تھیں کہ شہر اپنا حسن کھو بیٹھا تھا۔ پھر ان سے اچھے ہوئے گھروں اور گلیوں میں کوڑے اور پتھر کا ڈھیر، پھر آئے دن مذہبی اور سیاسی حوالوں سے قتل اور ہڑتالوں کا ایک سلسلہ سا چلتا تھا۔ شہر نوفا جا رہا تھا، غربت بڑھتی جا رہی تھی کہ اسی دوران امریکا کی لاٹری کے لیے کروڑوں کی تعداد میں فارم بھی بھرے جا رہے تھے۔ میں بے روزگار تو نہیں تھا، جیک ہاک نوکری کر رہا تھا اور تنخواہ بھی اچھی مل رہی تھی مگر میں شہر سے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ شہر جس کے لیے لندن میں بیٹھ کر تھیں لگتا تھا۔ وہ شہر جس کی یاد میں لندن کی گلیاں بھی سنان لگتیں، جس کے لیے امتحان پاس ہونے کے فوراً بعد ہی لندن چھوڑ کر واپس آ گیا تھا، وہ شہر اب اجنبی لگتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی اجنبی جگہ آ گیا ہوں۔ وہ جگہ نہیں ہے جہاں میں پلا بڑھا تھا۔ جہاں سب شہر کی مل کر بنی خوشی رہتے تھے۔ کراچی تو اب ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گیا تھا۔ اس ڈراؤنے خواب میں امریکن لاٹری میں نام لگنا ایسا ہی تھا جیسے کسی پیاسے کو بہت دور جانے کے بعد دریا مل جاتا ہے۔ میں نے سوچے سوچے اچھو دیکھا پھر بات چیت بڑھانے کے لیے پوچھا۔

”تو بھوکے غفور کو بالکل ہی پسند نہیں کرتی ہوگی؟“

”بالکل صحیح آپ نے دیکھ صاحب! بالکل یہی بات تھی۔ غفور بے ایمان آدمی تھا، کرائے کا سیاسی کارکن۔ کوئی بھی شریف آدمی اس سے دوستی رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر خطرناک آدمی تھا۔ اس نے بڑی خطرناک حرکت کی تھی۔

میں سارے شہر کی دیواروں پر پھرے لکھے ہوئے تھے، سرفراز اور بھوکا شفیق نہیں چلے گا۔ فحاشی حرام ہے، غیرت پر ہاتھ کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے پتا لگا کہ بھوکا اپنے کالج آتی نہیں تھی اور سرفراز کو بھی ہم لوگوں نے کالج سے گھر بھجوا دیا اور کہا تھا کہ وہ اپنے گاؤں چلا جائے۔ نہ جانے غفور کے دل میں کیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس طرح معاملہ رفع دفع ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ معاملہ یکا یک بہت ہی بڑھ گیا تھا کیونکہ اسی دن غفور نے جاکر بھوکے ماموں سے بات کی تھی کہ سرفراز اور بھوکے کا جائز تعلقات ہیں اور اس کا سدباب کرنا پڑے گا، ورنہ گجرات میں شریف لوگوں کی عزتوں کی دھجیاں اسی طرح سے اڑتی رہیں گی۔ پھر انہوں نے پلان بنالیا تھا مگر یہ کیسے ہوا، میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

اس نے دھیمے دھیمے بڑے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا تھا۔

”کیا پلان بنایا تھا ان لوگوں نے؟“ میں نے سوال کیا۔

”تین دن کے بعد سرفراز میرے گھر آیا تھا، شام کے وقت بھوکے ماموں نے اسے بلایا تھا تاکہ سارے معاملات عزت سے طے ہو جائیں کیونکہ بدنامی تو ہو ہی چکی تھی لہذا اب اس طرح سے معاملات کو ٹھیک نامی میں بدل دیا جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔ میرا خیال تھا کہ بھوکے ماموں کو سرفراز کے گھر والوں کو بلانا چاہیے تھا کیونکہ اس کے گھر والے تو بہر حال راضی تھے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ میں ساتھ چلتا ہوں مگر سرفراز نے روک دیا تھا کہ یہ تو بالکل ایک ایسی میٹنگ ہے بھوکے ماموں کے ساتھ مگر یہ ذاتی میٹنگ نہیں تھی ویکم صاحب۔ سرفراز سے بھوکا ماموں بات کرتا رہا۔ دینا جہاں کی باتیں، اچھے طریقے سے، محبت کے انداز میں پھر لہاتا ہوا تھا ہوا، باتیں کرتا ہوا اسے قبرستان لے گیا۔

یہاں غفور اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھا ہوا تھا اور وہاں پر ہی ان لوگوں نے کھڑکی سے سرفراز کے ہاتھ پیر کاٹ دیے اور ان کو بہرہ کراس کی جان چلی گئی۔

اسی رات پہلی دفعہ بھوکے ماموں نے بھوکا کہا تھا کہ ساتھ کے کمرے میں آ کیلی، سو جائے۔ جہاں وہ کبھی آ کیلی نہیں ہوئی تھی، پھر رات کو اس کے ماموں نے ایک کوئی اس کی وٹانی سے سر میں اتار دی تھی۔ اس طرح سے غیرت کے نام پر وہ دونوں قتل ہو گئے تھے۔ غفور، بھوکے ماموں اور بھوکے ماموں نے جانے یہ کیسے کر لیا تھا۔ آج تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ کس طرح کوئی ماں اپنی بیٹی کو جانتے بوجھتے وقت کے حوالے کر سکتی ہے؟ کیسے کوئی انسان اپنے سے

کمزور پر اس طرح کیجھاوار کر سکتا ہے؟ وہ کون سی طاقت ہوتی ہے جو رشتہ، پیار، محبت سب سے انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ یہ کیسی غیرت ہے جس کا کیجھا صرف انسانی خون کی کرنی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ غفور کو تو مطلب تھا، اس کی تو ہوس تھی۔ سرفراز اس کے لیے ایک دھمکی تھا۔ مکمل عذاب، جس نے اس کے گھر کی لڑکی کو درغلا دیا تھا۔ مگر بھوکے ماموں کو کیا ہوا تھا؟ وہ کیسے اس سازش میں شریک ہو گئی؟ اس نے کیوں اپنی کوکھ کی جی کھواس طرح بے مانگ کر دیا کیوں؟ کیوں؟ میں اکثر سوچتا ہوں اور سوچتا ہی رہتا ہوں اور میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ کاش کوئی مجھے جواب دے، مجھے بتائے سمجھائے۔“

خوب صورت ماحول، دل کشا موسم، حسین چہروں کے درمیان آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کئی ہو جائے گی۔ میں بالکل خاموش ہو گیا تھا۔

پھر وہ خود ہی بولا۔ ”یہ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ غفور نے جو کیا وہ کیا، وہ تو سمجھتا تھا کہ بھوکے ماموں اس کا بدلہ لے لیا ہوگا، ماموں کی غیرت کو اس نے جگا دیا ہوگا۔ قصے سنائے ہوں گے، افسانے بنائے ہوں گے مگر بھوکے ماموں نے بھوکے ماموں کو کیسے راضی کر لیا کہ اس کی بیٹی قتل کر دی جائے۔ بھائی اور بیٹی میں ماں اور بہن کا انتخاب بیٹی کی قتل کی صورت میں ہوگا، یہ کون سوچ سکتا ہے؟“

”میری سمجھ سے باہر ہے۔“ میرے اندر سے جیسے کسی نے شدید نفرت کا اظہار کیا تھا۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔ میں نے دل میں ایک بار پھر پاکستان سے نکل بھاگنے پر اطمینان سا محسوس کیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے آگ کا سمندر بہت دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔

”غفور اور بھوکا ماموں پڑا تو ضرور گیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا تھا۔

”نہیں تو آنکھوں سے۔ غفور صوبائی حکومت میں محکمہ تعلیم کا اعلیٰ افسر ہے اور بھوکا ماموں گجرات میں ہیروئن کا سب سے بڑا سپلائی ہے۔ ایک سینما بھی ہے اس کا۔ شراب کا ڈال بھی ہے۔ شہر میں بڑا نام چلتا ہے اس کا اور شہر کے ہی ایک اور اڑے میں بھوکے جیسی کتنی ہی لڑکیاں اس نے پال لی ہیں۔“ وہ چپ ہو گیا۔

میرا جی چاہا کہ اس سے کہوں بھائی! تم ایک شہر کا رونا روتے ہو، تمہارے حافظے میں یہ دکھ بھر ایک واقعہ ہے لیکن اب تو بے غیرتی ہر شہر کا اصول بن گئی ہے اور غیرت کے نام پر معصوم کنواروں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔ میں اپنی بات کہنا چاہتا تھا لیکن بولنے کا یارا نہ تھا۔

ضرورت مند

سرزا امجد بیگ

وہ جو چیونٹی کے مانند بے ضرر نظر آتے تھے اچانک ہاتھی کی ہلاکت کا سبب بن کر سامنے آئے تو کوئی یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ ”نظریہ ضرورت“ کے تحت بعض اوقات انسان اپنی اوقات سے بڑھ کر اڑان بھرنے کی کوشش کرتا ہے اور منہ کے بل گرتا ہے... کیونکہ کوئی اکبھی پنس کی چال نہیں چل سکا... اور جب جب کسی نے چلنے کی کوشش کی تو مرزا امجد بیگ نے اپنی دلیلوں سے سب کے چال چلن درست کر دیے۔

میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت تقریباً ناممکن ہی ہوتی ہے اور وہ بھی پہلی پیشی پر تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وکیل استغاثہ لب کشائی سے پہلے چند سیکنڈ تک ملزم کو گھورتا رہا۔ ایک نفیاتی رد عمل کے طور پر میرے موکل نے نگاہ جھکا دی۔ ملزم کی اس حرکت کو وکیل استغاثہ نے اس کی کمزوری جانا اور خامے چار حانہ لہجے میں بولا۔

”گردن اٹھا کر اور نظر ملا کر میری طرف دیکھو۔“

میرے موکل نے خفیف سی بوکھلاہٹ کے بعد وکیل استغاثہ کی فرمائش پوری کر دی۔ وکیل استغاثہ نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”کیا تم کوئی نشہ وغیرہ کرتے ہو؟“

”نہیں جناب، میں نے ایسا کام اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا۔“ ملزم نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”البتہ، دن میں پانچ گھنٹے سگریٹ ضرور پی لیتا ہوں۔“

”کون سی سگریٹ؟“ وکیل استغاثہ نے چڑھائی جاری رکھی۔

ملزم نے حیرت بھرے انداز میں پلکیں جھپکائیں اور بولا۔ ”جی کیا مطلب...؟“

”بھری ہوئی یا سادہ سگریٹ؟“ وکیل استغاثہ نے وضاحت کر دی۔

آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ سماعت تھی۔ عدالت کا کمر پوری طرح بھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سوائے ایک کرسی کے ہر کرسی پر کوئی نہ کوئی موجود تھا اور وہ خالی کرسی تھی اس شخصیت کی جو اس کیس میں منصف کا کردار ادا کر رہا تھا۔

چند لمحات کے بعد کرسی انصاف بھی خالی نہ رہی۔

جج نے اپنی مندر پر براجمان ہونے کے بعد عدالت کے کمرے میں، ایک جانب سے دوسری طرف تک نگاہ دوڑائی اور تمام متعلقہ افراد کو موجود پا کر اشیات میں گردن ہلا دی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔

پہلے مرحلے پر جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے موکل اور کیس کے ملزم نے نہایت اطمینان کے ساتھ صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا پھر باقاعدہ جرح کا آغاز ہو گیا۔ جج کی اجازت حاصل کر کے وکیل استغاثہ ملزم والے کٹھنرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

استغاثہ کی جانب سے میرے موکل صاحب علی پر ایک طرح وار عورت کو قتل کرنے کا الزام کیا گیا تھا۔ بنیادی اور عین الزام تو یہی تھا، علاوہ ازیں بھی چند چھوٹے موٹے معاملات اس کے ساتھ ہی تھے تھے۔ جب عدالت میں اس کیس کا چالان پیش کیا گیا تھا تو میں نے اپنے موکل کی ضمانت کرانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن مجھے اس کوشش

دیر اور ہر طرفیہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”لہذا..... استغاثہ کے نمائندے، میرے فاضل دوست کی جانب سے طرم کے لیے ”خطرناک مجرم“ کے الفاظ کا استعمال انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔“
جج نے اثبات میں گردن ہلائی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس نے میرے اعتراض کو درست تسلیم کر لیا ہے پھر اس نے وکیل استغاثہ کو یہ ہدایات دے کر میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔

”وکیل صاحب! آپ اپنے سوال میں سے لفظ ”مجرم“ کو خارج کر کے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھانے کا عمل جاری رکھیں۔“

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتانا چلوں کہ میرے موکل پر ایک خوبصورت عورت مسز نورین کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ اس کے علاوہ استغاثہ نے مسز نورین کی ہزار روپے کی چوری بھی اس کے کھاتے میں چڑھا رکھی تھی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ نہ تو میرے موکل نے کسی کو قتل کیا تھا اور نہ ہی وہ کسی چوری یا ڈکیتی میں ملوث تھا۔ اس کی قسمت بری تھی کہ وہ اس کیس میں گردن تک محض چکا تھا۔

وکیل استغاثہ، جج کی ہدایت سن کر تھوڑا خفیف ہوا پھر مجھ پر ایک ناپسندیدہ نگاہ ڈالنے کے بعد وہ دوبارہ اس کیس کے طرم اور میرے موکل صاحب علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔
”کیا یہ درست ہے کہ مقتولہ نورین کو تم کافی عرصے سے جانتے تھے؟“

”جی ہاں..... یہ درست ہے۔“

”کتنے عرصے سے؟“

”پچھلے چھ ماہ سے.....“ طرم نے جواب دیا۔

پچھلے چھ ماہ سے..... اس کی مراد یقیناً وقوعہ سے چھ ماہ پہلے کے عرصے سے تھی۔ وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”ان چھ ماہ میں تم کتنی مرتبہ مقتولہ سے ملے اس کے قلیٹ پر گئے تھے؟“

مقتولہ نورین ایک ایسا خوش بُلڈنگ میں چوتھے فلور پر رہائش پزیر تھی اور اس کے قتل والی واردات بھی اسی قلیٹ میں پیش آئی تھی۔ طرم نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا۔

”میں اس عرصہ کے دوران میں دس سے زیادہ مرتبہ اس کے قلیٹ پر گیا تھا۔“

”مذکورہ قلیٹ میں مقتولہ کے علاوہ اور کتنے رہائش پزیر تھے؟“

”کوئی بھی نہیں.....!“

”گویا مقتولہ اپنے قلیٹ میں اکیلی رہتی تھی؟“

”جی ہاں۔“ طرم نے اثبات میں جواب دیا۔ ”اس شوہر روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ بلکہ ہوا تھا۔“

”کیا ہوا تھا..... کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اب وہ واپس پاکستان آ چکا ہے۔“

طرم نے پراعتاد لہجے میں بتایا۔ ”اس واقعے نے اسے واپس آنے پر مجبور کر دیا تھا اور.....“ اس نے لمحائی توقف کر کے

حاضرین عدالت پر ایک گہری نگاہ ڈالی پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”غیب غوری اس وقت بھی عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔“

”تو گو یا تم مقتولہ کے شوہر کو بھی اچھی طرح پہچانتے ہو؟“

طرم نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”کیا تم ان لوگوں کے رشتے دار ہو؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

”نہیں.....!“ طرم قطعی لہجے میں بولا۔

”جی فریڈ ہو؟“

”جی نہیں.....!“

”مقتولہ کے شوہر کے ساتھ تمہاری دوستی وغیرہ ہوگی.....؟“ وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی نہیں.....“ طرم نے جواب دیا۔

”جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں!“ طرم نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔

”دوستی تو بہت دور کی بات ہے، میں تو سر مرتبہ میں نے شوہر سے ایک بار بھی نہیں ملنا ملا تھا اسے تو کبھی

مرتبہ میں نے ہمیں عدالت میں دیکھا ہے یا پھر اس سے پہلے

مقتولہ کے قلیٹ میں اس کی ایک بڑے سائز کی تصویر لگی

دیکھی تھی اسی لیے جب میں نے اسے عدالت میں دیکھا تو فوراً

پہچان لیا۔“

طرم کی وضاحت ختم ہوئی تو وکیل استغاثہ نے استفسار

کیا۔ ”تمہاری نہ تو مقتولہ کے شوہر سے دوستی تھی، نہ تم ان کے

رشتے دار اور نہ ہی کوئی اور قتل نانا تھا پھر تم کا یہ کہنا

مقتولہ کے گھر کے چلو کیوں کاٹے رہتے تھے جبکہ تم انہی طرح

کہا جاتے تھے کہ مقتولہ کا شوہر گھر پر موجود نہیں تھا؟“

”میں ایک مرتبہ بھی اپنی مرضی سے وہاں نہیں گیا۔“

اس نے اپنی صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔

”پھر کس کی مرضی سے وہاں جاتے تھے؟“ وکیل

استغاثہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ”تمہیں اس کام کے

”کون مجبور کرتا تھا.....؟“

”مقتولہ نورین اپنی ضرورت کے پیش نظر خود مجھے بلایا

لی تھی۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی تھی.....؟“

”آپ کہہ سکتے ہیں.....“ طرم جڑ بڑھوتے ہوئے

کہہ سکتے ہیں..... کیا مطلب؟“ وکیل استغاثہ نے

پراعتاد انداز میں پوچھا۔ ”کیا تمہیں یقین نہیں کہ مقتولہ تمہیں

بہت پسند کرتی تھی، اسی لیے اپنی ضرورت کے وقت وہ

”میں قلیٹ پر بلایا کرتی تھی؟“

”آپ بات کو کسی اور رخ پر لے جا رہے ہیں وکیل

صاحب!“ طرم نے منہ پر ہونے لہجے میں کہا۔ ”میرے

لہجے کا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ عدالت کے سامنے اجاگر

کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”تم اپنے مطلب کی وضاحت کرو۔“ جج نے براہ

راست طرم کو حکم دیا۔

”جنتا عالی!“ طرم کھنکھار کا صاف کرتے ہوئے

پہلی بات تو یہ کہ مقتولہ مجھے نہیں بلکہ میرے کام کو پسند

کرتی تھی، دوسری بات یہ کہ اس نے ایک مرتبہ مجھے مجھے خواہ

خواہ اپنے قلیٹ پر نہیں بلایا۔ اسے جب بھی میری ضرورت

پیش آتی، وہ مجھے فون کر دیتی تھی اور میں اپنی سہولت کے

مطابق آ کر اس کا کام کر دیا کرتا تھا۔ اپنی محنت کا معاوضہ

میں اس کے کس میں واپس چلا جاتا تھا لیکن وکیل استغاثہ.....“

وہ لمحائی توقف کر کے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پلٹیں

پلٹ کر اسے تسلی دی کہ وہ بالکل ٹھیک جا رہا ہے۔ وہ اپنی

وضاحت مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”وکیل استغاثہ کی جرح سے بالکل ایک منفی تاثر ابھر

کر سامنے آ رہا ہے۔ اس سے نہ صرف میرا بلکہ مرحومہ کا

دور بھی شک کی لپیٹ میں آ رہا ہے جبکہ حقیقت صرف اتنی

ہے کہ مقتولہ میرے کام سے مطمئن اور خوش تھی اسی لیے

جب بھی قلیٹ میں لگزی کا کوئی کام لکھا، وہ مجھ سے کرائی

میرا موکل پیشے کے اعتبار سے کارپینٹر (برہمنی) تھا اور

اپنے کام میں اس کے تجربے اور مہارت کو دشمن بھی تسلیم کرتے

تھے۔ اگر مقتولہ اس کی پیشہ ورانہ صلاحیت اور کارکردگی سے

مطمئن تھی تو اس میں حیرت یا تعجبے والی کوئی بات نظر نہیں آتی

تھی مگر وکیل استغاثہ میرے موکل کو زور اور پریشان کرنے

کے لیے اس معاملے کو خونخوار خطرناک انداز میں طول دے

رہا تھا۔ میں اپنے موکل کی اس بات سے پوری طرح متفق تھا

کہ وکیل استغاثہ کے جیسے اور ایسے سوالات مقتولہ اور طرم

کے مابین غیر اخلاقی تعلق کی جانب اشارہ کرتے دکھائی دیتے

تھے۔ وکیل استغاثہ کو اتنا بھی لالچ نہیں تھا کہ مقتولہ کا شوہر کبھی

عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں ایسے بے

ہودہ استفسارات کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا تھا۔

میں اگر چاہتا تو کبھی بھی موقع پر ”آجینشن یور آرز“ کا

نعرہ لگا کر میدان جنگ میں اتر سکتا تھا۔ وکیل استغاثہ اب

تک اعتراض کے بہت مواقع فراہم کر چکا تھا لیکن اس کے

ساتھ ہی میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ میرا موکل بڑے خوب

صورت انداز میں اپنا دفاع جاری رکھے ہوئے تھا، میں اس

کی کارکردگی سے خاصا مطمئن تھا اسی لیے خاموشی سے تماشا

دیکھ رہا تھا۔

”تو وقوعہ کے روز بھی تم مقتولہ کے بلانے پر لگزی کا

کوئی کام کرنے اس کے قلیٹ پر پہنچے تھے.....؟“ وکیل

استغاثہ نے تیز نظر سے طرم کو گھورا۔

”جی ہاں..... اسے ایک صوفی کی مرمت کرانا

تھی۔“ طرم نے جواب دیا۔

”کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ مقتولہ کے گھر

بار بار جانے سے تم وہاں کی تفصیلات سے اچھی طرح واقف

ہو چکے تھے۔“ وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے

بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ

ڈرائنگ روم، بیڈ روم، کچن، کامن روم اور دیگر مقامات کی کیا

پوزیشن ہے..... کون سی چیز کہاں پائی جاتی ہے؟“

”میں اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گا۔“ طرم نے

بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”کیونکہ میں نے اس دوران

میں مقتولہ کے قلیٹ کے مختلف حصوں میں کام کیا تھا۔ مقتولہ

نے اپنے کچن میں مجھ سے ایک دیوار گیر کینٹ بنوائی تھی۔

کیمپری میں کپڑے سکھانے کے لیے کھوپڑیاں لگوائی تھیں،

بیڈ روم میں موجود کپڑوں کی بڑی الماری کا لاک تبدیل کر دیا

تھا، ڈرائنگ روم میں رکھے صوفوں کی مرمت کرائی تھی۔

چھوٹے موٹے کام اس کے علاوہ ہیں.....“

”وقوعہ کے روز تم کس کام کی غرض سے مقتولہ کے قلیٹ

پر پہنچتے تھے؟“ وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

”میں تھوڑی دیر پہلے اس کا ذکر کر چکا ہوں۔“ ملزم نے منہ پر ہونے لگے میں جواب دیا۔ ”اس روز مقتولہ نے ایک صوفی کی مرمت کے لیے مجھے اپنے فلیٹ پر بلایا تھا۔ مذکورہ صوفی کا استرینگ جگہ سے نکل رہا تھا لہذا اس کی مرمت ضروری ہو گئی تھی۔“

وکیل استغاثہ نے فوراً زاویہ سوالات تبدیل کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ”تم جب بھی کسی کام کی غرض سے مقتولہ کے فلیٹ پر جاتے تھے تو وہ تم پر خاصی مہربان ہوا کرتی تھی؟“

”جی..... میں سمجھا نہیں!“ ملزم نے حیرت بھری نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ ”آپ کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟“

”مطلب یہ کہ.....“ وکیل استغاثہ بڑے مکارانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”مقتولہ تمہیں تمہارے کام کا معاوضہ دینے کے علاوہ بھی نوازی رہتی تھی؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب!“ ملزم نے اٹھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ کام شروع کرنے سے پہلے معاوضہ طے کر لیتا ہوں اور کام ختم کر کے اپنی اجرت لے کر واپس آ جاتا ہوں۔ اللہ اللہ، خیر سلا!“

”کیا مقتولہ کے ساتھ بھی تمہارا یہی رویہ تھا؟“

”جی ہاں، بالکل.....!“

”میں اس بات کو ثابت کر سکتا ہوں کہ مقتولہ تمہیں عام کارگر کی بہ نسبت زیادہ اہمیت دیتی تھی۔“ وکیل استغاثہ نے طنز پر لہجے میں کہا۔ ”وہ تمہارے تختانے کے علاوہ بھی تمہارا خیال رشتہ کی جو اس امر کی دلیل ہے کہ وہ تم پر خصوصی توجہ دیتی تھی لیکن.....“ وہ بولتے بولتے اچانک رک، کج کی جانب معنی خیز نظر سے دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرنے کے لیے دوبارہ ملزم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”لیکن تم نے.....“ وہ بڑے ڈرامائی انداز میں بولا۔ ”تم نے اس مہربان عورت کے خلوص کا ناجائز استعمال کیا..... نہ صرف یہ کہ اس کے اعتماد کا خون کیا..... بلکہ خود اسے ہی خون میں نہلا دیا۔“

”یہ جھوٹ ہے..... مجھ پر الزام ہے۔“ ملزم نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ مقتولہ کے قتل سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔“

”آپ کیسٹیشن پور آؤ!“ میں نے مداخلت ضرور

جاتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ ”اس وقت عدالت نورین مرڈر کیس زیر سماعت ہے لیکن میرے فاضل متعلقہ سوالات کو پس پشت ڈال کر سارا زور وکالت بات پر صرف کر رہے ہیں کہ مقتولہ کسی خاص زاویے ملزم پر مہربان تھی اور ابھی انہوں نے اس حوالے سے جو فراہم کرنے کی بات بھی کی ہے۔ معزز عدالت سے میرا استدعا ہے کہ وکیل استغاثہ کو وہ ثبوت سامنے لانے کا فرامہم کیا جائے جو اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ مقتولہ ملزم کے بیچ کام کے علاوہ بھی کوئی معاملہ چل رہا تھا کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ جب تک.....“ میں نے لحاظ تو قی کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جب تک میرے فاضل دوست اس حوالے سے اپنے دل اور دماغ کا سارا غبار نکال نہیں لیں گے، ان سے ٹوڈی پوائنٹ کسی مقتولہ جرح کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ بار جس انداز میں مقتولہ اور ملزم کے تعلقات کا بار بار ذکر رہے ہیں اس سے معزز عدالت اور یہاں پر موجود تمام سامعین کے ذہن میں مختلف نوعیت کے خدشات اور شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں لہذا اس ایٹوکواڈریس کرنے کے بعد آگے بڑھا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔“

جج نے گہری سنجیدگی سے میری بات سنی اور مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے وکیل استغاثہ سے کہا۔ کہنے کا انداز ہدایات دینے والا تھا۔

”وکیل صاحب! آپ ڈینس کے اعتراض کے جواب میں کیا کہنا چاہیں گے؟“

وکیل استغاثہ نے کھنکھار کا صاف کیا، معاندانہ نظر سے مجھے گھورا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”جناب عالی! میں اس سلسلے میں ذرا وضاحت سے بات کرنا چاہوں گا۔“

”اجازت ہے!“ جج نے منہ پر ہونے لگے میں کہا۔

”جناب عالی! ملزم شاندار شخصیت کا مالک ہے۔ مقتولہ اس پر خصوصی توجہ دیا کرتی تھی۔ یہ جب بھی کسی کام کی غرض سے مقتولہ کے فلیٹ پر جاتا، وہ اس کی ٹھیک ٹھاکہ خاطر توجہ کرتی تھی اور یہ ایسی پیشکش کو فوراً قبول بھی کرتا تھا۔“ وہ سانس بھرا کر کہنے کے لیے تھما پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ملزم اپنی معصوم شکل سے جتنا سیدھا نظر آتا ہے،

اس کے برعکس ہے۔ اس نے مقتولہ کی مہربانی اور ادب سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے ذہن میں ایک بہتر ترتیب دیا۔ مقتولہ اس کے ساتھ خاصی مکمل مل گئی تھی۔ یہ آزادانہ طور پر گھر کے ہر حصے میں جاسکتا تھا۔ اپنے ہمراہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ملزم نے مقتولہ کی ہر بات پر جواب میں یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ بھی اسے کرتا ہے جتنا چاہتا ہے۔ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگی اور پھر کے روز ملزم نے اپنے منصوبے کو مکمل جامہ پہنا دیا۔“

وکیل استغاثہ نے بات ختم کی تو میں نے رونے لگا۔ جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اپنے فاضل دوست سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

”جج نے انہیں گرائیڈ!“ جج نے انہیں انہیں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میں نے اپنی بات کا آغاز جج کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔“ گھر آئے ہوئے کسی بھی شخص کو چاہئے کہ اس کا پچھلا اخلاقی اقدار کا حصہ ہے اور یہ تو عام طور پر ملزم میں آیا ہے کہ راج مستی، بڑبستی، الیکٹریشن، پلیمبر اور دیگر کام کے گھر کا رگڑ گھر جب کسی کے گھر کے اندر آ کر کام کرتے ہیں اور گھر کے مالک کی ان سے واقفیت بھی ہوتی ہے تو انہیں کھانے پینے کو ضرور پوچھا جاتا ہے۔ مقتولہ کا یہ عمل معاشرتی اقدار، اپنی کیسٹیشن اور معزز وغیرہ میں شمار ہوتا ہے۔ اگر وکیل استغاثہ کے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں اور وہ ملزم کے ان آداب و اخلاقیات کو منفی نظر سے دیکھ کر ایک لاکھ لاکھ کا رنگ دینا چاہتے ہیں تو میں موصوف کی ذہنی بات کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا!.....“ میں نے معنی انداز میں بات اٹھوری چھوڑ کر کندھے اچکانے اور وکیل استغاثہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”وکیل صاحب! استغاثہ کی جانب سے میرے موکل پر ہری اور قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ آپ نے اب تک جج میں مختلف زاویوں سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرے موکل نے اپنی پراثر شخصیت کے مقتولہ کے دل میں جگہ بنائی اور وہ ملزم پر اندھا اعتماد کرنے لگی۔ ملزم نے وقوعہ کے روز اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل پہنچا دیا۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ ملزم کے ذہن میں ایسا کون سا منصوبہ تھا؟“

”چوری کا منصوبہ.....!“ وکیل استغاثہ نے جواب

دیا۔ ”ملزم مقتولہ کی الماری کا صفایا کرنا چاہتا تھا۔ اور اس نے ایسا کر بھی دکھایا۔“

”آپ کا اشارہ ان پچاس ہزار روپے کی جانب ہے جو یہ قول استغاثہ، ملزم نے مقتولہ کے فلیٹ سے چرائے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ”جی ہاں..... آپ بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔“

”تو آپ کے خیال میں پچاس ہزار کی وہ رقم مقتولہ نے اپنی الماری میں رکھی ہو گئی تھی؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں..... بالکل.....“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”مقتولہ اپنا کیسٹیشن، کپڑوں والی الماری کے اندر بنے ایک مخصوص لاکر میں رکھا کرتی تھی۔ مذکورہ الماری مقتولہ کے بیڈروم میں موجود تھی۔ بلکہ اب بھی وہیں موجود ہے۔“

”آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی کہ مقتولہ بیڈروم والی الماری میں کیسٹیشن وغیرہ رکھا کرتی تھی؟“ میں نے چپستے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”پولیس کی تفتیش کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے۔“

”اور یہ کیسے پتا چلا کہ مقتولہ کے لاکر میں وقوعہ کے روز پچاس ہزار روپے کی رقم موجود تھی جو ملزم چوری کر کے لے گیا؟“ ایک بار پھر میں نے چپستے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”اس امر کے محسوس ثبوت اور شواہد موجود ہیں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”وقوعہ والے دن شام میں مقتولہ نے ایک پارٹی کو پچاس ہزار روپے ادا کرنا تھے جو اس روز دوپہر میں اس نے بینک سے نکلوائے تھے۔ مقتولہ کی چیک بک اور متعلقہ بینک کا ریکارڈ اس بات کا گواہ ہے کہ مقتولہ نے اس روز بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوائے تھے۔ اسے شام میں سمیٹ کر ناگھی لہذا اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ مقتولہ نے یہ رقم اپنی الماری کے لاکر میں رکھی ہوگی۔“

”یہ کوئی مسلمہ فارمولہ نہیں کہ بینک سے رقم نکلوانے کے بعد گھریلو لاکر ہی میں رکھی جائے۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم کا مالک اپنی رقم کو کہیں بھی رکھنے کا مجاز ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مقتولہ نے وہ رقم اپنی پارٹی کو دے دی ہو جس کے لیے اس نے بینک سے نکلوائی تھی۔“

”نہیں جناب..... ایسا ہرگز ممکن نہیں۔“ وہ بڑی قطعیت سے بولا۔ ”استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں اس

لہر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کا اندازہ سو فیصد درست ہے۔“

وہ بڑے فخر سے سینہ جھلاتے ہوئے بولا۔ ”میرے وہاں موجود ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔ جائے وقوعہ از خود یہ کہانی سناتی ہے۔ وہاں کی افراتفری کو دیکھ کر یہی تاثر ابھرتا تھا کہ موت کے منہ میں جانے سے قبل مقتول نے ملزم کے خلاف اچھی خاصی مزاحمت کی تھی۔ بیڈروم میں موجود پکڑوں والی الماری کے دونوں پٹ پوری طرح کھلے ہوئے تھے اور اندرونی لاکر کی بھی یہی کیفیت تھی۔ مذکورہ الماری کے قریب ہی فرش پر مقتول کی لاش پڑی تھی۔ اسے جس آہنی ہتھوڑی سے لپٹی پر ضرب لگا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا، وہ بھی لاش کے قریب ہی پڑی مل گئی تھی۔ یہ تمام تر شواہد جن حقائق کی جانب اشارہ کرتے ہیں وہی ایک کہانی کی شکل میں تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کے سامنے بیان کیے ہیں۔“

”میں نے آپ کی وضاحت کو دل و جان سے مان لیا وکیل صاحب!“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”ان تمام تر واقعاتی شہادتوں سے وہی حقیقت اجاگر ہوتی ہے جو ابھی آپ نے بیان کی ہے لیکن میرا سوال ابھی تک تشہد جواب ہے جہاں سے اس بجٹ کا آغاز ہوا تھا۔“

”کون سا سوال؟“ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وکیل صاحب! آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وقوعہ کے روز مقتول نے اپنے بیڈروم میں، موت کے منہ میں جانے سے قبل جس ہتھوڑی بردار شخص کے خلاف مزاحمت پیش کی وہ اس مقدمے کا ملزم اور میرا موکل ساجد علی ہی تھا۔؟“

”اس امر کا سب سے بڑا ثبوت تو آلرل قتل ہی ہے۔“

وکیل استفسار نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... آلرل قتل کو کیا ہوا ہے؟“ میں پوچھنے بنانا رہا۔

وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ”آلرل قتل پر ملزم کے فکر پرش پائے گئے تھے۔“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ”دی کورٹ از ایڈ جرنل.....!“

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ نورین کی موت بارہ دھیر کی سپرہ چادر اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آلرل قتل کیل ٹھونکنے والی آہنی ہتھوڑی تھی جس کی مدد سے مقتولہ کی کپٹی کو نشانہ بنایا گیا تھا اور یہ ضرب اتنی کاری ثابت ہوئی تھی کہ مقتولہ تھوڑا کر وہیں گری تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی روح نفس غصری سے پرواز کر گئی تھی۔ استفسار کے مطابق انکوائری آفیسر جب وقوعہ پر پہنچا تو اسے بیڈروم کے فرش پر مقتولہ کی لاش پڑی ملی تھی۔ کمرے کے اندر اس نوعیت کی ابتری بھی پائی گئی تھی جیسے مقتولہ نے موت کے منہ میں جانے سے پہلے اچھی خاصی مزاحمت پیش کی ہو۔ پکڑوں والی الماری کے دونوں پٹ بھی کھلے پائے گئے تھے اور اس لاکر کا دروازہ بھی کھلا تھا جس کے اندر سے مبینہ طور پر پچاس ہزار روپے کی رقم چرائی گئی تھی۔

آلرل قتل یعنی آہنی ہتھوڑی کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی منسلک تھی۔ اس ہتھوڑی کے آہنی حصے پر مقتولہ کے خون کے علاوہ اس کے سر کے چند بال بھی چپکے ہوئے پائے گئے تھے جبکہ چوٹی دستے پر میرے موکل یعنی اس کیس کے ملزم ساجد علی کی اگلیوں کے نشانات ملے تھے۔

اس سے پہلے کہ استفسار کی جانب سے گواہوں کی پیشی کا سلسلہ شروع ہوتا، میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے درخواست کی۔

”جناب عالی! اگر اجازت ہو تو میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس سلسلے میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مجھے اجازت دے دی۔

جج کے اشارے پر مذکورہ آئی او ونس باکس میں آکر کھڑا ہو گیا اور منتظر نگاہ سے میری طرف دیکھنے لگا۔

اس آئی او کا نام اتیناز شاہ تھا۔ وہ ایک دراز قامت، مضبوط کاٹھی کا مالک، ساٹوا فٹس تھا۔ سر کے بال وسطی حصے سے غائب ہو چکے تھے۔ باقی ماندہ بال ایک مناسب سی جھار کے مانند کنپٹیوں کے اوپر سے ہوتے ہوئے اور کانوں کے عقب سے گزرتے ہوئے سر کے پچھلے حصے کی جانب چلے گئے تھے۔ وہ چہرے کے تاثرات سے خاصا ہیز اور غصیلیا نظر آتا تھا۔ عہدے کے اعتبار سے وہ ایک سب انسپکٹر تھا۔

”شاہ جی! میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”اس واقعے کی اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟“

”عباسی صاحب نے.....“ اس نے جواب دیا۔

”یہ کون صاحب ہیں؟“ میں نے انجان بن کر کہا۔

”عباسی صاحب ای اپارٹمنٹس بلڈنگ میں رہتے ہیں جہاں مقتولہ رہائش پذیر تھی۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بس بلاک کا فرق ہے۔ مقتولہ بلاک اے کے فلیٹ نمبر چار سو ایک میں رہتی تھی جبکہ عباسی صاحب بلاک بی کے فلیٹ نمبر تین سو تین میں۔“

میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی! نادر عباسی نے وقوعہ کے روز آپ کو کیسے اور کتنے بجے اس سانحے کی اطلاع دی تھی؟“

”ہمارے روزنامے کے مطابق اس واقعے کی اطلاع سپرہ ساڑھے پانچ بجے دی گئی تھی۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اور یہ اطلاع بذریعہ فون دی گئی تھی۔“

”آپ کتنے بجے جانے وقوعہ پر پہنچے تھے؟“

”ٹھیک چھ بجے۔“

”کیا اس وقت نادر عباسی بھی وہاں موجود تھا؟“

”جی ہاں، موجود تھا۔“

”کیا آپ نے نادر عباسی سے یہ سوال نہیں کیا کہ بی بلاک کے ایک فلیٹ میں رہتے ہوئے اسے یہ کیسے پتا چلا کہ بلاک اے میں کسی خاتون کا قتل ہو گیا ہے؟“

”پوچھا تھا۔“ اس نے بڑی رمان سے جواب دیا۔ ”عباسی صاحب کو بلڈنگ کے چوکیدار حنیف نے اس واقعے سے مطلع کیا تھا۔“

”جب آپ وقوعہ پر پہنچے تو وہاں کی کیا کیفیت تھی؟“

میں نے استفسار کیا۔

انکوائری آفیسر نے بڑے مفصل انداز میں مجھے کیفیت سے آگاہ کیا جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

”جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے بعد آپ کے ذہن میں پہلا خیال کیا آیا تھا؟“

”جی..... یہ ایک قتل اور ذہنی کی واردات ہے۔“

”جوری وغیرہ ہوئی ہے؟“

”کپڑوں والی الماری کی حالت اس امر کی منہ بولتی تصویر تھی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”رہی سبھی سرزبیر سلطان کے بیان نے پوری کر دی تھی۔“

”زبیر سلطان.....“ میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ بھی اسی کیس کا کوئی کردار ہے.....؟“

”جی ہاں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”زبیر سلطان بیٹے کے اعتبار سے ایک ریل اسٹیشن ایجنٹ ہے۔ مقتولہ وقوعہ کی شام اسی شخص سے ملاقات کرنے والی تھی۔ اس ملاقات میں مقتولہ نے زبیر سلطان کو وہ پچاس ہزار روپے ادا کرنے تھے جو اس نے اس روز بینک سے لگوائے تھے۔ ان دونوں کے بچ کیس فلیٹ کی خریداری کے سلسلے میں کوئی ذیل چل رہی تھی۔“

”اچھا اچھا، یہ وہ صاحب ہیں.....“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”ان کا نام تو استفسار کے گواہوں کی فہرست میں بھی شامل ہے۔“

”جی، شامل ہے۔“ آئی او نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”آئی او صاحب! کیا آلرل قتل آپ کو آسانی سے مل گیا تھا یا اس سلسلے میں آپ کو شواہد اٹھانا پڑی تھی؟“

”آلرل قتل مقتولہ کی لاش کے قریب ہی فرش پر پڑا تھا۔ انکوائری آفیسر نے جواب دیا۔ ”اس کی تلاش کے سلسلے میں ہمیں کوئی خاص محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔“

”آلرل قتل پر ملزم کی اگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”صرف اسی بنا پر آپ نے میرے موکل کو اس کیس کا ملزم قرار دیا ہے یا اس کے علاوہ بھی آپ کو کوئی ثبوت ملا تھا؟“

”آلرل قتل پر ملزم کے فکر پرش پٹ پٹاتی اہم ثبوت تھا۔“ تفتیشی افسر نے جواب دیا۔ ”مجرمل نے اس بات کا بھی اقرار کیا ہے کہ مذکورہ ہتھوڑی اسی کی ملکیت ہے۔“

”اگر آپ میرے ذاتی پتوں سے کسی کو قتل کر دیں تو کیا اس کیس میں مجھے قاتل قرار دیا جائے گا؟“ میں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ”آئی او صاحب! یہ تو کوئی فارمولہ نہ ہوا؟“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں، اس بات کو فارمولہ نہیں بنایا جاسکتا۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن آلرل قتل پر ملزم کے فکر پرش غور و فکر کی دعوت دیتے

ہاں۔ حالات و واقعات اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ یہ قتل مہم نے کیا ہے۔

”آپ نے مہم کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”اس کی دکان سے۔“ آئی اے نے جواب دیا۔ ”اور اس وقت لگ بھگ سات بجے کا وقت تھا۔“

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ نورین کی موت بارہ دسمبر کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور آپ نے مہم کو لگ بھگ سات بجے شام یا سات بجے رات گرفتار کیا تھا۔“ میں نے آئی اے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہم انتہائی وقت سمجھتے ہوئے یہ فرض کر لیں کہ مقتولہ کو پانچ بجے قتل کیا گیا تھا تو آپ کے مطابق اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ مہم اس واردات کے بعد بڑے آرام سے اپنی دکان پر موجود رہا تھا اور اگر آپ وہاں پہنچ کر اسے ہتھکڑی نہ لگاتے تو ممکن تھا یہ مزید کچھ وقت اپنی دکان پر بیٹھا رہتا۔“

”جی ہاں، حالات تو اسی جانب اشارہ کرتے ہیں۔“ اس نے گول مول سا جواب دیا۔

”کیا گرفتاری کے وقت آپ نے مہم کی اور اس کی دکان کی تلاشی لی تھی؟“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”دکان کی تو نہیں البتہ۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے مہم کی مکمل جامہ تلاشی لی تھی۔“

”کیا آپ نے مہم کی جامہ تلاشی کے دوران میں مقتولہ کی الماری کے لاکر میں سے چوری ہونے والے پچاس ہزار روپے برآمد کروالے تھے؟“

”جی نہیں، اس کے پاس سے کوئی رقم برآمد نہیں ہوئی تھی۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”اس کے بعد یقیناً آپ نے مہم کی دکان کو کھنگال ڈالا ہوگا۔“

”جی نہیں۔“ وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد بولا۔

”آئی اے صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔“ میں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ”مقتولہ کی الماری کے لاکر میں سے ایک بڑی رقم چرائی گئی اور آپ کا دعویٰ ہے کہ یہ رقم میرے موکل نے چرائی تھی تو پھر گرفتاری کے وقت آپ نے اس کی دکان کی تلاشی کیوں نہیں لی۔“

”جی ہاں، بہت ضروری تھی۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس وقت تک خانہ تلاشی کا جواز سامنے نہیں آیا تھا۔ ہم نے مہم کی جامہ تلاشی تو موقع کی

کارروائی کے تقاضے نبھاتے ہوئے کی تھی۔“

”آپ صرف کمال ہی نہیں بلکہ غضب بھی کر رہے ہیں آئی اے صاحب!“ میں نے آنکھیں پھیلا کر جیسے لہجے میں کہا۔

”معزز عدالت کے سامنے اس بات کی وضاحت کریں کہ مہم کی گرفتاری کے وقت، اس کی دکان کی تلاشی کا جواز کیوں آپ کو نظر نہیں آ رہا تھا جبکہ قتل کی واردات کے ساتھ ہی جائے وقوعہ سے پچاس ہزار روپے بھی غائب ہوئے تھے۔“

”وہ بات دراصل یہ ہے جناب۔“ وہ جڑ بڑ ہوتے ہوئے بولا۔ ”مہم کی گرفتاری کے وقت صرف مقتولہ کا قتل ہمارے پیش نظر تھا۔ رقم کی چوری کا قصہ تو بعد میں سامنے آیا تھا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ ویری انٹرسٹنگ!“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”تو گویا رقم کی چوری والا قصہ اس اسٹوری کا ایڈیشن ہے۔“

”جو بھی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مقتولہ کی الماری کے لاکر میں سے پچاس ہزار روپے غائب ہوئے تھے۔“ وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”ہمارے پاس اس امر کے ٹھوس ثبوت ہیں۔ بینک کی چیک بک کا ریکارڈ، اکاؤنٹ میں سے نکالی جانے والی پچاس ہزار کی رقم کا ثبوت، زیر سلطان کی گواہی۔“

”ان تمام تر واقعاتی شہادتوں اور گواہوں کو ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”مردست معزز عدالت کو آپ یہ بتائیں کہ آپ کوئی بھی ایسا ٹھوس ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ مقتولہ نے سرورقہ رقم واقعتاً اپنی الماری کے لاکر میں رکھی تھی؟“

”ایسا ثبوت تو وکیل صاحب اسی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے جب کسی نے مقتولہ کو، خود اپنی آنکھوں سے وہ رقم الماری میں رکھتے دیکھا ہو۔“ وہ ہیزاری سے بولا۔

”آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ استفسار کے پاس اس امر کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ ایسا ہی سمجھ لیں۔“ ”سمجھ لیا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر استفسار کیا۔ ”پھر تو استفسار کے اسٹاک میں اس امر کا بھی کوئی عینی شاہد نہیں ہوگا جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس نے مہم کو مقتولہ کی الماری میں سے پچاس ہزار روپے اڑاتے دیکھا ہے؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ یہی بات ہے۔“ وہ ہیزاری سے بولا۔ ”مذکورہ رقم کی لاکر میں موجودگی کو بینک کی دستاویزات اور زیر سلطان کی گواہی کے تناظر ہی میں سمجھا

بولاً۔ ”ساجد ایسا کام کر ہی نہیں سکتا۔ والد صاحب مرحوم نے ہماری جس انداز میں تربیت کی تھی اس کی روشنی میں چوری، ڈکیتی، ہیرا پھیری کی ہم سے توقع نہیں کی جاسکتی اور..... انسانی جان کا قتل تو بہت دور کی بات ہے۔“

”گو یا آپ کی نظر میں ساجد علی بے گناہ ہے.....؟“

”جی ہاں، بالکل!“ وہ بخوش لہجے میں بولا۔

”جب یہ بات اسنے دلوں سے آپ کو معلوم ہے تو پھر وہ قادر مطلق بھی اس حقیقت سے بہ خوبی واقف ہوگا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”وہ ذات پاک تو عظیم البصیر ہے، بصیر ہے۔“

”اور وہ انصاف کرنے والا بھی ہے؟“

”بے شک!“

”تو پھر آپ مطمئن ہو جائیں۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنے بھائی کو اور میں اپنے مولک کو بے گناہ سمجھتا ہوں اور ہم دونوں کا یہ بھی ایمان ہے کہ وہ قادر مطلق تمام تر زمینی حقائق سے پوری طرح آگاہ ہے۔“

جب وہ اپنے بندے پر کرم کرے گا اور میں اپنے مولک کی بریت کے لیے کوشش کروں گا تو پھر طرم اس عدالت سے باعزت ہی اپنے گھر جائے گا۔“

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکے لگا۔

☆ ☆ ☆

آئندہ پیشہ پر استغاثہ کی طرف سے پراپرٹی ایجنٹ زیر سلطان کو سب سے پہلے گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ زیر سلطان بھاری تن و دوش کا مالک ایک ہشاش بشاش شخص تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی تیزی پائی جاتی تھی۔ وہ گندمی رنگت کا مالک ایک دور بین انسان تھا۔

زیر سلطان نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا بیان ریکارڈ کرادیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹس باکس کے قریب چلا گیا۔ وہ مختلف سوالات کے ذریعے گواہ کی زبان سے یہ ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہا کہ

مقتول نے وقوعہ کے روز بینک سے پچاس ہزار روپے لٹکوائے تھے جو وہ شام سات بجے اسے دینے والی تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں چیک بک اور بینک کے ریکارڈ کا بھی کئی بار ذکر آیا۔ بہر حال، حاصل بحث صرف اتنا تھا کہ وقوعہ کے روز

مقتول کے گھر میں پچاس ہزار روپے کی رقم موجود تھی۔ وکیل استغاثہ نے گواہ کو فارغ کیا تو سچ سے اجازت

”آخری سوال.....“ میں نے طرم کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔ ”جب تم اپنا کام ختم کر کے مقتول کے فلیٹ سے رخصت ہوئے تو کیا اس وقت فلیٹ کے اندر مقتول کے علاوہ کوئی اور شخص بھی موجود تھا؟“

”نہیں جناب..... وہ گھر میں الکیلی ہی تھی۔“

”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“ میں نے روئے سخن سچ کی جانب پھیرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد استغاثہ کی طرف سے دو گواہ یکے بعد دیگرے شہادت کے لیے کٹہرے میں لائے گئے جن میں سے ایک تو اسی اپارٹمنٹس بلڈنگ کا رہائشی تھا اور دوسرا بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ ان دونوں گواہوں کے بیانات اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح میں کوئی خاص یا نئی بات موجود نہیں تھی۔ دونوں کا موقف وکیل استغاثہ کے ابتدائی زور و کالت کا عکاس تھا اور مجھے تو ان کے بیانات میں صرف یہی بات سمجھ میں آئی کہ انہیں طرم کا مقتول کے فلیٹ میں جانا اور اس سے خاطر خواہ متعلق نہیں ہوتا تھا۔

کوئی عورت اپنے شوہر کے بغیر نہیں الکی رہ رہی ہوتو بہت سوں کی ہوس بھری بھوک نظر میں اس پر لگ جاتی ہیں۔ یہ دونوں گواہان استغاثہ بھی اسی چکر میں دکھائی دیتے تھے۔

آپ اسے خواہ مخواہ کا حد بھی کہہ سکتے ہیں۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے پر جج نے آئندہ پیشی کے لیے تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو طرم کا بھائی رزاق میرے ساتھ تھا۔ رزاق فریج اور ایر کنڈیشن وغیرہ کی رینجرنگ وغیرہ کا کام کرتا تھا اور اپنے شعبے کا ایک تجربہ کار اور قابل بھروسہ ماہر سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا تو اس کا شیوہ اکا سا بڑھا ہوا نظر آیا۔ وہ درمیانے قد کا ایک فربہ اندام اور اس کھٹخص تھا۔ وہ ہر وقت سر پر ٹوپی لگائے رہتا تھا۔

رزاق نے مجھ سے پوچھا۔ ”وکیل صاحب! آپ کی نظر میں اس وقت یس کی کیا پوزیشن ہے؟“

”انتہائی تسلی بخش۔“ میں نے براعتاً دلچسپ لہجے میں جواب دیا۔

”یعنی ساجد باعزت بری ہو جائے گا نا.....؟“ وہ مذہب لہجے میں متفطر ہوا۔

”آپ مجھے ایک بات بتائیں رزاق صاحب.....!“

”اب دینے کے بجائے میں نے انہی سے سوال کر ڈالا۔“

”گو یا آپ کی نظر میں ساجد علی بے گناہ ہے؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!“ وہ اٹل لہجے میں

ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارا ساتھ پانچ سال سے زیادہ عرصے کا ہے اور یہ میرے استعمال میں بھی رہی ہے جیسی تو اس کے دستے پر میری انکھوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔“

”ویری گڈ.....!“ میں نے سر اٹھانے والے انداز میں کہا۔ ”اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ تمہاری یہ دیرینہ رفیق جانے وقوعہ پر کیسے پہنچی؟“

”میرا خیال ہے.....“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”وقوعہ کے روز جب میں مقتول کے گھر میں کام ختم کرنے کے بعد واپس آیا تھا تو یہ ہتھوڑی وہیں ڈرائنگ روم میں رہ گئی تھی۔“

”اچھا!“ میں نے پر مٹی انداز میں گردن ہلائی۔ ”تم جب اپنے اوزار سمیٹ کر مقتول کے فلیٹ سے نکلے تو اس وقت تمہیں یہ پتا نہیں تھا کہ یہ ہتھوڑی وہیں رہ گئی ہے؟“

”جی ہاں، مجھے اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”میں نے صوفے کی حرمت کے دوران میں سارے اوزار ڈرائنگ روم کے فرش پر پھیلا رکھے تھے اور جب کام ختم ہو گیا تو میں انہیں اپنے مخصوص تحیلے (ٹولز کٹ) میں رکھ کر مقتول کے فلیٹ سے نکل آیا تھا۔ مجھے نہیں ہے، میں اس ہتھوڑی کو تحیلے میں رکھنا بھول گیا تھا۔“

”تم مقتول کے فلیٹ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”میرا خیال ہے، اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور تم مقتول کے فلیٹ پر کتنی دیر رہے تھے؟“

”زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا.....“ وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کام تو میں نے چالیس بیس منٹ میں ختم کر لیا تھا۔ اس کے بعد مقتول نے مجھے جانے پینے کو دی جس کی وجہ سے مزید س پندرہ منٹ مجھے اس کے فلیٹ پر کرنا پڑا تھا لیکن یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ.....“

”لحاقی تو وقت کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”جب میں مقتول کے فلیٹ سے نکلا تو اس وقت چار بجنے میں ایک دو منٹ باقی تھے۔“

”یعنی جب تم مقتول کے فلیٹ سے باہر آئے تو اس وقت مقتول زندہ سلامت تھی؟“ میں نے تصدیق طلب انداز میں استفسار کیا۔

”بالکل..... میں اسے صبح سلامت وہاں چھوڑ کر آیا تھا۔“ اس نے میرے حسب توقع جواب دیا۔ ”بلکہ وہ میرے ساتھ دو روز تک آئی تھی اور جب میں فلیٹ سے باہر نکلا تو اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔“

اور ثابت کیا جاسکتا ہے۔“

”آخری سوال!“ میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”کیا آپ نے طرم کے پاس سے وہ رقم برآمد کر لی تھی؟“

آئی او نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں اس چوٹی میز کی جانب بڑھ گیا جہاں آلہ قتل یعنی کیبل شوٹنگ والی ہتھوڑی سیلفین بیگ کے اندر محفوظ رکھی نظر آرہی تھی۔ ہتھوڑی کے سر یعنی آہنی حصے پر موجود مقتول کا خون اب سہی مائل رنگت اختیار کر چکا تھا اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ قائم نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے اس کا رنگ سرخ بھی رہا ہوگا۔

میں نے مذکورہ سیلفین بیگ میز پر سے اٹھالیا اور ایکوڈ باکس میں کھڑے اپنے مولک کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سوال کیا۔

”جانتے ہو، اس بیگ کے اندر کیا ہے؟“

”ہتھوڑی ہے.....“ اس نے جواب دیا۔

”استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ اس ہتھوڑی کی مدد سے مقتولہ ٹورین کو قتل کیا گیا تھا۔“ میں نے اپنے مولک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

بہت ساری باتیں جو انتہائی سادہ اور سامنے کی ہوتی ہیں انہیں بڑے طریقے طریقے سے عدالت کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے اور ان لحاظ میں، میں یہی کام کر رہا تھا۔ میں نے پچھلے دنوں اس کیس کے حوالے سے بڑی بھاگ دوڑ کی تھی اور دو تین ملاقاتیں طرم سے بھی ہوئی تھیں جس کے نتیجے میں مجھے بیش قیمت معلومات حاصل ہوئی تھیں جنہیں میں گاہے بہ گاہے، مناسب موقع دیکھ کر عدالتی کارروائی کے دوران میں استعمال بھی کر رہا تھا۔

طرم نے میرے استفسار کے جواب میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور نہایت ہی مختصر سا جواب دیا۔

”جی.....!“

”کیا تم اس ہتھوڑی کو پہچانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”اس کے دستے پر تمہارے فنگر پرنٹس پائے گئے ہیں۔“ میں نے مٹی خیز انداز میں کہا۔ ”کیا اس ہتھوڑی کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق بنتا ہے۔ ایسا لگتا ہے، یہ تمہارے استعمال میں رہی ہو..... ہوں؟“

”جی ہاں.....“ آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔“ وہ

تائیدی انداز میں بولا۔ ”اس ہتھوڑی کا مجھ سے بڑا گہرا تعلق

لے کر میں گواہوں والے گہرے کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے کھٹاکر کھا صاف کیا اور کچھ اس انداز میں اپنی جرح کا آغاز کیا۔

”زیر صاحب! کیا یہ بات درست ہے کہ آپ کا تعلق ایک خاص کیوٹی سے ہے؟“

”جی ہاں، یہ بات سولہ آنے درست ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ کی کیوٹی میں نوکری وغیرہ کرنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔“ میں نے بڑے بیٹھے انداز میں جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگ کاروبار کو ترجیح دیتے ہیں؟“

”بات شخص ترجیح کی نہیں ہے وکیل صاحب۔۔۔۔۔“ وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ صرف کاروبار اور تجارت ہی کرتے ہیں۔ ہماری کیوٹی کے روحانی پیشوا نے ہمیں ملازمت وغیرہ سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ ہم صرف اور صرف اپنا کام کرتے ہیں، چاہے ہمیں چنے کی چھابڑی کیوں تلگانا پڑے۔“

”بہت خوب۔۔۔۔۔!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”کامیاب تجارت کے لیے تو ایسا انداز بنیادی شرط سمجھی جاتی ہے۔ کیا آپ کے ہاں بھی اس بنیادی لوازم کا خیال رکھا جاتا ہے؟“

”جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، بالکل اسی طرح دنیا میں پائے جانے والے تمام افراد بھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے لہذا ہماری کیوٹی میں سو فیصد دیانت دار لوگوں کا پایا جانا لازمی نہیں ہے۔“ وہ بڑے خوبصورت عیرائے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”البتہ، آپ نے جس کاروباری اصول کا ذکر کیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جو بھی شخص اس اصول پر کاربند رہتا ہے وہ فلاح و ترقی پاتا ہے۔“

”ہم دوسروں کی بات نہیں کرتے، صرف آپ کی ذات کو فوکس کرتے ہیں۔“ میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ”کیا آپ نے اپنے برٹس میں تذکرہ بالا اصول کے لیے جگہ بنا رکھی ہے؟“

”الحمد للہ۔۔۔۔۔!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”زیر صاحب!“ میں نے اچانک سوالات کا زاویہ بدل دیا۔ ”کیا آپ کے پاس کوئی ایسی صلاحیت بھی ہے کہ لوگ آپ کو اپنے گھر یا رازوں میں بھی شریک کر لیتے ہیں؟“

”اگر یہاں لوگوں سے مراد میرے گھر کے افراد ہیں

تو الحمد للہ۔۔۔۔۔ اس معاملے میں۔۔۔۔۔ میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں۔“ وہ پراعتاد انداز میں بولا۔ ”میرے فیملی کے تمام افراد اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتے ہیں۔“

”میں آپ کے گھر کی نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے وضاحت ضروری جانی۔ ”دوسرے لوگ جیسے۔۔۔۔۔ مقتول نورین۔۔۔۔۔“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب۔“ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”دوسرے لوگ بھلا کیوں مجھے اپنے رازوں میں شریک کرنے لگے؟“

”وکیل! استغاثہ نے آپ کے ساتھ جو بیس پچیس منٹ صرف کیے ہیں اس کا لب لباب اور اس لب لباب میں سے اٹھنے والے پیلے اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ مقتول اپنے مالیاتی راز آپ کے ساتھ شیئر کر چکی تھی جیسی آپ کو یہ بات پتا تھی کہ وقوعہ کے روز اس نے پچاس ہزار روپے بینک سے نکھو کر اپنی الماری کے لاکر میں رکھے تھے۔۔۔۔۔“

”نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ نے وکیل استغاثہ کی گفتگو سے خود ہی یہ مطلب اخذ کر لیا ہے ورنہ میں نے تو ایسا کوئی تاثر نہیں دیا۔“

”تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مقتول نے آپ کو نہیں بتایا تھا کہ اس نے پچاس ہزار روپے اپنی الماری کے لاکر میں رکھے تھے؟“ میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

”جی، میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”وہ بھلا مجھے اپنے بیڈروم اور اس میں رکھی الماری کے لاکر کے حوالے سے کیوں بتانے لگی۔۔۔۔۔“

”تو گویا آپ کی معلومات صرف اس حد تک ہیں کہ مقتول نے وقوعہ کے روز بینک سے پچاس ہزار روپے نکھوائے تھے؟“ میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہ بات دعوے سے نہیں کہہ سکتے کہ اس نے مذکورہ رقم اپنی الماری کے لاکر میں رکھی تھی؟“

”جی یہی حقیقت ہے۔“ وہ دونوک انداز میں بولا۔ ”مجھے صرف مقتول نے یہ بتایا تھا کہ اس نے بینک سے پچاس ہزار روپے نکھوائے ہیں جو وہ شام کو میرے آفس آکر مجھے ادا کر دے گی۔ اب اس نے ان پچاس ہزار روپوں کو الماری میں رکھا تھا، کچھ کے پیچھے چھپایا تھا، اپنے پرس میں ڈالا تھا یا کسی گلے میں دبایا تھا، یہ تو وہی جاتی تھی اور یا پھر خدا کو معلوم تھا۔“

”آپ بالکل شیک کہہ رہے ہیں زیر صاحب!“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔

ضرورت مند

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو معزز عدالت کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ مقتول کس سلسلے میں آپ کو پچاس ہزار روپے ادا کرنے والی تھی؟“

اس عدالت میں نورین مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی تھی لیکن زیادہ تر پچاس ہزار روپے کی چوری پر دھمکانی دیتا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ استغاثہ نے اس مرڈر کو پچاس ہزار روپے کی چوری کے ساتھ بانڈھ رکھا تھا۔

استغاثہ کے گواہ نے میرے استغاثہ کے جواب میں بتایا کہ مقتول اس کے توسط سے ایک فلیٹ کا سودا کر رہی تھی اور وقوعہ کے روز نوٹوں کے طور پر پارٹی کو پچاس ہزار روپے ادا کرتے تھے تاکہ سبیل انگری منٹ تیار کیا جاسکے لیکن مقتول کی موت کے باعث یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ میں نے مزید دو چار مہینے سوالات کے بعد زیر سلطان کو فارغ کر دیا۔

میرے حجاب سے زیر سلطان کی گواہی محض وقت کا زیاں ثابت ہوئی تھی۔ استغاثہ اس کے بیان سے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مقتول نے اپنے الماری کے لاکر میں پچاس ہزار روپے رکھے تھے، وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ اور میں نے استغاثہ کے اس اسٹیڈ کو قدامتوں سے اکھاڑ بیچنا تھا۔

اگلا گواہ نادر عباسی تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تھانے فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ عباسی لوکل گورنمنٹ کا ملازم تھا۔ اس کے مجھے یا عہدے کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ نادر عباسی اسی اپارٹمنٹس بلڈنگ کے بی بلاک میں رہائش پذیر تھا جس کے بلاک اسے میں مقتول نورین کا فلیٹ تھا۔ عباسی سائولی رنگت کا مالک ایک پست قامت شخص تھا۔

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح مکمل کر لی تو میں اپنی باری پر گواہوں والے گہرے کے پاس پہنچ گیا۔ میں چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے عباسی کو دیکھتا رہا پھر جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”عباسی صاحب! پولیس کے ریکارڈ کے مطابق اس اندوہناک واقعے کی اطلاع آپ ہی نے متعلقہ تھانے کو دی تھی۔ کیا یہ سناخدا آپ کی نظر کے سامنے وقوع پڑ رہا تھا؟“

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وقوعہ استغاثہ کے گواہ نادر عباسی کے سامنے پیش نہیں آیا تھا، تاہم میں نے اسے ایک خاص زاویے سے گھسنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے نہایت ہی مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

”نہیں وکیل صاحب۔۔۔۔۔!“

”پھر آپ کو اس واقعے کی خبر کیسے ہوئی؟“

”مجھے بلڈنگ کے چوکیدار نے اس بارے میں بتایا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”جب چوکیدار نے آپ کو یہ اطلاع دی اس وقت آپ کہاں تھے؟“ میں نے جرح کے سلسلے کو رفتہ رفتہ آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”میں چند لمبے پہلے ہی بلڈنگ میں داخل ہوا تھا۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”میں جیسے ہی گاڑی پارک کر کے باہر نکلا، چوکیدار حنیف نے میرے پاس آکر یہ اطلاع دی اور اس کے ساتھ ہی درخواست بھی کی کہ میں اس انفسوسناک واقعے کی اطلاع پولیس کو دے دوں، سو۔۔۔۔۔“ وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں جلدی سے گھر پہنچا اور متعلقہ تھانے میں فون کر دیا۔“

”آپ نے لگ بھگ کتنے بجے تھانے فون کیا تھا؟“

”میرے خیال میں اس وقت سہ پہر کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بلکہ شام ہونے والی تھی۔ سردیوں میں دن گھٹ کر کافی چھوٹا ہو جاتا ہے۔“

”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ کے خیال میں بلڈنگ کے چوکیدار حنیف کو یہ کیسے پتا چلا تھا کہ بلاک اسے کے فلیٹ نمبر چار سو ایک میں رہنے والی مسز نورین کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟“

”آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے وکیل صاحب!“ وہ تعریفی انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے پولیس کو فون کرنے سے پہلے اس بارے میں چوکیدار سے استغاثہ کیا تھا۔“

”پھر اس نے آپ کو کیا جواب دیا تھا؟“

”چوکیدار کو یہ بات آئندہ سے پتا چلی تھی۔“ عباسی نے جواب دیا۔

اس یس میں ایک نیا کردار سامنے آیا تھا لہذا میں نے چوکنے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”آئندہ کون؟“

”آئندہ ایک ماسی (نوکرانی) ہے جناب۔“ عباسی نے بتایا۔ ”وہ ہماری بلڈنگ کے چند گھروں میں کام کرنے آتی ہے۔ مقتول کے گھر پر بھی وہی کام کرتی تھی۔ وقوعہ کے روز سہ پہر میں جب وہ کام کے لیے مقتول کے گھر پہنچی تو اس نے مقتول کو بیڈروم کے فرش پر مردہ حالت میں پڑے

دیکھا۔ اس کے بعد وہ دوڑتی ہوئی چوکیدار کے پاس پہنچی۔

میں نے اپنی فالوں میں جھانکا اور وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”استغاثہ کی رپورٹ اور گواہان کی لہرست میں آمد نامی کسی کردار کا ذکر نظر نہیں آتا۔ یہ کچھ عجیب سی بات نہیں؟“

”اس میں آپ کو کیا عجیب محسوس ہو رہا ہے؟“ اس نے اٹھڑے ہوئے انداز میں التامی سے پوچھا۔

”آمدنہ عورت ہے جس نے سب سے پہلے مقتولہ کو مردہ حالت میں دیکھا تھا۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”رپورٹنگ پرس کا نام تو کسی بھی رپورٹ میں بڑے اہتمام کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور یہاں اس مایہ چاری کا ذکر تک پڑھنے کو نہیں ملتا۔ اس سنگین نظر اندازی کا کیا سبب ہے؟“

”کوئی سبب نہیں۔“ وہ بہ دستور اٹھڑے ہوئے انداز میں بولا۔ ”استغاثہ نے جس بات کو ضروری سمجھا، اسے رپورٹ میں شامل کر لیا اور.....“

”اور جس بات کو غیر ضروری جانا اسے گول کر دیا۔“ میں نے اس کا بیان مکمل ہونے سے پہلے ہی طنز پر لہجے میں کہا۔ ”یہی بات ہے تا میرے فاضل دوست؟“

”آپ جو بھی سمجھ لیں۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”جو بھی سمجھے گی بات نہیں ہے مانی ڈیز.....!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ترشی سے کہا۔ ”میں نے وہی سمجھا ہے جو آپ نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ہے.....“ پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور نہایت ہی ادب کے ساتھ عرض کیا۔

”جناب عالی! جس عورت نے سب سے پہلے مقتولہ نورین کی لاش کو دیکھا، ڈیفنس کی نظر میں وہ بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ مجھے تو اس بات پر سخت حیرت ہے کہ استغاثہ کی رپورٹ میں آمد نامی کا کہیں ذکر تک نہیں کیا گیا۔ میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ مذکورہ مایہ کو عدالت میں حاضر کرنے کا خصوصی بندوبست کیا جائے۔ میں اس گھریلو ملازمہ پر اپنے انداز میں جرح کرنا چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی..... میں نے لحاظی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اس کے ساتھ ہی بلڈنگ کے چوکیدار حنیف کو بھی گلی پیشی پر عدالت میں بلایا جائے۔ اس شخص سے پوچھ گچھ بھی اس یس کے سلسلے میں معاون اور میرے موکل کے حق

میں مفید ثابت ہو سکتی ہے۔“

معزز عدالت نے میرے مطالبے کو راست جانتے ہوئے متعلقہ عدالتی عمل کو خصوصی ہدایات جاری کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جرنل.....!“

☆ ☆ ☆

آئندہ پیشی پر آمد نامی عدالت میں موجود نہیں تھی۔ استغاثہ کی طرف سے وضاحت دی گئی کہ آمد نامی کاؤں گئی ہوئی ہے اور اسے ملانے کی مہم کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ آمد نامی کاؤں بلوچستان کا ایک دور دراز علاقہ تھا اور وہ کراچی کے علاقے گولی مار میں، ندی کے کنارے ایک بستی میں رہتی تھی جہاں زیادہ تر اسی کی ہم پیشہ عورتوں یعنی ماسیوں کے خاندان آباد تھے۔

پتا نہیں کیوں..... مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ استغاثہ آمد نامی کے سلسلے میں جان پوچھ کر تاخیری حربے آزمایا تھا اور نہ دس دن کا وقت کوئی کم نہیں ہوتا۔ اس عرصے میں پاکستان کے کسی بھی کونے سے آئی کو کھینچ کر عدالت میں پہنچایا جاسکتا ہے۔ بہر حال، میں نے کراچی لیول پر طرم کے پچائی رزاق کو خصوصی ہدایات کے ساتھ ایک ڈیوٹی سوپ دی تھی۔ اسے نہایت ہی غیر محسوس انداز میں آمد کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھ تک پہنچانا تھیں۔

اس پیشی پر بلڈنگ کا چوکیدار حنیف عدالت میں حاضر تھا لہذا میں نے اس روز اسی پر گزارہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ حنیف کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل نہیں تھا، تاہم اس کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ہی کی تھی۔

حنیف نے اپنا حلیہ بیان رلیکارڈ کرایا تو وکیل استغاثہ پوچھ گچھ کے لیے ونش باکس کے قریب چلا گیا۔ دو چار سرسری سوالات پوچھ کر وکیل استغاثہ نے اسے فارغ کر دیا۔ اس کے بعد یقیناً میری باری تھی۔

حنیف کی عمر پچیس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ میں نے کسی تنہید کے بغیر ہی خلاف عادت براہ راست جرح شروع کر دی۔

”کیا یہ سچ ہے کہ مقتولہ کی مایہ آمدنہ نے تمہیں اس کے قتل کے بارے میں بتایا تھا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی ہاں، یہ بالکل سچ بات ہے۔“ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”تم اس وقت کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے جب مایہ نے تمہیں یہ اطلاع دی؟“

”میں بلڈنگ کی چھت سے نیچے آ رہا تھا۔“ وہ بولا۔ ”میریوں پر مایہ آمدنہ سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ اندر مقتولہ یعنی نورین کی لاش پڑی ہے۔“

”تم بلڈنگ کی چھت پر کیا کرنے گئے تھے؟“

”پانی کھولنے.....“ اس نے بڑی رمان سے جواب دیا۔

مجھے مذاق کی سوچی، ترت پوچھا۔ ”کیا آپ لوگوں نے پانی کو بلڈنگ کی چھت پر کہیں قید کر رکھا ہے جو تم اسے کھولنے گئے تھے؟“

”ایسی بات نہیں ہے وکیل صاحب۔“ وہ کھینا سا ہو کر بولا۔

”پھر کسی بات ہے؟“ میں نے تقریباً پوچھا۔

”جناب، بات دراصل یہ ہے کہ.....“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بلڈنگ کے گھروں کو پانی سپلائی کرنے والی نیکی چھت پر بنی ہوئی ہے۔ میں پانی نہیں بلکہ اس کے والوز کھولنے چھت پر گیا تھا۔ یہ کام میں جوشام دونوں وقت کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم نیکی کا والوز کھول کر چھت سے نیچے آ رہے تھے تو اس وقت تم ویش سر پہر کے پانچ بجے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں، میرے خیال میں اس وقت شام کے پانچ دس ہوئے تھے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں والوز کھولنے کے بعد تقریباً دس منٹ تک چھت پر ہی موجود رہتا ہوں۔“

”تم جس اپارٹمنٹس بلڈنگ میں چوکیداری کرتے ہو اس میں کل کتنے فلور ہیں؟“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”چھ.....“ اس نے بتایا۔ ”یعنی گراؤنڈ فیلز پانچ فلور۔“

”مطلب یہ کہ پانچ فلور یعنی چھ منزلیں؟“

”جی ہاں، بالکل ایسا ہی ہے۔“

”مقتولہ کا فلیٹ کس فلور پر واقع ہے؟“

”فورٹھ فلور پر.....“ اس نے جواب دیا۔ ”فلیٹ نمبر چار سو ایک۔“

”فلیٹ نمبروں کے سامنے ہی پڑتا ہے۔“

”ویری گڈ!“ میں نے جلدی سے کہا پھر پوچھا۔

”جب تم والوز کھول کر بلڈنگ کی چھت سے نیچے آئے تو مایہ

آمدنہ نے تمہیں مقتولہ کی لاش کے بارے میں بتایا تھا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، تم دونوں کی ملاقات بلڈنگ کے کس حصے میں ہوئی تھی؟“

اس نے ایک لمحہ سوچنے کی اداکاری کی پھر جواب دیا۔ ”جناب! اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے۔ جب میں اوپر سے نیچے اتر رہا تھا تو فوراً فلور پر پہنچنے ہی مایہ آمدنہ اچانک میرے سامنے آ گئی تھی۔ بس وہیں زینے پر، مقتولہ کے فلیٹ کے دروازے کے سامنے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔“

”آمدنہ اچانک ہی تمہارے سامنے آ گئی تھی.....“ میں نے اسی کے الفاظ دہرائے پھر پوچھا۔ ”وہ آئی کہاں سے تھی؟“

”جج..... جی.....“ وہ الجھن بھرے انداز میں بولا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”میں نے تم سے ریاضی کا کوئی پیچیدہ سوال نہیں کیا جو تم اس قدر پریشان نظر آ رہے ہو؟“ میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نے بتایا ہے کہ وہ اچانک ہی تمہارے سامنے آ گئی تھی۔ میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ وہ زینوں کی طرف سے آئی تھی یا گیلری میں موجود ہی اچھٹ سے پگھلی یا.....“

”وہ کھر کے اندر سے نکلی تھی!“ وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔

”کس کے گھر سے؟“

”نورین کے گھر سے.....“ اس نے جواب دیا۔ ”میں جیسے ہی زینے اترتے ہوئے فوراً فلور پر پہنچا، فلیٹ نمبر چار سو ایک کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور مایہ باہر نکلی۔ وہ اس وقت بہت گھبراہٹ ہوئی تھی۔“

”اس نے تم سے کیا کہا تھا؟“ میں نے کریدنے والے انداز سے پوچھا۔

”اس نے بوکھلاہٹ بھرے لہجے میں بتایا کہ اندر نورین کی لاش پڑی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر تم نے کیا کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بھاگتا ہوں تھا اور مایہ صاحب کے پاس پہنچ گیا۔“ اس نے قہقہے لگتے ہوئے بتایا۔ ”میں جب چھت پر تھا تو میں نے ان کی گاڑی کو بلڈنگ میں داخل ہونے دیکھ لیا تھا۔ عباسی صاحب ایک پڑھے لکھے سرکاری افسر ہیں۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ اس واقعے کی اطلاع عباسی صاحب ہی کو دینا چاہیے۔ وہ بلڈنگ کی یونین کے عہدے دار بھی

”وہ لے کر کے لیے تھا پھر ایک گہری سانس خارج کر کے بند ہوا۔“

”میری بات سن کر وہ جلدی سے اپنے گھر گئے پھر انہوں نے اپنے گھر سے پولیس کو فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔“

”کیا تم نے مقتولہ نورین کی لاش کو اس کے بیڈروم میں پڑے دیکھا تھا؟“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ وہ بوکھلا گیا۔ ”ہاں۔۔۔ دیکھا تھا۔۔۔۔۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ نہ؟“

”وہ جناب، بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔۔۔“ وہ اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”جب ماسی آمنہ نے مجھے مقتولہ کے قتل کے بارے میں بتایا تو میں گھبرا گیا تھا اور میں تیزی سے زینے اتر کر عباسی صاحب کے پاس پہنچ گیا تھا پھر جب پولیس ہماری بلڈنگ میں آئی تو میں عباسی صاحب اور پولیس والوں کی موجودگی میں مقتولہ کے گھر کے اندر گیا تھا اور میں نے بیڈروم کے فرش پر اس کی لاش پڑی دیکھی تھی۔ پولیس نے مجھے بیڈروم کے اندر تو نہیں جانے دیا تھا۔ میں نے کاسن میں کھڑے کھڑے، بیڈروم کے فرش پر پڑی مقتولہ نورین کی لاش دیکھی تھی۔“

”یعنی جب آمنہ ماسی نے تمہیں اس واقعے کی اطلاع دی تو تم اس وقت مقتولہ کے قلیٹ میں داخل نہیں ہوئے تھے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔“ وہ ایک بار پھر اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں بعد میں عباسی صاحب کی موجودگی میں مقتولہ کے قلیٹ کے اندر گیا تھا۔“

میں نے چونک کر حریف پر اپنی جرح ختم کر دی اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! اس کیس کے تمام گواہ جھگڑتے چاچکے ہیں سوائے ایک کے اور وہ گواہ ہے۔۔۔۔۔ آمنہ ماسی۔ میری معزز عدالت سے پر زور استدعا ہے کہ آئندہ پیشی پر ماسی آمنہ کی گواہی کو یقینی بنایا جائے تاکہ اس کیس کو جلد از جلد نمٹایا جاسکے۔ ویش آل یور اٹارنی!“

جج نے اثبات میں سر ہلایا اور وکیل استغاثہ کو ضروری ہدایات دینے لگا، پھر ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر اس نے عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور کنبہرے میں آمنہ ماسی کھڑی تھی۔

وہ گھروں میں کام کرنے والی ایک ماسی تھی اور ماسی بی دکھائی بھی دیتی تھی۔ آمنہ کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ دھان پان، درمیانے قد کی مالک اور گوری جتنی عورت تھی۔ وہ بلا پتلا ہونے کے باوجود بھی وہ خاصی پھرتیلی نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک خاص قسم کی تیزی پائی جاتی تھی۔ اس کے چہرے کی خاص نشانی یہ بھی کہ اس نے اپنے دونوں کانوں کو متعدد مقامات سے چھدوا رکھا تھا اور دونوں کانوں کے بالائی حصوں میں چھوٹی چھوٹی بالیوں کی قطاریں چارھی تھیں۔ یہ طلائی بالیاں، کانوں کے بالائی حصے میں نیچے سے اوپر تک چلی گئی تھیں۔

وکیل استغاثہ نے واجبی سی جرح کر کے جب اسے فارغ کر دیا تو میں جج کی اجازت حاصل کر کے ویش باکس کے قریب چلا گیا۔ ان لمحات میں وہ خاصی گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ آمنہ میری دریافت تھی لہذا اس سے سوال وجواب کی ذمہ داری بھی مجھی پر عائد ہوتی تھی۔ میں نے کھٹاکر کھٹاکر صاف کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا خیال ہے آمنہ۔۔۔۔۔ اس مرتبہ تم نے گاؤں میں کچھ زیادہ ہی دن نہیں لگا دیے؟“

”ہاں، ادھر گاؤں میں کچھ مسئلہ ہو گیا تھا۔“ وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ ”میرا چاچا فوت ہو گیا تھا۔“ ”تو اب تم گاؤں والے معاملات نمٹا کر واپس آ گئی ہو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”تمہارے دل و دماغ سے غم کے بادل چھٹ چکے ہیں اور میں تم سے جو بھی پوچھوں گا، تم حاضر دماغی سے اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو گی؟“

”جی۔۔۔۔۔“ وہ تخفیف سی آواز میں بولی۔ ”آپ پوچھیں۔۔۔۔۔“

میں نے پوچھا۔ ”آمنہ! گھروں میں کام کرنے والی ماسیاں عموماً صبح آ کر کرتی ہیں۔ تمہارے سر پہر میں آنے کی کوئی خاص وجہ۔۔۔۔۔؟“

”باجی ویر تک سونے کی عادی تھی جناب۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ ساڑھے دس، گیارہ بجے سے پہلے سو کر میں اٹھتی تھی اور میرے پاس اس وقت ایک گھر لگا ہوا تھا۔ میں باجی کے پاس صبح سے پہلے آ سکتی تھی لہذا اس نے مجھے شام میں بلا لیا تھا۔“

”باجی۔۔۔۔۔“ آمنہ کی مراد مقتولہ نورین تھی۔ میں نے آمنہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”تم مقتولہ کے گھر کتنے بجے کام کرنے آیا کرتی تھیں؟“

”جی۔۔۔۔۔ پانچ بجے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور تمہارا کام کب تک ختم ہو جاتا تھا؟“

”جب باجی کپڑے بھی دھلاتی تھی تو پھر چھ تو بج ہی جاتے تھے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”اگر صرف جھاڑو پونچھا اور برتن وغیرہ ہوں تو میں یہ کام آدھے گھنٹے میں نمٹا کر فارغ ہو جاتی تھی۔“

”یعنی زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے۔۔۔۔۔؟“

”جی۔۔۔۔۔“ وہ متلاشی نظر سے عدالت کے دروازے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جی ہاں۔۔۔۔۔“

آمنہ کی حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کا اضطراب پایا جاتا تھا۔ وہ بار بار عدالت کے دروازے کی جانب اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ جب کوئی شخص پہلی مرتبہ گواہی دینے عدالت میں پیش ہوتا ہے تو اس پر لازماً ایک گھبراہٹ سی طاری ہوتی ہے لیکن آمنہ کی گھبراہٹ بڑی مختصر سی اور انوکھے انداز کی تھی۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آمنہ! کیا واقعہ کے روز بھی تم پانچ بجے سہ پہر ہی مقتولہ کے گھر پہنچی تھیں؟“

”جی اس روز میں ذرا جلدی آ گئی تھی۔“ وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

”میں نے پوچھا۔ ”کتنی جلدی؟“

”آدھا گھنٹہ پہلے۔۔۔۔۔“ اس نے جواب دیا۔

”یعنی ساڑھے چار بجے؟“

”جی ہاں!“

”اس روز جلدی آنے کی کوئی خاص وجہ تھی؟“

”جی۔۔۔۔۔ میرا بچہ بیمار تھا۔۔۔۔۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اسے پانچ بجے ڈاکٹر کو دکھانا تھا ایسے ہی میں نے سوچا کہ ذرا جلدی چلی جاتی ہوں تاکہ کام جلدی ختم کر کے گھر واپس آ جاؤں۔“

”جب تم مقتولہ کے گھر پہنچیں تو پھر کیا ہوا تھا؟“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

”جی سے شروع کیا کرتی تھی۔۔۔۔۔“ اس نے بات مکمل کر کے ایک بار پھر عدالت کے دروازے کی جانب نگاہ دوڑائی۔

”میں پوچھتے بنا نہ رہ سکا۔“ ”کیا تمہیں کسی کا انتظار ہے؟“

”جی۔۔۔۔۔ نہیں!“ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔

”یہاں سے جانے کی جلدی ہے؟“

”ایسی بات نہیں۔۔۔۔۔“ وہ دھمکے انداز میں بولی۔ ”وہ جی۔۔۔۔۔ میں پہلی مرتبہ عدالت میں آئی ہوں نا اس لیے۔۔۔۔۔ دل بہت گھبرا رہا ہے۔“

”اپنے دل کو قابو میں رکھو آمنہ، ابھی تو جرح کا آغاز ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تم سے ڈھیر دو سوالات پوچھنا ہیں۔ تم وہ گواہ ہو جس نے سب سے پہلے مقتولہ کی لاش کو دیکھا تھا۔ اگر تم نے اسی طرح گھبراہٹ کو خود پر طاری رکھا تو مجھے ڈر ہے، تم چھڑا کر کنبہرے کے فرش پر گر دو گی اور بے ہوش ہو جاؤ گی۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

”شباباش!“ میں نے یہ آواز بلند کہا پھر پوچھا۔

”جب تم جھاڑو اٹھائے مقتولہ کے بیڈروم میں داخل ہوئیں تو تم نے وہاں کیا دیکھا تھا؟“

”باجی۔۔۔۔۔ بیڈروم کے فرش۔۔۔۔۔ پر پڑی تھی۔“ وہ جھرجھری لیے ہوئے بولی۔ ”اس کے سر سے خون نکل رہا تھا اور کپڑوں والی الماری بھی کھلی پڑی تھی۔“

”ذرا اچھی طرح سوچ کر بتاؤ۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”قلیٹ میں داخل ہونے کے بعد سے لے کر بیڈروم تک جتنے میں تمہیں کتنا وقت لگا ہوگا؟“

”زیادہ سے زیادہ ایک منٹ جی۔۔۔۔۔“

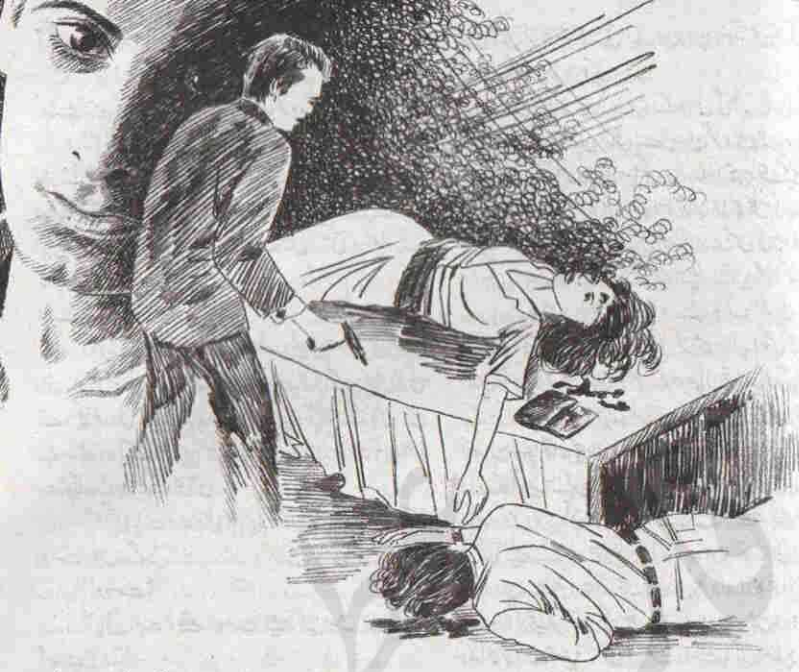
”واقعہ کے روز تمہارے بیان کے مطابق تم ساڑھے چار بجے مقتولہ کے قلیٹ پر پہنچی تھیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”اور ایک منٹ بعد ہی تم نے بیڈروم میں مقتولہ کی لاش پڑی دیکھی تھی۔“ میں نے محاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر کہا۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟“

”جی۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہوا تھا۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

”میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پھر تم نے کیا کیا تھا؟“

”باجی کو مردہ حالت میں فرش پر پڑے دیکھ کر میں تو



نظر انداز

رضوانہ بیگم

محبت دماغ سے نہیں دل سے سوچنے کا نام ہے... محبت اندھی ہوتی ہے... محبت عقل کی دشمن ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ... سیکڑوں کہاوٹیں، ہزاروں مثالیں... اور بے چاری محبت ایک... مگر افسوس سچ کو جاننے کا کوئی فارمولا ہے نہ جھوٹ پکڑنے کا کوئی آلہ۔ فقط دو چار دعوتوں اور وعدوں پر ہی یہ سارا کھیل کھیلتے کوئی دل میں اتر جاتا ہے اور... کوئی دل سے اتر جاتا ہے۔ زیر نظر کہانی بھی کچھ ایسی ہی کشمکش کا شاپکار محسوس ہوتی ہے۔

اپنے محفوظ دائرے سے نکلنے والے ایک بے وقوف عاشق کا ماجرا

”مہراشن نے کہا ہے کہ آپ یہ ٹوس دیکھ لیں۔“
سیلی نے کہا۔ ”ان میں بہت سوئی میعاد تاریخ گزر چکی ہیں خاص طور سے مشرجارج کی۔“
وہ ہنس کر کہتے رک جاتی۔ نیڈاس کی طرف اسی انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ سیلی کی نیلی آنکھیں نیڈاس کی بھوری

کلیسیا سیلی نے کاغذات کا پلندا نیڈاس گرین کی میز پر رکھا تو اس کے نرم ہاتھ نیڈاس کے ہاتھوں سے مس ہوئے۔ نیڈاس نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ سیلی کے ہاتھوں کا لمس اس کے جسم میں سنسنی پھیلا دیتا تھا اور اس کے کان دور نہیں ہادی کی گھنٹیاں بجنے کی آوازیں سننے لگتے تھے۔

پکڑی گئی تو اپنی حالت کے لیے اسی ہتھوڑی کو استعمال کر کے۔ ہتھوڑی کو آہنی حصے کی جانب سے پکڑنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے دستے پر اپنی انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک ٹی وی ڈرامے میں دیکھا تھا کہ فکٹر پرسن کی مدد سے پولیس پہ آسانی جرم تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ ہتھوڑی ساجد علی کی بھی لہذا پولیس کی تحقیق ساجد علی کو جرم ظہرائی۔ اس نے یہ وقت ضرورت ہتھوڑی کے دستے کو ایک رومال سے پکڑ کر مقتولہ کی کپڑی پر آزمایا تھا لہذا ساجد علی کے فکٹر پرسن ہتھوڑی کے دستے پر محفوظ رہے تھے۔

اس کیس میں بلکہ آمنہ ماسی کے بیان میں سب سے دلچسپ بلکہ افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ آخر اسے رگ چرانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی تھی۔ آمنہ کے مطابق، اس کے چھوٹے بہن بھائیوں اور بوڑھے ماں باپ کو گاؤں کے سردار نے اپنی پرائیویٹ جیل میں قید رکھا تھا۔ کسی زمانے میں آمنہ کے باپ نے سردار سے پانچ ہزار روپے قرض لیے تھے جو سودر سود بڑھ کر پچاس ہزار ہو گئے تھے۔ سردار نے نہ صرف آمنہ کی فحش فلمیں کو اپنی تحفہ قید میں ڈال دیا تھا بلکہ ان کے کچے مکان کو بھی اپنے ایک ملازم کے استعمال میں دے دیا تھا۔ اس سردار کا بس ایک ہی مطالبہ تھا کہ جب تک اس کے پچاس ہزار روپے ادا نہیں کیے جائیں گے، وہ ان لوگوں کو نہیں چھوڑے گا۔ آمنہ کو کسی طرح دو دن پہلے پتا چل گیا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتولہ دوپہر میں بینک سے ایک ٹھکڑی رقم نکال کر گھر لانے کی جو شام تک گھر کے اندر ہی موجود رہے گی لہذا اس نے اپنے خاندان کی آزادی کے جرم کی دلدل میں کودنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے یہ جرم نظریہ ضرورت کے تحت کیا تھا۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ نظریہ ضرورت کے تحت کیا گیا جرم جائز ہو جائے گا لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ تو یہ ہے کہ آمنہ نے جرم کیا، وہ قانون کی پکڑ میں آئی اور عدالت نے انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اسے اس ضرورت مند کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا مگر سرداروں اور وڈروں کی پرائیویٹ جیلیں اب بھی آباد ہیں اور خدا جانے کب تک آباد رہیں گی۔ قانون کی نگاہ اور ہاتھ وہاں تک رسائی کیوں نہیں حاصل کر پاتے۔ قانون اور انصاف تو ہر شاہ و کدکے لیے یکساں ہونا چاہیے نا۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

(تحریر: حُسام بٹ)

لیے دروازہ کیسے کھول سکتی تھی۔ اب ایک ہی بات ممکن ہے کہ... میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے تمسخرانہ انداز میں وکیل استفسار کی جانب دیکھا پھر دوبارہ آمنہ ماسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جب تم مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچیں تو مقتولہ نے تمہارے لیے دروازہ کھولا تھا اور... اور... تم نے اسے قتل کر دیا؟“

میری بات کی تکمیل کے ساتھ ہی عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ آمنہ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ برسوں کے مریض کی طرح کنبھیرے کی رینگ کا سا ہالے کھڑی تھی۔ وہاں موجود ہر شخص کی نگاہ اسی پر لگی ہوئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اس بار آمنہ نے بھولے سے بھی عدالت کے داخلی دروازے کی طرف نہیں دیکھا بلکہ... لگا بیک کنبھیرے سے نکل کر دروازے کی جانب دوڑ لگی۔

اس منظر نے جج سمیت ہر شخص کو درجہ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ فرار کی راہ اختیار کر کے اپنے جرم کا اقبال کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ عدالت کے دروازے تک پہنچ پائی، عدالت کے کمرے میں موجود آئی او نے اپنے ایک بیٹی بھائی کے تعاون سے اسے قابو کر لیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھوں میں آہنی زنجیر پھانسیا گیا۔

☆☆☆

بچھلی پیشی پر رونما ہونے والی ڈرامائی صورت حال نے میرے موکل کے بے گناہی ثابت کر دی تھی لہذا آئندہ پیشی پر عدالت نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ساجد کو باعزت بری کر دیا۔

آمنہ کو گزشتہ پیشی پر ہی حراست میں لے لیا گیا تھا۔ پولیس کھڑی کی بجلی رات ہی اس نے اپنا جرم قبول کر لیا تھا۔ مقتولہ کی الماری سے پچاس ہزار روپے اسی نے چرانے تھے اور پکڑے جانے پر اسی نے ہتھوڑی سے مقتولہ کی کپڑی پر ایک کاری ضرب لگا کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ اس کے اقبالی بیان کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

اس نے بچے کی بیماری کا کھنکھانہ کیا تھا۔ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وقوعہ کے روز آدھا گھنٹا پہلے وہاں پہنچ گئی تھی۔ ڈرامائی روم کے فرش پر بکھرے کھڑی اور کپڑے کے کچرے میں اسے ملزم کی ہتھوڑی پڑی نظر آئی تو اس نے ایک فوری خیال کے تحت اس ہتھوڑی کے آہنی حصے یعنی سر کی طرف سے پکڑا اور اپنے ساتھ بیڈروم میں لے گئی۔ اس کے ذہن میں آیا تھا کہ اگر وہ چوری کرتے ہوئے

آنکھوں سے ٹکرائیں اور جیسے ان میں الجھ کر رہ گئیں۔
 ”فیڈ ڈیز“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”میں نے تم سے کتنی بار
 کہا ہے کہ میری طرف اس طرح نہ دیکھا کرو، مجھے دھڑلکا ہے۔“
 ”اچھی بات ہے میں سہی، آئندہ نہیں دیکھوں گا۔“
 فیڈ نے مزاحیہ خمیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ ”اب ہمارے
 درمیان قطعی طور سے دفتری نوعیت کے تعلقات رہیں گے۔“
 ”جی نہیں، میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ ہم صرف
 کام ہی کے بارے میں گفتگو کیا کریں، آخر تم کیوں مجھے
 ستانے پر تلے ہوئے ہو۔“
 وہ ایک لمحے کے لیے وہاں افسردگی کی تصویر بنی کھڑی
 رہی۔ وہ وہ جوان اور بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ ایسی لڑکی
 جسے دیکھ کر دل بے اختیار اس کی جانب کھینچے لگے لیکن اسی
 کے ساتھ وہ ایک بہتر پیکر بھی تھی اور گزشتہ دو سال
 سے بینک میں کام کر رہی تھی۔
 ”اچھی بات ہے سہی ہم بہ دستور ایک دوسرے کے
 دوست رہیں گے۔“
 ”دوست؟“
 ”ہاں بہت اچھے دوست جیسے کہ ہمیشہ سے چلے
 آ رہے ہیں۔“

سیلی کی افسردگی برسات کی دھوپ کی طرح غائب
 ہو گئی اور اس کے ریلے ہونٹوں پر وہ میٹھی مسکراہٹ نمودار
 ہوئی جسے دیکھ کر فیڈ کا دل الٹ پلٹ ہونے لگا تھا۔ سیلی
 پرسل لون ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر مسٹر اسٹنسن کی میز کی
 جانب چلی گئی۔ اسٹنسن بینک کا پریذیڈنٹ تھا اور سیلی گزشتہ
 سال سے اس کی سیکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔
 سیلی وہ واحد لڑکی تھی جس کے لیے فیڈ گرین بینک کے
 وائس پریذیڈنٹ، کیئر اور پرسل لون ڈیپارٹمنٹ کے
 انچارج کے تمام عہدے چھوڑنے کے لیے تیار تھا۔ جس بینک
 میں وہ کام کرتا تھا اس کا نام سیکینڈ نیٹل بینک آف فورٹ
 سائڈز تھا اور فیڈ کو یہ بھی یقین تھا کہ سیلی ہر طرح وہ خطرہ بھی
 مول لینے کے قابل ہے جو وہ بینک کے محفوظ سرمائے سے
 ایک لاکھ ڈالر کی چوری کر کے اپنے سر لینے کے لیے تیار تھا۔
 اتنی ہی نہیں وہ سیلی کے لیے اپنی بیوی اور بیٹے کو بھی چھوڑنے
 کے لیے آمادہ تھا۔

فیڈ نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اسٹنسن کی طرف دیکھا جس
 کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے مگر اس کے مزاج کی سختی
 اور طبیعت کی سختی یہ دستور برقرار تھی۔ وہ سیلی کو ذرا سی توجہ کا
 مستحق بھی خیال نہیں کرتا تھا۔ اس کے نزدیک اس سے کوئی

فرق نہیں پڑتا تھا کہ سیلی ایک نوجوان اور حسین لڑکی ہے یا
 کوئی ساٹھ سالہ بڑھیا۔
 دن گزرتا گیا، روزمرہ کے دنوں کی طرح۔ بالکل اسی
 طرح جس طرح بیس سال سے ہر دن گزرتا چلا جا رہا تھا اور
 زندگی کی یہ یکسانیت فیڈ کو پاگل بنانے دے رہی تھی۔ دنوں
 کے ساتھ ساتھ وہ خود ختم ہوا جا رہا تھا۔ اس کا ہنس یہ رہ گیا
 تھا کہ مسٹر کیپٹن کے نوٹ پر غور کرے جس کی سو ڈالر کی
 ادائیگی واجب ہوئے کئی ہفتے گزر چکے تھے یا پھر ڈک جنری
 کے بارے میں پریشان ہوتا رہے۔ ڈک جنری جو ایک
 ایماندار آدمی تھا۔ جس کی تفصیلی گزشتہ سال اچھی نہیں ہوئی
 تھی، جس کا ٹریڈنگ مین موسم کے درمیان خراب ہو گیا تھا جس
 کے گھر اور کھلیان کو ایک طوفان باد و باران میں بری طرح
 نقصان پہنچا تھا۔ جو اس سال کے دوران میں سیلی ہی ایک ہزار
 ڈالر کا قرضہ لے چکا تھا اور مزید قرض لینے کی کوشش میں تھا،
 کچھ لوگوں کو یہ وقتی قرضے مدد دے سکتے تھے مگر کچھ لوگوں کو
 قرض لینے کے باوجود کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا لیکن اس کے
 باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کاہر فر داما کا خواہشمند مند
 ہے اور اگر فیڈ قرضوں کی منظوری کے بارے میں ذرا بھی نرمی
 دکھاتا تو اسے مسٹر اسٹنسن کی سخت دست بائیں سناتا پڑتیں۔

ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا جبکہ دوسری جانب فیڈ
 گرین خود بھی دن بے دن بڑھاپے کی جانب بڑھ رہا تھا۔
 زندگی کی دلچسپیاں جلد ہی اس کے لیے تنگ پڑ جانے والی
 تھیں اور سیلی ایسی لڑکی تھی جو زندگی میں صرف ایک بار وہ بھی
 قسمت کی مہربانی سے کسی کسی کے ہاتھ آئی تھی۔

آخر بینک کے کام کے اوقات ختم ہو گئے۔ بینک کے
 دروازے بینک کے لیے بند کر دیے گئے۔ اسٹاف جلدی
 جلدی اپنے گھروں کو رخصت ہونے لگا۔ حساب کتاب کے
 رجسٹروں میں دن کا آخری اندراج کیا جا چکا تھا۔ بینک میں
 لگے ہوئے کمپیوٹر ڈبھی انگلی دن تک کے لیے خاموش ہو گئے
 تھے۔ ٹیلی فون ایکس چینج پر کام کرنے والی لڑکی اگلی صبح تک
 کے لیے رخصت ہوئی تھی۔ ایک ایک کر کے عملے کے تمام
 افراد باہر چلے گئے۔ سوائے اسٹنسن کے آخر کار اس نے بھی
 کھٹکھٹا کر گلا صاف کرتے ہوئے اپنا بیٹ اٹھایا اور یوں
 سیکینڈ نیٹل بینک کا ایک اور دن قانونی طور پر مکمل ہو چکا تھا۔

لفٹ ہوائے اور ملازمہ نے اپنا اپنا کام ختم کیا۔ فیڈ نے
 بینک والٹ کے دروازے کو بند کر دیا اور ناٹم لاک کو دوسرے
 دن پونے نو بجے کے لیے سیٹ کر دیا۔ پھر اپنی رست و راہ کی
 طرف دیکھا۔ یہ اس کے روزمرہ کے فرائض میں شامل تھا اور

اس طرح رہا تھا کہ جب ہاتھ صاف کرنے کا موقع آئے گا تو اس
 کی شیم کی کوئی غلطی سرزد نہیں ہونی چاہیے۔ اسے اس وقت
 تک اپنے فرائض کی کو ذرا سے بھی شک کا موقع دینے بغیر ادا
 کرتے رہنا چاہیے۔ اسے ہفتے میں پانچ دن بینک بند کرنا پڑتا
 تھا اور یہ بات اس کے دفتری فرائض میں شامل تھی۔ جس وقت
 اسٹاف جا رہا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کاغذات اور مختلف
 فارموں کو ایک ترتیب سے لگا دیتا تھا تاکہ اسے دوسرے
 دن اپنا کام شروع کرنے میں آسانی ہو۔ اور اسی طرح کی
 پھولی چھوٹی باتیں تھیں جن کا خیال رکھنے کی وجہ سے اسے
 بینک کا وائس پریذیڈنٹ بنایا گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ
 فرائض جیسے اہم عہدے کی ذمہ داری بھی اسی کے شانوں پر
 تھی۔ بینک کے متعلق جملہ معاملات اور ان کے بارے میں
 معلومات کو یا فیڈ کی نوک برزاں تھیں۔

ایک وقت الینا ایسا تھا جب اسے بینک میں کام کرنے
 کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ ان دنوں نیو یورک سے نیا نیا
 واپس لے کر نکلا تھا۔ اس وقت اس کے لیے بینک کے کام
 ایک طرح سے ایڈ ونچر جیسی چیز سمجھے جاتے تھے اور اس نے
 ابتدائی دنوں میں اپنے فرائض میں اسی انہماک اور گہری توجہ
 سے حصہ لیا جس طرح وہ اسٹیٹ کانفرنس فنٹ بال کے
 مقابلوں میں اپنی ٹیم کے ساتھ کھیلا کرتا تھا یا پھر جس پھرتی،
 طاقت اور جوصلے سے وہ باسکٹ میں اپنے حریف کا مقابلہ کرتا
 تھا لیکن یہ سب اس زمانے کی باتیں تھیں جب وہ جوان تھا اور
 جب اسے زندگی سے یہ دھڑکا نہیں تھا کہ وہ اپنی تمام
 دلچسپیاں سمیٹ کر اس سے رخصت ہو جائے گی۔

وہ بھی آج کی طرح کا ایک دن تھا جب تین ماہ پہلے
 اس نے اپنی میز سے نگاہ اٹھائی تو سیلی کو اپنے ڈیپارٹمنٹ
 کے جنگلے کے باہر کھڑے ہوئے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ نہ
 معلوم ہے اس کی نظروں کا اثر تھا یا کچھ اور کہ فیڈ کو اپنے رگ
 وے میں ایک سنسنی خیز بھجان انگیز لہری اترتی محسوس ہوئی۔
 لہری نے زبان سے کچھ کہا اور نہ فیڈ نے اور نہ ہی کچھ کہنے
 کی ضرورت تھی۔ بینک کا تمام کلمہ جا چکا تھا۔ فیڈ اپنی جگہ
 سے اٹھا اور سیلی کو جیتا باندھ اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اسے
 ہار کر لیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سیلی خود بھی یہی چاہتی ہے اور
 غور تو اس کی نظروں کا مطلب پڑھنے میں وہ بوڑھے اسٹنسن کی
 طرح کندھ بن واقع نہیں ہوا تھا۔

اس دن کے بعد سے یہ سلسلہ رکنا نہیں بڑھتا اور پھیلتا
 ہی چلا گیا۔ وہ دونوں بینک کے اوقات کے بعد چھپ چھپ کر
 ملنے اور بھی کبھی جب فیڈ کو گھر سے باہر رات گزارنے کا کوئی

معتقول بہانہ مل جاتا تو دونوں کی موٹوں کے کینن میں رات بھر
 کے مہمان بھی بن جاتے تھے اور ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ فیڈ
 گرین جو اپنی زندگی کی یکسانیت سے پور ہو چکا تھا اس کے
 لیے زندگی دوبارہ ایک دلچسپ اور رنگین شے بن گئی۔ اس نے
 دوبارہ زندگی سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔

میری، بینک اور فیڈ نے رات کے کھانے پر مختصر سی
 گفتگو کی اور رہائشی کمرے میں آگئے تاکہ اخبار پڑھیں یا
 ٹیلی ویژن دیکھیں۔ یہ رات جبکہ کی اس کاؤٹ میننگ کی رات
 تھی اور جب بینک کے اسکول کی کار اسے لینے آئی تو فیڈ کو اس
 کا جانا اچھا معلوم نہیں ہوا۔ وہ اپنے بیٹے کو اپنی نظروں کے
 سامنے رکھنا پسند کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک اچھا تعلیمیت
 بننے کے بارے میں بینک اس سے مختلف سوالات پوچھے اور
 وہ ان کے جوابات دے۔ جب بینک چلا گیا تو فیڈ اپنے
 اسٹری روم میں آگیا۔ یہ کمرہ اسے کالج کے زمانے میں
 امتحانیت کے سلسلے میں طے والے انعامات، کپوں اور ٹرافیوں
 سے بھرا ہوا تھا۔ اپنے کالج کے زمانے میں فیڈ چار کھیلوں میں
 بڑی کامیابی سے حصہ لیتا رہا تھا۔ وہ فنٹ بال، باسکٹ بال اور
 بیس بال کا ایک اچھا کھلاڑی تھا جبکہ باسکٹ میں بھی اس نے
 بہت سے مقابلے جیتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ ریس میں بھی حصہ
 لے لیکن جس زمانے میں دوڑ کے مقابلے ہوتے تھے وہی
 زمانہ اس کی پڑھائی یا امتحانات کا ہوا کرتا تھا۔ اس لیے وہ دوڑ
 میں حصہ نہیں لے سکا۔ کمرے میں ہر طرف تصاویر آویزاں
 تھیں، اس کی اپنی تصویریں جن میں اسے مختلف کھیلوں میں
 حصہ لیتے یا انعامات وصول کرتے دکھایا گیا تھا۔

فیڈ کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کا بیٹا بینک بھی
 بہترین امتحانیت بنے گا۔ اس کے جسم کی بناوٹ، مختلف
 کھیلوں سے اس کا والہانہ لگاؤ ایسی باتیں تھیں جو ایک دن
 اسے کسی بھی ٹیم کا مایہ ناز کھلاڑی بنا سکتی تھیں۔ پھر اسے اپنے
 باپ کی صورت میں ایک بہترین کوچ بھی میسر تھا لیکن یہاں
 پہنچ کر فیڈ کے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ اب آئندہ زندگی
 کے بارے میں اس کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا۔ اب جس وقت
 جب کسی ٹیم میں شامل ہونے کے قابل ہوگا تو فیڈ اس کی
 کامیابی دیکھنے کے لیے موجود نہیں ہوگا۔ وہ دور نہیں سمندر
 پار سیلی کے ساتھ ان ایک لاکھ ڈالر سے عیش و عشرت کی
 رنگین زندگی گزار رہا ہوگا جو وہ مغرب بینک کے محفوظ
 سرمائے سے نکالنے کا پلان بنا رہا تھا۔

اسے امید تھی کہ اس کا یہ اقدام اس کے بیٹے کے
 مستقبل پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ فیڈ نے پہلے ہی بینک کے لیے

ایک تعلیمی انشورنس پالیسی خرید لی تھی اور اس کے تمام واجبات بھی ادا کر چکا تھا اور یہ انشورنس پالیسی اپنی بڑی رقم کی بھی جس کی مدد سے جب کسی بھی ایجنٹ کا جج میں داخلہ لے کر اپنے تعلیمی مدارج طے کر سکتا تھا۔ اب جہاں تک میری کا سوال تھا تو وہ ہمیشہ ٹیلے سے بہت رہی تھی کہ اگر وہ چاہتی تو سام ولنر سے شادی کر سکتی تھی۔ سام ولنر جواب سمیٹ کا ایک رکن تھا۔ جب بھی ان کے درمیان جھگڑا ہوتا میری ہمیشہ طنز یہ انداز میں سام ولنر کی مثال دیتی اور اسے برا بھلا کہتی کہ وہ سام کی طرح ترقی نہیں کر سکا۔ میری کا کہنا تھا کہ اس کے کھیلوں کے شوق نے اسے دنیا کے کسی کام کا نہیں رکھا۔ ٹھیک ہے، وہ چلا جائے گا تو میری کو بھی آئے دن کے جھگڑوں سے نجات مل جائے گی۔ پھر یہ کہ وہ بالکل بے سہارا بھی نہیں ہوگی۔ اس نے اپنا مکان میری کے نام کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ بینک میں اس کے اکاؤنٹ میں بھی مناسب رقم موجود تھی۔ ٹیلے کو یقین تھا کہ اس کے جانے کے بعد میری کو کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی بلکہ وہ سوسکا ہے کہ اسٹین اسے بینک میں ہی کوئی جگہ دیدے۔

ٹیلے نے پروگرام کے مطابق اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ چلتے وقت وہ بے ظاہر رخصت ہونے کے لیے ٹیلے کے پاس آئی۔

”گڈ بائی مسز گرین۔“ اس نے کہا۔ ”میں آپ کی ممنون ہوں کہ جب تک بھی میں یہاں کام کرتی رہی آپ نے ہر ممکن طریقے پر میری مدد کی، میری بہت افزائی کی۔ آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے میرا وقت اچھی طرح گزارا۔“

ٹیلے نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

”مجھے تمہارے ملازمت چھوڑ کر جانے پر افسوس ہے مس ٹیلے۔“ اس نے کہا۔ ”اس طرح ہم ایک اچھی اور مختص کارکن سے محروم ہو گئے۔“

اور یہ کہتے ہوئے وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ اچھا ہی تھا کہ وہ اس کے جانے سے بہت پہلے ملازمت چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اس میں کئی فائدے تھے۔ اول تو اب ان کے باہمی تعلقات ایسے موثر پر آگئے جہاں ان کا راز رہتا مشکل تھا۔ اگر ٹیلے ایک ہفتہ اور ٹھہر جاتی تو ممکن تھا کہ لوگ ان کے بارے میں چہ گیکوئیاں کرنے لگتے۔ اس کے علاوہ اس کے اپنے منصوبے کے مطابق بھی یہ ضروری تھا کہ ٹیلے پہلے چلی جائے تاکہ ٹیلے کی روانگی کو ٹیلے کے ساتھ مشک نہ کیا جاسکے اور پھر ٹیلے کو کچھ انتظامات بھی کرنا تھے۔

ٹیلے بینک سے چلی گئی تو اسٹین اپنی کرسی سے اٹھ کر ٹیلے کے پاس آیا۔

”ٹیلے کا یوں چلے جانا ہمارے لیے اچھا خاصا نقصان ہے۔“ اس نے ٹیلے کو فورے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ بہت اچھی اور مختص لڑکی تھی۔“ مجھے تو یقین تھی کہ مستقبل میں وہ ہمارے لیے اور بھی بہتر ثابت ہوگی۔“

معلوم نہیں یہ بات کہنے سے اسٹین کا اصل مقصد کیا تھا۔ بہر حال ٹیلے نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اپنی جگہ واپس بیٹھنے ہوئے اپنی سکرٹری جینی کو مختلف خطوط کے جوابات لکھوانے لگا۔

اس رات گھر پہنچ کر ٹیلے نے میری سے کہا۔

”میری، میں اگلے ہفتے نیویارک جا رہا ہوں۔ اسٹین بینک کے کچھ ضروری کاموں سے مجھے وہاں بھیج رہا ہے۔“

”اوہ۔“ میری نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس بات کا تو کوئی امکان نہیں ہوگا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چل سکوں؟“

”نہیں ڈیر۔“ اس مرتبہ تو تم نہیں جاسکتیں۔ مجھے بیسٹ میں کچھ لوگوں سے ملاقات کرنا ہے اور پھر ان کے ساتھ نیویارک جانا ہے اور مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہاں میری مصروفیات کتنی اور کس نوعیت کی ہوں گی۔ میں ابھی تو یہ بھی نہیں بتا سکا کہ واپسی کب تک ممکن ہوگی۔“

”ویسے بھی شاید یہ مناسب نہ ہوتا کہ ہم دونوں گھر سے غائب ہو جائیں۔“ میری بولی۔ ”یہاں بینک کی دیکھ بھال کے لیے کسی نہ کسی کو تو رہنا ہی ہوگا۔“

”تم اور بینک بعد میں ایک بار نہیں کئی مرتبہ میرے ساتھ کہیں نہ کہیں باہر جاسکو گے۔“

”کیا یہ وعدہ ہے؟“

”یقیناً۔“

”تم جانتے ہو ٹیلے کہ اب ہم بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں اور ابھی تک ہمیں کوئی ایسا مناسب موقع نہیں ملا کہ ہم کسی جگہ ساتھ جاسکے یا کسی جگہ کی سیاحت کر سکتے، کچھ دیکھ سکتے۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ موسم گرما میں ہمیں اپنے پس انداز سرمائے سے کچھ رقم اس مصرف کے لیے ضرور نکالنا چاہیے کہ ہم سیر و تفریح کر سکیں۔ ہمیں یاد ہوگا کہ جب ہم جوان تھے تو کس طرح مختلف مقامات پر ٹھہرتے پھرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔“

”مجھے افسوس ہے میری۔“ ٹیلے نے واقعی کچھ عداوت

محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”کہ میں اپنے بہت سے وعدے پارے نہیں کر سکا۔ شاید میں تمہیں اتنا بیس و آرام بھی نہیں دے سکا جس کی تمہیں مجھ سے توقع تھی لیکن ہوسکتا ہے کہ آئندہ بھی حالات بہتر ہو جائیں۔ ہم ہمیشہ ہی تو ذمے دار یوں میں اس طرح گھرے ہوئے نہیں رہیں گے جس طرح آج کل ہیں۔“

”لیکن میں کوئی شکایت تو نہیں کر رہی ہوں۔“ میری نے جواب دیا۔ ”مجھے اب بھی اگر انتخاب کا موقع ملے تو میں تمہیں..... میں نہیں.....“

”سینیٹر سام ولنر کے مقابلے میں ترجیح نہیں دوگی۔“ ٹیلے نے مزاحیہ انداز سے اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

میری نے ایک ہلکا ہنسنہ بنا دیا۔

”مجھے اندیشہ تھا کہ تم یہی کہو گے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اگر میں چاہتی تو ایک سینیٹر کی بیوی بن سکتی تھی۔“

”پھر تم نے سام سے شادی کیوں نہیں کر لی۔“ ٹیلے نے کہا۔ ”تم یہ بات مجھ سے اتنی مرتبہ کہہ چکی ہو کہ میں بھی کبھی حیرت کے ساتھ سوچنے لگتا ہوں کہ اگر ایسی ہی بات تھی تو تم نے اس سے شادی کیوں نہیں کی۔“

میری نے آگے بڑھ کر اپنی بائیں ٹیلے کی گردن میں ہمال کر دی۔

”میں نے سام سے اس لیے شادی نہیں کی کہ مجھے تم سے محبت تھی۔ میں نے پوری آزادی رائے سے تمہارا انتخاب کیا تھا۔“

ہوائی جہاز صبح کے ساڑھے پانچ بجے پرواز کر گیا۔ میری اور بینک، ٹیلے کو الوداع کہنے ایئر پورٹ تک آئے تھے۔ ٹیلے نے میری کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں میری۔ ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ بس یہ بات یاد رکھنا۔“ اس نے کہا۔ پھر اس نے بینک کے گالوں کو چوما۔ ”اپنا اور اپنی ماں کا خیال رکھنا بینک۔“ وہ بولا، میری ہنسنے لگی۔

”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے میدان جنگ میں ہمارے ہو یا ایک طویل مدت کے لیے رخصت ہو رہے ہو۔“ اس نے کہا۔

”مجھ جیسے بوڑھے آدمی کو نیویارک کا سفر بھی کافی دور دراز کا معلوم ہوتا ہے۔“ ٹیلے نے جواب دیا۔

جب جہاز رن وے پر دوڑنے لگا تو اس نے ہمارے کی کھڑکی سے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور اس وقت بے

اختیار اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اسی وقت طیارے سے اتر جائے اور اپنی بیوی بچے کو یوں چھوڑ کر نہ جائے لیکن طیارہ پرواز کرنے لگا تھا اور اب اس خواہش پر عمل کرنا اس کے بس سے باہر ہو چکا تھا۔ طیارے کے پہلے اسٹاپ لائل راک پر ٹیلے جہاز سے اتر گیا۔ اپنا سامان لیا جو دو سوٹ کیسوں پر مشتمل تھا جن میں سے ایک خالی تھا۔ اب اسے واپس فورٹ سائڈرس جانے کے لیے تین گھنٹے تک انتظار کرنا تھا۔ وہ کچھ دیر ٹھہرا رہا پھر ایک ریٹورنٹ میں شام کا کھانا کھایا۔ اس کے سامنے ایک میز پر بیٹھی ہوئی سرخ بالوں والی لڑکی اسے ٹیلے کی یاد دلانے لگی۔ لڑکی اسے دیکھ کر دھجوت آمیز انداز میں مسکرائی جو اب وہ بھی مسکرایا۔ مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوا۔ یہ لڑکی ٹیلے سے کتنی مختلف ہے، ٹیلے نے سوچا۔ وہ ٹیلے سے یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک ایجنٹ شخص کو دیکھ کر یوں مسکرائے گی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اگر تمام باتیں خاطر خواہ طریقے پر انجام پائیں جیسا کہ ان میں کسی قسم کی گڑبڑ کا یہ ظاہر کوئی امکان نہیں تھا تو وہ آج رات اوکلاہا کے ایک قصبے سکونی کے اسٹار موٹل میں کالج نمبر 54 میں قیام پزیر ہوگا اور اس کے ساتھ ٹیلے بھی ہوگی اور کل رات وہ اس وقت تک ٹیلے کے ساتھ میکسیکو سٹی تک پہنچ چکا ہوگا اور ایک دوسرے ملک میں زندگی، رومان اور ایڈو وچر سے بیک وقت لطف اندوز ہو رہا ہوگا۔ اس نے اپنی بیوی اور بیٹے سے نیویارک جانے کے بارے میں جھوٹ بولا تھا اور اس نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ اسی طرح بروئے کار آ رہا تھا جیسی کہ اسے توقع تھی۔

تقریباً چار گھنٹے اور دس منٹ بعد ٹھیک ساڑھے نو بجے وہ لائل راک سے فورٹ سائڈرس واپس پہنچ گیا۔ ایک ٹیکسی لے کر سائنائی ریلوے اسٹیشن گیا۔ یہاں اس نے اپنا وہ سوٹ کیس کچھ روم کے لاک میں رکھ دیا جس میں اس کے کپڑے وغیرہ تھے اور پھر خالی سوٹ کیس ہاتھ میں لے کر وہ وارڈ ہوئی پچھانچو صرف ایک ہلاک کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہوٹل ٹھکر کیسروں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”گھر میں بیوی کے کچھ عزیز مہمان آگئے ہیں۔“ ٹیلے نے کیسروں کو بتایا۔ ”اس لیے مجھے لا محالہ رات گھر سے باہر بسر کرنا پڑے گی۔“

”اوہ۔“

ٹیلے نے کمرے کا کرایہ وغیرہ چیکنگ ادا کر دیا اور ٹھکر سے کہا کہ اس کا ارادہ صبح صادق ہی ہوئی سے چلے جانے کا ہے۔ پھر وہ اپنے کمرے میں گیا۔ بستر پر بیٹھنے ہوئے اس

سینیٹر سام ولنر کے مقابلے میں ترجیح نہیں دوگی۔“ ٹیلے نے مزاحیہ انداز سے اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

میری نے ایک ہلکا ہنسنہ بنا دیا۔

”مجھے اندیشہ تھا کہ تم یہی کہو گے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اگر میں چاہتی تو ایک سینیٹر کی بیوی بن سکتی تھی۔“

”پھر تم نے سام سے شادی کیوں نہیں کر لی۔“ ٹیلے نے کہا۔ ”تم یہ بات مجھ سے اتنی مرتبہ کہہ چکی ہو کہ میں بھی کبھی حیرت کے ساتھ سوچنے لگتا ہوں کہ اگر ایسی ہی بات تھی تو تم نے اس سے شادی کیوں نہیں کی۔“

میری نے آگے بڑھ کر اپنی بائیں ٹیلے کی گردن میں ہمال کر دی۔

”میں نے سام سے اس لیے شادی نہیں کی کہ مجھے تم سے محبت تھی۔ میں نے پوری آزادی رائے سے تمہارا انتخاب کیا تھا۔“

نے اپنی جیب سے چمڑے کا ایک کس نکالا جس میں اس کی بیوی میری اور بارہ سالہ بیٹے جیک کے فوٹو لگے ہوئے تھے۔ وہ انہیں پر غور دیکھنے لگا۔ وہ ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ لیکن وہ اپنے دل کی اس بے چینی و بے قراری سے بھی مجبور تھا جو بیس برس تک ایک ہی میزکری پر بیٹھے اس کے اندر پیدا ہو چکی تھی اور جس کی تسکین صرف سبکی جیسی حسین لڑکی ہی کر سکتی تھی جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ یوں وہ اب بھی اسی وقت اپنے گھرواپس جا سکتا تھا۔ میری سے کہہ سکتا تھا اسنسن نے نعل راک پر نیلی گرام بیچ کر اسے واپس لایا۔ پھر صبح کو حسب معمول اپنی ملازمت پر جا سکتا تھا۔ وہ پہر کو برس بائرس کے معمول کے مطابق کسی کینے یا ریٹورنٹ میں کھانا کھا سکتا تھا۔ پھر شام کو ٹیلی وژن دیکھتے ہوئے تھکے تھکے انداز میں بچا ہوا لیتے ہوئے اپنے کمرے میں سونے کے لیے جا سکتا تھا اور پھر اگلے دن صبح اپنی ملازمت پر.....

ٹیڈ نے اپنی مضامین بیچ لیں، لعت ہو۔ ایک آدمی آخر تک اس کے گئے بندھے معمول کو برداشت کر سکتا ہے۔ اگر اسے اپنی زندگی میں واقعی خوشی اور مسرت سے بھرپور لمحات حاصل کرتا ہے تو پھر انہیں حاصل کرنے کا بھی ایک موقع تھا۔ اگر اس نے اس وقت اس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو پھر ایسا کوئی سنہری موقع اسے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت اس پر وگرام پر عمل ملتوی کرنے کا مطلب تھا کہ وہ پھر ہمیشہ کے لیے اپنے اس خواب کو بھول جائے اور یہ اس سے نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سیر و تفریح کرنا چاہتا تھا۔ گھومنا پھرنا چاہتا تھا۔ ایک دوسری عورت کے ساتھ رہنا اور خود کو ایک مرتبہ پھر جوان دیکھنا چاہتا تھا۔ ورنہ اسے معلوم تھا کہ بڑھا پاپت جلد اس پر قابو پالے گا اور پھر زندگی سے لطف اندوز ہونے کا ہر موقع اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

دن بچے کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ لفٹ سے نیچے پہنچا۔ سڑک پر آیا۔ سڑک بالکل سناں تھی۔ صرف ایک دور ریٹورنٹ ابھی تک کھلے ہوئے تھے یا پھر سڑک کے بالکل آخری کنارے پر ایک سینما گھر میں آخری شو چل رہا تھا۔ وہ بڑے پر اعتماد انداز سے چلتے ہوئے اپنے بینک کے سائڈ والے دروازے تک آیا۔ اسے کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ لابی میں جگہ جگہ آلے نصب تھے جن سے نکلنے والی شاعروں کے سامنے آجانے سے بینک میں خطرے کا الارم بج سکتا تھا لیکن چونکہ وہ آلہ کی موجودگی سے واقف تھا اس لیے شاعروں کی زد سے بچتے ہوئے آگے بڑھا اور اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں بینک والٹ لگا ہوا تھا۔ اس نے آج سہ پہر

بینک بند کرتے ہوئے والٹ کے دروازے کو دائیں کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے والٹ کے اندر قدم رکھا اور دروازہ بند کرتے ہوئے اندر کی قبائ روشن کر دیں۔ اس سینک کو کھولا جس کے اندر محفوظ سرمایہ رکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیبیں میں ڈالر کے نوٹوں کی گڈیوں سے بھرنا شروع کر دیں۔ ہر گڈی میں ایک سو نوٹ تھے۔ اس نے پانچ پانچ گڈیاں کوٹ کی ہر جیب میں رکھیں پھر پانچ گڈیاں کوٹ کی اندرونی جیبوں میں ڈالیں اور سو گڈیاں چلتوں کی مختلف جیبوں میں بھر دیں۔ روشنیاں گل گئیں۔ والٹ سے باہر نکلا۔ دروازے کو بند دھڑکھلا چھوڑ کر شاعروں سے بچتا ہوا بینک سے باہر آیا۔ سائڈ کا دروازہ مفل کیا اور تیزی سے اپنے ہوٹل کی طرف چل دیا۔ کسی نے اسے بینک میں جاتے یا وہاں سے نکلے نہیں دیکھا تھا۔ سڑک پر ایک دو راگبیہ تھے جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنی تمام جیبوں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر سوٹ کیس میں رکھ دیں۔ کل بیس گڈیاں گڈیاں تھیں اور ہر گڈی میں دو ہزار ڈالر کے نوٹ تھے۔ گویا یہ کل رقم پچاس ہزار ڈالر بنتی تھی۔

ٹیڈ نے کمرہ بند کیا اور دوبارہ بینک کی طرف چل دیا۔ علاقہ اب بھی سناں تھا۔ اب تک اس کا ہر اقدام منصوبے کے عین مطابق اور کامیاب تھا۔ جب ٹیڈ اس مرتبہ والٹ سے باہر آیا تو اس کی جیبیں دوبارہ نوٹوں کی گڈیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے والٹ کا دروازہ بند کیا اور دروازے پر لگے ہوئے ٹائم کلارک کو اس طرح سیٹ کر دیا کہ اگلے دن دروازہ ٹھیک پونے نو بجے خود بخود کھل جائے جس طرح وہ ہمیشہ کیا کرتا تھا۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے دروازے کو جہاں جہاں سے چھوڑا تھا وہاں سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیے اور ایک مرتبہ پھر سائڈ دروازے کو مفل کرتے ہوئے بینک سے باہر آیا اور پھر جب اس نے اپنی جیبوں سے تمام گڈیاں نکال کر سوٹ کیس میں رکھیں تو سوٹ کیس میں رکھی ہوئی کل رقم ایک لاکھ ڈالر تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے اپنی رست و راج کی طرف دیکھا۔ اسے بس اسٹاپ تک پہنچنے کے لیے جو صرف ایک بلاک کے فاصلے پر واقع تھا، بیس منٹ کی مہلت حاصل تھی۔ ابھی تک ٹھیک اسی طرح ہوا تھا جس طرح اس نے سوچا تھا۔ ایک لاکھ ڈالر اس کے قبضے میں آچکے تھے اور سبکی اس سے صرف ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جلدی سے ہوٹل سے نکلا۔ دولت سے بھرا ہوا سوٹ کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔

سامانی ریلوے اسٹیشن پر اس نے لاکر سے اپنا دوسرا سوٹ کیس بھی نکال لیا اور جب مسکو جی کے لیے بس روانہ ہوئی تو وہ اس بس میں موجود تھا۔

ہوا اسٹیشن پولیس کا سپاہی جیکسن اپنے راؤنڈ پر گشت لگاتا ہوا اسٹیشن کے پلیٹ فارم تک آیا۔ ٹیڈ نے اسے دیکھتے ہی جلدی سے اپنا سوٹ دوسری طرف کر لیا۔ یہ اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا جب ایک پولیس مین کی موجودگی نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا لیکن اسے حقائق سے آنکھیں چرانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ اب قانون کے یہ محافظ اس کے دشمن نہیں بن سکتے ہیں۔ جس وقت بس روانہ ہوئی تو ٹیڈ نے اطمینان کی گہری سانس لی اور جس وقت فورٹ سائڈز کی روشنیاں دور ہوتے ہوئے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو اس نے بڑی احتیاط سے اپنے اب تک کے ہر اقدام کا تفصیلی جائزہ لیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہیں اس سے کسی قسم کی کوئی تعلق تو سرزد نہیں ہوئی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے ایک نوٹ لکھ کر اسنسن کی میز پر چھوڑ دیا تھا۔ جس میں اسے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ وہ اور اس کی بیوی کیسٹاس سٹی جا رہے ہیں جہاں انہیں اپنے ایک عزیز کی تدفین ناک ملائی کی اطلاع دی گئی تھی اور یہ کہ وہ کئی دن تک دفتر نہیں آ سکے گا۔ اسے اسے یہ بھی کہ یہ تحریر اسنسن کو اس کے گھر فون کرنے سے باز رکھے گی اور وہی میری تو ظاہر ہے کہ وہ تو پہلے ہی یہ سمجھ رہی ہے کہ وہ بینک کے کام سے نیو یارک جا چکا ہے اور یہ عین ممکن تھا کہ محفوظ سرمایے میں ایک لاکھ ڈالر کی کمی دن تک معلوم نہ کی جا سکے۔ زیادہ تر سبھی اس طرح اسے کم سے کم دو دن کی مہلت تو ضرور مل جائے گی اور اگر کوئی ایسا..... واقعہ نہ ہوا جس سے اس کی چوری کا حال کھل جائے تو یہ مہلت زیادہ دن کی بھی ہو سکتی تھی اور جب یہ انکشاف ہو بھی جائے گا تب بھی بینک کی کوشش یہی ہوگی کہ ابتدا میں اس کی روپوشی کو ممکن حد تک راز رکھا جائے تاکہ اس دوران میں پولیس اور ایف بی آئی کے ایجنٹ اسے تلاش کر سکیں لیکن اس وقت تک وہ سیکورٹی کی یا اس جیسے کسی اور شہر میں غائب ہو چکا ہوگا۔ اس نے سبکی کو اتنی رقم دے دی تھی جس سے وہ سیکورٹی مل جائے والے طریقے کے دو گن خرید سکے۔ مسکو جی سے ایک طریقہ سلا تک جا تا تھا اور وہاں سے پھر سیدھا سیکورٹی دروازہ کرتا تھا اور دوسرا دن طلوع ہونے سے پہلے وہ سیکورٹی چلا چکا ہوگا۔

مسکو جی پہنچ کر اس نے اپنے سوٹ کیس عیسی ڈرائیور کے پیروں کے تاکہ وہ انہیں ڈکی میں رکھ دے اور اسے اس

اقوال زریں

☆ رب سے محبت اور انسان سے محبت میں یہ فرق ہے کہ انسان سے محبت آپ کی سب سے بڑی کمزوری اور رب سے محبت آپ کی سب سے بڑی طاقت بن جاتی ہے۔

☆ جب آپ کسی کو بہتر مشورہ دیتے ہیں تو وہ تبدیل نہیں ہوتے۔ صرف اسی وقت تبدیل ہوتے ہیں جب انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی دوسرا مشورہ بھی ہے۔

☆ اپنے متعلق کوئی بھی بری بات نہ کہو، آپ کے رشتہ دار اس موضوع پر بحث کرنے کے لیے کافی ہیں۔

☆ زندگی توقعات کے پورا نہ ہونے اور غیر متوقع حادثات و واقعات کا سامنا کرنے کا نام ہے۔ جب آپ درست ہوں تو کوئی بھی آپ کو یاد نہیں کرتا مگر جب آپ غلط ہوں تو کوئی بھی آپ کو بھول نہیں پاتا۔

☆ اگر آپ اپنے کسی درست موقف پر ڈٹ جائیں تو اپنے آپ کو کسی تباہی و سختی کی طرح اکیلا رہ جانے کے لیے تیار رکھیں، لیکن اگر آپ زمین پر گر جائیں تو اس جگہ کی طرح گریں، جو زمین میں آگ کر دوبارہ مڑنے کے لیے کسی پودے کی شکل میں سر اٹھا لیتا ہے۔

☆ کسی کو تکلیف دے کر سوری (اعتذار نہ امت) کہنا بڑا آسان ہوتا ہے، مگر تکلیف اٹھا کر مسکرا کے ٹال دینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

مرسلہ: اختر شاہ عارف، جہلم

مونل تک چلنے کی ہدایت کی جہاں سبکی بھری ہوئی تھی۔ مونل پہنچ کر اس نے ہرم وافرانی کے نام سے ایک کمرہ کر کے پر لیا۔ اس کا کمرہ ادا کیا یہ کہتے ہوئے کہ وہ علی الصبح روانہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے کمرے کا نمبر 108 تھا۔ سبکی اسی منزل کے ایک کمرے میں مقیم تھی۔ اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر کھڑکیوں کے پردے گرا دیے۔ بستر پر

اور اس کے نصف گھنٹے بعد ٹیڈ اس بس پر سوار اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ ابھی اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ بینک جا کر ایک لاکھ ڈالرز اپنی میز کی درازوں میں چھپا دے پھر جب کل صبح پونے نو بجے والٹ کا دروازہ کھلے تو وہ دن میں کسی بھی وقت سوچ پا کر رقم کو دوبارہ والٹ کے اندر جا محفوظ سرمائے کے سیف میں واپس رکھ دے۔ بینک میں ایک لاکھ ڈالرز اپنی میز میں چھپانے کے بعد وہ اسٹین کی میز سے اپنا وہ تحریری پیغام بھی اٹھا کر ضائع کر سکتا تھا جو وہاں چھوڑ آیا تھا۔ پھر وہ باقی رات اسی ہوٹل کے کمرے میں گزار دے گا جس کا کرایہ وہ پہلے ہی ادا کر چکا ہے اور صبح کو کسی وقت میری کوفون کر کے اس سے کہے گا کہ اسٹین نے اپنا پلان مین وقت پر تبدیل کرتے ہوئے اسے بغض سے واپس بلالیا۔ وہ اپنا کپڑوں والا سوٹ کیس اسٹین کے لاکر میں چھوڑ دے گا اور دوسرا سوٹ کیس نوٹ نکالنے کے بعد کہیں چھپک دے گا مگر نہیں..... یہ ایک غلطی ہوگی۔ میری اسے دوست کیسوں کے ساتھ روانہ ہوتے دیکھ چکی تھی چنانچہ وہ اس خالی سوٹ کیس میں کچھ کاغذات رکھ دے گا اور کسی کیسی ڈرائیور کے ساتھ دوپہر کو گھر بھجوا دے گا۔ لیکن اسے سب سے زیادہ شواہ کام چرائی ہوئی رقم کا سیف میں واپس رکھنا محسوس ہو رہا تھا، اس کے چرانے سے بھی زیادہ مشکل۔

آخر کار اس نے اس مشکل کا بھی ایک حل سوچ لیا اور پھر اطمینان سے اپنی سیٹ سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ اب محسوس کر رہا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ حماقت ہی تھی۔ بہر حال ایک بات یقینی ہے کہ میری کو اس بارے میں زندگی بھر بھی کچھ معلوم نہیں ہو چکا ہے اور جہاں تک خود اس کا تعلق ہے، وہ آئندہ کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا چاہے اپنی کرسی پر بیٹھ بیٹھ بوڑھا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ایک ہی رات میں اس نے ایک ایسے ایڈوچر کا مزہ چکھ لیا تھا جو اسے تمام زندگی بچھتاوے میں جتنا رکھنے کے لیے کافی تھا۔ اور تب اچانک ٹیڈ کو اپنے جسم کے روٹنگے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ چڑے کا کیس، وہ کیس جس میں اس کی بیوی اور لڑکے کے فوٹو لگے ہوئے تھے، اس کی جیب میں موجود نہیں تھا۔ اس نے اضطراب کے عالم میں درجنوں مرتبہ اپنی جیب کی تلاشی لے ڈالی مگر وہ موجود ہوتا ہوتا۔ وہ تو کوئی کے اسی موٹی من کر انمبر 54 میں، شاید بستر کے نیچے یا پھر..... یا پھر سیلی کی لاش کے نیچے ہوا ہوا پڑا تھا۔

اس کی زندگی موت سے کس قدر قریب پہنچ گئی تھی۔ تمام ادا و پیر، دنیا کی سیر و سیاحت کا شوق، ایک خوبصورت لڑکی سے محبت کرنے کا ولولہ، سب کچھ وہ دھ کے ابال کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت وہ خود کو ایک ایسے بچے کی طرح محسوس کر رہا تھا جس کے خوبصورت اور پستیدہ غمازے میں دفعتاً جمید ہو گیا ہو اور اس کی تمام ہوا باہر نکل گئی ہو۔ گزشتہ چند منٹ کے دوران وہ اپنے خوفناک تجربے سے گزر چکا تھا جس کی بدنامی زندگی ایک کانٹا بن کر اس کے دل میں چبھتی رہے گی لیکن یہ وقت بچھتاوے کا نہیں تھا۔ اسے تیزی سے عمل کرنا تھا۔ اسے اپنے آپ کو سنبھالنا تھا۔ اگر وہ جلد ہی یہاں سے نہیں نکلا تو پھر اسے قتل اور عین، دو سنگین جرائم کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دفعتاً اسے طیارے کے کھٹکوں کا خیال آیا۔ اس نے سیلی کا پرس دیکھا مگر کھٹ وہاں نہیں تھے۔ پھر اس نے اپنی کھٹوں کی جیبوں کی تلاشی لی اور اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک لفافہ مل گیا جس کے اندر دو کٹ رکھے ہوئے تھے۔ ایک کٹ پر سیلی کا اور دوسرے پر جوآن کوئزل کا نام تحریر تھا۔ یہ اطالوی مجرم جوآن کوئزل غالباً سیلی کا شوہر وغیرہ تھا۔ لڑنے غصے میں آکر کھٹوں کے پزے پزے کر دیے اور انہیں واش سین میں بہا دیا۔ پھر اس نے رومال لے کر ہر اس پزے کو صاف کرنا شروع کر دیا جہاں جہاں اسے اپنے ہاتھ لگنے کا شبہ تھا۔ پرس، لیپ، الماری اور دوسری تمام چیزیں۔ پھر اس نے ریمو لور اٹھایا۔ بڑی احتیاط سے اسے رومال سے صاف کیا۔ پھر رومال ہی سے پزے پزے ہوئے اس نے ریمو لور کو اطالوی کے سیدھے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کی انگلیاں پوری طاقت سے ریمو لور کے دستے پر جمادیں تاکہ ان کے نشانات آجائیں اور پھر اس نے ریمو لور کو دستور رومال سے پکڑے ہوئے اس کے ہاتھ سے چند انچ کے لاسے پر ڈال دیا۔ اس نے سوٹ کیس بند کیا۔ کمرے کی روشنیاں بجھا دیں اور سوٹ کیس لیے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آکر اس نے دروازے کے ہینڈل کو بھی رومال سے صاف کر دیا۔ جلدی سے اپنے کمرے میں واپس آیا۔ اسے جلد سے جلد کوئی سے چلے جانا تھا۔ اپنے کمرے سے اس نے ایک ٹیکسی کے لیے فون کیا۔ ٹیکسی پانچ منٹ میں پہنچ گئی۔ اگرچہ یہ پانچ منٹ ٹیڈ کو پانچ گھنٹوں سے زیادہ طویل محسوس ہو رہے تھے بہر حال..... وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر بس اسٹاپ پر پہنچا۔ پوچھے پر معلوم ہوا کہ فورٹ سائڈز کے لیے بس اگلی نصف گھنٹے میں روانہ ہونے والی ہے۔

بہت ہی خوبصورت، بہت ہی قیمتی۔ تم اسے ابھی دیکھنا چاہتی ہو یا بعد میں؟“

”میں اسے ابھی دیکھنا چاہتی ہوں سوٹ ہارٹ۔“

سیلی نے فوراً جواب دیا۔

ٹیڈ آہستہ آہستہ الماری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بیروں کے ٹیکس کی بات سن کر اس آدمی نے اپنے ریمو لور کا رخ نیچے کی جانب کر لیا ہے۔ ظاہر تھا کہ جب تک وہ ٹیکس کے بارے میں یقین نہ کر لے کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ ٹیڈ نے اپنی جیب سے چڑے کا وہ کیس نکالا جس میں اس کی بیوی اور بچے کا فوٹو لگا ہوا تھا اور اسے سیلی کی طرف بڑھا دیا، جیسے ہی سیلی نے وہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا، ٹیڈ نے الماری کے قریب میز پر رکھا ہوا بھاری ٹیلی لیپ اٹھا لیا اور خود گھوم کر فرش پر گرے ہوئے لیپ اس شخص کی طرف بھیج دیا۔ لیپ اس شخص کے پیٹ پر لگا اور وہ اس کی چوٹ کھا کر فرش پر لڑھک گیا۔ ٹیڈ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جگہ سے جست ماری اور..... اس شخص پر اس طرح جا کر کہ اس کا ریمو لور والا ہاتھ اپنے قابو میں کر لیا۔ چند لمحوں کی ٹیکس کے بعد ریمو لور ٹیڈ کے قبضے میں تھا۔

”سنیور جیلز!“..... اطالوی اپنی خوف زدہ ہو کر گونگایا مگر ٹیڈ نے فریگیر دیا دیا۔ گولی اطالوی کے گھونگرے یا لے بالوں سے گزرتی ہوئی اس کے سر میں گھس گئی۔ ٹیڈ اسے چھوڑ کر پھلتے ہوئے کھڑا ہو گیا، اسے تو یہ بھی کہ سیلی اپنے ساتھی کی مدد کے لیے آگے بڑھے گی لیکن وہ کمرے میں نہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ کمرے میں بارود کے دھوئیں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی محسوس کر چکا تھا اور اب اس کے سر سے خون نکل کر کمرے میں بچے ہوئے قالین پر پڑ رہا تھا اور تب ٹیڈ نے کمرے کے دوسرے حصے میں بستر کے قریب سیلی کو فرش پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے دیکھا۔ اس کے دل کے مقام پر گولی کا نشان نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب ٹیڈ نے اس کے اطالوی ساتھی پر لیپ کی گولی مارا تھا تو حادثاتی طور پر اس کی انگلی فریگیر پر پڑ گئی تھی اور اس طرح ریمو لور سے چلنے والی گولی نے سیلی کو جو اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی، اپنا نشانہ بنالیا تھا۔

ٹیڈ بے جان سا بستر پر گر پڑا۔ آن کی آن میں اس کے تمام خواب چٹنا چور ہو چکے تھے۔ سیلی نے اسے ڈبل کر اس کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ شروع سے اب تک اسے بے وقوف بنا رہی تھی اور اب اسے اپنی اس بے وفائی کا خمیازہ اپنی جان دے کر اٹھانا پڑا تھا، پھر چند لمحوں پہلے تو

اپنا سوٹ کیس رکھ دیا۔ پھر کمرے کی روشنی گل کرتے ہوئے وہ خاموشی سے باہر نکلا اور وہ سوٹ کیس بھی ساتھ لیتا گیا جس میں رقم موجود تھی۔ سیلی کے کمرے کا نمبر 54 تھا۔ اندر بھی بلی روشنی ہو رہی تھی۔ ٹیڈ کا دل ایک رنگین رات بسر کرنے کے خیال سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ سیلی کے خوبصورت چہرے نے ہچک کر دیکھا۔

”کیا یہ تم ہو ڈارلنگ؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں ہائی سوٹ ہارٹ۔ میں وعدے کے مطابق ٹیکس کا وقت پر پہنچ گیا ہوں۔“

دروازہ پورا کھول دیا گیا۔ ٹیڈ اندر داخل ہوا اور اس نے اندر سے چٹنی لگادی۔ ایک لمحے کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں گئے۔

”کیا تم رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ڈارلنگ؟“ سیلی نے پوچھا۔

اور جواب میں ٹیڈ نے سوٹ کیس بستر پر رکھتے ہوئے اس کا ڈھکن کھول دیا۔ اندر بیس بیس ڈالر کی پچاس گڈیاں بڑے سلیٹ سے جتی ہوئی رکھی تھیں۔

”اوہ ڈارلنگ، تم کتنے ہوشیار، کتنے عقل مند ہو۔“ سیلی نے جوش کے ساتھ کہا۔ ”تم نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کر دکھایا۔“

”کیا تم نے طیارے کے ٹکٹ خرید لیے ہیں؟“

”ہاں ٹیکس اسی طرح جس طرح تم نے ہدایت کی تھی۔ اگلی پرواز ہمیں اس شہر سے میکسیکو لے جائے گی۔“

ٹیڈ اسے دوبارہ آغوش میں لینے کے لیے آگے بڑھا، مگر اسے حیرت ہوئی کہ سیلی پیچھے ہٹ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس سے دور رہنا چاہتی ہو لیکن کم سے کم آج کی رات ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ سیلی تو ہمیشہ اس کے جذبات کی پذیرائی کے لیے تیار رہتی تھی۔

اور ٹیکس اسی لمحے ٹیڈ نے سنگار میز کے بڑے آئینے میں ایک طویل قامت سیاہ بالوں والے آدمی کا عکس دیکھا جس کی آنکھیں اٹلی کے باشندوں کی طرح تھیں اور جو بڑی خاموشی سے ہاتھ روم سے نکل کر باہر آ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک اور چیز بھی دیکھی۔ یہ ایک ریمو لور تھا جو اس طویل قامت آدمی کے ہاتھ میں دب ہوا تھا۔ ریمو لور، جس میں سائنلکس بھی لگا ہوا تھا، ٹیڈ کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگیں مگر اس نے خود کو سنبھالا۔

”میں تمہارے لیے ایک قیمتی تحفہ بھی لایا ہوں ڈارلنگ۔“ اس نے سیلی سے کہا۔ ”بیروں کا ایک ٹیکس

✽ ڈاکٹر اسحاق اے لطیف..... فقیر والی
نہخت و تاج کی ہے آرزو نہ بزم شاہ کی ہے جستجو
جو نظر سے دل کو بدل سکے مجھے اس نگاہ کی تلاش ہے
✽ محمد قیصر شہزاد..... جام پور، ضلع راجن پور
ساون بھی میرے تم ہو، میری پیاس بھی تم ہو
صحرا کے بکولوں میں چھپی آس بھی تم ہو
تم یوں تو بہت دور بہت دور ہو مجھ سے
محسوس یہ ہوتا ہے میرے پاس بھی تم ہو
✽ محبوب علی..... ٹورنٹو، کینیڈا
مائی نہ میری اک بھی بہت خود سے تو اے دل
اب خود ہی تڑپ میں تو تیرا کچھ نہیں لگتا

دے

✽ ابرار وارث..... درآباد سندھیلیا ٹوای
اسے یہ شکوہ ہے کہ میں اسے سمجھ نہ سکا
اور مجھے یہ مان ہے کہ میں جانتا فقط اسی کو ہوں
✽ محمد بشارت..... کنٹرودورہ
پھر فضا دھندلا گئی آثار ہیں طوفان کے
کا پتے ہیں پھول کمرے میں میرے گلدان کے
✽ عمران حیدر بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
تم تو غیروں کی بات کرتے ہو
ہم نے اپنے بھی آزمائے ہیں
لوگ کانٹوں سے بچ نکلتے ہیں
ہم نے پھولوں سے زخم کھائے ہیں
✽ ڈاکٹر وسیم خالق کہیاں..... سمرات
اب کہاں ملاقات میں وہ جذبات کی گری
اب تو وہ رکستے محبت کا بھرم آتے ہیں
✽ نسیم عباس بابر..... اوکاڑہ
آنکھوں کا رنگ لال ہوا تو باتیں کرنا بھول گئے
شہر دل پامال ہوا تو باتیں کرنا بھول گئے
کب سے بارش کر رہی تھی ہم پر لاکھ سوالوں کی
خود پر ایک سوال ہوا تو باتیں کرنا بھول گئے



✽ سائرہ، صائمہ..... کھاناں
اس نے کہا مفہوم غلط جنہی کیا ہے؟
میں نے کہا تم سے امید وفا کرنا
✽ عون عباس بابر..... اوکاڑہ
تیری معراج کہ تو لوح و قلم تک پہنچا
میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا
✽ شبیر علی خان..... اسلام آباد
تاریخ اگر ڈھونڈے گی کہیں جانی عمر
جانی تو بڑی چیز ہے سایہ نہ ملے گا
✽ حجاب کنول خان..... ملکوٹ
تیرے خیال میں رہتی ہوں پاؤں ڈرتے ہوئے
کہ گر پڑوں نہ کہیں بیڑیاں اترتے ہوئے
میں لڑکی ہو کے بھی اپنے وعدوں پہ قائم ہوں
مگر حیا نہ آئی؟ تجھے مکررتے ہوئے
✽ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی..... خوشاب
سچ جھکا یا تو پتھر صنم بن گئے
عشق بھٹکا تو حق آشنا ہو گیا
رنگ کرتا ہے کعبہ میرے کفر
میں نے جس بت کو پوجا خدا ہو گیا

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
ہار مجھے زخم جدائی نہ دیا کر
اگر میرا نہیں ہے تو دکھائی نہ دیا کر
✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
بے دور کے نئے خواب ہیں، نئے مومنوں کے گلاب ہیں
پتھروں کے چراغ ہیں انہیں نفرتوں کی ہوا نہ دے
✽ شوکت علی..... گلبرگ، لاہور
نہ کہیں بھی رہے تجھ پر میرا الزام تو ہے
میرے ہاتھوں کی گلیروں میں میرا نام تو ہے
✽ یوسف مرزا..... ملتان شریف
اس عشق میں کیا کیا ہوتا ہے عاشق جانے یارب جانے
اس بار نہ جانے کیا ہوگا پہلے بھی ہوئے تھے دیوانے
✽ راجیل نواب..... ملتان
ہم خون کی فسطیں تو بہت دے چکے، لیکن
اے خاک وٹن، قرض ادا کیوں نہیں ہوتا
✽ صوبیدار انوار بخش (ر)..... ملیر کینٹ
پہاڑ زندگی ہو گا فروزاں، ہم نہیں ہوں گے
ہمالو، اب تمہارے ہاتھ میں تقدیر عالم ہے
✽ محمد آصف ساجد..... ارزانی پور، قصور
ہاں تو اس جلوہ گر حسن میں کیا کیا دیکھا
اب تجھے دیکھ چکے کوئی نہ تجھ سا دیکھا
✽ شہباز اکرم لوہی..... پاکپتن شریف
شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتا ہوں
اک دل ہی کافی ہے تیری یاد میں جلنے کے لیے
✽ حبیبہ احمد..... نوشہرہ
تم ہی نہ سن سکے اگر قصہ غم سنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر ہم نہ اگر سنا سکے
ہاں میں آچکے تھے ہم جوش میں آچکے تھے تم
لام کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے
✽ مسز باب احمد حسن عرضی خان..... قنولہ شریف
پھر کر مجھ سے سبھی یہ سوچا ہے
اورا چاند بھی کتنا اداس لگتا ہے
✽ شمس الدین سیال..... نوشہرہ و فیروز
عاشق کیا کیا تیری بے رنجی سے ہوں گے
ساری دنیا کے لیے ہم اجنبی سے ہوں گے

✽ کاشف محمود..... لاہور
آ زندگی تجھے قاتل کے حوالے کر دوں
ہر روز کا مرنا مجھے اچھا نہیں لگتا
✽ نیر زیدی..... سرگودھا
جس نے چھپی ہی نہیں عشق و وفا کی تاریخ
اس سے کیا ہوگی کسی تاج محل کی تعریف
✽ اختر شاہ عارف..... ڈھوک جھو، جہلم
روپے گا اب کے وہ دریاں کاغذ دیکھ کر
آخری خط میں اسے میں نے لکھا کچھ بھی نہیں
✽ عمران علی..... جھنگ
میں چاہت کی اس منزل پر کھڑا ہوں فراز
کوئی اس کی طرف دیکھے بھی تو اچھا نہیں لگتا
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
تم سن کے کیا کر دو گے مجھ سے میری کہانی
بے لطف زندگی کے قصے ہیں پھینکے پھینکے
✽ مرزا طاہر الدین بیگ..... میر پور خاص
کوئی جھوٹا تو ادھر آئے گا خوشبو لے کر
سوچ کر ہم بھی یہی وقت سحر بیٹھے ہیں
یاد کا دیپ جلا ہے تو یہ لگتا ہے خلیل
میرے پہلو میں کئی شمس و قمر بیٹھے ہیں
✽ راجا ضیاء الحسن کبانی..... ساہیوال
ہزاروں بار اس نے مات دی فولاد و آہن کو
محبت ریشمی ڈوری سہی، پچی نہیں ہوئی
✽ محمد اشفاق سیال..... شورکوٹ شی
دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
بھی اس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے
✽ راشد حبیب تابش..... انک
آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
اس موقع پر کہ شاید تو پلٹ کر دیکھے
✽ فضل اہری..... چمن
محبت کو کوئی مجھے تو آخر کس طرح سمجھے
یہ ظالم انتہا تک ابتدا معلوم ہوئی ہے
✽ محمد مقبول عاشق..... خوشاب
کھساروں کے دل پھٹتے تو دریا ہوئے جاری
اور لوگ کہتے ہیں کہ پتھر نہیں روتے



گمنامیان

تنویر ریاض

خدا کے ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے... کسی کو آزادی دے کر اور کسی کو قید میں رکھ کر آزماتا ہے... کچھ ایسی ہی کشمکش اسے بھی درپیش تھی... اس کے ساتھ جو واقعات رونما ہو رہے تھے، اس کی کوئی بھی وجہ اس کی عقل سے بالاتر تھی مگر... اسے یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا... اور وہ کرتی گئی حتیٰ کہ ایک دن ایسا کچھ ہو گیا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

معاشرتی تحریکوں کا شمار ایک دو شیزہ کا ماجر

نہائی تھی۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ میں اس میں گلے تک ڈوب جاتی تھی۔ ہاتھ آئل کے چند قطروں اور شاہور ہے نکلے گرم پانی کی پھوار جسم پر پڑتے ہی میری ساری ہڈیاں اور پریشانیوں فضا میں تحلیل ہو جاتیں۔ جبکہ یہاں جیل میں لڑکیوں کو شاہور لینے کی اجازت ہے جس میں بھی نیم گرم اور بھی ٹھنڈا پانی آتا

✽ ہمایوں اختر... فیصل آباد
دشت میں قیس نہیں کوہ پہ فرہاد نہیں
ہے وہی عشق کی دنیا مگر آباد نہیں
✽ فرح ناز... لاہور

ہجرت کی گھڑی ہم نے ترے خط کے علاوہ
بوسیدہ کتابوں کو بھی سامان میں رکھا

✽ زویب احمد ملک... گلستان جوہر، کراچی
کچھ تو ہوا بھی سرد بھی، کچھ تھا ترا خیال بھی
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ملال بھی

✽ طاہرہ یاسمین... ضلع سرگودھا
میں فقط خاک ہوں مگر نام محمد سے نسبت میری
یہی اک رشتہ ہے جو میری اوقات بدل دیتا ہے

✽ عدنان صدیقی... ملتان
عمر بھر کا یاد ہے بس ایک افسانہ مجھے
میں نے پہچانا جسے اس نے نہ پہچانا مجھے

✽ محمد عزیز... کراچی
جس سورج کی آس لگی ہے شاید وہ بھی آئے
تم یہ کہو، خود تم نے اب تک کتنے دیے جلائے

✽ راجا افتخار علی افقی... چٹا سدن شاہ
ہم تو سوکھے ہوئے پتے ہیں بھلا کون پوچھے
لوگ اٹھاتے ہیں ضرورت میں جلانے کے لیے

✽ کمال انور... اورنگی ٹاؤن، کراچی
کوئی جنت کا طالب ہے تو کوئی غم سے پریشان ہے
ضرورت سمجھ کر واتی ہے عبادت کون کرتا ہے

✽ عبدالواحد... ماڈل کالونی، کراچی
پانی آنکھ میں بھر کر لایا جاسکتا ہے
اب بھی جلتا شہر پہچایا جاسکتا ہے

✽ ذیشان منہاس... گلشن اقبال، کراچی
میں پانی اور آگ سے اک مٹی کی خاطر لڑتا تھا
اور یہ دونوں عالم کھیل تماشا دیکھنے والے تھے

✽ احمد خان توحیدی... پاکستان اسٹیل، کراچی
سے لاکھ ستم نہ کی آہ و فغان اب تک
زبان رکھتے ہوئے بھی رہے ہم بے زبان اب تک
✽ محمد رشید سیال... نثرانی عکس، کمر

کچھ اور بڑھ گئے اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوع سحر سے ہم
✽ محمد قدرت اللہ نیازی... حکیم ٹاؤن، خانیوال

بیٹھ جاتی ہے میرے پہلو میں آکے کچھ اس طرح
اس کی یاد میرے گھر کا کوئی فرد ہو جیسے
✽ بارون ظفر... لیہ

بتاؤں کہ ہر جواب میں بس مختصر سی ہاں
لگتا ہے میری ذات سے اکتا گیا ہے وہ
✽ ارشد وارثی... ملتان

باز آجاؤ تقافل سے ورنہ اہل دل اکثر
جسے بھول جاتے ہیں اسے بھول جاتے ہیں
✽ فرہاد احمد... میانوالی

ورچے بے صدا کوئی نہیں ہے اگرچہ بولتا کوئی نہیں ہے
میں ایسے جگہ میں ہو گیا ہوں جہاں میرے سا کوئی نہیں ہے
✽ ظہیر عباس... کراچی

وہ قتل کر کے مجھے ہر کسی سے پوچھتے ہیں
یہ کام کس نے کیا ہے یہ کام کس کا تھا
✽ رحمت شاہ... انک

بے نور ہو چکی ہے بہت شہر کی فضا
تاریک راستوں میں کہیں کھو نہ جائیں ہم
✽ رحمان بلوچ... سکران

میری بھی کچھ خطائیں تھیں قاضی شہر نے مگر
اپنے بھی جتنے جرم تھے میرے ہی سر لگا دیے
✽ رمضہ علی... شیخوپورہ

وہ ہمیں جب تک نظر آتا رہا، نکتے رہے
گیل آنکھوں، اکٹھے لفظوں سے دعا دیتے ہوئے

محفل شعروسیخت

نام: _____

پتا: _____

کوین
برائے
شمارہ
اپریل
2012

ہے اور دروازے پر انتہائی بد صورت اور نیم شبیم گاڑ پھرا دیتی رہتی ہے۔۔۔۔۔ اس نے وقف کو اتنی بھی عقل نہیں کہ کوئی لڑکی برہنہ حالت میں بھلا جیل سے فرار ہو سکتی ہے؟ اسی لیے مجھے یہاں غسل کرنا اچھا نہیں لگا بلکہ پوچھیں تو ایک نہانہ پر ہی کیا منحصر ہے، یہاں تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ سکتا۔

میں اپنے آپ کو اس گندے ماحول سے دور رکھنے کے لیے ماضی میں صوف جاتی ہوں۔ آج صبح بھی جب ہمیں جگانے کے لیے کھٹی بجی تو میں فیروز اور سونی کے بڑے سے ماربل روم میں اپنے آخری غسل کو یاد کر رہی تھی۔ اس میں لگی ہوئی سنہری ٹونٹیں کو گھمانے سے بھاپ برآمد ہوتی اور میں اپنے پورے جسم کو بھاپ اور گرم پانی سے بھگو لیتی پھر سفید تولیا سے اپنا جسم خشک کرتی اور اسے اچھی طرح لپیٹ کر وارڈ روم میں چلی جاتی۔ جانتی تھی کہ سونی کی نظر پر میرا طواف کر رہی ہوں گی۔ اسے تاک جھانک کی عادت تھی۔ آخر وہ کب تک میرے خوب صورت جسم اور نرم و نازک جلد کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ یہاں آکر میرے تصورات کا کل دھڑم سے زبیں یوں ہو گیا کیونکہ وہی ننھوں صورت گاڑڈ زور زور سے دروازہ پیٹ رہی تھی اور چلا چلا کر ہمیں بچ چھوڑنے اور ناشتے کے لیے قلعہ ربانے کی ہدایت دے رہی تھی۔



میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگلی بار جب میری وکیل ملاقات کے لیے آئے گی تو اس سے ہاتھ آگے نکلاؤں گی۔ ہمیں جیل میں یہ چیزیں مہیا نہیں کی جاتی تھیں لیکن ہم اپنے طور پر انہیں استعمال کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ کیک بھی۔ کیونکہ انہوں نے ہمیں جو کچھ دے رکھا تھا۔ اسے کیک کہنا بھی اس نام کی توہین تھی۔ ایک پلاسٹک کے تھیلے میں دو بچہ موٹا فوم کا ٹکڑا ڈال کر اسے کیک کا نام دے دیا گیا تھا جس میں عجیب سی بو آتی رہتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دونوں گالوں پر ہاتھ آگے لگانے سے یہ بدبودب جائے گی اور میں آرام کی نیند سو سکوں گی۔ مشکل یہ تھی کہ وکیل بھی میرا کھڑا سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی باتیں میرے خلاف جاسکتی ہیں۔ میں اسے بھاننے کی کوشش کرتی کہ میں کسی ایسے جرم کا اعتراف نہیں کر رہی جو مجھ سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ اگر انہوں نے ان باتوں کو میرے خلاف استعمال کیا تب بھی وہ میرا کیا بگاڑیں گے۔ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا تھا، اس سے زیادہ اور کیا برا ہو سکتا تھا۔

میری وکیل کا حلیہ ایسا تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کا منہ خطرناک حد تک چوڑا تھا جس میں

ہونٹوں کی جگہ ایک باریک سی لکیر نظر آتی تھی۔ اس کے خشک اگھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر چڑیا کا گھونسلہ یاد آ جاتا۔ یوں لگا تھا جیسے اس نے کاج کا امتحان پاس کرنے کے بعد کبھی اس بالوں کو نہیں ترشوا یا تھا۔ وہ عموماً گرے رنگ کا سوٹ پہنتی تھی جو اس کے جسم پر بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ جلدی میں ہوتی۔ میری ماما بھی ایسا ہی کرتی تھی۔ مجھے ہمیشہ سے دھمکے لہجے میں بات کرنے کی عادت تھی اور میں نے بھی اسے ناراض کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ میری خواہش تھی کہ وہ صبر سے میری بات سن لیا کرے۔

آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ جیل میں قید کاٹنے والی لڑکی کسی کے رنگوں کے انتخاب کے بارے میں کیونکر فیصلہ کر سکتی ہے۔ جبکہ مجھے بچپن سے ہی رنگوں کی سمجھ بوجھ تھی۔ میں نے بہت چھوٹی عمر میں ہی ماڈلنگ اور مقابلہ حسن میں شرکت کرنا شروع کر دیا تھا اور ان شوز میں خوب ہماری بھر کم میک اپ کر کے حصہ لیا کرتی تھی۔ البتہ ہفتے کے باقی دنوں میں ماما اور میں عام زندگی گزارتے تھے۔ وہ گھر کی صفائی کرتی اور میں اسکول جایا کرتی تھی لیکن اختتام ہفتہ ہمارے درمیان مقابلہ ہوتا تھا۔ ہم جار جیا، جینا اور ہر اس شہر میں جاتے جہاں سے اچھے معاوضے کی پیشکش ہوتی۔ میں تینو بچایا کرتی تھی اور ماما نے اس کی تربیت بہت پہلے مجھے دے دی تھی۔ کیونکہ میری آواز اتنی اچھی نہیں تھی لیکن تینو پر میری انگلیاں خوب چلتی تھیں اور میں چند مرتبہ ہی کوئی دھن سن کر اسے تینو پر بجانا شروع کر دیتی۔ میرا تینو پورٹیل تھا اور ہم اسے یہ آسانی دوسری جگہ لے جاسکتے تھے۔ اس تینو نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب ماما بیمار پڑ گئی اور اس کی بیماری کا خرچ بڑھتا گیا۔ بیسوں کی بروقت ادائیگی نہ ہونے پر ایک قرض خواں نے ہمارے زیریں میں تالا ڈال دیا اور ہم آٹھ مہینے تک کام میں سزا کرتے رہے۔ اس دوران ہم نے مختلف چھوٹے چھوٹے کام کر کے ایک ایک پیسہ بچایا تاکہ میرے لباس اور ادخالہ فیس کے لیے رقم جمع ہو سکے۔ کار میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس میں ٹی وی نہیں ہوتا۔ اس طرح مجھے کھینے کے لیے کافی وقت مل گیا۔

دسویں سالگرہ سے ایک دن پہلے میں نے ایک شو میں حصہ لے کر کل ماس ساؤتھ ایسٹ، کا خطاب حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ میں ہزار ڈالرز کا نقد انعام بھی لیا۔ اب ہم نے ایک کمرہ کرانے پر لے لیا تھا۔ میں اس کے ہاتھ فکرم بھی نہیں بھولوں گی۔ اس کے بعد میں نے اگلے سال کے دوران کئی مقابلوں میں حصہ لے کر اتنے ڈالرز جمع کر لیے کہ

اس نے رہنے کے لیے ایک ٹرانزیرٹ خرید سکیں۔ میں اٹھارہ سال کی تھی لیکن جسم پر فالتو چربی چڑھ جانے کی وجہ سے اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی اسی لیے سب صورت ہونے کے باوجود میرے چہرے اور جسم میں کوئی کشش نہیں تھی۔ ایک طرف میرا قد بڑھ رہا تھا تو دوسری جانب چہرے کی سوجن اور سر کی موٹائی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس سبب کے ساتھ میں کسی مقابلہ حسن یا شو میں شرکت نہیں کر سکتی تھی۔ لہذا میں نے اپنے آپ کو ایک کمرے تک محدود کر لیا اور تین سال تک گٹار بجانے کی پریکٹس کرتی رہی۔

ماما صحت یاب ہو چکی تھی لیکن اسے میرے مستقبل کی بڑی فکر تھی۔ وہ ہمیشہ مجھے دینا اور اساتذہ رہنے کی ترغیبیں دلاتی رہتی لیکن میں اپنی کالی اور سستی کی وجہ سے ان پر عمل کرنے سے قاصر تھی۔ تنگ آ کر اس نے مجھے جم بھینجا شروع کر دیا۔ چندا بعد ہی میرے جسم کی چربی پگھلنا شروع ہوئی اور میں نے مس نہا کر کیرولینا کا مقابلہ جیت لیا۔ وہ میری زندگی کا یادگار لمحہ تھا جب سابق مس نہا کر کیرولینا نے مجھے تاج پہنایا۔ اس کے بعد میں نے مس ہائی پوائنٹ کا مقابلہ جیتا جو میرے کیریئر کا نقطہ عروج تھا پھر میرا زوال شروع ہو گیا۔ میں اگلے برس مس نہا کر کیرولینا کے مقابلے سے خارج کر دی گئی۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں نے مقابلے میں شامل ایک لڑکی کو دھکا دیا تھا جس کے نتیجے میں اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ معمولی سی زخمی ہوئی۔ کسی نے مجھ سے اس کی وجہ دریافت نہیں کی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس لڑکیا نے میرے پرس سے میک اپ کا سامان چرایا تھا۔



میں نے کاج میں داخلہ لے لیا۔ سوشل ورک میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے مجھے بھی غربت مثانے اور خاندانوں کو جوڑنے میں دلچسپی تھی۔ وہاں میرا واسطہ ڈاکٹر دوو سے پڑا جو چینی ڈاکٹر تھا۔ میں جب بھی اس سے کوئی سوال کرتی تو وہ اپنی سر ڈاکٹمنیں میرے چہرے پر گاڑ دیتا اور پھر اس کی نظریں میرے پورے جسم کا طواف کرتے لگتیں۔ مجھے اپنے بدن میں سونیاں سی پچھتی محسوس ہوتی تھیں پھر اس نے کلاس کے بعد مجھے اپنے کمرے میں بلانا شروع کر دیا۔ اس کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی چنانچہ وہ مجھے کھنٹوں اپنے پاس بٹھا کر میرے سوالوں کے جواب دیتا رہتا۔ پھر ایک دن اس نے میرے ساتھ دست دراز کی کوشش کی تو میں نے جنگلی بلی کی طرح اس کا چہرہ ٹوچ لیا۔

اور تم سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اس جانب کے لیے بالکل مناسب ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بیٹی کی اچھی تربیت کر سکو گی۔“

پہلے تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری بے عزتی کر رہی ہو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی کیونکہ مجھے ملازمت کی سخت ضرورت تھی تاکہ اپنا گزارہ کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے بھی کچھ پس انداز کر سکوں۔ ساری عمر تو آیا کہ طور پر کام نہیں کر سکتی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ پیسے جمع ہو جائیں تو اپنا بیٹی بار بار اور شینگ سینفر کھول لوں۔ اس طرح ماما کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی اور وہ سکون سے مر سکیں گی۔

سونی نے ایک اچھٹی سی نظر مجھ پر ڈالی اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”فیرن میرے خیالات پڑھ لیتی ہے، اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔“

میں بھی نہیں سمجھتی جو اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تحریر نہ پڑھ سکتی۔ وہ اپنی بیوی کے کندھے پر رکھ کر ہندوق چلا رہا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ چلی نظر میں ہی مجھے پسند کر چکا تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ میں یہ ملازمت قبول کر لوں۔

جیسا کہ پہلے بتا چکی ہوں کہ جیل میں زندگی بہت مشکل سے گزرتی ہے۔ میں ہمیشہ سے ہی پرسکون زندگی گزارنے کی عادی تھی لیکن یہاں اتنا شور ہوتا ہے کہ آدمی دو منٹ کے لیے بھی سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ عورتیں ہر وقت اوجھ چائے رہتی ہیں۔ زور زور سے باتیں کرتا، لڑتا اور چپٹا چلاتا۔ اس پر متزور یہ کہ سارا دن انٹرکام کی کھٹی بھٹی رہتی ہے۔ میری کونھڑی میں ساتھ رہنے والی لڑکی ہر دو ماہ بعد بدل جاتی ہے۔ ان دنوں سوئی نام کی لڑکی میرے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ ہیروئن کی عادی ہے اور جیل اس کے لیے دوسرے گھر جیسی ہے۔ البتہ مجھے ایک بات بہت پسند آئی اور وہ یہ کہ بہت خوش مزاج ہے اور ان عورتوں میں سے نہیں جو بات بات پر لڑنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ رہ کر میں نے بھی خوش ہونا سیکھ لیا ہے، ویسے بھی میرے کون سے بچے ہیں جن کے لیے اداس ہوتی رہوں۔

میں اندازہ ہو گیا کہ وہاں صرف گلاب ہی نہیں بلکہ کانے بھی بکھرے ہوئے تھے۔

فیرن بے حد مزاج عورت تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک اچھٹی۔ مثلاً یہ کہ خالی گلاس لیوگ روم میں کیوں رکھا ہوا ہے۔ ماما یا کی جیکٹ فرش پر کیوں پڑی ہوئی ہے۔ الماری کا دروازہ کیوں کھلا ہوا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس میں کل و برداشت کا مادہ بالکل نہیں تھا اور معمولی معمولی باتوں پر ابھٹتا اس نے اپنا دھیرہ بنالیا تھا۔ سونی جب بھی کام سے واپس آتا، وہ اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتی مثلاً یہ کہ تم کس سے بات کر رہے تھے؟ تم نے سچ کہاں کیا اور تمہارے ساتھ کون تھا؟ میں نے انہیں دوپہر میں دو دفعہ فون کیا لیکن تم اپنی جگہ پر موجود نہیں تھے۔

وہ بچیوں کا حساب کتاب رکھنے کے معاملے میں بھی بہت سخت تھی۔ یہاں تک کہ وہ گرومری کے سامان کی رسیدیں دیکھ کر گھر کی ملازمت اہلچلے سے بحث کرنے لگتی۔ اس کا خیال تھا کہ اہلچلے ضرورت سے زیادہ خریداری کرتی ہے تاکہ وہ ان اشیاء کو اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر سکے جو ایک قریبی کارخانے میں کام کرتے تھے۔

اہلچلے کھانا بنانے کے علاوہ گھر کی صفائی کرتی اور بازار سے سودا سلفا لیا بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ سارا دن کام کے دوران میکینک گانے گاتی رہتی۔ وہ چالیس سال پہلے اس گھر میں سونی کی آیا کے طور پر آئی تھی لیکن تازہ کیرولینا میں اتنا طویل عرصہ قیام کرنے کے باوجود وہ ڈھنگ سے انگریزی نہیں بول سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ماما بھی اس کی دیکھا دیکھی سپانوی زبان بولنے لگی۔ وہ دونوں سارا دن اسی زبان میں باتیں کرتی رہتیں۔ میرے پہلے پچھ بھی نہیں پڑتا۔ ممکن ہے کہ وہ میرے بارے میں بھی باتیں کرتی ہو لیکن میں اس پر تسکون کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے ماما کو بھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ اپنے ہونٹ سختی سے بچھے رکھتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ساری دنیا سے خفا ہے بالخصوص فیرن سے جو زیادہ تر گھر سے باہر رہتی اور اس کا بالکل خیال نہیں رکھتی تھی۔

ایک دن فیرن غصے میں بھری ہوئی میرے پاس آئی اور بولی۔ ”مجھے اس کی بالکل پروا نہیں۔ وہ جہاں مرضی جائے۔ یہ تو مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اپنا بیشتر وقت عورتوں کے ساتھ گزارتا ہے۔ کام کا تو بس بہانہ ہے۔“

میں بھی سونی کی طرف داری کروں گی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ آہستہ سے بولی۔ ”دراصل بات یہ ہے کہ بعض اوقات وہ عورتیں ہی اس کے پیچھے لگ جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ مشکل میں پڑ جاتا ہے۔“

میں نے ہمت کر کے پوچھ لی۔ ”تم یہ سب کچھ کہتے ہوئے بھی اسے برداشت کر رہی ہو؟“

”یہ میری مجبوری ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”سونی کی ساری جائیداد فرسٹ کے پاس ہے اور اس میں سے مجھے اس وقت تک کچھ نہیں مل سکتا جب تک کہ ہماری ٹادی کو دس سال نہ ہو جائیں۔ ابھی چار سال باقی ہیں۔ اب تک مجھے اس سے نفرت کرنے کے باوجود یہ وقت گزارنا ہوگا۔“

حقیقت تو یہ ہے کہ ماما بھی اس سے نفرت کرتی تھی۔ گوکہ زبان سے اس نے بھی اظہار نہیں کیا لیکن فیرن سے بات کرتے وقت اس کے چہرے کے تاثرات سب کچھ عیاں کر دیتے تھے جن کا مقہوم کچھ یوں ہوتا۔ ”تم میری ماں نہیں ہو، میں تم سے نفرت کرتی ہوں، ڈیڈی بھی تم سے نفرت کرتے ہیں۔ تم نے صرف دولت کی خاطر ان سے شادی کی ہے، وغیرہ وغیرہ“ عام طور پر وہ فیرن کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی جیسے وہ گھر میں موجود ہی نہ ہو، یہ کام سونی کا تھا کہ وہ ماما کو بھجواتا اور اس کے دل میں فیرن کے لیے پائی جانے والی نفرت کو کم کر تا لیکن اسے اپنے کام سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا اور رات گئے اس کی واپسی ہوتی لہذا اب یہ میری ذمہ داری تھی کہ ماما کو اپنی ماں کی عزت کرنا سکھاؤں لیکن میں دل سے اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

ماما یا کے بال سیدھے اور گہرے سیاہ تھے لیکن وہ ان کا خیال نہیں رکھتی تھی اور اکثر انہیں پونی ٹیل کی شکل میں اٹھا کرتی جو کہ بالوں کے لیے خشک نہیں تھا۔ اس سے بال ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں نے اسے شیمپو بول دی اور کہا کہ وہ صبح اسکوٹل جانے سے پہلے اس سے اپنا سر دھو یا کرے۔ وہ ہانے کے بعد لباس تبدیل کر کے مجھے نکلتی کرنے کے لیے آئی۔ میں ڈرائر سے اس کے بال خشک کر کے انہیں برش سے سیدھا کرتی مجھے معلوم تھا کہ چند ہی مہینوں میں اپنی گلاس کی لٹریکٹوں میں اس کے بال سب سے زیادہ خوب صورت اور چمکدار ہو جائیں گے۔

تبدیلیوں کے لحاظ سے اس کے کپڑے چھوٹے پڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جیکٹ کی زپ پر مشکل لگائی جبکہ فیرن کا کہنا تھا کہ اس کے پاس کپڑوں کی خریداری کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ مجھے ماما کی حالت پر بڑا ترس آیا اور میں نے اس سے ایک دن پوچھ لی۔ ”تمہاری ماں کہاں ہے؟ کیا تم اس سے پیسے نہیں لے سکتیں؟“

”میری ماں مر چکی ہے۔“ وہ روہائی آواز میں بولی۔ اس کے چہرے پر پچھائی افسردگی دیکھ کر میری ہمت نہ ہوئی کہ اس بارے میں مزید سوالات کرتی۔ میں نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔ دوسرے دن میں اسے اپنے ہمراہ لے کر بازار گئی اور اسے ایک جیکٹ، تین چٹوئیں، چارٹرٹیل اور دو عدد سوئٹر دلوائے۔ ان چیزوں کی خریداری پر میرے کافی پیسے خرچ ہو گئے اور جوتوں کے لیے نمونہ شاپ نہ مل سکی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس بار سونی گھر آئے گا تو اس کے لیے جوتے بھی خریدوں گی۔

”فیرن کو کچھ مت بتانا۔“ وہ خوشی سے چھپکھپاتے ہوئے بولی۔ ”وہ مجھے خوش نہیں دیکھ سکتی اور تم پر بھی ناراض ہوگی کہ میرے اوپر اتنے پیسے کیوں خرچ کیے۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ میں نے اس کے گال پر چپتے مارتے ہوئے کہا، اس کے بعد ہم دونوں میں دوستی ہو گئی۔ میں نے اسے بیٹھو کھانا شروع کر دیا۔ وہ بہت ذہین تھی اور اسے موسیقی سے بھی لگاؤ تھا لہذا بہت تھوڑے عرصے میں وہ بہت اچھا بیٹھو بجانے لگی۔

ہماری زندگی میں بہت کچھ ایسا ہو جاتا ہے جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ نہ جانے کب اور کیسے سونی میرے قریب آ گیا۔ ویسے تو پہلی ملاقات میں اس نے مجھے جن نظروں سے دیکھا تھا، میں ان کا مقہوم سمجھتی تھی پھر جب سونی نے پیش قدمی کی تو میں مزاحمت نہ کر سکی اور ہم چوری چھپے ملنے لگے۔ ماما یا کو اسکوٹل لے جانے اور واپس لانے کی ذمہ داری میری تھی۔ میں اس کی چھٹی سے ایک فوڈ ہگٹا پہلے گھر سے نکل جاتی اور شہر کے شمال میں واقع جنگل کا رخ کرتی۔ وہاں گاڑی کھڑی کر کے میں اس پگڈنڈی پر ہولیتی جو کسی کھیت کی طرف جارہی تھی۔ راستے میں ایک بڑا سادرخت آتا تھا۔ میں اس کے تنے سے ٹپک لگا کر کھڑی ہو جاتی اور گہری گہری سانس لینے لگتی پھر کچھ دیر انتظار کے بعد مجھے اس کی آواز سنائی دیتی۔ ”بے بی، تم کہاں ہو؟“

میں نے مقدمہ شروع ہونے کے بعد یہ آواز پھر بھی نہیں سنی۔

→→→

یہ سلسلہ اچانک ہی ختم ہو گیا۔ جب فیرن کی موت واقع ہوئی تو میں گھر پر موجود نہیں تھی لیکن انجیلا نے اپنے بیان میں میری موجودگی کی تصدیق کر دی۔ حقیقت کچھ اور تھی، اس روز فیرن دوپہر میں کہیں گئی ہوئی تھی لہذا سونی نے موقع غنیمت جانا اور مجھے لے کر کمرے میں بند ہو گیا۔ باہر بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ تیز ہوا اور موسلا دھار بارش کے شور کی وجہ سے ہم فیرن کے کار کی آواز نہ سن سکے اور نہ ہی ہمیں سڑکیوں پر اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ سیدھی کمرے میں آئی اور ہمیں قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر چھتری سے دونوں کو مارنا شروع کر دیا۔ شور کی آواز سن کر انجیلا بھی دوڑی چلی آئی۔ میں اور سونی چادریں لپیٹے اپنے آپ کو فیرن کے حملوں سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ پاگل عورت بری طرح چلا رہی تھی اور انجیلا بھی ہسٹواری زبان میں زور زور سے کچھ کہہ رہی تھی۔ فیرن نے غضب ناک لہجے میں مجھ سے کہا۔ ”بد معاش لڑکی، فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ۔“

شکر ہے کہ اس وقت مار یا اسکول گئی ہوئی تھی۔ میں نے کپڑے پہنے اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ میں مار یا کو خدا حافظ کہتا چاہ رہی تھی مگر فیرن نے اس کی مہلت بھی نہیں دی اور کہا کہ میں فوراً اس کے گھر سے چلی جاؤں۔ تب میں نے مار یا کے نام ایک خط لکھا کہ میں بہت مجبوری کے عالم میں اس سے ملے بغیر جا رہی ہوں وہ ہمیشہ مجھے یاد آتی رہے گی۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کا مستقبل بہت اچھا ہے پھر میں نے اپنا سامان اٹھایا اور بس اسٹاپ کی طرف چل دی۔ میں نے وہاں سے روانہ ہوتے وقت کسی کو خدا حافظ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

→→→

دو سال جیل میں گزارنے کے بعد میں نے اپنی وکیل سے کہا کہ وہ جیل انتظامیہ سے کہہ کر مجھے بیوی شاپ کھولنے کی اجازت دلوادے تاکہ لڑکیاں اپنے بالوں، چہرے اور جسم کی دیکھ بھال پر توجہ دے سکیں تاکہ جیل میں ان کے لیے بنائے گئے بندوبست تھا لیکن وہاں وہ نہ تو اپنے بالوں کو دھو سکتی تھیں اور نہ ہی ان کی تراش خراش پر کوئی توجہ دے سکتی تھیں جس کی وجہ سے ان کے بال روکھے، خشک اور بے ترتیب

ہو گئے تھے۔ جب میں ان کے بال سنواری تو اس دوران میں وہ مجھے اپنی کہانیاں سناتیں۔ ہر ایک کی الگ الگ داستان تھی لیکن کم و بیش سب ہی میری کہانی جیسی تھیں۔ کہانی سنانے کے بعد وہ اپنی ماؤں اور بچوں کو یاد کر کے روتیں لیکن کبھی ان کی زبان پر کسی مرد کا نام نہیں آیا اور نہ ہی انہوں نے بار بار اپنی کہانی دہرانے کی کوشش کی کیونکہ ان میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر وہ فخر کر سکیں، گوکہ میری اپنی کہانی بھی کم درناک نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں ان لوگوں کی کہانیاں سن کر میں افسردہ ہو جاتی۔

→→→

میں نے اپنے بیان میں یہی کہا تھا کہ جب فیرن نے مجھے گھر سے نکل جانے کو کہا تو میں اپنا سامان سمیٹ کر کمرے سے چلی آئی اور بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے لگی۔ میری وکیل نے بہت کوشش کی کہ کوئی ایسا گواہ مل جائے جس نے مجھے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے دیکھا ہو لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ سوموار کے روز اس روٹ پر بسیں نہیں چلتیں لہذا میرے دیکھ لیے جانے کا امکان بہت کم تھا جبکہ میں وہاں بہت دیر سے کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر میں نے فیرن کو وہاں سے گاڑی میں گزرتے ہوئے دیکھا لیکن اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ کچھ دیر بعد وہ مار یا کو اسکول سے واپس لے کر آئی ہر اپنی سیٹ پر بچگی مجھے دیکھ کر اپنا ہاتھ مار رہی تھی۔ میں ایک کھٹے بعد بھی اسی بس اسٹاپ پر کھڑی ہوئی تھی جب ایک ایوبینس وہاں سے گزری۔ میں اس وقت بھی وہاں موجود تھی جب پولیس مجھے گرفتار کرنے آئی۔ یہ ہے وہ کہانی جو میں نے آپ کے سامنے بیان کر دی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انجیلا نے اپنے بیان حلفیہ میں کیا کہا تھا۔

→→→

وکیل کا کہنا تھا کہ سزا کے خلاف اپیل کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہاں پر موجود شیٹوں اور انجیلا کی چشم دید گواہی نے استغاثہ کے کس کو مزید مضبوط کر دیا تھا۔ استغاثہ نے مجھ پر الزام لگایا تھا کہ میں نے اپنے تیز ڈرائنگ پلگ ایک دور تک پھیلے ہوئے تار کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ ڈرائر میں نے فیرن کے بھاری سے بے مذہب میں رکھ دیا۔ اس مکان میں بجلی کی وائرنگ بہت پرانی ہو چکی تھی اور کرنٹ سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں تھا لہذا فیرن جیسے ہی نہانے کے لیے ٹب میں اترتی۔ اسے بجلی کا جھکا لگا اور وہ موٹے پر ہی ہلاک ہو گئی۔ پولیس کو نہ صرف وہاں سے میرا

اور اڑا کر لے گیا بلکہ ہاتھ ب پر میری انگوٹھیں اور فرش پر سے قدموں کے نشان بھی ملے۔ تفتیش کے دوران جب انکوائری نے مجھ سے سوالات کیے تو پولیس اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر میرے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے یا کوئی کام میری اسی کے خلاف ہو تو میں فوری رد عمل ظاہر کرنے کی عادی تھی لہذا میں نے تجویز اخذ کیا کہ میں نے فیرن کو فوری اشتعال کے تحت ہلاک کر دیا کیونکہ اس نے مجھے گھر سے نکل جانے کے لیے کہا تھا۔ میری وکیل کا کہنا تھا کہ میں اقبال جرم کرلوں اور اس کے مجھ پر جنون سوار ہو گیا تھا۔ ایسی صورت میں مجھے کم سزا ملے گی لیکن میں نے اس کی بات نہ مانی اور اقبال جرم کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جیوری نے میرے موقف سے اتفاق نہیں کیا اور مجھے سزا کا مجرم قرار دیتے ہوئے عمر قید کی سزا سنائی دی۔ انہوں نے مجھے پیرول کی رعایت بھی نہیں دی۔

→→→

میرے لیے جیل میں ایک ایک دن گزارنا مشکل اور ہاتھ تھا۔ میری وکیل جب بھی مجھ سے ملنے آتی تو یہی کہتی کہ وہ اس سزا کے خلاف اپیل دائر کرنے کی تیاری کر رہی ہے لیکن اسے کسی ایسے مضبوط ثبوت کی تلاش ہے جس کی بنیاد پر وہ میری سزا ختم کر دے سکے۔ آہستہ آہستہ میں جیل کی زندگی کی عادی ہوتی چلی گئی اور میں نے اپنے آپ کو اس کے معمول کے مطابق ڈھال لیا۔ میں ہر اتوار کو وکیل کے چھوٹے سے گرجا میں بیٹھ جاتی۔ میں نے وہیں رہ کر بپوشن کا کورس بھی لرایا تھا اور وکیل کی کوششوں سے مجھے بیوی پارکھولنے کی اجازت بھی مل گئی تھی جہاں میں قیدی خواتین کے بالوں، چہرے اور جلد کی حفاظت کے لیے نئے نئے آزمائشی دوائی۔ ان کی دیکھا دیکھی جیل کے عمل نے بھی میرے پاس آثار شروع کر دیا تھا۔ خاص طور پر وہ گارڈ تو مجھ پر اتنی مہربان ہوئی کہ کتوں کی طرح بھونکنے کے بجائے اب بڑے پیار سے مجھے ناشتے کے لیے بلاتی کیونکہ میں نے اپنے من کا اظہار کرتے ہوئے اس کے چہرے کے اضافی بال صاف کر دیے تھے۔ اس کا نام اٹھا تھا اور صرف اڑیس سال کی عمر میں ہی وہ نانی بن چکی تھی۔ وہ ہر وقت اس لڑکے کو کوئی رتی باری اس کی بیٹی کو گناہ سال کی عمر میں ہی ماں کے رتے پر فاقہ کر کے خود نہیں غائب ہو گیا تھا۔ اسے گانے کا بھی بہت شوق تھا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اگر جیل میں موسیقی کے دو تین رگدادہ اور مل جائیں تو ہم اپنا بیڑ قائم کر سکتے ہیں۔ شب اور دن کو ہی گزرتا رہتا تھا اور میں نہیں جانتی تھی کہ آنے والے دنوں میں کون سی بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔

→→→

وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور مجھے جیل میں رہتے ہوئے چھ برس بیت گئے۔ میری رہائی کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی تھیں اور وکیل بھی مایوس ہو چکی تھی لیکن اس نے مجھ سے ملنا ترک نہیں کیا تھا اور گارے بگاڑے خبر گیری کے لیے آتی رہتی تھی پھر ایک دن وہ دھماکا ہوا جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ میں اس خوش گوار صبح کو کبھی نہیں بھول پاؤں گی جب مجھے ڈاک سے ایک خط موصول ہوا۔ میں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بھیجے والے کا نام دیکھ کر چونک گئی، وہ خط انجیلا نے لکھا تھا۔

”پیاری لڑکی!“

شاید میں بھی یہ خط نہیں لکھتی لیکن ضمیر کی خلش نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھ سے ایک عظیم غلطی سرزد ہوئی تھی اور وہ یہ کہ میں نے تم پر فیرن کے قتل کا الزام عائد کیا جبکہ میں جانتی تھی کہ تم بے قصور ہو۔ میں نے ایسا کیوں کیا۔ شاید اس کا جواب بھی نہ دے سکوں بس یوں سمجھ لو کہ میں بھی مجبور ہوئی تھی۔ میں گناہ کے اس بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی ہوں۔ جانتی ہوں کہ اب چند دن کی مہمان ہوں۔ اس لیے مرنے سے پہلے اس بوجھ سے آزاد ہونا چاہتی ہوں۔ میں نے باور دی کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا ہے اور اس نے مجھے یہی نصیحت کی ہے کہ جو بچ ہے وہ دنیا کو بتا دوں لہذا میں اس خط کے ذریعے یہ اعتراف کر رہی ہوں کہ میں نے اس وقت جھوٹ بولا تھا۔ تم نے فیرن کو قتل نہیں کیا۔ خدا مجھے معاف کرے۔

بد نصیب انجیلا۔“

میں یہ خط پڑھ کر حیران رہ گئی۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ فیرن کو کس نے قتل کیا ہوگا؟ انجیلا نے لکھا تھا کہ وہ مجبور ہوئی تھی۔ آخر کیوں؟ اسے کیا مجبوری تھی؟ کیا وہ کسی کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی میری سوچ کا دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ذہن کے پردے پر ایک نام ابھرا تو میں نے فوراً ہی سوچ پر پھرا بٹھالیا۔ دیواروں کے کمرے میں کان ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کمزور لمحے میں وہ نام میری زبان پر آجائے اور انجیلا نے جس کو بچانے کی کوشش کی تھی، وہ میری کسی حماقت سے راگناں جاکتی تھی۔ میں نے احتیاط سے وہ لفافہ اپنے پاس محفوظ کر لیا اور وکیل کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

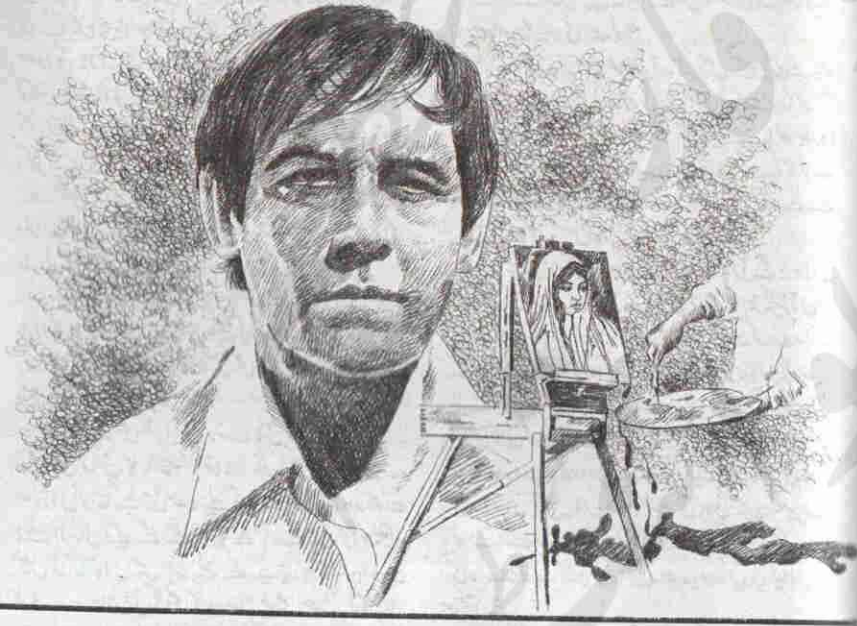
→→→

وکیل نے وہ خط پڑھا تو اس کی آنکھوں میں امید کے

ادھوری تصویر

ایم اے راحت

دنیا کا دستور بھی نرالا ہے... جہاں وجود کے بجائے پرچھائی میں لوگ زندگی تلاش کرتے ہیں... جہاں عکس کی سرگوشی تو سن لیتے ہیں مگر دل کی دھڑکن کسی کو سنائی نہیں دیتی... جہاں بے جان تصویر انمول ہوتی اور جیتی جاگتی زندگی بھکار بن کر جگہ جگہ دستک دینے پر مجبور ہو جاتی ہے... ایسے میں اگر دلوں پر قیامتیں نہ گزریں تو کیا ہو؟



ایک باکمال مصور... ایک ادھوری زندگی اور مکمل شاہکار

کوئی ایسی تخلیق، کوئی ایسا شاہکار جو ہمیشہ کی طرح ہاپل بچا دے۔ ایک بار پھر ثابت ہو جائے کہ میرزا اپنے فن میں منفرد ہے۔ فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والوں کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اس

نمائش میں حصہ لے گا۔ اور جب مصوروں کی فہرست شائع ہوئی تو فن شناسوں نے رائے دے دی کہ میرزا کا مقابلہ مشکل ہے۔ ہمیشہ ایسا ہوا تھا۔ ملک بھر کے مصور بار بار اس کے مقابل آچکے تھے لیکن اس جیسی سوچ، جدت اور اس کا سا

سراٹھا کر چل سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کی کار ایک شاندار عمارت کے پاس جا کر رکی۔ وہ ایک کھلی پر فضا جگہ تھی۔ وکیل نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور ہم درختوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے مرکزی عمارت کی جانب بڑھنے لگے۔ فینس کورٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے وکیل بولی۔ ”یہاں سونگ پول اور فینس سینئر بھی ہے۔“ پھر ہم بیڑھیاں چڑھتے ہوئے پہلی منزل پر گئے۔ ایک اپارٹمنٹ کے دروازے پر رک کر اس نے جیب سے چابی نکالی اور مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ”اب تم یہاں رہو گی۔“

میں نے نقل میں چابی گھا کر دروازہ کھولا اور اس عالی شان اپارٹمنٹ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ”اس اپارٹمنٹ کا ایک سال کا کرایہ بیٹنگی ادا کیا جا چکا ہے اور تمہارے اکاؤنٹ میں بھی گزارے کے لیے ایک معقول رقم جمع کرا دی گئی ہے۔“ اس نے مجھے ایک چیک بک پکارتے ہوئے کہا۔ ”البتہ بینک کے اکاؤنٹ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ مہربانی کس نے کی ہے، شاید وہ سامنے آتا نہیں چاہتا۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جو مجھ پر اتنا مہربان ہے لیکن مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ کون ہے۔ فی الحال مجھے ایک ٹھکانا میرا آگیا تھا۔ میں وکیل کے جانے کے بعد خوشی اور سرت کے عالم میں پورے اپارٹمنٹ میں گھوم کر اس کا جائزہ لیتی رہی۔ الماریاں اور درازیں کھول کر دیکھیں۔ بالکنی میں گئی جہاں خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ پھر میں نے ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر دیکھا تو خوشی کے مارے میرے حلق سے بچ نکلی۔ وہاں ایک بڑا سا سفید بے موجود تھا جس میں نہانے کے لیے تین سات سال سے ترس رہی تھی۔ میں نے کپڑے اتار کر بے غلط لگایا اور گرم پانی کا شاور کھول دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے جیل میں گزارے ہوئے ہر لمحے کی تلخ یاد بھاپ بن کر آ رہی ہو۔ میں اپنے آپ کو بے حد یرسکون محسوس کرنے لگی۔ اب میرے کان دروازے پر کوئی آہٹ سننے کے منتظر تھے۔ میں جانتی تھی کہ گناہ مہربان زیادہ دیر مجھ سے دو رہیں رہ سکتا پھر مجھے ہاتھ روم کے دروازے کے باہر اس کی سرگوشی سنائی دی۔ ”بی بی۔ تم کہاں ہو؟“ آپ مجھے گھس گھس گئے کہ میرا اشارہ کس کی جانب ہے لیکن میں اپنی زبان پر اس کا نام نہیں لاسکتی کیونکہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

چراغ روشن ہو گئے۔ وہ خوشی سے لہراتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ابھی کسی ثبوت کی تلاش تھی، میں کل ہی اہل دائرہ کر دوں گی۔“

”ہاں۔ تمہیں یہ کام فوراً کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ عورت مر جائے۔“ میں نے پر جوش اعزاز میں کہا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ میری رہائی کے لیے یہ ثبوت کافی ہے؟“

”میرے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔“ وہ رکھائی سے بولی۔ ”اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔ میں تو وہی چاہوں گی جو تمہارے حق میں بہتر ہو۔“

”کیس کا فیصلہ ہونے میں کتنا وقت لگ سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور بولی۔ ”کم از کم چھ ماہ یا ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ وقت لگ جائے۔“

”کوئی بات نہیں۔ کم از کم یہ اس سے تو بہتر ہوگا کہ میں جیل کے بغیر ہی ساری زندگی اس جیل میں گزار دوں۔“

”میں کوشش کروں گی کہ تم جلد از جلد رہا ہو جاؤ۔“ وہ مجھے تسلی دے کر چلی گئی۔

اہل کا فیصلہ ہونے میں گیارہ ماہ لگ گئے۔ جیوری نے مجھے باعزت طور پر بری کرتے ہوئے پولیس کو ہدایت کی کہ اصل قاتل کو گرفتار کر کے دوبارہ چالان عدالت میں پیش کیا جائے۔ میں جیوری کے ارکان سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ ایک جھوٹی گواہی کی بنیاد پر مجھے عمر قید کی سزا سنائی گئی اور میری زندگی کے چھ قیمتی سال جیل کی نذر ہو گئے۔ اس کے علاوہ جو ذلت اور رسوائی میرے جسے میں آئی اس کی تلخی کیسے ہوئی لیکن میں بے سبب نہ کہہ سکتی کیونکہ سانپ لکل چکا تھا۔ اب لکیر پٹنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ مجھے وکیل نے بتا دیا تھا کہ انجیلا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

میں نے اپنا سوٹ کیس اور بیجو اٹھا لیا اور جیل کی چار دیواری سے باہر آ گئی۔ مرکزی دروازے پر وکیل میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنی کار میں بٹھا لیا اور اخبارات کا ایک پلندا میری گود میں ڈال دیا۔ تقریباً سبھی اخباروں میں میری تصویر کے ساتھ رہائی کی خبر شائع ہوئی تھی اور سب نے کم و بیش ایک جیسی سرفرازی لکھی تھی۔ ”بے گناہ عورت قتل کے الزام سے بری۔“ مجھے ان خبروں کو پڑھ کر تھوڑا سا سکون ملا۔ میری بے گناہی ثابت ہو گئی تھی۔ اب میں معاشرے میں

خیال نہ لاسکے۔

وہ مصروف طرقت تھا۔ زندگی کی حقیقتوں کا عکاس، رنگ اور برش اس کے ہاتھوں میں آکر گویا تپیں کرتے تھے، رنگ اپنی جگہ کا حسین خود کردیتے، لکیریں اپنی تپیں بناتیں اور وہ ان کی مدد سے شاہکار تخلیق کرتا چلا جاتا اور جب یہ شاہکار منظر عام پر آتے تو فن شناس سر دھن لیتے تھے۔ دیکھنے والوں کے ٹھٹھک جاتے تھے۔ ملک سے باہر بھی کئی بار اس کی تصویریں کی کامیاب نمائش ہو چکی تھی۔

مرزا شمشیر بیگ ساری والے ہر چند کہ فن مصوری کی اجہ سے بھی واقف نہیں تھے لیکن اگھوتے بیٹے کے شوق کو انہوں نے بھی بڑھا دیا تھا۔ ہر طرح اس سے تعاون کرتے۔ نورولاز کا ایک علیحدہ حصہ اس کی خواہش کے مطابق تعمیر کرایا گیا تھا۔ جہاں اس کا نگار خانہ تھا جو وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے قرب و جوار کی جگہ کو ایک مصوری کی نازک خیالیوں کا نمونہ بنایا گیا تھا۔ عام کیا خاص لوگوں کی بھی اس نگار خانے تک رسائی نہیں تھی۔ نورولاز خود بھی ایک عالی شان عمارت تھی اور مرزا شمشیر بیگ کے شاسا اکثر اسے لے لے اور غیر ملکی دوستوں کو یہاں کی سیر ضرور کرتے تھے۔ لیکن خود مرزا صاحب بھی کسی سے اس نگار خانے کو دکھانے کا وعدہ نہیں کر سکتے تھے۔ معیر شاڈو نادر ہی کسی کو نگار خانے میں داخل ہونے کی اجازت دیتا تھا۔

درحقیقت وہ ایک بالکل مصور تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا اور پھر رنگ اور برش کے ملاپ سے کسی بھی خیال کو زندہ کر لیتا اس کے لیے کوئی مشکل امر نہیں تھا۔

اس بار بھی کلر اینڈ آرٹس نامی ایک سوسائٹی نے تصاویر کی نمائش کا انعقاد کیا تھا اور ملک میں بڑے بڑے مصوروں کو مقابلے میں حصہ لینے کی دعوت دی تھی اور دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے۔ معیر کے بارے میں کسی کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوگا لیکن اس کی طرف سے اطلاع مل گئی تھی کہ وہ مقابلے میں حصہ لے گا۔ پھر حصہ لینے والے مصوروں کے ناموں کی فہرست شائع ہوئی تو بہت سے چراغ بجھ گئے اور فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والے نمائش کی تاریخ کا انتظار کرنے لگے۔

معیر نے پھر ایک ڈے داری قبول کر لی تھی اور ان دنوں وہ کسی اچھوتے خیال کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس کی خوبصورت کارسزوں، بازاروں اور دروازوں میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پارہا تھا کہ اس بار کس خیال کو موضوع

بنائے۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی تخلیق، کوئی ایسی چیز ہو جو پلچل مچا دے۔

پھر اسے اس کا خیال مل گیا۔ اس کی لمبی کارایک سنگل پر رکی تھی۔ سامنے والی کارکی کھڑکی سے ایک بھکارن نے ہاتھ اندر ڈالا اور جواب ملنے پر باؤی سے گردن جھکا کر آگے بڑھ گئی۔ اس بار وہ معیر کے پاس آئی تھی۔ بوسیدہ، میلا پھیلا لباس، پوندنگ ہوا۔ مٹی سے اٹنے ہوئے بال، دبلا پتلا بدن، سونکا چہرہ لیکن حسین ترین نقوش۔ ستوں ناک، پستے سنے ہونٹ جن پر اگر خشک پڑیاں نہ جھی ہوتیں تو ان کا یہ گلابی رنگ نمایاں ہوتا۔ سفید رنگ جسے گرد اور دھوپ نے مائل کر دیا تھا۔

گھر سے گھر سے سانس لیتی ہوئی وہ معیر کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ اس کے دہلے پستے ہاتھوں کی غزری انگلیاں معیر کے سامنے پھیل گئیں۔ معیر نے ان آنکھوں کے سوالات کو پڑھا اور پھر جلدی سے بولا۔

”سنگل کے اس طرف آ جاؤ۔ میں تمہیں بہت کچھ دوں گا۔ فکر مت کرو، کوئی بدگیری نہیں ہوگی تمہارے ساتھ۔“ اس کی آنکھوں میں شبہات ابھر آئے۔ ہاتھ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ معیر نے جب سے پیچاس روپے کا نوٹ نکالا اور اس کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ”ایسے بہت سے نوٹ مل سکتے ہیں تمہیں، اس طرف آ جاؤ۔“

سنگل کی روشنی بڑھ گئی اور اس نے کار آگے بڑھا دی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے بائیں طرف کا انڈیکسٹر آن کر دیا تھا۔ کار کو آہستہ آہستہ اس نے بائیں سمت کر کے سڑک کے کنارے روک دیا اور عقب نما آئینے میں بھکارن کو تلاش کرنے لگا۔ وہ آئینے میں نظر نہ آئی تو اس نے کھڑکی سے گردن نکال کر پیچھے دیکھا۔

چوراہے کے دوسری جانب وہ ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں اس کار کی سمت لگی ہوئی تھیں۔ معیر نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا اور انتظار کرنے لگا لیکن وہ جھجک رہی تھی۔ بے وقوف نہیں کی، اس سے زیادہ اس کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔

معیر کو جھجکا ہٹ ہونے لگی۔

ایک بار پھر اس نے جھلائے ہوئے انداز میں ہاتھ پلایا اور وہ اس طرح آگے بڑھنے لگی جیسے اسے پیچھے سے کوئی دھکیل رہا ہو۔ نہ جانے کون سا خیال اسے دھکیل رہا تھا۔ جب وہ سڑک عبور کرنے لگی تو معیر کو کسی قدر سکون ہوا اور چند لمحات کے بعد وہ معیر کے پاس آ گئی۔ وہ اب بھی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

”خدا اسلامت رکھے بابو جی! اللہ کے نام پر.....“

”خیرے کیوں دکھا رہی تھی تو؟“ معیر بولا۔

”خدا خوش رکھے بابو جی! اللہ کے نام پر۔ جمہرات ہے۔“ اس نے پھر کہا۔ معیر کی بات کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

”اچھا جمہرات ہے آج..... اس اطلاع کا شکریہ۔“

”خوشبو، بابو جی کچھ اللہ.....“

”ہاں..... ہاں..... ایک ہی رٹ مت لگا۔ یہ بتا تو سو روپے روز پر کام کرے گی؟ دو سو روپے روز بھی مل سکتے ہیں، جواب دے۔“

”نہیں بابو جی، ہم عزت نہیں بیچتے۔ اللہ کے نام پر کچھ دے سکتے ہو تو دو۔“

”بے وقوف ہے تو..... تجھ سے عزت کون مانگ رہا ہے۔ میں مصور ہوں۔ تیری تصویر بنانا چاہتا ہوں، تصویر کھجکتی ہے؟“

”ہاں، بابو جی!“

”بس! میں تیری تصویر بناؤں گا۔ روزانہ دو گھنٹے کے لیے تجھے میرے پاس آنا پڑے گا۔ کم از کم ایک ہفتے کا یہ کام ہے، دو سو روپے روز دوں گا تجھے، بول منظور ہے؟“

”نہیں بابو جی، دے دو کچھ اللہ کے نام پر۔“

”جہنم میں جا۔ تیرا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔“

ضرورت سے زیادہ پار سامن رہی ہے۔ دیکھتے پھر دوسرا، میں صرف تیری تصویر بناؤں گا۔ ایسی تصویر کہ تو دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی۔ جس جگہ تجھے آنا پڑے گا وہ میرا گھر ہے، وہاں میری ماں ہے، بہنیں ہیں، بہت سے لوگ ہیں وہاں۔ تو ایک مرتبہ میری بات مان لے۔ اگر کوئی پریشانی ہو تجھے تو آئندہ مت آنا۔“

معیر کو اس کے انکار سے سخت جھجکا ہٹ ہو رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ میں کیوں نہیں مان جاتی۔ بھکارن کچھ سوچنے لگی، پھر بولی۔

”ہم مان جائیں گے بابو جی! پر ایک بات سن لو۔“

”ہاں کجی۔“ معیر خوش ہو کر بولا۔

”ہمیں سانس کا مرض ہے اور..... اور.....“

”ہے۔ سردیوں میں سانس اکھڑتا ہے اور گرمیوں میں منہ سے خون آتا ہے، یہ بچوت کی بیماری ہے۔ ہمیں چھوٹے تو خود بھی نقصان اٹھاؤ گے۔“

”میں صرف تیری تصویر بناؤں گا اور تصویر بنانے کے لیے کسی کو چھوٹا نہیں پڑتا۔ کبھی تو؟“

”ٹھیک ہے، کہاں ہے تیرا گھر؟“

”ہٹھ جا پیچھے، چل پیچھے جا۔“ معیر نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ بھکارن کھجکتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔ پیچھے ایک دکان میں بیٹھ ہوئے دو تین لڑکوں نے آوازیں لگائیں۔

”ابے کیا کھٹیا ٹیٹ ہے، کوئی ڈھنگ کی ٹوٹی نہیں ملی تھی؟“

”معیر نے سنی ان کی کردی اور کار آگے بڑھا دی۔ دکان پر بیٹھ لڑکے اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بول پڑی۔ ”سن لیا تم نے بابو جی؟“

”ذیل تھے، آوارہ کہیں کے؟“

”ہمارا یہ کھٹا تو آج چھن گیا بابو جی۔“

”کیوں؟“ وہ سڑک پر دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب اگر ادھر بھیک مانگنے آئیں گے تو یہ لڑکے ناک میں دم کر دیں گے۔“

”ہوں..... تو کہیں اور نکل جانا۔ شہر چھوٹا تو نہیں ہے۔“ معیر نے کہا اور وہ خاموشی سی بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی سی۔

”معیر نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

وہ نورولاز کے قبضی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ عموماً اسی طرف سے آتا تھا۔ عجبی پورج میں اس نے کار روکی اور نیچے اتر آیا۔

”آ جا.....“ اس نے بھکارن کے لیے دروازہ کھول دیا اور وہ نیچے اتر آئی۔ اس کا چہرہ کچھ اورست گیا تھا۔ وہ کچھ اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی لیکن معیر کے ساتھ وہ آگے بڑھتی رہی اور اس نگار خانے میں داخل ہوئی جہاں اچھے اچھے لوگ قدم نہیں رکھ پاتے تھے۔

چاروں طرف حسین تصاویر آویزاں تھیں۔ ہر شے قابل حیرت، بھکارن کی زبان بند ہو گئی۔ سب سے کدہ روئے زمین پر تھا لیکن اس کا تصور بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر جب اسے ہوش آیا، تو اس کے بدن میں خوف کی لرزش پیدا ہو گئی۔

”تم نے بولا تھا بابو جی! تمہاری ماں اور بہن.....؟“

اس نے کبھی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا کرتا ہے، تجھے ان لوگوں کا۔ خاموشی سے اس جگہ بیٹھ جا۔“ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ سڑکوں کی بات اور بھی اور وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن یہ اس کا نگار خانہ تھا اور وہ یہاں کا شہنشاہ تھا۔ اس کی سلطنت میں کوئی اس سے برتر نہیں تھا۔ بھکارن کبھی بھی سی بیٹھ گئی۔ وہ آنے

لے کسی کو چھوٹا نہیں پڑتا۔ کبھی تو؟“

”ٹھیک ہے، کہاں ہے تیرا گھر؟“

”ہٹھ جا پیچھے، چل پیچھے جا۔“ معیر نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ بھکارن کھجکتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔ پیچھے ایک دکان میں بیٹھ ہوئے دو تین لڑکوں نے آوازیں لگائیں۔

”ابے کیا کھٹیا ٹیٹ ہے، کوئی ڈھنگ کی ٹوٹی نہیں ملی تھی؟“

”معیر نے سنی ان کی کردی اور کار آگے بڑھا دی۔ دکان پر بیٹھ لڑکے اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بول پڑی۔ ”سن لیا تم نے بابو جی؟“

”ذیل تھے، آوارہ کہیں کے؟“

”ہمارا یہ کھٹا تو آج چھن گیا بابو جی۔“

”کیوں؟“ وہ سڑک پر دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب اگر ادھر بھیک مانگنے آئیں گے تو یہ لڑکے ناک میں دم کر دیں گے۔“

”ہوں..... تو کہیں اور نکل جانا۔ شہر چھوٹا تو نہیں ہے۔“ معیر نے کہا اور وہ خاموشی سی بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی سی۔

”معیر نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

وہ نورولاز کے قبضی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ عموماً اسی طرف سے آتا تھا۔ عجبی پورج میں اس نے کار روکی اور نیچے اتر آیا۔

”آ جا.....“ اس نے بھکارن کے لیے دروازہ کھول دیا اور وہ نیچے اتر آئی۔ اس کا چہرہ کچھ اورست گیا تھا۔ وہ کچھ اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی لیکن معیر کے ساتھ وہ آگے بڑھتی رہی اور اس نگار خانے میں داخل ہوئی جہاں اچھے اچھے لوگ قدم نہیں رکھ پاتے تھے۔

چاروں طرف حسین تصاویر آویزاں تھیں۔ ہر شے قابل حیرت، بھکارن کی زبان بند ہو گئی۔ سب سے کدہ روئے زمین پر تھا لیکن اس کا تصور بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر جب اسے ہوش آیا، تو اس کے بدن میں خوف کی لرزش پیدا ہو گئی۔

”تم نے بولا تھا بابو جی! تمہاری ماں اور بہن.....؟“

اس نے کبھی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا کرتا ہے، تجھے ان لوگوں کا۔ خاموشی سے اس جگہ بیٹھ جا۔“ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ سڑکوں کی بات اور بھی اور وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن یہ اس کا نگار خانہ تھا اور وہ یہاں کا شہنشاہ تھا۔ اس کی سلطنت میں کوئی اس سے برتر نہیں تھا۔ بھکارن کبھی بھی سی بیٹھ گئی۔ وہ آنے

لے کسی کو چھوٹا نہیں پڑتا۔ کبھی تو؟“

”ٹھیک ہے، کہاں ہے تیرا گھر؟“

”ہٹھ جا پیچھے، چل پیچھے جا۔“ معیر نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ بھکارن کھجکتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔ پیچھے ایک دکان میں بیٹھ ہوئے دو تین لڑکوں نے آوازیں لگائیں۔

”ابے کیا کھٹیا ٹیٹ ہے، کوئی ڈھنگ کی ٹوٹی نہیں ملی تھی؟“

”معیر نے سنی ان کی کردی اور کار آگے بڑھا دی۔ دکان پر بیٹھ لڑکے اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بول پڑی۔ ”سن لیا تم نے بابو جی؟“

”ذیل تھے، آوارہ کہیں کے؟“

”ہمارا یہ کھٹا تو آج چھن گیا بابو جی۔“

”کیوں؟“ وہ سڑک پر دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب اگر ادھر بھیک مانگنے آئیں گے تو یہ لڑکے ناک میں دم کر دیں گے۔“

”ہوں..... تو کہیں اور نکل جانا۔ شہر چھوٹا تو نہیں ہے۔“ معیر نے کہا اور وہ خاموشی سی بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی سی۔

”معیر نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

وہ نورولاز کے قبضی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ عموماً اسی طرف سے آتا تھا۔ عجبی پورج میں اس نے کار روکی اور نیچے اتر آیا۔

”آ جا.....“ اس نے بھکارن کے لیے دروازہ کھول دیا اور وہ نیچے اتر آئی۔ اس کا چہرہ کچھ اورست گیا تھا۔ وہ کچھ اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی لیکن معیر کے ساتھ وہ آگے بڑھتی رہی اور اس نگار خانے میں داخل ہوئی جہاں اچھے اچھے لوگ قدم نہیں رکھ پاتے تھے۔

چاروں طرف حسین تصاویر آویزاں تھیں۔ ہر شے قابل حیرت، بھکارن کی زبان بند ہو گئی۔ سب سے کدہ روئے زمین پر تھا لیکن اس کا تصور بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر جب اسے ہوش آیا، تو اس کے بدن میں خوف کی لرزش پیدا ہو گئی۔

”تم نے بولا تھا بابو جی! تمہاری ماں اور بہن.....؟“

اس نے کبھی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا کرتا ہے، تجھے ان لوگوں کا۔ خاموشی سے اس جگہ بیٹھ جا۔“ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ سڑکوں کی بات اور بھی اور وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن یہ اس کا نگار خانہ تھا اور وہ یہاں کا شہنشاہ تھا۔ اس کی سلطنت میں کوئی اس سے برتر نہیں تھا۔ بھکارن کبھی بھی سی بیٹھ گئی۔ وہ آنے

لے کسی کو چھوٹا نہیں پڑتا۔ کبھی تو؟“

”ٹھیک ہے، کہاں ہے تیرا گھر؟“

”ہٹھ جا پیچھے، چل پیچھے جا۔“ معیر نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ بھکارن کھجکتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔ پیچھے ایک دکان میں بیٹھ ہوئے دو تین لڑکوں نے آوازیں لگائیں۔

”ابے کیا کھٹیا ٹیٹ ہے، کوئی ڈھنگ کی ٹوٹی نہیں ملی تھی؟“

”معیر نے سنی ان کی کردی اور کار آگے بڑھا دی۔ دکان پر بیٹھ لڑکے اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بول پڑی۔ ”سن لیا تم نے بابو جی؟“

”ذیل تھے، آوارہ کہیں کے؟“

”ہمارا یہ کھٹا تو آج چھن گیا بابو جی۔“

”کیوں؟“ وہ سڑک پر دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب اگر ادھر بھیک مانگنے آئیں گے تو یہ لڑکے ناک میں دم کر دیں گے۔“

”ہوں..... تو کہیں اور نکل جانا۔ شہر چھوٹا تو نہیں ہے۔“ معیر نے کہا اور وہ خاموشی سی بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی سی۔

”معیر نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

وہ نورولاز کے قبضی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ عموماً اسی طرف سے آتا تھا۔ عجبی پورج میں اس نے کار روکی اور نیچے اتر آیا۔

”آ جا.....“ اس نے بھکارن کے لیے دروازہ کھول دیا اور وہ نیچے اتر آئی۔ اس کا چہرہ کچھ اورست گیا تھا۔ وہ کچھ اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی لیکن معیر کے ساتھ وہ آگے بڑھتی رہی اور اس نگار خانے میں داخل ہوئی جہاں اچھے اچھے لوگ قدم نہیں رکھ پاتے تھے۔

چاروں طرف حسین تصاویر آویزاں تھیں۔ ہر شے قابل حیرت، بھکارن کی زبان بند ہو گئی۔ سب سے کدہ روئے زمین پر تھا لیکن اس کا تصور بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر جب اسے ہوش آیا، تو اس کے بدن میں خوف کی لرزش پیدا ہو گئی۔

”تم نے بولا تھا بابو جی! تمہاری ماں اور بہن.....؟“

اس نے کبھی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا کرتا ہے، تجھے ان لوگوں کا۔ خاموشی سے اس جگہ بیٹھ جا۔“ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ سڑکوں کی بات اور بھی اور وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن یہ اس کا نگار خانہ تھا اور وہ یہاں کا شہنشاہ تھا۔ اس کی سلطنت میں کوئی اس سے برتر نہیں تھا۔ بھکارن کبھی بھی سی بیٹھ گئی۔ وہ آنے

لے کسی کو چھوٹا نہیں پڑتا۔ کبھی تو؟“

”ٹھیک ہے، کہاں ہے تیرا گھر؟“

”ہٹھ جا پیچھے، چل پیچھے جا۔“ معیر نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ بھکارن کھجکتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔ پیچھے ایک دکان میں بیٹھ ہوئے دو تین لڑکوں نے آوازیں لگائیں۔

”ابے کیا کھٹیا ٹیٹ ہے، کوئی ڈھنگ کی ٹوٹی نہیں ملی تھی؟“

”معیر نے سنی ان کی کردی اور کار آگے بڑھا دی۔ دکان پر بیٹھ لڑکے اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بول پڑی۔ ”سن لیا تم نے بابو جی؟“

”ذیل تھے، آوارہ کہیں کے؟“

”ہمارا یہ کھٹا تو آج چھن گیا بابو جی۔“

”کیوں؟“ وہ سڑک پر دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب اگر ادھر بھیک مانگنے آئیں گے تو یہ لڑکے ناک میں دم کر دیں گے۔“

”ہوں..... تو کہیں اور نکل جانا۔ شہر چھوٹا تو نہیں ہے۔“ معیر نے کہا اور وہ خاموشی سی بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی سی۔

”معیر نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

وہ نورولاز کے قبضی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ عموماً اسی طرف سے آتا تھا۔ عجبی پورج میں اس نے کار روکی اور نیچے اتر آیا۔

”آ جا.....“ اس نے بھکارن کے لیے دروازہ کھول دیا اور وہ نیچے اتر آئی۔ اس کا چہرہ کچھ اورست گیا تھا۔ وہ کچھ اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی لیکن معیر کے ساتھ وہ آگے بڑھتی رہی اور اس نگار خانے میں داخل ہوئی جہاں اچھے اچھے لوگ قدم نہیں رکھ پاتے تھے۔

چاروں طرف حسین تصاویر آویزاں تھیں۔ ہر شے قابل حیرت، بھکارن کی زبان بند ہو گئی۔ سب سے کدہ روئے زمین پر تھا لیکن اس کا تصور بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر جب اسے ہوش آیا، تو اس کے بدن میں خوف کی لرزش پیدا ہو گئی۔

”تم نے بولا تھا بابو جی! تمہاری ماں اور بہن.....؟“

اس نے کبھی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا کرتا ہے، تجھے ان لوگوں کا۔ خاموشی سے اس جگہ بیٹھ جا۔“ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ سڑکوں کی بات اور بھی اور وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن یہ اس کا نگار خانہ تھا اور وہ یہاں کا شہنشاہ تھا۔ اس کی سلطنت میں کوئی اس سے برتر نہیں تھا۔ بھکارن کبھی بھی سی بیٹھ گئی۔ وہ آنے

لے کسی کو چھوٹا نہیں پڑتا۔ کبھی تو؟“

”ٹھیک ہے، کہاں ہے تیرا گھر؟“

”ہٹھ جا پیچھے، چل پیچھے جا۔“ معیر نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ بھکارن کھجکتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔ پیچھے ایک دکان میں بیٹھ ہوئے دو تین لڑکوں نے آوازیں لگائیں۔

”ابے کیا کھٹیا ٹیٹ ہے، کوئی ڈھنگ کی ٹوٹی نہیں ملی تھی؟“

”معیر نے سنی ان کی کردی اور کار آگے بڑھا دی۔ دکان پر بیٹھ لڑکے اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بول پڑی۔ ”سن لیا تم نے بابو جی؟“

”ذیل تھے، آوارہ کہیں کے؟“

”ہمارا یہ کھٹا تو آج چھن گیا بابو جی۔“

”کیوں؟“ وہ سڑک پر دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب اگر ادھر بھیک مانگنے آئیں گے تو یہ لڑکے ناک میں دم کر دیں گے۔“

”ہوں..... تو کہیں اور نکل جانا۔ شہر چھوٹا تو نہیں ہے۔“ معیر نے کہا اور وہ خاموشی سی بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی سی۔

”معیر نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

وہ نورولاز کے قبضی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ عموماً اسی طرف سے آتا تھا۔ عجبی پورج میں اس نے کار روکی اور نیچے اتر آیا۔

”آ جا.....“ اس نے بھکارن کے لیے دروازہ کھول دیا اور وہ نیچے اتر آئی۔ اس کا چہرہ کچھ اورست گیا تھا۔ وہ کچھ اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی لیکن معیر کے ساتھ وہ آگے بڑھتی رہی اور اس نگار خانے میں داخل ہوئی جہاں اچھے اچھے لوگ قدم نہیں رکھ پاتے تھے۔

چاروں طرف حسین تصاویر آویزاں تھیں۔ ہر شے قابل حیرت، بھکارن کی زبان بند ہو گئی۔ سب سے کدہ روئے زمین پر تھا لیکن اس کا تصور بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر جب اسے ہوش آیا، تو اس کے بدن میں خوف کی لرزش پیدا ہو گئی۔

”تم نے بولا تھا بابو جی! تمہاری ماں اور بہن.....؟“

اس نے کبھی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا کرتا ہے، تجھے ان لوگوں کا۔ خاموشی سے اس جگہ بیٹھ جا۔“ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ سڑکوں کی بات اور بھی اور وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن یہ اس کا نگار خانہ تھا اور وہ یہاں کا شہنشاہ تھا۔ اس کی سلطنت میں کوئی اس سے برتر نہیں تھا۔ بھکارن کبھی بھی سی بیٹھ گئی۔ وہ آنے

لے کسی کو چھوٹا نہیں پڑتا۔ کبھی تو؟“

”ٹھیک ہے، کہاں ہے تیرا گھر؟“

”ہٹھ جا پیچھے، چل پیچھے جا۔“ معیر نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ بھکارن کھجکتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔ پیچھے ایک دکان میں بیٹھ ہوئے دو تین لڑکوں نے آوازیں لگائیں۔

”ابے کیا کھٹیا ٹیٹ ہے، کوئی ڈھنگ کی ٹوٹی نہیں ملی تھی؟“

”معیر نے سنی ان کی کردی اور کار آگے بڑھا دی۔ دکان پر بیٹھ لڑکے اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بول پڑی۔ ”سن لیا تم نے بابو جی؟“

”ذیل تھے، آوارہ کہیں کے؟“

”ہمارا یہ کھٹا تو آج چھن گیا بابو جی۔“

”کیوں؟“ وہ سڑک پر دیکھتے ہوئے بولا۔

والے وقت کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔

میز تیار یوں میں مصروف تھا۔ وہ مصروف تھا۔ اس کی نگاہ میں اپنا شاہکار گردش کر رہا تھا۔ وہ گہری نظروں سے بھکارن کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس کی ہر نگاہ سے کانپ رہی تھی۔ پھر میز نے کمر استیصال لیا اور مختلف زاویوں سے اس کی تصاویر اتارنے لگا۔ درجنوں تصاویر اتاریں اس نے بھکارن کی۔ اور مطمئن ہو گیا، آج کا کام بس اتنا ہی تھا۔ اب ان تصاویر میں سے کوئی ایک پور منتخب کرنا تھا اور اسی ایگل سے تصویر بنانی تھی۔

”بس اتنا سا کام تھا جس سے تو میری جاری تھی۔ لے یہ نوٹ رکھ لے اور یہ سووے اوپر سے۔ کل سے تجھے دو گھنٹے یہاں روز صرف کرنا ہوں گے اور اتنے ہی روپے روزانہ ملیں گے؟“

”روزانہ؟“ بھکارن کی آواز بچھ گئی۔

”ہاں، روزانہ۔ کہاں رہتی ہو؟“ اس نے کہا اور بھکارن نے اپنا گھانا بتا دیا۔ ”چل میں تجھے تیرے کمر چھوڑ آؤں۔ تیرا گھر بھی دیکھ لوں گا تاکہ اگر تو غائب ہونے کی کوشش کرے تو تجھے تیرے گھر سے پکڑاؤں۔“ بھکارن تیار ہو گئی۔ میز اسے کار میں لے کر چل پڑا۔ بھکارن کا گھر ایسی جگہ تھا جہاں سے میز کو گزرتے ہوئے ناک پر رومال رکھنا پڑا۔ واپسی پر اس نے ملازم کو ہدایت کردی کہ کار کی سیٹ کو دھو دے اور اس کے بعد وہ اپنے نگارخانے میں داخل ہو گیا۔

تصاویر کے پرئس بنائے اور ان میں سے سب سے عمدہ پوز کا انتخاب کرنے لگا۔ ہر تصویر پر اپنا جواب آپ تھی۔ انتخاب مشکل ہو گیا، بہر حال اس نے کافی جانچ پڑتال کے بعد ایک تصویر منتخب کر لی اور اس پر کام شروع کر دیا۔

دوسرے دن وہ بہت کر کے دوبارہ بھکارن کے مکان پر پہنچ گیا۔ بھکارن اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ آج وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس نے خود ہی کار کا رعشی دروازہ کھولا اور بیٹھی۔ راستے میں اس نے کہا۔

”میں جگہ ٹھیک رہے گی باجی! ہم جہیں بیٹھیں مل جایا کریں گے، یہیں نہیں اتار دینی دیا کرتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ مختصر آہولا۔

”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم نے یہ بات کیوں کہی؟“

”بیادو۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ بے خیالی کے انداز میں بولا۔ بھکارن کی باتیں اس کے لیے قابل توجہ نہیں تھیں۔ نور ولاز میں پہنچ کر وہ نگارخانے میں داخل ہو گیا۔ بھکارن کو اس نے سامنے بٹھایا اور کام شروع کر دیا۔ وہ بے خودی کے عالم میں کام کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بھکارن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان نگاہوں میں پارتھا، وارثی تھی۔ وہ اس تصویر کو آنکھوں میں اتار رہا تھا اور اس کے ہاتھ اس کے ذہن سے عکس لے کر اسے کیوں پر منتقل کر رہے تھے۔ لیکن بھکارن کے سوکھے مدقق چہرے پر بار بار رنگ آ رہے تھے۔ کئی بار اس نے شرما کر نگاہیں جھکا لی تھیں اور میز کو اسے ٹوکنا پڑا تھا۔

”باجی! تیسرے دن اس نے کہا۔“

”ہوں؟“

”تھک گئی ہوں۔ رات کو طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ خون تھوکا تھا میں نے۔“ اس کی آواز میں ایک مان تھا۔ ایک عجیب سا احساس تھا۔ جیسے وہ پریشان ہو جائے گا، بے چین ہو جائے گا خون تھوکنے والی بات سن کر۔ امید بھری نظروں سے وہ اسے دیکھنے کی لیکن میز کا ذہن تصویر میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے بڑے سپاٹ سے انداز میں یہ بات سنی۔

پھر گہری سانس لے کر بولا۔

”آرام کرو چند منٹ۔“ اس نے پھل رکھ دی اور خود بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”کب سے بیمار ہو؟“

”تین سال سے۔“

”کون۔۔۔۔۔ کون ہے گھر میں؟“

”چاچا۔۔۔۔۔ اور بس۔“

”پاپ نہیں ہیں؟“

”نہیں مر گئے بہت دن ہوئے۔“

”چاچا کیا کرتا ہے؟“

”میں دھندلا کرتا ہے، خاندانی کام ہے ہمارا۔“

”تمہاری شادی نہیں ہوئی؟“

”نہیں جی۔“ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

”کرو گی بھی نہیں؟“ میز نے سرسری انداز میں پوچھا اور اس کے زرد چہرے پر سرخری پھیل گئی۔ ناراض تھی وہ اس بات پر کہ وہ اس کے خون تھوکنے کی خبر سے پریشان کیوں نہیں ہوا۔ لیکن اس سوال سے اس کی ناراضی دور ہو گئی۔ اس نے شرما کر کہا۔

”مجھے کیا معلوم؟“

”ہاں۔ یہ بات تو تمہارے چاچا کو معلوم ہو گی مگر جہیں تو بی بی ہے۔“

”تھک ہو سکتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اگر علاج ہو جائے تو میں ٹھیک ہو سکتی ہوں۔“

”علاج کیوں نہیں کرایا؟“

”مہم غریب لوگ ہیں باجی اور علاج بہت مہنگا ہے، تین ہزار روپے مینینا کی دوا لی آئی ہے۔“

”او۔۔۔۔۔ اچھا یہ بات تھی۔“ وہ بہ دستور سادہ سے لہجے میں بولا۔ کوئی جذبہ نہیں ابھرا تھا اس کے دل میں۔ کوئی احساس نہ تھا اس کے چہرے پر۔ وہ مصروف تھا، اپنے کون میں کھویا ہوا۔ دوسری باتوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

”پر اب میں نے علاج شروع کر لیا ہے۔ تم نے جو پیسے دیے تھے نا، اس میں سے دوا لی اور تھوڑے چاچا کو دیے۔ میں نے بتایا تھوڑی ہے انہیں تمہارے بارے میں۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”باجی۔ پہلے میں ڈرنی تھی تم سے۔“

”مجھ سے۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”بس باجی ایک بات ہو گئی تھی، ایسی ہی۔“

”کیا؟“

”تمہاری طرح کا ایک باجی مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے گیا تھا، کہنے لگا ابا کی نیاز ہے۔ کھانا اور کپڑے دینے ہیں، مگر۔۔۔۔۔ وہاں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور باجی۔۔۔۔۔ اس نے۔۔۔۔۔ اس نے۔۔۔۔۔“ وہ شرما گئی۔

اس نے اپنا پھندا دو ٹیبلٹ میں ٹھونس لیا۔ انتظار کرتی رہی وہ کہ باجی کچھ بولے لیکن باجی ایک برش اٹھا کر صاف کرنے لگا۔

”پھر باجی۔۔۔۔۔ میری طبیعت خراب ہو گئی، میں بیمار رہنے لگی، اٹلیاں آنے لگیں مجھے، چکر آتے رہتے تھے ہر وقت۔ چاچا نے مانی بشیراں کو دکھایا اور مانی بشیراں نے چاچا کو نہ جانے کیا پیڑھائی کہ چاچا میرے اوپر ڈنڈا لے کر پل پڑا۔ کئی اٹلیں ماریں اس نے میرے پیٹ پر۔ میں بیمار ہو گئی۔ میری سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ میرے پیٹ میں پتھر آ گیا ہے۔ خدا قسم باجیوں تو حیران رہ گئی۔ کہاں سے آ گیا یہ پتھر میرے پیٹ میں۔ وہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ پتھر آجی میں اور چلا بھی گیا۔ بس اس کے بعد مجھے دق ہو گئی۔ نہیں تو پہلے میں بہت اچھی تھی۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔ ”چل اب کام شروع کریں۔“

اور وہ جل گئی، خاموشی سے وہاں آئی جی جہاں وہ چاہتا تھا۔ ایک گھٹنا ہو گیا اسے بیٹھے بیٹھے، تب وہ اچانک بول پڑی۔ ”بھئی تو اس دن میں تم سے ڈر رہی تھی۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”تیرے وہ کپڑے کہاں ہیں؟“

”گھر میں ہیں۔“

”بیکار ہے۔ تو نے اپنی شکل بھی بگاڑ لی ہے، آج کل کام نہیں ہو سکتا۔“

عام عقیدے

سنت نفرت ہے۔

بائیس کے سبب سے لڑکوں کے لیے

نقل و حرکت مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت اس وقت منظر عام پر آئی جب پرنسوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے والوں نے دیکھا کہ لڑکوں میں بارش کے دوران تالاب کے وسط میں کبھی نہیں بھرتیں بلکہ کنارے پر پناہ تلاش کرتی ہیں۔

”اس۔۔۔۔۔“ میز خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”مگر تم تو سن ہی نہیں رہے میری بات۔ نہ سنو۔۔۔۔۔“

میرا کیا ہے۔“

دوسری صبح جب وہ اسے لینے گیا تو وہ پہلے ہی وہاں کھڑی ہو گئی تھی۔ میز نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا تو تھا لیکن پہچان نہیں رکھا تھا۔ یہ وہ تو نہیں تھی۔ گہرے نیلے رنگ کی شلوار، خوبصورت پر عذیص، میچ کرتا ہوا دوپٹا، سلیٹے سے بندھے ہوئے بال۔ اس کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ خود اس کے پاس پہنچ گئی۔

”مجھے تلاش کر رہے ہو باجی، میں یہ کھڑی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں مسرت ناچ رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی لیکن وہ پریشان ہو گیا۔

یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا حلیہ بنالیا تو نے؟ پاگل ہوئی ہے کیا؟ وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

”ارے خوب چمک دیا ہے چاچا کو۔ کیا یاد کرے گا۔ میں نے کہہ دیا کہ آج میں شہزادی کی چھٹی پر جا رہی ہوں۔ خوب دانت میسے اس نے، بوڑھانے لگا کہ کام پر نہیں جائے گی تو کھائے گی کیا۔ پر میں نے بھی ایک دن سی۔ اچھی لگ رہی ہوں نا میں؟“ وہ کار کے دروازے کی طرف بڑھی۔

”من تو سہی، پاگل ہو گئی ہے کیا؟“ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”تیرے وہ کپڑے کہاں ہیں؟“

”گھر میں ہیں۔“

”بیکار ہے۔ تو نے اپنی شکل بھی بگاڑ لی ہے، آج کل کام نہیں ہو سکتا۔“

سینسپنس ڈائجسٹ

175

ماہ 2012ء

”بگڑ گئی ہے میری شکل؟“ وہ منہ بسور کر بولی۔
 ”ہاں تصویر کیسے بنے گی اس حلیے میں، دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔ جاہلی امتحان نہیں کی..... جاویتی پڑے پہن کر آ۔ میں انتظار کر رہا ہوں، جلدی کر۔“
 اس کے چہرے کی دیوانی ماند پڑ گئی۔ سارے چراغ بجھ گئے۔ وہ کتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ پھر واپس لوٹ گئی۔
 کافی دیر سے کام شروع ہوا تھا۔ وہ بہت اداس تھی۔ دن بھر خاموش رہی۔ شام کو پیسے لے کر خاموشی سے چلی گئی اور پھر دوسرے دن اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔
 ”کل میں نے دو ابھی نہیں لی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ دن بھر بس بھوک رہی۔“
 ”آج بھی دو نہیں لوں گی۔ سوچ لیا ہے، اچھا ہے مر جاؤں۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ اس نے جواب دیا اور وہ حیران رہ گئی پھر خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ دوسرے دن اور تیسرے دن بھی کچھ نہیں کہا۔ اب وہ کچھ ویران ہو گئی تھی۔ معیز نے اس کے چہرے کی ساری ویو ایناں تصویریں مسودی میں تصویر مکمل ہو گئی۔
 ”بس خوشبو، تیرا کام ختم۔“ اس نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ اس کی نگاہیں پگل سے بنے ہوئے اس خاکے پر جمی ہوئی تھیں جن میں بس اب رنگ بھرنے تھے، سارے جہاں کی ویرانیوں کے رنگ۔
 ”میں جاؤں؟“
 ”ہاں..... یہ پیسے رکھ لے۔“ اس نے کہا اور وہ پیسے لے کر چلی گئی۔ دوسرے دن دوپہر کو جب وہ نگار خانے سے نکلا تو ملازم ہاتھ باندھ کھڑے تھا۔
 ”چھوٹے حضور! باہر وہ بھکارن کھڑی ہے۔ گیارہ بجے سے کھڑی ہے۔ پریشان تھی..... بائبل..... پوچھنے لگی کہ صاحب بیمار تو نہیں ہو گئے۔ آج مجھے لینے نہیں آئے؟“
 ”اوہ۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کام ختم ہو گیا ہے۔ جاؤ اس سے کہہ دو۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اندرونی عمارت کی طرف چل پڑا۔ دوسری دوپہر ملازم نے پھر اسے بھکارن کے بارے میں اطلاع دی۔
 ”وہ بری طرح رو پیٹ رہی ہے چھوٹے حضور۔ آج نو بجے ہی آگئی تھی، کہہ رہی ہے، بس ایک بار اسے آپ سے

ملا دوں۔“ وہ ملازم کو خوشخوار نگاہوں سے گھورنے لگا۔ ”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“
 ”جی..... وہ سرکار.....“ ملازم بوکھلا گیا۔
 ”دوبارہ مجھے اس کے بارے میں اطلاع نہ ملے۔“
 اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور تیز تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔
 اس کے بعد اسے اس بھکارن کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی۔ تصویر مکمل ہو گئی تھی۔ جس کے پس منظر، پیش منظر میں بھکارن کا چہرہ تھا۔ حسرت و یاس کی تصویر، سوکھا چہرہ، تنکے خدو خال، پھڑپھڑانے ہوئے ہونٹ۔ پس منظر میں بھی وہی چہرہ تھا۔ سرسبز و شاداب، تروتازہ، زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور۔ وہی خدو خال تھے جو پیش منظر میں تھے لیکن پس منظر میں وہ حسن و دل نشینی کا مجسمہ تھی۔ اس تصویر میں معیز نے انسان کی بے بسی پیش کی تھی۔ دل میں چپے ہوئے، اس درد کو لکیروں میں سودا ہوا تھا جو انسانیت کا درد تھا۔ افلاس، سرسبز و شاداب چہروں کو کیا ہے کیا بناتا ہے۔
 تصویر فٹاش میں سرگئی اور لاکھوں نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ نقادان سر دھنسنے لگے۔ مقابلے میں حصہ لینے والوں کے دلوں پر پہلی ہی دن اوس پر چلی تھی۔ وہ خود اس تصویر کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے تھے۔ معیز نے ایک بار پھر ایک شاہکار تخلیق کر دیا تھا۔
 اخبارات نے لکھا:
 نمبر ایک..... فن کار ہمیشہ سچ کہتا ہے۔ پس منظر میں معیز نے ایک فلاں زدہ بھکارن کو پیش کیا ہے جو نو جوان ہے، جیسے خدو خال کی مالک ہے، لیکن اس کے حسین نقوش افلاس اور فاقہ کشی کی چادر کے چپے چپے ہوئے ہیں۔ پس منظر میں اس کا دلکش روپ نظر آتا ہے، لیکن حقیقت بدہنہ ہے۔
 نمبر دو..... نورمل کا نمبرادہ عظیم ہے کہ اس کی نگاہ زمین کی گہرائیوں پر روتی ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ کسی گندی سی گھولی میں رہنے والے مسور کا ذہن اگر اس منظر کی عکاسی کرتا تو یہ بات اس قدر قابل ستائش نہ ہوتی لیکن فن کار دولت کی چمک سے اندھا نہیں ہوتا جس کا ثبوت پس منظر ہے۔ معیز ایک ارب پتی خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ مرزا معیز بیگ، بلکہ یہ صرف معیز ہے۔ صرف ایک فنکار۔
 نمبر تین..... سچ کو پرکھ کر خون دل میں ڈبو کر معیز نے پس منظر تخلیق کیا ہے اور ایک بار پھر اپنے فن کا لوہا منوا لیا ہے۔ اس کا حساس دل انسانیت کے دکھوں سے لبریز ہے۔ پس منظر کے عظیم فنکار کو ہمارا اسلام۔“

فیصلہ ہو گیا۔ متفقہ طور پر اس تصویر کو اول قرار دیا گیا۔ معیز کو پھولوں سے لادا گیا۔ الزام ڈارن لڑکیوں نے اس کے ہاتھ چومے، فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والی ایک خاتون نے کہا۔
 ”معیز۔ کاش تمہارے ہاتھ کی پرچھائیں ہی ہمیں نصیب ہو جائے۔ کاش.....“ ایک شوخ و شنگ اخباری رپورٹر لڑکی نے کہا۔
 ”پلیز مسٹر معیز! صرف چند سوال۔ سنا ہے، آپ اخبار نویسوں کو مایوس نہیں کرتے۔“
 ”جی فرمائیے۔“ وہ پروقار لہجے میں بولا۔
 ”آپ یہ خیال کہاں سے حاصل کرتے ہیں؟“
 ”خیالات حاصل نہیں کیے جاتے۔ ان کا تعلق ذہن و دل کی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”یہ تصویر صرف خیالی ہے یا حقیقی؟“
 ”ایک حقیقت ہے۔“
 ”کہو! آپ نے کسی کو ماڈل بنایا ہے؟“
 ”ہاں.....“
 ”کون ہے، یہ لڑکی؟ کہاں ہے؟“
 ”میرے وطن، میرے شہر کی لڑکیاں اور سڑکیں غربت و افلاس کے ایسے ماڈلوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ لڑکی خوشبو ہے، ہاں..... اس کا نام خوشبو ہے، لیکن یہ بھوک، پیاس، افلاس اور بیماری کے جہنم میں رہتی ہے۔ شہر کی کسی سڑک پر تلاش کر لیں۔ یہ آپ کو ضرور مل جائے گی۔ یہ بد نصیب بی بی کے مرض میں مبتلا کسی زندہ رہنے کی خواہش رکھتی تھی لیکن اس کی غربت، اس کا افلاس بالآخر اسے موت کی وادیوں تک لے جائے گا۔ مجھے یقین ہے، وہ طویل عرصہ زندگی کے اس بوجھ کو کھیت نہ سکے گی۔“ معیز کی آواز بھرا گئی۔
 ”آپ نے اس کی صرف تصویر بنائی ہے معیز، یا اس کی غربت کا علاج..... آپ تو ایک دولت مند خاندان کے چشم و چراغ ہیں؟“ لڑکی نے سوال کیا۔
 ”ایسیلئے زی معیز، آپ اس تصویر کو فروخت کریں گے۔ سنا ہے، فن مصوری کے سب سے بڑے قدر دان سینٹھ نظام شاہ اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں؟“ ایک اور پوچھنے والے اسے اس نازک سوال کے جواب سے بچایا۔
 ”میں اپنا شاہکار فروخت نہیں کرتا۔“ اس نے ایک شان سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔
 نمائش گاہ کے باہر، درمیانی سڑک کی دوسری جانب فٹ پاتھ پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ سینٹھ نظام شاہ اپنی شاندار

مرسدیز کے پاس کھڑے کھڑے تھے۔
 ”کسی طرح اسے تیار کرو جیلانی صاحب! میں اس تصویر کے پچاس لاکھ سے کم لاکھ تک دے دوں گا۔ تم جنت نے کیجا نکال کر رکھ دیا ہے، کیا پتہ بنائی ہے۔ جیلانی! اس کے بغیر میری آرٹ گیلری نامکمل ہے۔ تم پھر بات کرو، اس سے۔ یہ ڈرائیور کم جنت کہاں مر گیا۔ دیکھو اس بھیڑ میں تو نہیں ہے؟“
 ”ابھی دیکھتا ہوں، سرکار! جیلانی آگے بڑھ گیا۔ فٹ پاتھ پر ایک نو جوان بھکارن کی لاش پڑی تھی جس کے قریب ایک بوڑھا بیٹا رو رہا تھا۔
 ”ہائے، خوشبو! میری بچی! اب میں کیا کروں گا اس دنیا میں جی کر۔ ہائے اس جوانی میں مرنا تھا تجھے۔ میری خوشبو! لوگو، اس کے نقن کے لیے کچھ دو۔ ارے اس بے نقن کو نقن تو دے دو۔ دو! تو کوئی نہ دے سکا۔ اسے نقن ہی دے دو۔ ہائے میری خوشبو۔“
 ”کیا ہو گیا تھا اسے بابا؟“ مجمع میں سے کسی نے دریافت کیا۔
 ”دق کی مریض تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اگر علاج ہو جائے تو ٹھیک ہو سکتی ہے، مگر علاج..... ہائے میری خوشبو!“ بوڑھے نے روتے ہوئے کہا۔
 جیلانی نے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کھڑے ہو۔ میاں صاحب! اتنی دیر سے گاڑی کے قریب کھڑے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ کبسا جمع ہے؟“
 ”ایک بھکارن مر گئی ہے؟“ ڈرائیور نے کہا۔
 ”ارے..... اوہ..... یہ تو وہی ہے، بالکل وہی تصویر والی۔“ جیلانی نے بھکارن کے مردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دوڑتا، ہاپتا ہوا گاڑی کی طرف بھاگا۔
 ”صاحب..... صاحب وہی ہے..... وہی تصویر والی..... مر گئی۔ فٹ پاتھ پر پڑی ہے۔ بالکل وہی ہے، آپ دیکھیں تو سہی۔“ اور صاحب کی گھورتی ہوئی نگاہوں کو دیکھ کر وہ سنبھل گیا۔ ڈرائیور نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سینٹھ صاحب نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔
 ”جیلانی! تمہاری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو گئی ہے۔ شاید بالکل ہی ٹھیک گئے ہو۔ مجھے تصویر چاہیے..... مجھے صرف تصویر چاہیے..... تصویر والی نہیں..... کیا میں اس کی لاش کو لاکاؤں گا آرٹ گیلری میں؟ چلو ڈرائیور..... آگے بڑھو۔“

ناصر ملک مسافر

گل دنگڑا سے راہ پر خاریک ایک مسافر بے نوا کی رواد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زار سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود پر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانمان خراب، بے سپر اور ابلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چہرے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساس زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

سفر کا آغاز آنکھ کھلنے پر ہوتا ہے اور تب تک جاری رہتا ہے جب تک آنکھ کھلی رہتی ہے۔ مسافرت کسی نہ کسی رنگ میں اپنے فطری تسلسل کے ساتھ زندگی کو سن کی طرح چاٹتی جاتی ہے۔ بدن گشت خوردہ ہوتا جاتا ہے اور پھر ایک دن پیر ڈال کر کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ تب مشکل روح گروسر میں آت کر بے وفائی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ہر شخص مسافر، ہر زندگی مسافرت اور تمام تر اعمال زار سفر ہیں۔ میں بھی خانمان خراب، بے سپر اور ابلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر جذبات سوختے ہوں جس نے ایک دور افتادہ بستی "نور پور" میں آنکھ کھولی۔

میرا نام شہر یار ہے۔ میری داستان معاشرے کی ناہمواریوں سے آلودہ فضا میں سانس لیتے ہوئے ان گنت

لوگوں سے بہت کڑیوں بلکہ قہری سے مرق شاید یہی ہے کہ ان کی کہانیاں موقوفہ طلاس پر نہیں آئیں جبکہ میں نے اپنے واقعات و گفتگوں کا پیرا بن دے کر ہر نظر احساس پر آشکار کر دیا ہے۔

خوف، ہمدردی اور پسیائی..... یہ سب بہت پہلے کی باتیں ہیں، جب میں ایک بے ضرر انسان تھا اور میری خواہشیں اس بچ تک نہیں پہنچیں تھیں کہ میں اپنے اور بیگانے کی پہچان بھول جاتا۔ انسانیت کے لبادے سے نکل کر بچہ کی صورت واصل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں، یہ بساط تو ہم دو ہل کی تحریک ہوتی ہے۔ میں کسی ایسے ہی لمحے کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور بے دھیانی میں اس قدر دور نکل گیا کہ میرا اپنا سایہ مجھ سے گریزاں دکھائی دینے لگا۔

سوچتا ہوں کہ اچھا ہوتا اگر میری زندگی بھی ان ہزاروں لاکھوں اشخاص کے جیسی ہوتی جو اس کائنات میں آتے ہیں اور بغیر کچھ کیے واپس چلے جاتے ہیں۔ معدودے چند لوگ انہیں جانتے ہیں اور ابعد ان کا تذکرہ اچھے یا بُرے لفظوں میں کرتے ہیں، پھر بھول جاتے ہیں۔

کافی عرصہ پہلے میرے ماں باپ بھی کھیتوں سے رزق اُگاتے، مزدوری کرتے تھے اور ایک رات مجھے اور پروین کو دنیا کے دم و کرم پر چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔ میرا باپ امام دین بڑا ذوق دار انسان تھا۔ قد آور، خوب رو اور خوش لباس تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ بڑے دھمے لہجے میں مسکرا کر بات کرنے کا عادی تھا۔ اکثر ماں کی بھی ڈانٹ ڈپٹ یاد آتی ہے مگر یہ یاد نہیں آتا کہ مجھے کبھی باپ نے کسی بات پر ڈانٹا ہو یا مارا پینا ہو۔ پروین میری سگی بہن تھی جو مجھ سے تین سال چھوٹی تھی۔ جب ایک اندوہناک شب خون میں ماں اور باپ کا انتقال ہوا، تب وہ محض پانچ سال کی تھی۔ اگر میرے والدین کی موت طبعی ہوتی تو شاید مجھے اُن کا محبت بھرا درواریہ یاد تک نہ رہتا۔ اب یہ حتی جدائی ایک لک، ایک نہ بھلائی جانے والی جبین بن کر ہمیشہ ذہن میں ابھرتی رہتی تھی۔

زمین و جانکد تو تھی نہیں جس پر ہم عیش سے زندگی گزارتے اس لیے ہم دونوں طفیلہ بن کر کچا چراغ دین کے گھر آ گئے۔ وہ ہمارا لگا لگا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا جو ابھی چند سال کا تھا۔ آبائی زمین پر مشکل ان کا پیٹ پالتی تھی۔ جب ہم بھی مستقل بوجھ کی صورت ان کے سروں پر آن وارد ہوئے تو معاشی مشکلات دو چند ہو گئیں۔ قریبی قصبے سے ایف ایس کرنے کے بعد میں نے ہر امر مجبوری تعلیم کو

خیر باد کہنا چاہا مگر چچا چراغ نے کہا ”میں پتر نہیں..... حیرا باپ، میرا بڑا بھائی مجھے پڑھا لکھا کر بڑا افسر بنانا چاہتا تھا۔ میں اُس کی بے چارگی کی موت کا مداوا تو نہیں کر سکا مگر اُس کی خواہش کو پروان ضرور چڑھا سکتا ہوں۔ تم اللہ کا نام لو اور آگے بڑھنے کے لیے شہر چلے جاؤ۔“

شہر سے اُس کی مراد ملتان شہر تھی۔ ملتان یہاں سے گھٹنا بھر کی مسافت پر واقع تھا۔ میں نے اُس کی ہر امر اور خواہش پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے ملتان کا قصد کیا۔ پہلی مرتبہ شہر دیکھا تھا۔ پریشان ہو گیا مگر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لینے اور ہوٹل میں چند دن رہنے کے بعد میں نے اپنی راہیں متعین کر لی تھیں۔ اولین روز جس احساس کتری سے واسطہ پڑا تھا، جلد ہی میں نے اُس سے جان چھڑائی تھی۔ اُس کالج میں امرا اور اعلیٰ افسروں کے لڑکے زیر تعلیم تھے جن کی فضول خرچیاں مجھ سمیت تمام دیہاتی لڑکوں کو کھتری کے احساس میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ ابتدائی دو تین مہینوں میں ہی میں اس ماحول میں رنج بس گیا اور مفاہمت کرنے کے لائق ہو گیا۔

کالج کی فضا پر ایک سیاسی جماعت کی مکمل اجارہ داری قائم تھی۔ اس جماعت کا طلبہ ونگ جو چاہتا، وہی کرتا تھا۔ کالج کی انتظامیہ اس طلبہ تنظیم کے ہاتھوں پرغال بنی ہوئی تھی۔ انہی دنوں ایک اور بڑی سیاسی جماعت نے بھی یہاں ڈیرا ڈال دیا۔ پہلے سے موجود تنظیم کے ہاتھوں ستائے ہوئے لڑکوں نے اُسے جوائن کر لیا۔ یوں کالج میں دو متضارب دھڑے بن گئے۔ مجھے بھی ایک تنظیم کی رکنیت اختیار کرنا پڑی۔ چند مہینوں میں ہی مجھے تنظیم کا ایک کلیدی عہدہ ممبر آ گیا اور مجھ پر غیر نصابی سرگرمیوں کا بوجھ لگ گیا۔

گاؤں کی فضا سے نکلنے والے سادہ لوح شہریاں کو یہاں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ دلیرانہ فیصلوں، جذباتی مزاج اور چہرے کے بھولپن نے مجھ سے وہ کام بھی کروائے جن کے بارے میں کالج میں آنے سے قبل میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کالج بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا ہی ایک اور کالج پڑوس میں موجود تھا۔ اسی سڑک کے آخر پر یونیورسٹی کی طویل و عریض عمارت بھی سر اٹھائے موجود تھی۔ کہنے کو یہ علاقہ تعلیمی زون کہلاتا تھا مگر مکمل طور پر تمام متغیر ہائشی کالونیوں اور سڑکوں پر طلبہ کا راج قائم تھا۔ یعنی یہ کہنا تھا کہ ہوسٹ تنظیم کے واسطے سے میری دہشت چاروٹوٹاری تھی۔ میں نائب صدر تھا۔ عرفان مرزا گزشتہ کئی سالوں سے صدر چلا آ رہا تھا۔ اُس کا رابطہ تنظیم کے بڑوں سے رہتا تھا۔ حکم تنظیم کے ہیڈ آفس سے جاری ہو کر صدر تک پہنچتا تھا، پھر مجھ تک اور پھر تنظیم کے ہر رکن تک

تھا۔ ہم اس سلسلے کے جلو میں ہوئے تھے اور غوفان میں طرح نکلنے اور اپنا مشن مکمل کر کے عام طالب علموں میں ڈال ہو جاتے۔

جب میں یون روڈ پر واقع اس عظیم الشان سرکاری تعلیم گاہ سے نکلا تو نہ صرف یہ کہ میرے ہاتھوں میں گریجویشن کی اگری ڈلی ہوئی تھی بلکہ میں کئی اقسام کا اسلحہ استعمال کرنے میں بھی خلاق ہو چکا تھا۔ میری تنظیم کے بڑوں نے بہت کوشش کی کہ میں کالج میں رہوں، ایم ایس سی پارٹ ون میں داخلہ لوں تاکہ ان کے تعلیمی معاملات پسے کی طرح چلتے رہیں مگر میں اُس دلہنی زندگی سے اکتا گیا تھا۔ دوسالوں میں ہی میری طبیعت بھگتی تھی۔ تنظیم کے بڑے، عرفان مرزا کے توسط سے مجھ تک اپنی پیشکش متعدد بار پہنچا چکے تھے کہ وہ میرے تعلیمی اخراجات برداشت کریں گے۔ چونکہ میں مجھ کا تھا کہ میں جس راستے پر چل نکلا ہوں، اُس کی منزل اندیشی کھائی، بے زمین آسمان یا آگ بھری جہنم ہی اس لیے میں یہاں سے جلد از جلد بھاگ نکلتا چاہتا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ برس میں تنظیم نے مجھ سے کئی ایسے کام بھی لیے تھے جن کا تعلق کسی بھی لحاظ سے کالج کے معاملات سے نہیں تھا۔

غیر نصابی سرگرمیوں میں غیر معمولی شرکت کے باوجود میں نے فرسٹ ڈویژن میں بی ایس سی کیا تھا۔ جب میں منٹائی کا ڈپٹی تھا تو نور پور میں داخل ہوا تو نہ جانے کتنے گھروں کے دروازے کھلے تھے، کتنی مبارکبادیں میسر آتی تھیں اور نہیں معلوم کہ کتنے چہروں سے ستائش اور داد و آفریں کے ڈھنگ سے برسے تھے۔ پروین، غزالہ اور فرزانہ میزک کر چکی تھیں اور آب فراغت کے ایام گزار رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے انداز میں مجھے ملنے والی اس خوشی کو جشن کی صورت میں منایا تھا۔

غربت حوصلہ دیتی ہے۔ اس کے دامن میں دلاسوں کے سوار کھائی کیا ہے۔ چاچا اگر اہل ہوتا اور عہد حاضر کی نام نہاد تہذیب میں رنگا ہوتا تو ہم دونوں بہن بھائیوں کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتا۔ مگر تھا کہ وہ غریب محنت کش تھا۔ چونکہ غربت کے ماروں کو اپنی عزت دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی عزیز ہوتی ہے اور خون کے رشتوں کی کشش مستزاد، اسی لیے اس نے ہمیں اپنی اولاد کی طرح سنبے سے لگا لیا۔ چاچا بھی پہلی نسل دیہاتی عورت تھی جس نے مسکینوں کی بددعا سے ڈرتے ہوئے اپنی سلطنت میں قبول کر لیا۔ وہ اکثر اپنی ملنے جلنے والیوں سے کہا کرتی تھی ”قتیوں اور مسکینوں کی دعا تو سیدھی عرش پر جاتی ہے۔ مجھے ڈر لگا رہتا ہے کہ میں کہیں

ان دونوں کی بددعا نہ لے لیں۔“ اسی گاؤں میں، ہماری ہمسایگی میں، میری پھوپھی رہتی تھی۔ پھوپھی کہتی تھیں مجھ سے اور پروین سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس پیار کے عقب میں ہمیں اُن دونوں کی ہونے والی وجہ سے ہمدردی کا فرما تھی یا خوشی رشتوں کی ان دیکھی کشش، یہ تفریق کرنا بہت مشکل تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی چاچا کی طرح مسکینوں کی بددعا سے ڈرتی ہو اور عرش والے کو ناراض نہ کرنا چاہتی ہو۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ میری ماں، رضیہ بی بی عرف رجونے اپنی زندگی میں ہی اپنی نند زادی غزالہ کے ساتھ میری منگنی طے کر دی تھی۔ جب شاید مجھے اس لفظ کے معانی کا بھی علم نہیں تھا۔ اب جبکہ میں اس میں پہناں مفہوم و لذت سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا، غزالہ تو بس کلاس میں پہنچ چکی تھی۔ ہم دونوں پر منگنی کی روایتی پابندیاں عائد ہو چکی تھیں لیکن قریبی رشتہ دار اور ہمسایہ ہونے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے بہ آسانی بات چیت کر لیا کرتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ شادی سے قبل آزادانہ ملاقاتوں کا سلسلہ مناسب نہیں مگر دل میں اک چور چھپا رہتا تھا جو ہر دم چوری پر اکساتا رہتا تھا۔ ہم جب بھی دل کی کوئی بات کرنے لگتے، ہمارا احساس ہمیں چونکا کر دیتا۔ کچھ آزادی اور کچھ رکاوٹیں عشق کو ہوا دیتی ہیں۔ ہم دونوں بھی اس ہوا کے دوش پر لہراتے ڈگمگاتے رفتہ رفتہ محبت کی مبین دلدل میں گرتے چلے گئے۔

پرانے زمانے میں جنوں، پروین کی جان کسی دور پار کے جزیرے میں سونے کے بچرے میں بند طوطے یا اینٹا میں قید ہوتی تھی اور اگر اس طوطے یا اینٹا کی گردن مروڑ دی جاتی تھی تو وہ جن یا پری نورانی ہلاک ہو جاتی۔ اسی طرح شاید میری جان بھی پروین کے وجود میں آ چکی ہوئی تھی۔ اسے بخارا آن لیتا تو میں جاں بہ لب ہو جاتا اور یوں دکھائی دیتا کہ اس کے بجائے میں بخاری آگ میں چپ رہا ہوں۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد میں ہی اُس کا سہارا تھا، میں ہی غم گسار تھا اس لیے وہ میرے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار پائی تھی۔ میں اگر دو تین دنوں کے لیے کہیں چلا جاتا تو وہ رورو کر بکاں ہو جاتی۔ فطرتاً کم گوئیں تھی اور اک بے نام ی خاموش مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت رقصاں ریتی۔ اسے شے کے لیے کسی خاص لفظ کی ضرورت نہیں تھی، وہ کسی بھی لمحے، بات بہ بات کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔

چچا اور چچی کا اس کے ساتھ رویہ بہت مشفقانہ اور محبت بھرا تھا۔ چچی کی دونوں بیٹیاں، فرزانہ اور شبنم، پروین سے

عمر میں کچھ ہی بڑی تھیں۔ بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے پروین کو اپنی تیسری بہن اور مجھے اپنا بھائی مان لیا تھا۔ چاچا چراغ عام دیہاتیوں کی طرح بیٹیوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کے بیاہ کے بارے میں سوچنے لگتا تھا اور جب اس نے پروین کو دیکھا تو اس کی نیم خیزہ کمر میں ایک بل اور ڈرٹیک۔ دو سے تین ہو گئیں تو گھر دو چند ہوئی۔ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا میرا دوست تھا۔ چونکہ میرے پاس ایف ایس سی کر لینے کے بعد کوئی کام نہیں تھا اس لیے میں سارا دن اس کے ساتھ گھومتا پھرتا اور اس کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ یہ بڑے لوگ بہت سیانے ہوتے ہیں۔ امیر نوازی کی میرے ساتھ وہ بھی شاید اس وجہ سے تھی کہ میں اس کے عام نوعیت کام کاج کر دیا کرتا تھا۔ بڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اس کے والد حیات خان کا ایک طرح سے شتی بھی تھا۔

میرا دوسرا دوست خالد عرف کھانا تھا جو گاؤں کی انکوئی وگن کا ڈرائیور تھا۔ یہ کھانا راسی وگن حیات خان کی بھی جس پر کھانا ہانا تنخواہ پر کام کرتا تھا۔ میں بھی کھانا راس کے ساتھ دس کلومیٹر کی دوری پر واقع ہستی قریشی موٹر سیکل چلا جاتا اور وہاں گھوم پھر کر واپس آ جاتا تھا۔ کھالے کی دوستی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں نے تھوڑے ہی عرصے میں ڈرائیونگ سیکھ لی۔ میری کارکردگی سے مطمئن ہو کر وہ اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ میرا لائسنس بن جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہزار انسان کے بھی نہ کسی کام آ جاتا ہے۔ لائسنس ڈرائیونگ کے ہزار کا دستاویز ہی ثبوت تھا۔ وہ کہتا تھا ”لائسنس کے بغیر شہر میں ڈرائیوری کی نوکری نہیں مل سکتی۔ اسٹیونگ وکیل پر تمہارا ہاتھ نکل گیا ہے، اب کوشش کرو، چار پیسے خرچ کرو اور اپنا لائسنس بنوا لو۔“

مجھے اس کا مشورہ پسند آیا۔ سر دست میرا نوکری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اس صلاحیت سے فائدہ اٹھایا جاسکے گا۔ کھانا میرا ہم عمر، میٹرک تک ہم جماعت اور گونا گونا تھا۔ وجہ میں مجھ سے برتر ہونے کے باوصف مجھ سے دب کر رہتا تھا۔ شاید وجہ یہ رہی ہو کہ وہ ہڑائی میں تالائق واقع ہوا تھا جبکہ میں ہونہار طالب علم مانا جاتا تھا۔ اس کی شراتوں، پٹائی، چھوٹی موٹی چوریوں اور اسکول سے غیر حاضری سمیت اُن گنت عیوب پر پردہ اسی صورت میں ہی پڑا رہ سکتا تھا کہ وہ مجھ سے بنا کر رہے۔

اُس نے میٹرک کے بعد ہڑائی چھوڑ دی تھی اور حیات خان کی وگن پر بطور کنڈیکٹر ملازم ہو گیا تھا۔ ساتھ ساتھ ڈرائیونگ بھی سیکھتا رہا۔ جب اُس کے استاد ملتان ڈیرا روٹ پر تھی لی اس کے کونٹر پر نوکری ملی، کھالے کو وگن کی ڈرائیونگ عایت ہوئی۔ وہ عام سے خدو خال کا چالاک اور زیرک انسان تھا۔ چھوٹے بڑے دھڑلے سے بولتا، جھد کے جھد سستی شراب ”کچی“ پیتا اور اپنے پیٹے کو اپنے ہر عمل و فعل سے آشکار کرتا تھا۔ اُس کا باپ گاؤں کا واحد لوہار تھا۔ اللہ بخش عرف بخشو لوہار تمام دن اپنے گھر سے ملحقہ ڈکان پر درانتیاں، دھولے، کھارے اور خرینچل بنایا کرتا تھا۔ اُس کے بنائے ہوئے اوزار مقامی سطح پر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جایا کرتے تھے۔ اپنے بیچے ہوئے آلات کی مرمت کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ کھانا اپنے باپ کی ڈکان کے پہلو میں پختہ سڑک کے کنارے پر کلے میدان میں وگن کھڑی کرتا تھا۔ یہ ایک طرح کا ہستی کا وگن اسٹیڈ قرار پا چکا تھا۔ وگن بھرنے تک سواریاں اپنے سامان سمیت بخشو لوہار کے سرکٹروں کے چھپرے ٹھیکہ ریتی تھیں۔

جب سواریوں کی مطلوبہ تعداد پوری ہو جاتی، اللہ بخش گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوتا، کمر پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہوئے ڈکان اور گھر کے درمیان دروازے میں آں کھڑا ہوتا۔ دونوں ہاتھیں دروازے کی اوپر والی چوکت پر ٹکا رکھتا کہ زور دار آواز دیتا اور کہا ”چل اوئے کھالیا! گڈی آڈے وچوں کڈھ گن.....“

کھانا ایک شان بے نیازی سے اپنی مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے برآمد ہوتا اور سواریوں پر خزانہ نگاہ ڈال کر اپنی سیٹ پر براجمان ہو کر ہان بھانے لگتا۔ اُس کا خالہ زاد بھائی، عبدالرشید عرف شیدہ، خافٹ سواریوں کو بھانے لگتا۔ سامان وگن کی چھت پر رکھوتا۔ وہ کنڈیکٹر تھا۔ گہری سنو لائی رنگت والا شیدہ چاق و چوبند، چست اور خاصا پھرتیلا واقع ہوا تھا۔ یہ مشکل بارہ میرہ کے سن میں ہوگا۔ کچھ لوگ وگن اسٹیڈ کے عین مشرق میں واقع حیات خان کے بڑے سے مہمان خانے کے برآمدے میں چھپی چارپائیوں پر بیٹھ کر کھالے کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔ وہ بھی اپنا اپنا سامان اٹھائے لپک کر آ جاتے۔ خواہن کو وگن کی سیٹوں پر بٹھادیا جاتا جبکہ مرد وگن کے عقبی حصے میں کھڑے ہو جاتے۔ کچھ چھت پر چڑھ جاتے اور باہر کی سمت ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ جاتے۔ میں نے بھی لوگوں کو سیٹ کے حصول کے لیے آہیں لڑتے، جھگڑتے نہیں دیکھا تھا بلکہ ایک خاموش اور خود کار معاہدہ ہستی والوں کے بیچ طے پا چکا تھا۔ یہ شاید علانی

کی واحد راز پسپورٹ سروس تھی جو سواریوں کو بے وقت ضرورت ’ادھار‘ کی شاندار ہولٹ بھی فراہم کرتی تھی۔ میرا اتیرا دوست ڈاکٹر منور علی شاہ تھا۔ وہ ہمارے گاؤں کے چھوٹے سرکاری اسپتال میں تعینات تھا۔ میں اس کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ علاقے کے ہر بڑے چھوٹے کی طرح میں بھی اُسے ’شاہ جی‘ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس سے میری شناسائی کی ابتدا ہوئی تھی جب میں گندم کی کٹائی کے موسم میں بیمار ہو کر اس کے پاس گیا تھا۔ وہ درویش منش ہونے کے باوجود انتہائی آدم بیزار شخص واقع ہوا تھا۔ کسی کے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا مگر مریضوں کو ضرورت پڑنے پر اپنے خون کا عطیہ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس کی شخصیت میں بڑا اقتصاد تھا۔ اس نے بھی اس بارے میں کوئی بات کھل کر نہیں بتائی تھی۔ ظاہر ہے کہ میں بھی اسے کرید نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ نہ صرف مجھ سے عمر میں بلکہ تعلیم، مرتبہ، الغرض ہر لحاظ سے بڑا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ شادی نہیں کی تھی، اس لیے بال بچوں کے سمجھنے سے دور تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے میرے استفسار پر کہا تھا۔ ”میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا، مجھے عورتوں سے نفرت ہے۔“

مجھے اچھا ہوا، زہر لب بڑا ڈیا ”بھلا عورت سے بھی کسی کو نفرت ہو سکتی ہے؟“ میں اس کے چھوٹے موٹے گھر یلو کام کر دیا کرتا تھا۔ وہ خود کھانا پکا یا کرتا تھا۔ ایسے میں اگر میں اُس کی کوئی پرہوتا تو اس کی مدد کرتا۔ اُس کی سرکاری کوٹھی کی ہفتہ وار صفائی بھی کر دیا کرتا۔ کوٹھی سے ملحقہ چھوٹا سالانہ مستطیل میرے سپرد تھا۔ اس نے ایک دوسرے مجھے پیسے دینا چاہے تو میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں پیسوں کے لالچ میں کام نہیں کرتا۔ وہ اس بات پر بہت پریشان ہوا تھا۔ بڑا افسر تھا مگر اُس میں افسروں والی کوئی بات میں نے نہ دیکھی تھی۔

دیہاتیوں کے پاس وقت وافر مقدار میں ہوتا ہے۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد ہم گھر والے اکٹھے بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ ایسے میں کوئی موضوع بھی ہاتھ لگ جاتا جس پر دل کھول کر بحث کی جاتی۔ ’اسلم کر یا نہ والے کے مونچھی کیوں بیمار رہتے ہیں، جھل ڈونہ کے بکروں کا بڑا ریٹ لگا ہے، ہمسائے بدر دین کے بیٹے صادق کو نمبر دار نے پانی چوری کرتے رہتے ہاتھوں پکڑ لیا تو اس نے کیسے جبرمانہ دے کر جان چھڑائی، وغیرہ۔ میں البتہ کبھی کبھار ڈاکٹر منور علی شاہ کے پاس چلا جاتا جہاں بیٹھ کر وہ دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن کھانے کے بعد چاچا چراغ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”پتر! بات دراصل یہ ہے کہ تینوں لڑکیاں سفیدے کے بولنے کی طرح بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان کی شادیوں پر سیکڑوں نہیں، ہزاروں روپے خرچ ہوں گے۔ ان کا جیز بھی آگئی بنانا ہے اور تم جانتے ہو کہ ہماری زمین یہ مشکل ہمیں پال رہی ہے۔ روٹی مشکل سے بنتی ہے، کپڑا لٹا کہاں سے بنے گا، ترڈ (زیور) اور بھانڈے ٹنڈر (برتن) کا کیا ہوگا۔ میں اکیلا کام کرتا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ صرف میرے کرنے سے شادی کے لیے چار پیسے اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ پانچ سات سال اور بھی کرلوں گا۔ اتنا خرصتم شہر میں جا کر کام کر سکتے ہو اور چار کنگے جوڑ سکتے ہو۔ شہر میں محنت مزدوری کی کی نہیں۔ تم تو بڑے لکھے بھی ہو، تمہیں آسانی سے کوئی لکھائی پڑھائی والا کام مل جائے گا۔“

چاچا درست کہتا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا ”تم یہ نہ جھجھکو میں تمہیں یہاں سے جانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ تم میرے جوان جہان پتر ہو۔ اولاد کو کوئی آٹکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا مگر میں کیا کروں۔ تین بیٹیوں کا باپ ہوں جنہیں اُن کے اصل گھر بھیجتا میری ذمہ داری ہے۔ شہرے! یہ ذمہ داری تمہارے کندھوں پر بھی ہے۔ زیادہ نہ سہی، تھوڑا ہی سہی، کچھ نہ کچھ تو گھر میں آئے گا ناں.....“

مجھے شش و پنج میں دیکھ کر وہ ترسان سے بولا۔ ”پتر! کیا تم اپنی بہن کی وجہ سے کہیں جانا نہیں چاہتے ہو؟“ میں نے آسمانی سے کہا۔ ”چاچا! میں کچھ کرتا ہوں۔“ ”تور پور میں؟“

”ہاں.....“ میں نے نیم دلانہ انداز میں کہا۔ ”یا نزدیک میں۔“

”کوئی ڈکان ہی بنا تو قریشی موڑ پر..... ہیں؟“ ”اتنا پیسا کہاں سے آئے گا چاچا؟“ میں نے استغیاب آمیز لہجہ میں کہا۔

”میں حیات خان سے بات کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے، وہ مجھے ادھار دیدے جو تھوڑا تھوڑا کر کے چکا دیا جائے۔“ ”چاچا! دکان کے لیے کم از کم چائیس پچاس ہزار روپے چاہئیں۔“

”میں جانتا ہوں پتر.....“ ”خان نہیں دے گا۔“ میں نے اپنے تئیں فیصلہ سنایا۔ ”کوشش کر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بہر حال پتر! کچھ نہ کچھ کرنے کی سوچو..... ایسے کام نہیں

چلتا۔ چپ چراغ نے گفتگو کی بساط سینے ہوئے کہا اور حسبِ عادت مجھے میرے حال پر چھوڑ گیا۔

فطرت دکھائی نہیں دیتی، مظاہر بنا کر اپنا آپ ٹھکانی ہے۔ چڑیاں جب انڈے دینے پر آتی ہیں تو ان کے لاشعور میں یہ بات آپوں آپ سا جاتی ہے کہ انڈوں اور ان سے نکلنے والے بچوں کے لیے نرم اور حدت انگیز جگہ کا ہونا ضروری ہے اور وہ ایک لگن کے ساتھ تنگہ اکٹھے کرنے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ شمرزت کے آنے تک وہ اپنا آشیانہ تیار کر چکی ہوتی ہیں۔ یہی حال انسانوں کا ہوتا ہے۔ آنول نکلتی ہے تو خودزائیدہ بچے کو عرفان مل جاتا ہے کہ اب اسے خوراک اس نالی کے ذریعے نہیں، منہ کے ذریعے ملے گی۔ ساتھ ہی چوستے کا ہنر مل جاتا ہے۔ ماں کے سینے سے دودھ کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور بچہ اپنے لب ان سوتوں پر رکھ دیتا ہے۔ جب یہ نوری دھارے اُس کی بھوک مٹانے کے لیے ناکافی ہو جاتے ہیں تو وہ فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کھلی بے وفائی کا ارتکاب کرتا ہے اور منہ پھیر لیتا ہے۔ تب ذائقوں کا ایک جہان اُس پر کھل جاتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو ماں یا باپ بننا چاہتا ہے اور اس لگن میں سب کچھ کرتا جاتا ہے۔ صدیوں سے اس عمل کو دہرائے جانے کے بعد بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا اور اب بھی آئے گا۔ تن ڈھانپنے اور پیٹ پالنے کا جھکیر فطری تقاضوں پر مبنی ہے۔

چاہے کی بات کن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ چاچا کیا، ہر کوئی کہتا ہے کہ گھر کے سبھی افراد نے کما میں تو گزر بسر نہیں ہوتی۔ شہر میں جو ان لڑکیاں کمانے کے لیے روزانہ گھر سے دفتر یا فیکٹری کے لیے نکلتی ہیں۔ میں تو پھر مرد تھا۔ مرد بھی وہ جس پر ایک نہیں تین بہنوں کا بوجھ لدا ہوا تھا۔ بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے مگر ہم غریبوں کے ہاں بیٹی کسی کڑے امتحان کی خبر سے کم نہیں ہوتی۔ مجھے چاہے کی بات سے کوئی اختلاف نہ تھا مگر شہر میں جا کر کام کرنا بڑا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ دکان بنانے کے لیے سرمایہ نہیں تھا۔ مانگے مانگے سے کام چلتا تو ہر کوئی چلا لیتا۔

ابھی سوچوں میں غفلان ڈاکٹر شاہ جی کے پاس چلا گیا۔ آج بی بی وی ہر ہفتہ وار نشر ہونے والے ایک ڈرامے کی آخری قسط تھی جسے میں مس نہیں کر سکتا تھا۔ ڈراما شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ ڈاکٹر عمر علی شاہ نے مجھے کہا۔ ”شہر یار! چائے کا موڈ ہے، بنا لو یا۔ بڑا جی چاہ رہا ہے مگر سستی کی وجہ سے اٹھا نہیں جا رہا۔“

گاؤں میں وہ واحد شخص تھا جو مجھے میرے پورے نام

سے پکارتا تھا۔ مجھے لگتا تھا جی میں نے ایک مرتبہ اُس سے دریافت کیا تھا۔ ”شاہ جی! آپ مجھے پورے نام سے کیوں پکارتے ہیں؟“

وہ حیرت سے بولا۔ ”تو اور کیا کروں؟“

”مجھے شہر یا شہر ایشیا کہتے ہیں، آپ بھی اسی نام۔۔۔۔۔“

اُس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور کہا۔ ”نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ سبھی ہوئی کیونٹی میں آدھا، نام مکمل یا بگڑا ہوا نام لینا بدہنہی اور بدکلی میں شمار کیا جاتا ہے۔“

اپنے غیر معمولی درشت رویے کے باوجود وہ اپنے ہاں آنے والے غریب مریضوں کو بھی ایسے ہی احترام سے مخاطب کرتا تھا۔

میں نے بچن کا رخ کیا۔ دوپک چائے بنائی اور شرے میں رکھ کر ڈاکٹر کے کمرے میں آ گیا۔

ہم ابھی چائے پی ہی رہے تھے کہ بجلی چلی گئی۔ چارو پُرسکوت اندھیرا طاری ہو گیا۔ گاؤں کی فضا جب اندھیرا پکڑتی ہے تو اتنی پرسکون ہو جاتی ہے کہ ساگر کی بے موج نیند کا سا گماں ابھرنے لگتا ہے۔ کہیں کوئی مینڈک یا جھینگہ شرانا ہے تو کوئی فلاگ تک اُس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہم نے ڈرامے کی وجہ سے بجلی کے آنے کا کچھ دیر انتظار کیا مگر نہ آئی تو ڈاکٹر نے کہا۔ ”چل کر باہر بیٹھے ہیں، کمرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

میں نے چار پاکی نکال کر محسن میں بچھائی۔ وہ سر ہانے کی جانب جبکہ میں پینتی پر بیٹھ گیا۔ اچانک سیاہ بدلی کی اوٹ سے چاند چمکنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی پوری روشنی سمیت آشکار ہو گیا۔ سفید روشنی چادر جیسی چاندنی میں ڈاکٹر منور کے خدوخال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بے حد خوب و انسان تھا۔ میں سوچنے لگا کہ ایسے آدمی نے اب تک شادی کیوں نہیں کی حالانکہ وہ جس لڑکی کو چاہتا، اپنی نوکر کی اور شخصی جاذبیت کی بدولت حاصل کر سکتا تھا۔ بڑھاپے کی دلیلیز پر کھڑا ہونے کے باوجود وہ پُرکشش تھا اور چاہتا تو اب بھی اُسے خوبصورت بھولی ل سکتی تھی۔

اس نے میرے انہماک کو تاڑ لیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

میں چونک گیا۔ ”شاہ جی! ایک بات پوچھوں؟“

”ضرور۔۔۔۔۔“

”آپ کا گھر کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اُس نے عجیب نگاہوں سے مجھے گھورا۔

میں گڑبڑا گیا۔ ”میرا کہنے کا مقصد ہے کہ آپ گھر کیوں نہیں جاتے؟ چھٹیاں بھی سبیلیں گزرتے ہیں اور میریں بھی، کیا آپ اپنے گھر والوں سے ناراض ہیں؟“

آنکھوں کا مشتعل الاؤسٹ گیا، طنز یہ مسکراہٹ آمستکی سے اسفردگی میں تبدیل ہو گئی اور ماحول میں ناموس خاموشی چھا گئی۔ وہ ہونٹ سینٹے بہت دیر تک بیٹھا رہا، پھر بولا۔ ”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“

”گھر والے نہیں انے احقانہ انداز میں پوچھا۔

”جب گھر ہی نہیں تو گھر والا کون ہوگا؟“

میں نے اکتھبے سے اسے دیکھا اور کہا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے؟“

وہ مجبوراً مسکرایا۔ ”تمہارے ماں باپ فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ نہ کرے تمہاری بہن بھی فوت ہو جائے تو تم کیا کہو گے؟۔۔۔۔۔ یہی کہو گے ناں کہ تمہارے گھر والے نہیں ہیں؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”چاچا چراغ، چاچی، خزانہ اور شا تو تو ہوں گے ناں!“

اُس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رقصاں ہو گئی، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”نہیں شہر یار! ماں

مقبول فیس میں ہنرمند رہیں

MoB: 0300-2219514, 0344-2609828
Tel: 021-34519074

SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام پتہ پتہ کا نام ضرور لکھیں

بذریعہ کار

9 صبح 5 شام

ہنر سیکھتے روزگار لیجئے

Registered with CBR Govt. of Pakistan

اگرچہ مندرجہ ذیل ہنر سیکھنے کی فہرست میں درج ہیں مگر ہر ہنر سیکھنے والے کو اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے مطابق ہنر سیکھنا چاہیے۔

ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس
ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس	ایس ایس ایس

75080 پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد کراچی

دی انسٹی ٹیوٹ

سے جدا گانہ رہا کہ میں اپنی مکمل تنہائی کی گود میں ہی پلا بڑھا۔ مجھے کسی کے ساتھ کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کسی اپنی نسل بڑھانے کی تمنا رہی ہے۔ آج میں تنہا ہوں تو خوش ہوں، جب کچھ عرصہ کے لیے تنہا نہیں تھا تو میں نے بہت سارے دکھ دیکھے تھے۔

اس کا لہجہ اچانک غیر معمولی حد تک سخت ہو گیا اور پھر مجھے جرأت نہ ہوئی کہ بات کو آگے بڑھاتا۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک کے لیے خاموشی عود کر آئی۔ میں بھی کبھی نظر اٹھا کر اسے دیکھ لیتا۔ وہ میرے اور آسمان پر چمکتے چاند کے درمیان حائل تھا۔ اس کے وجود کے گرد روشنی کا سفید ہالا قائم تھا جو اس کے وجود کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ بڑا پراسرار اور عجیب لگ رہا تھا۔

آخر میں نے ہی اس اعصاب شکن سکوت کو توڑا اور آہستگی سے کہا۔ ”شاہ جی! میرا جی چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں۔ یہ بھی جی چاہتا ہے کہ بہت سارا پڑھوں، اتنا، جتنا آپ نے پڑھ رکھا ہے مگر کیا کروں؟ چاہا کہتا ہے کہ میں شہر چلا جاؤں یا کوئی کام کروں۔ یہاں ایسا کوئی کام دکھائی نہیں دیتا۔ شہر سے دل دڑتا ہے۔ آپ کہیں، کیا کروں؟“

”مجھے تمہاری یا کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے انسانوں کو دودھ پلایا اور اپنی رگوں میں زہر آرتا محسوس کیا۔ ان خوش نصیبوں کو نہیں دیکھ پایا جن کے ہاتھوں دودھ پی کر جوان ہونے والے سانپ اپنی زہر چکاس سرشت بھول جاتے ہیں۔ تم وہی کرو جو تمہارا چاہا کہتا ہے۔ وہ تمہارے بارے میں واقعی فکر مند ہے۔ پرسوں مجھ سے بھی کہہ رہا تھا کہ شہر یا رکو کہیں جا کر کام و ام کرنا چاہیے تاکہ گاڑی چل سکے۔“

کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا۔ ”دیکھو ناں! وہ بوڑھا آدمی ہے۔ آج نہیں توکل اس کے ہاتھ میر جواب دے جائیں گے اور تمہیں گھر کا بوجھ اٹھانا پڑ جائے گا۔ آج اٹھا لو گے توکل بھی محسوس نہیں ہوگی۔ کیا تمہارا کوئی جاننے والا شہر میں نہیں ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”کوئی کام دام جانتے ہو؟“

”میں کوئی کام نہیں جانتا مگر.....“ میں نے سوچ کر کہا۔

”کھالے سے ذرا بیونگ بیکھ کر بھی ہے پرا جی لائسنس نہیں بنا۔“

”ہوں.....“ اس نے کہا اور کچھ دیر کے لیے سوچ میں گم ہو گیا۔ ناخن سے چار پائی کی چوٹی بائیں کھوپڑی سے لگا۔

”میرا ایک جاننے والا ہے شہر میں.....“ وہ خودکامی کے

سے انداز میں بولا پھر چار پائی پر آتی باقی مار کر بیٹھ گیا اور اپنے سینے کے گھنیرے سفید سیاہ پھجڑی بالوں میں جھکی کرنے کے سے انداز میں ہاتھ پھیرے ہوئے بولا۔ ”تم ایسا کرو کہ اس کے پاس چل جاؤ۔ وہ تمہاری ہر ممکن مدد کرے گا۔“

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”کس کے پاس؟“

”اس کے پاس..... وہ، ایک ہے..... میرا دوست ہے۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔“ اس کا بیان بے رنگی کا شکار تھا۔

”کہاں.....؟ ملتان میں؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”نہیں، لاہور میں.....“ اس نے کہا۔

میں قدرے مایوس ہو گیا۔ بولا۔ ”میں شاہ جی! پروین اکیلی رہ جائے گی۔ رورو رو کر پاگل ہو جائے گی۔“

وہ میرا شانہ جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”جب کام کرنے اور کمانے کے لیے گھر سے نکلنا ہے تو پھر قرینی موز کیا اور لاہور کیا؟ وہاں تم سو کھے ہو گے۔ بڑا شہر ہے، زیادہ مزدوری ملے گی اور کام بھی آسانی سے مل جائے گا۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”نہیں شاہ جی!“

”تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”مجھے اگر چالیس پچاس ہزار روپے مل جائیں تو میں قریبی موز میں دکان کھول لوں گا تاکہ میں روزانہ شام کو گھر آجایا کروں۔“

”اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟“

شاہ جی کے اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا

تمہی خاموش ہو گیا۔ ایک پل کو سہارا اٹھرا کہ اپنے مال مویشی بیچ دوں..... ساتھ ہی اس ناواں سہارے پر سے ہاتھ پھل گیا۔ مال مویشی بیچ دے تو پھر دودھ کہاں سے آئے گا؟ گھر کی گزیر کہاں سے ہوگی؟ اس کے علاوہ کچھ بیچنے کو نہیں تھا۔ مال کے چھوڑے ہوئے چند گھنٹے تھے جنہیں بیچنے کی بات سن کر پروین کمر کے بل جا کر گے کی اور کبھی نہیں اٹھے گی۔

شاہ جی نے اپنا سوال دہرایا۔ ”شہر یا ر! تم نے بتایا نہیں، اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟“

”جا چا کہہ رہا تھا کہ وہ حیات خان سے ادھار مانگے گا۔“

”مجھے حیات خان سے توقع نہیں ہے۔“

تو قہر تو مجھے بھی نہیں تھی، بھی کہا۔ ”شاہ جی! آپ کوئی راہ دکھائیں ناں!“

”سوچوں گا، پھر کچھ کہہ سکوں گا!“

اس کے بعد ہم کافی دیر تک بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں

کرتے رہے۔ کیا وہ کے لک بھگ اسے نیند ستانے کی تو میں نے کھر کا راستہ لیا۔ بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اس کے آنے یا نہ آنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ہمارے گاؤں میں سوائے ہماری برادری کے چند بڑے گھروں، جیت شاہ کے مزار اور سرکاری اسپتال کے، کسی گھر تک بجلی نہیں پہنچی تھی۔ بد قسمتی سے یہ سرکاری اجالے ہماری دسترس سے بھی نہیں دور تھے۔ سردار حیدر خان نے صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر گھر گھر میں بجلی پہنچانے کا وعدہ کیا تھا، بڑھ چڑھ کر تقریریں کی تھیں مگر ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ وہ جب بھی نور پور آتا، لوگ وعدے کی تکمیل کا مؤذبانہ تقاضا کرتے مگر ابھی تک وعدہ وفا نہیں ہوا تھا۔

کھالا حب معمول شام کو مجھ سے ملنے کے لیے آیا تو خاصا پرجوش دکھائی دیا۔ میں نے پوچھا ”غیر تو ہے کھالے؟“

آج بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔“

اُس نے میرے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا۔

”ہاں یار! مجھ، لاٹری نکل آئی ہے۔“

ہم دونوں گھر سے نکل کر حیات خان کی حویلی کے پچھواڑے واقع کپے کھالے کے نکلے (کنارے) پر آنے

سائے بیٹھ گئے۔ ہم عموماً اس جگہ پر آن بیٹھے تھے اور دن بھر کی کارگزاری پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا

”کیسی لاٹری؟“

”افنی کی وحلقی برقی اُس کی آنکھوں میں چمک اٹھی،

بولا۔ ”کسی سے ذکر تو نہیں کرو گے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟“

وہ بولا۔ ”نہیں مگر اس امانت کا بوجھ نہیں بھاری ہے۔“

”میرا حوصلہ بھی تم نے آزار کھا ہے کھالے!“

”وہ تو جھیک ہے مگر.....“

میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔ ”اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں تو دل کی بات دل میں ہی رکھو۔“

وہ عجیب ادھیر بن میں پڑ کر مذہب کا شکار ہو گیا۔

جوتے اتارے، پاؤں کھال کے میالے پانی میں ڈالے اور

تھرکانے کے سے انداز میں جھٹکنے لگا۔ مجھے اُس کا مسرت آمیز اضطراب بری طرح کھلنے لگا۔ میں نے قدرے نفی سے کہا۔ ”میں نے کہا ہے کہ مجھے شریک راز مت کرو مگر یہ

نہیں کہا کہ یوں سر جھکا کر بیٹھ جاؤ۔ تم اپنی نکلنے والی لاٹری کے علاوہ کوئی اور بات تو کر ہی سکتے ہو، کرو ناں۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”بتاتا ہوں یا راز سارے بھی نہیں کر

سکتے ہو؟“

میں خاموش ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ مجھے کچھ بتائے، نہ بتائے، پھر از خود فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔

”اس کا کو جانتے ہوتاں؟“

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اسا!“

”ہاں اسسا..... سردار حیدر خان کی بیٹی..... وہی جو ملتان میں پڑھتی ہے۔“ اُس کا لہجہ راز دارانہ ہو گیا۔

”ہاں یار! جانتا ہوں اُسے، پر یہ بتا کہ ہوا کیا ہے؟“

”یہ پوچھ کہہ کیا نہیں ہوا ہے؟“

میں نے زچ ہو کر پوچھا۔ ”اچھا چلو یونی سکے۔ یہ بتا کہ کیا نہیں ہوا ہے؟“

وہ مزید میرے قریب ہو کر سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”اُس نے مجھے سردار حیات خان کی نوکری چھوڑنے کا

کہا ہے۔“

مجھ پر مایوسی کا شدید حملہ ہوا۔ کھودا پہاڑ، نکلا چوہا۔ میں نے غم آکٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یار! یہ بات تو وہ پہلے

بھی کئی مرتبہ مجھے کہہ چکی ہے۔“

”سن تو سکی یار!“ وہ مادانے تکلفی سے میرے کندھے پر

ہاتھ مار کر بولا۔ ”اب کی بار اُس نے مجھے تنبیہ کی ہے کہا ہے۔“

”پہلے تو ل کر تھی کئی؟“ میں نے جھٹ سے پوچھا۔

اُس نے ایک شکایت بھری نظر سے مجھ دیکھا۔

”تو اُس کی بات مان لو ناں، کون روکتا ہے تجھے؟“

میں نے بے دلی سے کہا۔ ”اُس سے یہ بھی پوچھ لیا ہوتا کہ یہ

نوکری چھوڑ کر کیا کروں، کیا کھلے میں ذھول ڈال کر شادی

بیاہ پر خسروں کی طرح ناچوں یا گھر میں باپ کے ساتھ بیٹھ کر لوہا کوٹوں؟“

”ہا! ناچوں، لوہا کوٹوں!“ اُس نے منہ بنایا، پھر اپنی

ترنگ میں لوٹ آیا۔ ”بہی تو خوشی کی بات ہے کہ اُس نے

مجھے ملتان بلا لیا ہے۔ وہاں اُس نے میرے لیے اس سے

کہیں بھرتو نوکری تلاش کر رہی ہے۔ سچ شہرے! زندگی کا مزہ

آجائے گا۔“ کھالے کے انگ انگ سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔

مجھے خاموش پا کر اُس نے پھر میرا کندھا ٹھونکا

”اوئے! تجھے سانپ سوگھ گیا یا زبان پر تالا لگ گیا، بولنا

کیوں نہیں ہو؟“

مجھے اُس پر افسوس ہوا۔ میں نے ملامت آمیز لہجے میں

کہا۔ ”اوئے! کھالے! تو ایک لڑکی کی خاطر اپنے ماں باپ،

بہنوں اور ہم سب کو چھوڑ جانے کا اور تجھے ذرا دکھ بھی نہیں

ہوگا۔ ہیں؟“

وہ ہنرگاہ گیا۔ ”میں اس کے لیے نہیں، زیادہ پیسوں والی نوکری کے لیے ملان جا رہا ہوں۔ حیات خان مجھے اسی روپے روزانہ دیتا ہے۔ میں بچپن میں روپے کی پچھلی گج جاتی ہے۔ اس بات پر بھی کہ وہاں میری تنخواہ پانچ ہزار ہوگی، پانچ ہزار۔“ اُس نے منہ کھنکھرتا ہوا انداز میں اپنے دائیں ہاتھ کی پانچ انگلیاں، دونوں آنکھیں اور منہ پوری وسعت میں کھول کر کہا۔ ”روٹی پانی بھی مالک دیں گے۔ کچھ نہ کچھ اوپر سے بھی بن جایا کرے گا۔“

”یہاں بھی تم اچھی خاصی نوکری کرتے ہو، پیسا کما تے ہو اور ہر رات اپنے گھر میں گزارتے ہو۔ سردار حیات خان تمہیں اپنا پتر کھتا ہے اور کسی بھی شے کی نہیں آنے دیتا۔ پھر بھی تم اپنی خوشی کے ساتھ ملتان جانے کی خبر سنارہے ہو؟“ میرا غصہ فزوں ش ہو گیا۔

”سمجھانے کے بجائے مجھے کی کوشش کرو بے وقوف انسان! میں ایک دو روز میں ملتان چلا جاؤں گا۔ کل صبح حیات خان سے بات کر کے اپنی جگہ پر چھوٹے لیکن پرکھوا دوں گا۔ موع میل کرنا اور اپنے بار کھالے کو دعائیں دینا کہ تجھے پیسے بھائے اچھی خاصی نوکری مل گئی۔“ اُس نے اچھی خاصی نوکری پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”بکواس نہ کرو تم کہیں نہیں جاؤ گے“ میں نے فیصلہ نہ کیا۔ ”تم مجھے ملتان جانے سے کیوں روکتے ہو؟“ وہ استہزاء سے لہجے میں بولا۔ ”میرے دل کی دنیا موع میں ہے، تم جانو، نہ جانو، میرے فخر نہیں پڑتا۔ یہاں چوری چھپے اسما سے ملاقات ہوتی ہے، وہاں جب جی چاہے گا، مل لیا کروں گا۔ یہ کوئی معمولی بات ہے؟ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ ترقی کرنے کے لیے اپنا گھر بار چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس آبا سے بات کر لی ہے۔ جب میں نے انہیں تنخواہ کے بارے میں بتایا تو مارے خوشی کے اُن کی باپجی کا نونوں سے جا لگیں۔ ایک تم ہو کہ میری خوشی دیکھ کر کالے سیاہ ہو گئے ہو۔ ہے نا!“

کوئی جواب دیے بغیر، میں نے اُس کے چہرے پر خوشی کے اُن گنت عکس، جوش اور پیمان کی ملی جلی کیفیت دیکھ کر اپنا سنا ہوا فیصلہ واپس لیا اور خاموشی کی چادر اڑھ لی کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ وہ اپنی سستی میں مست، اپنی محبت کی الوہی ترک کے بہاؤ میں رقصاں کافی دیر تک مسرت بھری ہنسی ہنسی کرتا رہا، خواب بٹا رہا اور میں ”ہاں، ہوں“ میں جواب دیتا رہا۔ گاؤں میں اندھیرا پھیلنے کے

ساتھ ہی ہماری محفل آج گئی۔

بے رشتی کے ساتھ کھانا کھا یا اور چار پائی پر لیٹ گیا۔ پروین دودھ کا بھرا ہوا پیالہ ہاتھ کر چلی گئی اور میں جاندے طور سے دودھ بھرے پیالے میں ابھری ہوئی اسما کی شیبہ میں کھو گیا۔ دودھ حلق سے اُترنے والی توانائی تھی۔ اسما آنکھوں کے راستے تر کر کر دل کی گہرائیوں تک کو چھیدنے والے حسن کا نام تھا جو دل سے اُترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس میں کوئی شیبہ نہیں تھا کہ وہ آواز دیتی، کھالانوکھا، دنیا کا مضبوط سے مضبوط تر مرد بھی خود کو صدائے حسن کی کشش کے ہاتھ میں گروی رکھ چھوڑتا، تنہم جاتا۔ میں جب اُسے کھالے کے لیے بے چین دیکھتا تو اک بے نام ساحب میرے روم روم میں بھر جایا کرتا تھا۔

سردار حیدر خان نور پور کے نمبردار حیات خان کا دور پار کا رشتہ دار تھا۔ بڑے کروڑ والا آدمی تھا۔ قریشی موڑ سے تین کلو میٹر کے فاصلے پر واقع بلوچ موڑ کے اطراف کی تمام تر اراضی اُسی کی ملکیت تھی۔ میرے مختا اندازے کے مطابق وہ کم و بیش پچاس مربع زمین کا مالک تھا۔ صوبائی اسمبلی کے ہر انتخاب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ اب تک دوسرے مرتبہ بن چکا تھا۔ اس سال بھی وہ اپنے رواجی حریف کو ہینچا ڈر اسمبلی میں ہینچ گیا تھا۔ باوجود کہ وہ اس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا تھا، وہ حکومت بنانے میں ناکام ہوئی تھی، اُس کے اختیارات اور رسوخ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی پارٹی حزب اختلاف میں آ جانے کے باوجود خاصی مضبوط تھی۔

بلوچ موڑ سے تقریباً دو کلو میٹر کے فاصلے پر اُس کی عالی شان کوٹھی، اُس کے جاہ و جلال کا استعارہ، مزک پر سے دکھائی دیتی تھی۔ کوٹھی کے اطراف میں چونکہ اُسی کی اراضی واقع تھی، اُس لیے بلوچ نگر، سردار حیدر خان کی بستی میں صرف اُس کے مزرائین اور نوکر چاکر ہی رہائش پذیر تھے۔

گاؤں کے ہر گھر وہ سردار حیات خان اور دو یام خان کے پاس آتا رہتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں اُس کی حریف سیاسی پارٹی کے فعال کارکن ابان اللہ قریشی کی بھی بڑی سی حویلی واقع تھی جہاں اُس کے مخالفین مینے میں ایک آدھ چکر لگا لیا کرتے تھے۔ انتخابات کے دنوں میں کئی مرتبہ نور پور میں دونوں پارٹیوں کے کارکن دست و گریباں بھی ہو چکے تھے۔

میں نے ایک انتخابی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتا تھا۔ یہیں کہیں اُس کی نظر حیدر خان کی پر شکوہ کوٹھی کے باغ پر پڑتی۔ سردار حیدر خان کی بیٹی، اسما حیدر پر کھالے کی نگاہ یوں پڑی کہ پلٹنا بھول گئی۔ جب اُس نے میرے سامنے اس کے مادر پائی حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے تلانے تو اُسے دیکھنے کا جس مجھ میں بلورے لینے لگا۔ چونکہ انتخابی دنوں کے علاوہ کھالے کا بلوچ نگر میں آنا پانا نہیں تھا، اس لیے میری یہ خواہش پوری ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے کھالے کو کھایا کہ وہ اس نظر بازی سے پرہیز کرے۔ سردار حیدر خان بہت ظالم فطرت و ذرا تھا۔ وہ اپنے غصے اور جلال کی تاب خود بھی برداشت نہیں کرتا تھا، کھالے کے لیے معافی کی محتاش کہاں رکھتا؟ مگر کھالے کے سر پر نہایت غیر فطری اور ناموزوں عشق کا بحوت ایسے چڑھا کہ اُس نے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا بلکہ سر پٹ اندکی راہوں پر دوڑنا چلا گیا۔

اُس نے کھوج نکال لی۔ پتا چلا کہ اسما ملتان میں پڑھتی ہے۔ وہ گاؤں سے آگے اُس کا دیدار کرنے کے لیے ملتان جانے لگا۔ وہ کالج کے گیٹ سے کچھ دوری پر جا کھڑا ہوتا۔ چنچھی ہونے پر سلور کورکٹی چمکدار گاڑی کے خیشوں میں متعبد حسن کا لالچی دیدار کرتا اور دھڑکتی آہیں بھرتا ہوا لوٹ آتا۔ مجھے وہ دن بے خوبی یاد ہے جب اس نے ایک شام مجھے مایوسی آمیز لہجے میں کہا تھا۔ ”شہرے! آج کہتے ہیں، اپنے سے بڑے کی نہ باری ہو سکتی نہ دھڑکی۔ اگر وہ نور پور میں رہنے والی ہوتی یا قریشی موڑ کی، تو میں اُسے جی بھر کے دیکھ لیا کرتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اب تک راہ و رسم بھی پیدا کر چکا ہوتا۔ وہ بڑے گھر کی کڑی ہے۔ دیکھنے سے شبلی ہوتی ہے۔ اُسے جی بھر کے دیکھنے اور چھونے کی حسرت میں تمہارا یاد کھالہ دنیا سے گزر جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”جب تمہیں اپنی اوقات کا علم ہے تو کیوں چاند کو چھونے کی خواہش کرتے ہو؟“

”مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں ہے۔“

”کب تک ملتان کی خاک چھانتے رہو گے؟“

”جب تک وہ جانی رہے گی۔“

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس کی شادی ملتان میں ہی ہو جائے۔ پھر؟“

”تو کیا ہے؟ اب بھی جاتا ہوں، دیکھ کر پلٹ آتا ہوں۔ تب بھی جایا کروں گا اور اُس کی ایک جھلک دیکھ کر آ جایا کروں گا۔“

”اُس سے نہیں حاصل کیا ہوگا؟“ میں مجب ہوا۔

”مجھے حاصل کی پروا نہیں۔“

”مجھے تو شاید اپنی اور اپنے خاندان کی عزت اور سلامتی کی بھی پروا نہیں ہے۔“ میں نے قدرے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔

”اگر سردار حیدر خان کو پتا چل گیا تو وہ تجھے اور تیرے گھر بار کو آگ لگا دے گا۔“

”اُسے کیسے پتا چلے گا؟“ وہ عام سے لہجے میں بولا۔

”میں نے اس کا ذکر سوائے تمہارے، کسی سے بھی نہیں کیا اور نہ ہی بھی کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ عزت کے معاملے میں سردار حیدر خان اور اُس کا خاندان کتنا ظالم اور سخت گیر ہے۔ ویسے بھی، میں نے بھی اس کا مطلب نہیں کیا، کبھی چھیڑنے کی کوشش نہیں کی، پھر اُسے کیا شایہ ہوگی؟ کسی کو دیکھنا تو کوئی جرم نہیں ہے۔“

مجھے اُس کے حماقت آمیز رویے پر ڈکھ ہوا۔ جب کبھ لیتا دینا ہی نہیں تھا تو پھر خود کو اس عذاب میں ڈالنے کی ضرورت کیا تھی۔ میں نے کہا۔ ”دیکھ کھالے! سردار حیات خان اور امیر نواز کے سامنے بھی بھول کر بھی حیدر خان کے گھر کی بات نہ کرنا ورنہ وہ تمہیں اتلا لٹکا دیں گے۔ تم نے دل لگانا ہی ہے تو کوئی ہم پلہ لڑکی دیکھو۔ اُس کی یادیں آں بھرہ جس تک تمہاری آہ کا اثر پہنچ سکا ہو۔ اُسے شوق سے دیکھو جس تک تمہاری نظر کی حدت پہنچ سکتی ہو۔ میں تو ویسے بھی عاشقی معشوقی کے معاملات کو اچھا نہیں سمجھتا، ایسے نامعقول رومانس پر سوائے سر ہینے کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ خود پر دم گرد، اپنے خاندان کی فکر اور سکون کے ساتھ روزی کھاؤ۔ یہ جو تم پیٹے پلاتے ہو نا، یہ وہی کچی کا نشہ کرتے ہو نا، اس سارے خراپے کی جڑ یہی ہے۔ یہی نشہ تمہیں ایک نہ ایک دن لے ڈوبے گا۔ تمہیں ہوش نہیں رہتا۔ کیا کہنا ہے، کیا نہیں کہنا ہے، سدھ نہیں رہتی۔ نشے کے شمار نے تمہیں پاگل کر رکھا ہے اور تم اسما، اسما کا ورد کرتے رہتے ہو۔ بھی امیر نواز کے سامنے تمہارے لبوں پر یہ نام آگیا تو بھجھو قیامت آگئی۔“ اُس نے بے پروائی سے کہا، ”اللہ مالک ہے۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا، خواہ وہ دل ڈرانے والی باتیں نہ کرو۔ تم ایسا کرو کہ مجھے اپنی خوبصورت لکھائی میں ایسا خط لکھ دو جسے پڑھتے ہی اسما کی آنکھیں کل جائیں اور۔۔۔۔۔“ ”اور اُس کے باپ کی توپوں کا منہ بھی کل جائے۔۔۔۔۔“ ”ہے نا؟“ میں نے اُسے ڈانٹا۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ کھالے نے بڑا سا منایا۔ ”تم

حسب عادت بیٹھ کر خوش گپیاں کر رہے تھے کہ یک لخت کھالے کے منہ سے پھوٹا۔ ”شہرے! مزے کی بات سناؤں؟“

”میں متفہم ہوں۔“ ”ہاں، ہاں! کیوں نہیں۔“

”میں نے آج اسام کو جی بھر کے دیکھا ہے۔“

”کہاں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”مکان میں اور کہاں!“ وہ بولا۔ ”میرے عین سامنے

سڑک پر اُس کی گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا۔ ڈرائیور تازہ بدلتے

لگا۔ وہ گاڑی کا گیٹ کھول کر سڑک پر آ گئی۔ کچھ دیر کھڑی

ٹائر کو دیکھتی رہی، میں اُسے دیکھتا رہا، پھر وہ دوبارہ گاڑی میں

بیٹھ گئی۔ میں بت کی طرح کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اوئے

شہرے! ایمان سے بچ کہہ رہا ہوں، اُس نے بھی مجھے بڑے

غور سے دیکھا تھا۔ اُس کے دیکھنے سے مجھے یوں لگا تھا جیسے

چار سو چالیس ولٹ کا کرنٹ لگا ہو، جیسے میرے بدن کا سارا

خون چڑ کر میری آنکھوں میں آ گیا ہو۔ غور سے دیکھا تو پتا

چلا کہ اُس کے جسمی تو پوری دنیا میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ اتنے

لبے لمبے سیاہ بال..... مونی مونی کا لالی آنکھیں..... سیبوں کی

طرح لال لال گال.....“

”اچھا اچھا..... زیادہ تعریف مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ اُس

نے تمہیں پہچانا تو نہیں؟“

”کیا مطلب؟“ وہ حیرانی سے بولا۔ ”اُسے کیا پتا، میں

کون ہوں؟ جب میں نے بلوچ نگر میں اُسے دیکھا تھا تو وہ

گاڑی سے اتر کر حویلی کے بڑے پھانک میں داخل ہو رہی

تھی۔ اُس نے یقیناً مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھا بھی تھا تو

اتنے آدمیوں میں اُسے میری شکل کہاں یاد رہی ہوگی۔“

”تم تو کہا کرتے تھے کہ ہو سکتا ہے وہ بھی تمہیں یاد کرتی

ہو؟“ میں نے غصے سے کہا۔

”وہ تو میں ایسے ہی کہتا تھا۔ لیکن آج وہ ضرور میرے

بارے میں سوچ رہی ہوگی۔“

”وہ کیوں؟“

”آج اُس نے مجھے غور سے دیکھ کر جویا ہے۔“

”تب تو وہ ڈر کے مارے کانپ رہی ہوگی۔“

”کیا میں اتنا ہی بد صورت ہوں؟“

”تو اور کیا تم خوب صورت ہو؟ مجھے یقین ہے کہ

تمہارے بچے بھی تمہیں دیکھ کر ڈر کے مارے ماں کی گود میں

چھپ جایا کریں گے۔“ میں نے کہا۔

اُس نے تہہ لگایا۔ ”وہ نہیں ڈریں گے شہرے خان!“

”کیوں؟“

سردار حیدر خان سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟ انسان ہی تو ہے وہ۔ کیا ہے؟ اُس کی بیٹی کیا عورت نہیں ہے؟ کیا اُس کے سینے میں دل نہیں ہے یا وہ کسی سے پیار نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے، جیسے میں اُس کے بارے میں دن رات سوچتا رہتا ہوں، وہ بھی میرے بارے میں دن رات سوچتی ہو۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ لکھنویوں میں رہنے والی امیر زادیوں کے تعلقات ہمیشہ اپنے ڈرائیوروں کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔ بعض گھروں سے بھاگ کر شادیاں بھی کر لیتی ہیں اُن بے اوقات نوکروں کے ساتھ۔“

میری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں خوف کی ایک سرد لہر میرے بدن میں اتر گئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس حد تک آگے نکل چکا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے آگے جوڑ دیے۔ ”کھالے! مجھے معاف کر دے بھی، اپنے گھر والوں کو معاف کر دے..... تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تو پی پی کر پاگل ہو گیا ہے اور اگر تیرے شغل میلے کی کیفیت یہی رہی تو وہ دن دور نہیں، جب نور پور کی گلیوں میں تجھ پر بچے پتھر مارا کریں گے اور تو ننگے پنڈے ادھر ادھر دوڑا پھرے گا۔ اسام کو مت دیکھ، اپنی اوقات کو دیکھ۔ اپنی شکل و صورت اور اپنی حیثیت پر نگاہ ڈال۔ تجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے جس کی بنیاد پر تجھے کوئی پڑوسی لکھی عام سی لڑکی بھی چاہے۔ وہ تو پھر بڑے گھر کی لاڈلی بیٹی ہے۔ وہ تجھے زندہ زمین میں گاڑ دے گی یا کسی دیوار میں چنوا دے گی۔“

وہ اپنے مخصوص بے نیازانہ انداز میں گویا ہوا۔ ”پر وہ نہیں..... میں پہلا آدمی نہیں ہوں گا جسے زمین میں گاڑا جائے گا یا دیوار میں چننا جائے گا۔ عشق تو عشق ہے، کبھی ایسی دھمکیوں سے خوفزدہ نہیں ہوا۔ تم اگر میرے بچے یار ہو تو مجھے اُس کے نام پیارا سا خط لکھ کر دو، یہ اگر نہیں کر سکتے تو اپنی زبان بند رکھو اور مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔“

میں خاموش ہو گیا۔ اُس کے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ یہ بلا جس کا سر پر پڑھ جائے، ارد گرد کی سوجھ بوجھ ختم کر دیتی ہے۔ اُسے سمجھانے کا عمل میں نے گاہے بگاہے جاری رکھا۔ بات بے بات اُس کی مرمت کرتا مگر میں جوں جوں اُسے باز رکھنے کی کوشش کرتا، توں توں اُس کا جنوں شدت اختیار کرتا گیا۔ میں تا تجر بہ کاری میں اُس کے شوق کو ہمیز کرتا گیا۔ ایک ماہ بعد کی بات ہے۔ ہم شام کا دھندلک گزرنے حیات خان کی حویلی کے پچھواڑے پختہ کھال کے کتے پر

”اس لیے کہ وہ میرے بچے ہوں گے، مجھ پر ہی جائیں گے بلکہ مجھ سے بھی دو چار قدم آگے ہوں گے۔“

اُس کی زبان شوق پر اس کی خوب صورتی اور خوش لباسی کے نہ ختم ہونے والے تذکرے چمک گئے۔ آنے والے کئی دنوں تک وہ جب بھی ملتا، اسی نازن کا قصہ چھیڑ لیتا۔ وہ کیسے چلتی ہے، وہ کیسے دکھائی دیتی ہے اور باتیں کرتی ہے تو اُس کے نین و نقوش کیسے مقابل کے ساتھ گویا کی چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔

میں اُس سے مذاق کرتا۔ ”ابھی تو تم نے محض اُسے ایک نظر دیکھا ہے، اگر کسی حسن اتفاق سے مل بیٹھو تو پھر کیا ہوگا؟“

روز بہ روز اُس کی دیوانگی فرسوں تر ہوتی گئی۔ مجھے یہ اندازہ تھا کہ اُس کا جنوں، محض لجاجتی اور جذباتی ہے۔ جب بھی اُسے اپنی اور اس کی حیثیتوں کے مابین حامل فرق کی آگہی ہوگی، مایوس ہو کر پلٹ آئے گا اور پھر بھی اُس کا نام بھی نہیں لے گا اس کا باپ لوہار تھا۔ نور پور کے زمینداروں کا بچہ تھا۔ پاکستان کے دوسرے تمام زمینداروں کی طرح نور پور کے زمیندار بھی اپنے مقرر کیے ہوئے سکین لوگوں کو ایک حد تک قریب آنے دیتے تھے۔ بلاشبہ کھالے اور اُس کے باپ کا ہر گھر میں کھلا آنا جانا تھا اور کسی گھر میں بھی اُن سے پردہ نہیں کیا جاتا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ انہیں اپنا ہم سر قرار دیا جاتا تھا۔

یہی صورت حال سر دار حیدر خان اور اُس کے خاندان کی تھی۔ وہ خاندانی پس منظر کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ اس پر مستزاد اُس کا صوبائی اسمبلی کا ممبر بن جانا تھا۔ اس کی جواں سال بیٹی ملتان کے کالج میں پڑھتی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ وہاں کیا پڑھتی ہے مگر یہ ضرور اندازہ تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ہی وہاں مقیم ہوگی۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ عام سے خردوخال والے سانولے لوہار کے لیے اپنے دل میں نرم جذبات پالتی۔ یہ بعید نہیں تھا کہ اگر کبھی کھالا اپنی اوقات سے اوپر اُٹھ کر اُسے دیکھنے کی غلطی کرتا تو وہ اپنے باپ کے کارندوں کے ذریعے اُسے بالکل اوپر انخواب دیتی۔

میں نے یہ باتیں وقتاً فوقتاً کھالے سے بھی کی تھیں۔ اُسے سمجھانے کی بہتری کی کوشش کی تھی مگر اُس کے پاس اپنے موقف پر ان گنت جذباتی استدلال تھے۔ مجز بہ کہ وہ کبھی استدلال کتابی تھے، وہ بہ ضد تھا کہ ممکن ہے کہ اس اُس کے جنون و محبت اور شوق کو دیکھتے ہوئے مائل ہو جائے۔ وہ اعتقالات کی جنت میں رہنے والا تو نہیں تھا مگر نہ جانے اُس کی ذہنی و روحی قدر کیوں چمک نہ گئی۔

ہم دونوں جب بھی حیات خان کی حویلی کے پچھواڑے سینٹ والے کٹے پر بیٹھے، بلا ارادہ اس کا تذکرہ چھڑ جاتا۔ ہم نے ہمیشہ سے احتیاط برتنی تھی کہ امیر نواز یا سردار حیات خان کے کسی بھی عزیز کی موجودگی میں اس کا تذکرہ نہ چھڑے۔ ہم اس پیش بندی پر بہ حسن و کامیابی گامزن تھے۔ یہ بھی ہوا تھا کہ کھالے کی باتیں سن کر میرے من میں اس کا دیکھنے کا تجسس حد سے تجاوز کر گیا تھا اور میں گا رہے بہ گاہے اُسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار بھی کرنے لگا تھا۔

ایسے میں کھالا بڑی شکست خوردہ سی آواز نکالتا۔ ”یار! میں ابھی خود دیکھنے سے عاری ہوں، تمہیں اُس ماہ جبیں کا دیدار کیسے کروا سکتا ہوں۔ میرے لیے دعا کرو، وہ مجھے اپنا دیدار بخش دیا کرے، میں تھوڑا بہت حصہ تجھ تک پہنچا دیا کروں گا۔“

میں نے فہلا اُس کے شوق و دیدار کی آبیاری کے لیے کیا دعا کرنا تھی البتہ اُس کی خیریت اور سلامتی کے لیے دل ہی دل میں دعا گو رہتا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ ستائے رکھتا تھا کہ اُس کی ایک طرف نظر بازی کا قائل اگر حیدر خان یا اُس کے خاندان کے کسی فرد کو ہو گیا تو اُس کی تکد بونی کر دی جائے گی۔ کھالا یا کھالے کا غریب خاندان اُس فرعون صفت وڈیرے کا مقابلہ کرنے کی شکست نہیں رکھتا تھا۔

ایک صبح کھالا مجھے لینے کے لیے میرے گھر پہنچ گیا۔ اُس کا کنڈیکٹر سفید و پتھر ہو گیا تھا۔ اُس کے داہیں گھٹنے کی چھنی ہڈی کے عین اوپر چھنی گھل آئی تھی جس کی وجہ سے اُس کا چلنا پھرنا یکسر موقوف ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی چھنی کی وجہ سے ہی اُسے بخار نے آن لیا اور وہ چار پائی کا ہو کر رہ گیا۔ کھالا مجھے اپنے ساتھ یہ طور کنڈیکٹر دو چار روز کے لیے رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے دیکھی نہیں تھی مگر کھالے کی منت سماجت پر اُس کی مدد کے ارادے سے اُس کے ساتھ چل پڑا۔ ویکن پر سامان لادنے اور سواریاں بٹھانے کے مشکل کام میں اُس نے میری رہنمائی کی۔ مجھے کرایہ وصول کرنے کے ذریعے اصول بتائے۔ نور پور سے قریبی موڈ تک دو بڑے اسٹاپ تھے۔ پہلا اسٹاپ نوری چوک تھا۔ کوٹ ادو سے قریبی چوک جانے والی بڑی سڑک پر نور پور کی لنک روڈ تھیں اُن ملتی تھی۔ کہنے کو یہ چوک تھا مگر یہاں تین سڑکوں کا اتصال ہوتا تھا۔ چھٹی سڑک تھیں تھی۔ یہ نور پور سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر بلوچ موڈ تھا۔ قریبی موڈ یہاں سے مزید تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ ان بڑے اڈوں کے علاوہ چند ایک چھوٹے چھوٹے اسٹاپ بھی

واقع تھے۔ ویسے تو نور پور وادی اس کھلا روٹین کے ہر مسافر کو حق حاصل تھا کہ وہ جہاں چاہتا، ویکن کوڑا سکتا تھا۔

نوری چوک پر واقع خستہ حال ”ٹنک ہوٹل“ کے برکنڈوں کے بنے ہوئے چھپر کے عین سامنے کھالے نے ویکن روکی۔ ہوٹل والے کا تھا کارندہ جانے کا پیالہ تھا۔ بھانسا ہوا آیا۔ کھالے نے ڈپٹ کر کہا۔ ”چل اوئے“

”ایک پیالہ اور پکڑ۔۔۔۔۔“

میلے چیکٹ پکڑوں میں مایوس لڑکے نے الٹے ہیروں دوڑ لگا دی۔ کھالے نے ”پائلٹ گیت“ کھولا، اشارے سے مجھے اپنی جانب بلایا اور ایک آنکھ ڈھک کر بولا۔ ”شہرے ادعا کرے۔ ہیر کا دن ہے، بلوچ موڈ پر عمل پری کا دیدار نصیب ہو جائے۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”ہیر کا دن خاص ہے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ ہفت کی شام کو کھر آتی ہے۔ ہیر کی صبح کو ملتان جاتی ہے۔ کبھی بھی بلوچ موڈ پر یا قریبی موڈ تک نہیں راستے میں مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے۔“

میں نے دل ہی دل میں اُس پر چار حرف بھیجے اور ہوٹل والے لڑکے کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ تھام کر چکیاں لینے لگا۔ ایسے میں ویکن میں مقید سوار یوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ وقت کی کمی کا رونا رونے لگے۔ کھالا جب مراتب اُن کا کی تو شیخ کرنے لگا۔ مجھے کھالے کا رویہ کھلتا تھا مگر وہ جواباً ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا۔ ”تم اُن لوگوں کو نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ ان کے ساتھ ہمیز اور ادب کے ساتھ بات کرو تو یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کر رکھو تو سیدھے رہتے ہیں اور بھی پریشانی کا سبب نہیں بنتے۔“

چائے کا پیالہ حلق سے اُتارنے کے بعد کھالا اپنی ’پائلٹ سیٹ‘ پر بیٹھ گیا۔ اُس کی ڈرائیونگ نشست بھی عجوبہ تھی۔ سیٹ کا فوم بیٹھ گیا تھا اور سیٹ کی اونچائی کو برقرار رکھنے کے لیے کھالے نے اپنے گھر سے ایک سرہانہ اٹھا کر یہاں رکھ دیا تھا۔ پھر سیٹ کی ٹیک بھی پیچھے کی طرف جھک گئی تو ایک سرہانہ وہاں پر بھی رکھنا پڑا۔ میٹوں تک نہ دھلانے کی وجہ سے دونوں سرہانوں کا اصل رنگ سیل میں چھپ گیا تھا اور وہ سیاہ انفیونی رنگت اختیار کر چکے تھے۔ سن ستر ماڈل کی فورڈ ویکن کی رفتار کی حد بھی یہ مشکل چالیں پیچاس ہی تھی۔ کبھی یہ چاروں طرف سے بند ہوا کرتی تھی۔ باڈی گھل گئی تھی تو اس پر ملتان کے ایک باڈی میکر سے ڈال لیا باڈی بنا کر رکھ دی گئی تھی۔ یہ شتر خریہ ویکن دیکھنے کے لائق تھی اور اس روٹ پر یقیناً کسی ہی ویکن کی ضرورت تھی۔

بلوچ موڈ پر پہنچ کر کھالے نے پھر بریک لگا دیے۔

مجھ پر دیر زری، ایک مسافر نے وہین کے اندر سے ہی چلا کر کہا۔ ”کھالے! استاد! دور دور تک کوئی سواری دکھائی نہیں دیتی، چلتے رہو۔“

کھالے نے اک نگاہ غلط اُسے دیکھا اور مغرب کی جانب جاتی سرسبز سڑک پر ٹکا نہیں نکالیں۔ چندا بنے بعد اُس نے آواز لگائی۔ ”شہرے! اذرا نازوں کی ہوا چمک کر لے۔ مجھے لگتا ہے کہ کنڈیکٹر سا نڈالا نڈا گڑبڑ کر رہا ہے۔“

میں اُس کی پیشہ وارانہ چالاکی کو سمجھ گیا۔ طوعاً و کرہاً ویکن کے پچھلے بھر سے آڑا باری باری چاروں نازوں کو ہاتھ سے ٹھونک بجا کر ہوا کی کی کا جائزہ لیا۔ کچھ وقت یوں گزر گیا۔ کھالے نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ مجھ سے رپورٹ لینے میں کچھ گھڑیاں بیت گئیں۔ ایسے میں اُس کی دعا کی قبولیت کی گھڑی آگئی۔ دور مغرب میں کار کے آثار دکھائی دیے۔ چند لمحوں میں کار بلوچ موڈ پر پہنچ گئی اور ڈرائیور ادھر ادھر دیکھ کر کار کو مین روڈ پر چڑھانے لگا۔ کھالے نے میرے پہلو میں ٹھوک دیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر کار کے پچھلے حصے میں جھانکا۔ ایک چاند گاڑی میں سنا دکھائی دیا۔ چندا بیوں کے دیدار نے ہی مجھے یاد کر دیا کہ کھالے نے اس کے بارے میں اب تک جو بھی کہا تھا، وہ کیواس نہیں تھا، عین حقیقت پر مبنی اظہار تھا۔ چونکہ چند تانیوں میں حسن کی محض ایک جھلک، سرخ و سپید رنگت اور وڈیرہ زادی کا کردار ہی ملاحظہ ہوا تھا، اس لیے اُس کے خال و خد بصارت میں ٹھہر نہ پائے۔ کار فرائے بھرتی ہوئی آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مجھے اپنے عقب میں کھالے کے حلق سے پھوٹی آہ کی صدائے موموم ستانی دی اور میں بھاگ کر ویکن کے پھر پر چڑھ گیا۔

کھالے نے شہر بے مہار کی طرح ویکن کو سرپٹ دوڑایا مگر کھالے اور اس کی حیثیتوں میں موجود فرق کی طرح دونوں گاڑیوں کی رفتار میں بھی زمین و آسمان کا فرق موجود تھا۔ ویکن کی باڈی سے مختلف اقسام کی آوازیں نکلنے لگیں۔ مسافر خوف زدہ ہو گئے۔ انہیں جو آیات اور وظائف یاد تھے، چند منٹوں میں اُنہیں پڑھ بیٹھے اور تیز رفتاری کے نقصانات پر بحث کنال ہو گئے۔

میں نے گردن باہر نکالی۔ ویکن کا سائز مرٹو ٹا ہوا تھا۔ آدھا آئینہ موجود تھا، آدھا غائب تھا۔ میں نے آدھے سائز مرٹو جھانکا اور کھالے کو مخاطب کرتے ہوئے چمک کر کہا۔ ”استاد! ہولی چل متان گڈی سڑک اُٹے ای کلیر جاوے۔۔۔۔۔“

کھالے نے پیر کا دباؤ کم کر دیا۔ قریشی موزہ بیچ کر گاڑی اڑے برلنگا کی اور ہم دونوں اک شان بے نیازی کے ساتھ قریشی ہوٹل کے ہمارے (بڑی چار پائی) پر جا بیٹھے۔ میری ران پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر کھالے نے پوچھا۔ ”سنا بھی شہرے! دیکھا اُسے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں..... دیکھا۔“

”پھر؟“ ایک عجیب شوق آمیز سوال اُس کے چہرے سے ہوتا تھا۔

”دکھ ہوا۔“

”کیوں؟“

”میرے بے وقوف یار نے اپنا دل ایسی جگہ پر لگایا جہاں مراد براری کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”تمہاری اوقات دیکھ کر۔“

”کیا وہ میری اوقات کو؟“ وہ جھلا کر بولا۔

”تم جانتے ہو دیکھ سکتے ہو، اُس کی خواہش کر سکتے ہو مگر اُسے کبھی چھو نہیں سکتے۔“

”کیا اس لیے کہ میں غریب ہوں؟“

”نہ صرف غریب بلکہ خاندانی پس منظر اور شکل و صورت کے لحاظ سے اس سے بہت کم تر ہو۔“ میں نے حق گوئی میں اُس کی دل آزاری کا دھیان نہیں کیا۔

وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے کے بدلتے تاثرات پر میری نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ چائے کا آڈر دے کر اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، چند ثانیوں بعد بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”شہرے! میں اُسے حاصل نہیں کر سکتا مگر اُس کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر سکتا ہوں۔ دیکھ لیتا، وہ کیسی میرا نام لے کر ابھیرے گی، مجھے دیکھ کر۔ مجھے میں ہی چاہیے۔“

میں اُس کی حالت زار پر ہنس پڑا۔ اُسے رنج ہوا، بولا۔ ”ہاں! تم بھی مجھ پر ہنسنے ہو۔ جب میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو میں بھی اپنی سوچ پر ہنسنے بنائیں رہتا مگر عشق ذاتیں اوقات میں نہیں پوچھتا، بس ہو جاتا ہے اور مجھے بھی اس سے عشق ہو گیا ہے۔“

عشق پر ہنس میں ایسے ہی تند و تیز ثابت ہوتا ہے مگر عشق کا ثمر ایک جیسا نہیں ہوتا۔ کہیں گل و گھڑا رہ سکتے ہیں، کہیں باؤسوم چلتی ہے تو کہیں پر آگ کے جھلسا دے۔ قدرت کھڑے ہیں۔ کھلا فطرتا ضدی اور آنا پرست واقع ہوا تھا۔ میرے

سمجھانے سے سمجھنے والا نہیں تھا۔ مجھے ہی سمجھنا تھا کہ اُس کے حال پر چھوڑ دینے میں ہی عافیت تھی۔ آنے والے کسی وقت میں اُسے شعور از خود عطا ہو جاتا تھا۔

میں نے اُس کی توجہ بنانے کے لیے شموں کا تذکرہ جمیز دیا۔ پوچھا۔ ”اس کے چکر میں تم اپنی شموں کو بھول ہی ہو۔ کیا اُسے پتا ہے کہ تم نے اپنی راہ بدل لی ہے؟“

اُس نے نیم پیروائی سے کہا۔ ”کبھی کبھی شکوہ کرتی ہے۔ میں نے اُسے سمجھا دیا ہے کہ میری اور اُس کی راہیں الگ ہیں اس لیے مجھے نہ بلایا کرے اور نہ ہی مجھے بھیجا کرے۔“

”کیا شیرے قسانی کو تمہاری اُس عشق کہانی کا پتا چل گیا تھا؟“

”اگر پتا چل گیا ہوتا تو اپنے بڑے سے بعدے کے ساتھ میرے کٹورے کٹورے کر چکا ہوتا اور اب تک نور پور کے آسے کتے میری بوٹیاں ہضم بھی کر چکے ہوتے۔“ اُس نے ہنس کر کہا۔

شیرا قسانی شموں کا باپ تھا۔ وہ بخشو لہاری کا ملحقہ دکان کے آگے گوشت کا پھانگ لگا کرتا تھا جبکہ اُس کا گھر کھالے کے گھر کے سامنے، جنوب مغربی جانب میں کرکٹ کے میدان کے پار واقع تھا۔ عام دیہاتی گھروں کی طرح شیرے قسانی کے گھر کی چار دیواری بھی بلند نہیں تھی۔ صحن میں چلتی پھرتی ہوئی اُس کی بیوی اور بیٹی شمس عرف شموں کی سڑک پر کھڑے ہونے والے ہر فرد کو بے آسانی دکھائی دیتی تھیں۔

کھالے اور شموں کا اٹکھ مکالمہ بھی اسی دستیاب بولت کے سبب شروع ہوا تھا جو ہوتے ہوتے اچھے خاصے پر جوش عشق میں بدل گیا تھا۔ اگرچہ میں اس کا معاملہ کھڑا نہ ہوتا تو اب تک اُس عشق کی وارداتوں میں خاصا اضافہ ہو چکا ہوتا۔ شموں کھالے کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ اُس نے اپنے اور کھالے کے مابین استوار ہونے والے جذباتی تعلق کو ازلی رابطہ سمجھ لیا تھا اور اُس کی ڈولی میں بیٹھنے کے خواب دیکھ رکھے تھے۔

میں نے آنے والے چند دنوں، جب تک شید و تندہ دست نہیں ہوا، کھالے کے ساتھ گزارے اور سمجھ گیا کہ اُس نے اپنی دل چاہی فطرت کو ایک ہی جتو پر مرکوز کر دیا ہے۔ وہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اس کے نام کا ہی ورد کرتے لگا تھا۔

وہ کھالے جو ہر واقعے میں حظ کے پہلو ڈھونڈا کرتا تھا اور ہر دن کی گزران کے لیے نئی جہت تلاش تھا، بالکل بدل گیا تھا۔ اُس کی عادات میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ اُس

کے حوالے سے میرا بھی اس کے ساتھ ایک بے عنوان ربط استوار ہو گیا تھا۔

شیدو کے کھٹنے میں لگی ہوئی پھنسی کی آگ بجھ گئی اور میری جان اُس جاں کش وین سے بھی چھوٹ گئی۔

میں نے بھر بعد سردار ویرام خان کی بیٹی کی شادی سر انجام پائی تھی۔ مجھے سمیت نور پور کے لڑکے والے ویرام خان کے گرد جمع تھے۔ ویرام خان اور حیات خان اپنے اپنے روایتی خاندانی لباس میں ہر ایک کو اُس کی ذمہ داری سمجھا رہے تھے اور بار بار تاکید کر رہے تھے کہ برات کی آمد پر انتظامات بالکل بے داغ ہونے چاہئیں ورنہ نور پور کی عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ ہمیں بخوبی احساس تھا کہ ایسے نازک موقع پر سردار حیات اور ویرام خان کی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کریں گے۔ اُن کے متوقع مہمان اُنہی کے ہم مرتبہ تھے یا اُن سے بھی اونچے شملے والے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کھالے کا چہرہ کسی نامعلوم خوشی کے باعث دک رہا تھا۔ وہ بھاگ بھاگ کر کام کرتا دکھائی دیتا تھا۔ کبھی ڈرائیوں سے ٹنٹ، قاتیں اور شامیانے اتارنے والوں کے ساتھ ہوتا، کبھی دیگوں اور برتنوں کو منہ لانے میں مشغول ہوتا تو کبھی اپنی کھٹار اوٹین کی ڈرائیو تک سیٹ پر براہمان سودا سلف کی پرچی پر نظر سر گاڑے تنہک دکھائی دیتا۔

میں نے چھیڑا۔ ”کیوں بھی خالد محمود آج کوئی خاص بات ہے؟“

اُس نے سوالیہ لگا ہوں سے مجھے گھورا۔

”آج تم بڑے شوق سے شادی کے انتظامات میں جتے ہوئے ہو حالانکہ تم فطرتاً پیار کو پیار سمجھتے اور جان چھڑانے والے شخص ہو۔“ میں نے اُسے ٹٹولا۔

اُس کے گہرے سانولے رنگ پر کئی رنگ جھلما گئے۔

میرے بہت زیادہ قریب ہو کر رازداری سے بولا۔ ”زنان خانے میں اس کا آئی ہوئی ہے۔“

میں نے ایک طویل سانس طلق سے خارج کی۔ اس کی غیر معمولی خوشی کا سبب معلوم ہونے پر میں حیران نہیں ہوا تھا مگر مجھے بتانے جانے سے پہلے اندازہ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

”تم نے دیکھا ہے اُسے؟“

اُس نے بتایا۔ ”ہاں! میں اُسے دو تین مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔“

”کیسے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

اُس نے مجھے بازو سے پکڑا، ٹنٹ کے ایستادہ بانسوں کے چچ میں سے گزرتے ہوئے دارے (ڈنک) کی مغربی

دیوار کے پاس لے گیا اور دیوار کی جانب منہ کر کے زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ تب وہ روزن دکھائی دیا جو اینٹ کے ٹکڑے سے دیوار میں پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے روزن پر آنکھ لگائی۔ چند لمبے دیکھتا رہا پھر ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”وہ دیکھو..... وہ بڑے بڑے کے تیسرے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی ہے۔“

میں نے دیکھا، کچھ لمحوں تک منظر پوری طرح آشکار نہیں ہوا، عمدہ مندی کے آترے ہی ستون کے ساتھ کمر لگا کر کھڑی اس دکھائی دی۔ اُس کا منہ شال کی جانب تھا اور روزن سے دیکھنے پر اُس کے چہرے کی ایک سائز دکھائی دے رہی تھی۔ کھالے نے اچانک مجھے شانے سے دھکیل کر پڑے ہٹا دیا۔ خود آنکھ لگا کر چند لمبے دیکھتا رہا، پھر آنکھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”میں اُسے یہاں سے دیکھتا ہوں کیونکہ ستون کی باڈی کی وجہ سے کوئی مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ نہیں سکتا۔ چلو، اس کی طرف چلیں۔“

ہم دونوں واپس آگے صحن میں بھی ہوئی چار پائیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے ہم عمر، کچھ کم دیش عمر والے، تقویم شدہ کاموں کو باہر تکمیل تک پہنچانے میں سرگرداں تھے۔ آواز پہنچی رکھتے ہوئے کھالے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”میں نے رات کو اس کو ناچتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔“

”آج؟“ میری حیرانی فروں تر ہو گئی۔

”ہاں تو.....“ وہ اپنی آنکھوں کو پوری وسعت میں کھول کر بولا۔ ”ویرام خان کی بیٹی کی منہدی کی رسم کا دھوم دھڑکا رات بھر چلتا رہا۔ باری باری بھی لڑکیوں نے ڈانس کیا، ڈھولک بجی اور خوب دھما چوڑی ہوئی۔ میں یہاں پانی چھڑکنے پر مامور تھا۔ پانی والا پائپ درست کرنے کے بہانے بار بار ستھنے کی باڈی کے پیچھے چلا جاتا اور روزن سے جھانک کر اُسے دیکھتا۔ اچانک لڑکیوں نے اُس سے ناچنے کی فرمائش کی جو اُس نے پوری کی اور میں دُنیائے بے خبر اُسے تھرتھرتے ہوئے دیکھتا رہا.....“

”کیا واقعی اُس نے ڈانس کیا؟“

”تو اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ وہ غم منگلی سے بولا۔ ”یاد رکھنا ڈانس نہیں؟ وہ جب ناچ رہی تھی تو یوں لگ رہا تھا جیسے پورا زمانہ اُس کا ساتھ دے رہا ہو۔ اُس کے بدن کی معمولی سی حرکت پر زمین حرکت میں آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اُس نے سب سے عمدہ ڈانس کیا تھا۔“

وہ جھوٹ نہیں کہتا تھا۔ وہ اُس ذہنی سطح پر پہنچ چکا تھا کہ

اُسے اسما کی معمولی اچھل کود بھی دنیا کا سب سے بہترین قصہ محسوس ہوتا چاہیے گی۔

میں نے توشیوش زوہ لہجے میں کہا۔ ”اگر کوئی تمہیں چوروں کی طرح تاکا جھانکی کرتے ہوئے دیکھ لیتا تو؟“

”رات کے اُس سے یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔“
علاقائی روایات کھالے کے لیے بہت بڑی رکاوٹ تھیں۔ وہ شادی کے پُر جھوم موقع پر بھی زنان خانے کا دروازہ عبور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ حد صرف سردار حیات خان اور وریام خان کے خاندان کے لڑکوں اور مردوں کے لیے کھلتی تھی۔ ہمیں بھی اگر کوئی کام ہوتا یا کچھ درکار ہوتا تو ہم انہیں کہتے۔ وہ زنان خانے میں جاتے اور ہماری مطلوبہ شے ڈھونڈ لاتے۔ جب دن چڑھے نور پور والی سوک پر شہنائیاں گونجیں، پٹانے پھوٹے تب شاید کھالے کی قسمت بھی ہڑ بڑا کر جاگ گئی۔ سردار وریام خان کا بڑا بیٹا، بہرام خان بھاگا ہوا دارے میں داخل ہوا۔ ہماری ٹولی پر نگاہ پڑی تو تیر کی طرح ہماری طرف بڑھا۔ مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ”شہرے! تم اندر جا کر بتاؤ کہ برات آگئی ہے۔ یہ بھی بتانا کہ پھول آخری کمرے میں سفید چادر کے نیچے چارپائی پر رکھے ہوئے ہیں۔“

وہ کافی جلدی میں تھا، حکم دے کر اُلٹے بیروں باہر کی طرف بھاگا۔ اُسے یہ بھی وحیان نہیں رہا تھا کہ ان کے ہاں مہمانوں کی آمد کے بعد ہمارا زنان خانے میں داخلہ ممنوع قرار پایا تھا۔ میں نے قدم بڑھانا چاہے تو کھالے نے جلدی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کھالے کی آنکھوں میں ایک ہی التجائی تھی۔ میں اُس کے بولنے سے پہلے ہی سمجھ گیا اور انھی بیروں تھم گیا۔ اُسے زنان خانے میں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی ٹولی کے ہمراہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

برات کا شاندار استقبال ہوا۔ نور پور کی لڑکیوں نے برات پر پھول پھنچا رکھے۔ میں نے اس موقع پر پہلی مرتبہ اساکو یہ حسن وکمال دیکھا تھا۔ کھالابھی دھڑلے سے اُسی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ جب براتی دارے میں بھی ہوئی چارپائیوں اور لال پتلی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ان کی تواضع کا کام شروع ہو گیا جو ہمیں سونا گیا تھا۔

جب کچھ فرصت ملی تو میں نے کھالے کو علیحدہ کر لیا، پوچھا۔ ”سنناؤ بھی جنوں میاں! کیا رہا؟“
وہ بولا۔ ”اللہ تیرا بھلا کرے شہرے! تیرے طفل آج مجھے اسامے بات کرنے کا موقع مل گیا۔“

میں نے اشتیاق سے دریافت کیا۔ ”وہ کیسے؟“
”زنان خانے میں داخل ہوتے ہی میں نے اساکو تاڑ لیا۔ بس پھر کیا تھا، تیر کی طرح اس کے پاس پہنچا۔ براہ راست، اسی کو بہرام خان کا پیغام دیا۔ اُس نے اچھا کہا اور ہاں شہرے! آج میں نے اُسے غریب سے دیکھا ہے۔ وہ تو بہت ہی سوہنی ہے۔ دور سے دیکھتے پر بھی خوب صورت لگتی تھی مگر نزدیک سے دیکھنے پر یوں محسوس ہوا جیسے میں آنکھوں کے نیچے چاند چمک اٹھا ہوں۔ اُس نے مجھے کہا کہ اب کھڑے کیوں ہو، جاؤ، اُسے کہہ دو کہ تمام انتظامات مکمل ہیں، ہم نے برات پر گل پاشی کا اہتمام کر لیا ہے۔ پھر میں اُسے اپنی آنکھوں میں بسا کر لوٹ آیا۔“

”اُس نے اور کچھ نہیں کہا؟“
”نہیں تو۔۔۔۔۔۔“
”اکیلی تھی؟“
”نہیں۔ اُس کے ساتھ پانچ چھ لڑکیاں اور بھی کھڑی تھیں۔“
”انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا؟“
”نہیں۔“

نور پور کا مولوی نکاح پڑھانے میں مصروف تھا۔ کھالابھی بڑھانے میں مشغول تھا۔ عشق کی نگاہ سے دیکھے ہوئے محبوب کے حسن کی تعریفوں کے بل باندھتے ہوئے وہ ماحول سے یکسر بے خبر دکھائی دیتا تھا۔ لباس، خوشبو، آنکھیں، زلفیں، چال۔۔۔۔۔۔ اُس نے چند ہی منٹوں میں کس کس موضوع کو نہیں چھیڑا تھا۔ مولوی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ہم نے بھی اٹھا دیے۔

کھالے نے کھسک پھسکی۔ ”شہرے! میرے ہاتھوں میں اُسی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔“
میں نے ڈانٹا۔ ”انسان بنو اور دعا کو فور سے سنو۔“
اُسے مولوی صاحب کی مانگی جانے والی دعا سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اُنے والے کئی دنوں تک اسی ملاقات کے حصار میں گم رہنے والا عاشق تھا۔ برات آئی بیٹھی اور چلی گئی مگر کھالے کی نگاہوں میں پڑا جہا کر بیٹھی ہوئی محبوب نے پردہ بصارت سے بھی نہ اترنے کی قسم کھائی تھی۔

رخصتی کے بعد شادی والے گھر میں خوشیوں اور ہڑ مسرت افرا تقریروں کی جگہ ملال، انشمال اور ٹھکنے نے لے لی تھی۔ عجیب اداس اور بے نامی کیفیت میں اٹھتی ہوئی فضا دل میں ہمیں پیدا کرنے لگی تو میں چپکے سے وریام خان کے دارے سے نکل آیا۔

وریام خان کے عین سامنے شرقی سمت میں سردار بخت خان کی حویلی واقع تھی۔ وہ وریام خان کا سگا بھائی تھا مگر دونوں کے بیچ اختلافات اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ دشمنی کی واضح اور پسندیدہ فضا دونوں گھر پر مسلط ہو گئی تھی۔ سردار بخت خان اپنی بیٹی کی شادی میں مدعو ہونے کے باوجود شریک نہیں ہوا تھا۔ شادی سے چند دن قبل وریام خان نے برادری کے رسم و رواج کے مطابق اُس کا ”میلا“ کیا تھا۔ اُس کے گھر میں سردار حیات خان، اپنی بیوی اور بیٹوں اور برادری کے چند معززین کو لے کر گیا تھا اور شادی میں شریک ہونے کی استدعا کی تھی مگر اُس نے سب کو ناراض کر کے گھر سے اٹھا دیا۔ اُس نے رسماً بھی تو شادی میں شرکت کی مای نہیں بھری تھی۔

میں نے نظر اٹھا کر جاہ و حشم والی حویلی کو دیکھا۔ عجب یاسیت اور تنہائی کا احساس دل میں جا گزریں ہو گیا۔ بخت خان اپنے رویے اور خود ساختہ اصولوں کے باعث عملی طور پر نور پور میں بالکل تنہا ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کی برادری کے ہم پلہ گھرانوں کے علاوہ، ہم جیسے درجہ دوم کے باسی بھی اُسے ناپسند کرتے تھے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ اُس کے ممر میں ڈپرے پر کوئی بختیاں بیٹھی ہو، کوئی سائل یا فریادی آیا ہو یا کوئی مہمان آن ٹھہرا ہو۔ میرا بھی اُس کے ساتھ تعلق بس السلام علیکم تک ہی محدود رہا تھا۔

وریام خان اور بخت خان کی حویلیاں گلی کے چوک میں غریب اور شرقی کوٹوں میں واقع تھیں۔ یہی گلی شرقی سمت میں میرے گھر کی طرف جاتی تھی۔ بخت خان کے پچھواڑے پھوپھی کبریٰ کا گھر واقع تھا۔ اُس سے ملحقہ گھر محل خان کی ملکیت تھا جبکہ محل خان کی شرقی جانب میرا یعنی چاچے چراغ کا گھر واقع تھا۔ اپنے والدین کی زندگی میں ہم دونوں بہن بھائی اپنے گھر میں رہتے تھے جو وریام خان کی حویلی کے جنوب میں گلی کے آخر پر واقع تھا۔ وہ گھر ابھی تک خالی پڑا تھا۔ چونکہ گھر کی تعمیر کئی انیٹوں اور چٹنی مٹی کے ساتھ ہوئی تھی، اس لیے وہ زمانہ برد کی کا شکار ہو چکا تھا۔ مناسب دیکھ بھال اور رہائش نہ ہونے کی وجہ سے اب وہ گھر نہیں، کلنڈر دکھائی دینے لگا تھا۔

یہ کلنڈر مجھے پیارا تھا۔ یہ مجھے ایک ایسا اکساوا دیا کرتا تھا جو بھری دنیا میں مجھے کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ بے اختیار میرے قدم اُس طرف اٹھنے لگے اور میں عجیب سی خالی الذہنی کی سی کیفیت لیے اپنے آبائی گھر کی طرف چل دیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ پھلو کی جیب میں گیا، نامراد پلٹا کیونکہ

ہر شمارہ خاص شمارہ

سرگزشت

ماہنامہ

مارچ 2012ء کے نمبر کے لیے بھلیاں

سوز و ساز
اردو ادب میں غزل گوئی کی ابتدا کرنے والے ایک باکمال شاعر کا زندگی نامہ

لیسن ڈاؤن برہ
پاکستان کی شان کے چہانے والے بل کا تاجی پس منظر
چملا

بولی وڈ کے ایک معروف اداکار کے حالات زندگی

پراسرار مخلوق
امریکا ایسیس ریسرچ سینٹر میں کیا واقعی
ایلیٹن قیدی ہیں؟ کیا دوسرے سیاروں کی
مخلوق کا زمین سے رابطہ ہے؟

ان کے علاوہ

پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کر کے بدنامی اٹھانے والے شخص کی روداد ”سربلنڈ“ یورپ سے درآمد
ایک پراسرار واقعہ ”دوسری زندگی“ افریقا کی
سفر کہانی ”شب رنگیں“ اور بھی بہت سی بیج
باناں، سچے واقعات، معلوماتی قصے

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ
مخلوق رکھنا ضروری سمجھیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ بخش کر لیں
خاص شمارہ..... ہر شمارہ خاص شمارہ..... ہر شمارہ خاص شمارہ

اس سے میرے پاس گھر کی چابیاں نہیں تھیں۔ ناچار مجھے اپنے گھنڈر نما گھر میں جا کر یادوں کے اعادے کو اگلے دن پر موقوف کر کے اُدھر سے سے پلٹنا پڑا۔

اگلے دن سہ پہر کو اس اپنے آبائی مکان کی طرف نکلا۔ سالنوردہ چابکوں کا گھما میرے ہاتھ میں تاجس میں کی رنگ کی جگہ سرخ رنگ کے پڑے کا پٹی نما لٹکا لٹکا رہا تھا۔ جو پٹی کا بڑا چوٹی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ صحن میں ہر شو و برائی کا راج تھا۔ برسوں کی دھول کاواڑوں اور تالوں پر جچی ہوئی تھی۔ میں نے بائیں ہاتھ پر واقع آخری دروازے کا قفل کھولا۔ چرچاہٹ کی خصوص آواز سنائی دی۔ چند ہی لمحوں بعد میں کمرے کے صحن وسط میں کھڑا تھا۔ دائیں ہاتھ پر تین چار چار پائیاں ایک دوسرے پر بھی نظر آ رہی تھیں جبکہ سامنے، دیوار کے ساتھ پیٹیاں اور بیٹھیکوں کے اوپر چند ٹرنک رکھے ہوئے تھے۔

بیٹھیکوں اور فرخوں پر میلی سی چادریں پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے بائیں ہاتھ پر کمرے کی کڑ میں چٹنی مٹی کا بنا ہوا ایک بڑے سائز کا بھڑوا موجود تھا جس کے صحن وسط میں ایک سوراخ تھا۔ سوراخ کا سائز محض اتنا سا تھا جس میں سے یہ مشکل ہاتھ کا انگوٹھا گزر سکتا تھا۔ میں اس بھڑولے کو، بھڑولے کے غیر روایتی سوراخ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں مٹی کا فرش اکھڑا ہوا تھا اور میں اس اکھاڑ کے بس منظر سے یہ خوبی آگاہ تھا۔

میں گرد میں آئی ہوئی چیزوں پر حسرت کناں نگاہ ڈال کر بھڑولے تک گیا اور اُس پر ہاتھ بھیرے لگا۔ سوراخ کے اندر جھانک کر سوائے اندھیرے کے کچھ دکھائی نہ دیا تو میں بھڑولے کی بڑ میں بیٹھ گیا۔ میری حالت خاصی دگرگوں ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن بھی حد سے تجاوز تھی۔ میرے دونوں ہاتھ بھڑولے کی پگلی کنارہ پر ٹک گئے اور میں سسک سسک کر رونے لگا۔ کمرے میں میری سسکیاں آئینی آوازوں کی طرح گونجنے لگیں مگر مجھے پروا نہیں تھی۔ ایسے میں اچانک کمرے میں دہشت زدہ چہنیں گونجنے لگیں۔ میرے کانوں کے پردے پھٹنے کو آگئے۔ میں نے بھڑولا چھوڑ کر دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر سختی سے رکھ دیے مگر شاید یہ آوازیں باہر سے نہیں، اندر سے پھوٹ رہی تھیں جن کا کوئی علاج نہیں تھا۔

ہاتھوں کے کس نے بتایا کہ میرا چہرہ میرے آنسوؤں سے بھیک گیا تھا۔ میں نے آنکھیں سختی سے بند کیں۔ اچانک ناک پر بڑے سے تل والا ایک بھیا نکا چہرہ ابھر کر سامنے

آ گیا۔ میری ہی جانب اٹھا ہوا، قدرے زمین کی طرف جھکا ہوا، بڑی مونچھوں والا خوشخوار چہرہ جسے میں شاید زندگی کے آخری منظر کو دیکھنے تک فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

میں یہ وقت تمام اٹھا اور دروازے کے دائیں ہاتھ پر دیوار میں بنی ہوئی الماری کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ یہاں عام استعمال کی اشیاء کے نرنے میں ایک پرانی طرز کا چوٹی فریم موجود تھا۔ اس طرز کے تصویروں والے فریم نور پور کے ہر گھر میں موجود تھے مگر اس جیسا تو شاید دنیا میں کہیں بھی نہیں تھا۔ میں نے قہیں کے اگلے دامن سے شیشے پر جچی ہوئی گرد صاف کی۔ ایک خوب صورت جوڑے کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر دکھائی دینے لگی۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر حسین اور خوش دکھائی دیتے تھے۔ ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑے ہو کر تصویر کھینچوانے کا مسرت آمیز بیچان الوہی مسکراہٹوں کی صورت میں اُن کے چہروں پر ثبت تھا۔ عورت دلن تھی، میری ماں تھی۔ مرد دولہا تھا، میرا باپ امام دین تھا جسے اُس کی خوب روئی کے غیر معمولی وصف کی بنا پر نور پور والے پیارے سوتہا خان کہا کرتے تھے۔

فریم میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ میں نے گردن موڑ کر بھڑولے کے سوراخ کو دیکھا اور پھر میری نظریں بے اختیار اکھڑے ہوئے فرش پر جم گئیں۔ میرے ہاتھوں میں تھا یہی تصویر کے حقیقی کردار اسی فرش پر ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہوئے تھے۔ جہاں یہ بے ڈھنگا کڑھا سا دکھائی دے رہا تھا، وہاں دونوں کا خون ایک دوپے میں خلط ملط ہوا تھا۔ کیڑوں کوڑوں نے خون کے ساتھ فرش کی مٹی بھی جاٹ لی تھی جس کی وجہ سے چٹکی مٹی کے لپ والا فرش اکھڑ گیا تھا۔ میں ست روی سے چلتا ہوا کمرے کے وسط میں آ گیا۔ تصویر کو سینے سے لگا کر گھٹنوں کے تل زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر جھکتے جھکتے زمین پر دراز ہو گیا اور پھر دیوانہ وار زمین کو جانوروں کی طرح جاننے لگا تھا۔ مٹی کا ڈانڈ میرے دہن میں کل گیا مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

مجھے تو اپنی نمک آلود پانی المتی ہوئی آنکھوں کی بھی پروا نہیں تھی۔ میں کتنا رویا، کسے رویا، کچھ خبر نہیں تھی۔ بہت دیر گزر گئی۔ شاید گھنٹے گزر گئے تھے جب میں کھٹ خورده انداز میں اس مختصر بیدار کمرے کو تالا لگا کر باہر نکل آیا تھا۔

میں کئی کے چوک میں کچھ دیر کا پھر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں اپنے گھر سے بھی آگے نکل گیا۔ افسر علی کے گھر کی شرقی جانب پختہ کھال کئی کوکراس

کرنا تھا۔ اُس پر پگلی کچی ہوئی تھی۔ میں پٹی پر جا کھڑا ہوا۔ لہلہائی فصولوں سے ٹکر آنے والی ہوائ مجھے اپنے حرم میں لے لگی، اپنی سرمستی میں مگن میرے ساتھ اٹھکیاں کرنے لگی۔ میرا گاؤں بہت خوب صورت تھا۔ یہاں کے لوگ سادہ دل اور منافق نہ روہیوں سے نسبتاً ناشتا تھے۔

میں نے کچی سے چند قدموں کے فاصلے پر ایسا تودہ دیکھی کیکر کی ایک مٹی توڑی، اُس کے کانٹے توڑ پھینکے اور دانتوں میں کھینچے ہوئے کھال کے پختہ کنارے پر چلتے لگا۔ میرے بائیں ہاتھ پر سردار حیات خان کے ڈیری فارم کا اونچی چھت والا شیڈ تھا جبکہ دائیں ہاتھ پر تاجہ نگاہ لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ فارم کا شیڈ حیات خان کی حویلی سے ملحق تھا اور حویلی کی سیدہ سے آٹھ دس فٹ باہر کی طرف نکلا ہوا تھا جس کی وجہ سے کھال میں شیڈ اور حویلی کے اتصال پر تل بڑا ہوا تھا۔ میں وہ موڑ عبور کر کے آہستہ روی سے چلتا ہوا حویلی کی عقیبت میں واقع کچے پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہ میری اور کھال کی مخصوص نشست گاہ تھی اور ہر لحاظ سے طویل اور راز دارانہ گفتگو کے لیے بہت موزوں تھی۔

مسواک کرتے ہوئے میں مسلسل آج سرانجام پانے والی شادی کے بارے میں سوچنے لگا۔ چند دن پہلے تک پورے گاؤں میں خوشیاں اور مسرت کی عجیب کیفیات دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ رات ہی جیسے ہر وجود پر غیر مرئی تھکن اُتر آئی تھی۔ رخصتی کے بعد میں نے سردار وریام خان کے سرخ و پید چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ سارا رعب و دبہہ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا، معدوم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ کھٹ خورہ کی بے بسی اور ذہن خزانے نے لے لی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اشک نہیں تھے مگر اُس کی ایک ایک اداسک بار تھی۔ اُس کی مونچھوں کے اکڑے ہوئے سرے بھی جھکے جھکے محسوس ہوتے تھے۔ ایک ہی وقت میں جب کوئی ولا سادے رہا تھا، کوئی فرض کی انجام دہی پر مبادک باددے رہا تھا اور زنان خانے سے آنکھیں سکیں اور اُڑ ہوں کی آواز کانوں میں مسلسل روزن کاری کر رہی تھی، وہ مجھے نہایت عجیب لگا۔ جب ہر نوع کے جذبات ایک ہی وقت میں انسان پر یلغار کرتے ہیں تو شاید ایسی ہی ملی جلی عکاسی چہرے پر کھڑ جاتی ہے۔

بخت خان کی بے پردہائی اور سفاکی پر دل ایک کئی کو بے چین ہوا۔ کیا تھا، اگر وہ اپنی بختی کے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے زنان خانے میں چلا جاتا۔ اختلاقات اور دعاوت تو اُس کی اپنے بھائی کے ساتھ تھی، اپنے بھتیجیوں اور بھتیجیوں کے ساتھ تو دشمنی نہیں تھی۔ شادی میں شریک ہو جاتا، بھلے اپنے

بھائی کو نہ بلاتا مگر جو ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑ کر جارہی تھی، اُس کی دل جوئی تو کر دیتا۔ شاید اُس کا خون سپید ہو گیا تھا، جذبات پر سکیں حوصلے اپنا تعلق جھانچکی تھیں یا کیا تھا کہ اُسے رخصت ہوتی ہوئی بیٹی بھی اپنے پاس بلانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

میں کچھ دیر تک کچے پر بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر کھال کے پختہ کنارے پر چلتا ہوا شال کی جانب واقع سرکاری اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ حیات خان کی حویلی کے ملحقہ مکانات کے بعد پختہ کچی تھی جس کی دوسری جانب اسپتال کی سرکاری ہیٹ والی عمارت واقع تھی۔ یہ کھال بنیادی مرکز صحت کے پچھواڑے سے گزر کر ایک لکیر کی صورت اختیار کر جاتا تھا اور دور گھنے درختوں کے جھنڈ میں ہم ہو جاتا تھا۔

اسپتال کی عقیبتی دیوار کا ایک بلاک بہت عرصہ پہلے گر چکا تھا جہاں سے میں بے آسانی گزر کر کوارٹروں کے بیچ سے گزرتے ہوئے راستے پر پہنچ جاتا تھا۔ اسی راستے کے دائیں طرف لان تھا جس کی نگہداشت میری عملداری میں تھی جبکہ بائیں ہاتھ پر اسپتال کے عملے کے لیے ایک قطار میں تعمیر کیے گئے چار کوارٹر موجود تھے۔ ان میں سے ایک کوارٹر غیر آباد تھا جبکہ باقی تینوں میں اسپتال کا عملدرہائش پڑ رہا تھا۔ لان کے ساتھ، اٹھوں کی اس روش کے دائیں ہاتھ پر بھی تین کوارٹر ایک لائن میں بنے ہوئے تھے۔ ان تینوں میں قہری گاؤں کے سینکڑی اسکول میں پڑھانے والے اساتذہ رہائش پزیر تھے۔ اُن کو دی جانے والی یہ ناجائز سہولت ڈاکٹر منور علی شاہ کی سرپرستی میں تھی۔

میں آہستہ روی سے چلتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی کے کوارٹر میں داخل ہوا۔ توقع کے عین مطابق اُسے صحن میں بھیجی ہوئی چار پائی پر نیم دراز ایک ضخیم کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔ وہ مطالعہ کا بے حد شائق تھا۔ فارغ وقت میں کوئی نہ کوئی کتاب اُس کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ خواہ لینے کے لیے جب بھی ضلعی ہیڈ کوارٹر، مظفر گڑھ جاتا، دو چار نئی کتابیں اور رسائل کا پلندا اٹھا لاتا۔ جو کتاب اُس کے شوق کو سیراب کر دیتی، وہ مجھے عنایت ہو جاتی۔ میں ڈاکٹر شاہ جی کے اس اصول کی پاسداری کیا کرتا تھا کہ جو کتاب پڑھ لیتا، کوئی وقت ضائع کے بغیر واپس کر دیتا اور دوسری اٹھا لیتا۔

قریب بیچ کر میں نے اپنی موجودگی کی خبر دینے کی خاطر آگے سے کہا۔ ”ڈاکٹر شاہ جی! اس کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں؟“

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا، کتاب بلد کی اور

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کمرے سے دوسری چار پائی نکال لانے کا حکم صادر کر دیا۔ میں نے فیصلہ کی۔ چار پائی پر بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔ ”وریام خان کی بیٹی کی شادی کیسی رہی؟“

”بہت اچھا انتظام تھا۔“

”پیسہ تو پانی کی طرح بہا یا گیا ہوگا؟“

”ہی! سردار لوگ شادی بیاہ کے موقع پر سڈھر اُتارتے ہیں۔“

”یہ سڈھر کیا بلا ہے؟“ وہ متحیر ہوا۔

”یہ مقامی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معانی ہیں شوق پورا کرنا۔“ میں نے تفصیل سے بتایا۔ ”شادی کے موقع پر جب برادری اٹھتی ہوتی ہے تو ہمارے یہاں کے لوگ اپنی اوقات سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں اور اپنی سڈھریں اُتارتے ہیں یعنی اپنے شوق پورے کرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر اگر پیسہ پانی کی طرح نہ بہا یا گیا تو برادری میں ناک کٹ جائے گی۔“

اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی استہزائیہ کھینچ گئی۔ قدرے توقف کے بعد گویا ہوا۔ ”میں نے تعلیم حاصل کرنے کے دوران کسی نصابی کتاب میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ وہ ایک پنجابی زمیندار کی ایسی ہی سڈھروں اور نام نہاد رسومات کی ادائیگی پر لکھی گئی تھی۔ وہ اپنی سڈھریں پوری کرتے کرتے خود پورا ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں، شادی بیاہ کے موقع پر لوگ اتنے فضول خرچ ہو جاتے ہیں کہ چند گھنٹوں میں ہی خون پسینے کے عوض حاصل کی گئی جمع پونجی کو بے دردی سے لٹا دیتے ہیں۔“

”شاہ جی! یہ کہاں خون پسینا بہا تے ہیں؟“ میرا لہجہ طنز سے معمور تھا۔

”ہاں! مگر حلال کمانے والے بھی اس موقع پر بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے بڑی جانفشانی سے چند گھنٹے جوڑ رکھے ہیں۔“ شاہ جی نے کہا اور میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

قدرے توقف کے بعد ڈاکٹر شاہ جی نے اپنی مخصوص بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شادی، دو انسانوں کا پوری ہم آہنگی کے ساتھ بقیہ زندگی مشترک طور پر گزارنے کے عہد کا نام ہے۔ اس میں دکھاوے اور زمانے کو اپنی امارت دکھانے کی گنجائش نہیں ہے۔ معاشرے کی رگوں میں سرائت شدہ عدم مساوات کو آشکار کرنے کی ضرورت بھی تو نہیں دکھائی دیتی، پھر نہ جانے کیوں لوگ ایسا کرتے ہیں۔ بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے اس نئے تعلق کے پس منظر میں دونوں کی کامل رضامندی شامل ہو۔ اس پر

توجہ نہیں دی جاتی بلکہ غیر ضروری معاملات کو خوشی کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے۔“

”آپ کے خیال میں شادی کا طریق کار کیا ہونا چاہیے؟“ میں نے پوچھا۔

مجھے ڈاکٹر شاہ جی کی دانش بھری باتیں اچھی لگتی تھیں۔ وہ مذہبی، سماجی یا معاشرتی، کسی بھی موضوع پر پوری دیانت داری اور غیر جانبداری سے بات کرتا تھا۔ لگی پٹی رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والی عالمانہ نشستوں، اس سے لے کر پڑھی جانے والی کتابوں اور میری ذہانت نے میرے ذہن میں بے شمار معلومات اکٹھی کر دی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں محض گرجوٹ ہونے کے باوجود اپنی گفتگو کی سلاست اور روانی سے کسی طرح بھی ماسٹر سے کم سمجھا نہیں جاتا تھا۔

اس نے اپنے مخصوص میسر لہجے میں کہا۔ ”شہر یا ر! دنیا میں دو ہی خاندان آباد ہیں۔ ایک انسان، دوسرا انسان کا دشمن۔ انسان کے دشمن کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان نفرت، نا انصافی اور عدم توازن کے بیج بوتا رہے۔ چونکہ اس خاندان کے افراد کے پاس لفاظی، بہروپ سازی اور جوٹے دلائل کی اجلی خشکیاں موجود ہیں، اس لیے یہ اپنے مذموم مقاصد میں ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔ انسان بھولا بھالا اور سادہ لوح رہا جس کی وجہ سے انارکی، انتشار اور خون کے بے دریغ بہاؤ نے اسے بھی آسودہ نہیں رہنے دیا۔“

چند لمحوں کی لمبی سانسیں لیں، پھر سلسلہ کلام جوڑا۔ ”وریام خان، جس نے میرے اندازے کے مطابق لاکھوں روپے شادی پر ضائع کر دیے مگر اس نے یہ نہیں سوچا کہ اپنی بیٹی کے ساتھ ساتھ وہ گاؤں کے کسی غریب گھر کی لڑکی کی رخصتی کا بھی اہتمام کر دیتا تو کیا بھوکا رہتا۔ اپنی بیٹی کے جینز میں ایک غریب خاندان کی مخلصانہ دعا میں بھی شامل کر دیتا جو اسے سدا خوش حال رکھیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ مگر انسانوں کے دشمن قبیلے نے انسانوں کی سوچ اور عمل کو بے رغبت بنا رکھا ہے۔“

میں بڑی توجہ اور انہماک سے ڈاکٹر شاہ جی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ دھیمے اور کھمبیر لہجے میں بڑی سنجیدگی اور سفاک باتیں روایت میں کر جاتا تھا۔ مجھے متوجہ پا کر بولا۔ ”تمہیں یاد ہوگا، جب شیر سے قتالی کی بہن کا ہاتھ چارہ کانٹے والی شیتن میں آ کر کٹ گیا تھا اور اس کا شوہر اسے اسپتال میں لے آیا تھا، یاد ہے ناں؟“ تب اسپتال میں روایتی دوا میں موجود تھیں

مگر وہ دوا میں موجود نہیں تھیں جن کی ضرورت تھی۔ شیر نے بہن کی معاشی حالت اس کی سہ ایک وقت کی دوا بھی خرید نہیں سکتی تھی۔ مجھے ترس آیا، میں نے اپنے ڈپنر کو بیچ کر تین دنوں کی دوا اپنی گھر سے منگوائی کیونکہ ان دنوں اسپتال میں ایل بی (لوکل پریچرنگ) کی کھولت موجود نہیں تھی۔ دوا کا استعمال ایک ماہ کے لیے ناگزیر تھا۔ میرے کہنے پر شیر نے کابھوٹی اپنی بیوی کو لے کر وریام خان سمیت نور پور کے بھی خانوں کے گھروں میں گیا تھا۔ دو چار ہزار کی بات تھی، لاکھوں کا معاملہ نہیں تھا اور فاطمہ نے تو اپنی تمام عمر ان لوگوں کی خوشامد کرنے، ان کے گھروں کے کام کاج کرنے میں گزار دی تھی۔ کیا تھا کہ چار گائے اس کی خدمت کا عوضانہ سمجھ کر دے دیے جاتے۔ کسی نے نہیں دیے۔ اس کا زخم خراب ہو گیا۔ جب میں فاطمہ کو لے کر منظر کڑھ کے اسپتال کی طرف روانہ ہوا تو میرے اور فاطمہ کے علاوہ ساتھ چلنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ پھر؟ وریام خان کی بیٹی کی رخصتی پر مجھے کیا خوشی ہو، فاطمہ اور اس کے خاندان کو کیا مسرت ہو، مگر یقیناً وہی فاطمہ اپنے ایک ہاتھ کے ساتھ وریام خان کے زمان خانے میں پھر کی طرح پھرکتی ہوئی دکھائی دیتی ہوگی۔ ایسا ہی ہے ناں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ بات کرتے کرتے نثر حال سا ہو گیا تھا۔ وہ گاہ بے گاہ مجھے انسانوں کے بیچ میں پلنے والی بے عنوان نفرت اور عدم تعاون پر مبنی سوچوں کے بارے میں متعلقہ واقعات سناتا اور اپنے آپ میں کڑھتا رہتا تھا۔ پورے گاؤں میں اس کا میں ہی سامع تھا اور بارہا تجربے سے ثابت ہوا تھا کہ میں بہت اچھا سامع تھا۔

اس نے موضوع بدل دیا۔ ”کافی دنوں سے خالد محمود دکھائی نہیں دے رہا، کہیں گیا ہو ہے؟“

”وہ کئی دن وریام خان کے دارے پر، شادی کے کام کاج میں مصروف رہا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”حیات خان کی وینکین چلا رہا ہے؟“

”ہی! اچھی دیہات بن جاتی ہے اس کی۔“

”وہ اگر وینکین چلانے کے بجائے اپنے باپ کے کام کاج کو سنبھال لے تو کہیں زیادہ بچت متوقع ہے۔“

میں نے بلاوجہ جھک کر کہا۔ ”اُسے اپنے باپ دادا کے کام سے نفرت ہے۔“

”اس کی احمقانہ سوچ پر تعجب ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”کسی کی نوکری سے اپنا کاروبار بحال بہتر ہوتا ہے۔“

میں نے کندھے اچکائے، خاموش رہا، پھر بولا۔

”آپ شادی میں شریک کیوں نہیں ہوتے؟“

”میں ایسی محفلوں سے گھبراتا ہوں۔“

”کیوں؟“ میرے منہ سے بے ساختہ برآمد ہوا۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کچھ کہ نہ پایا۔

کوشی کے مرکزی دروازے پر اچانک شور مچا ہو گیا۔ شور میں نسوانی آواز نمایاں تھی۔ ہم دونوں ابھی معاملے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ فاطمہ، جس کا تذکرہ ہمارے درمیان کچھ دیر پہلے چھڑا تھا، دوپٹے سے بے نیاز بھاگتی ہوئی کچن میں گھس آئی۔ اس کے چہرے پر ہوا یاں اڑ رہی تھیں۔ پھولی ہوئی سانس میں بدقت تمام بولی۔ ”ڈاکٹر جی! وہ..... جوہی میں چلو..... وہ..... وہ بیمار ہوئی ہے۔“

”کس جوہی میں؟ کون بیمار ہے؟ ذرا دم لے کر بتاؤ تو کچھ سمجھ آئے۔“ ڈاکٹر شاہ جی نے مانائوس کو فٹ زدگی کے عالم میں کہا۔

میں چار پائی سے اُترا اور اس کے قریب ہو کر بولا۔

”کون بیمار ہوا ہے باسی فاطمہ؟“

وہ ایک ذرا ٹھم گئی، گردن میں دوپٹے کی غیر موجودگی کو بھانپا اور نہ پا کر شرمساری ہوئی، بولی۔ ”خان صاحب دی بزمان (مہمان) پیار تھی گئی اے..... پیٹ میں بڑا سخت مروڑ اٹھا ہے بے چاری کے، دہری ہو گئی۔ ڈاکٹر جی! فوراً میرے ساتھ چلیں، خان صاحب بڑے پریشان ہیں۔“

”کون خان صاحب؟“ ڈاکٹر شاہ جی کے تہر بدل گئے۔

”اپنے خان صاحب، وریام خان..... بلوچ نگر سے شادی پر ان کے بزمان (مہمان) آئے ہوئے تھے۔ ان کی بیٹی.....“

ڈاکٹر شاہ جی نے ہاتھ اٹھا کر اُسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور سچ لہجے میں بولا۔ ”تم منہ اٹھا کر میرے پاس دوڑی چلی آئی ہو، جاؤ، اپنے خان صاحب سے کہو کہ مرلیضہ کو گاڑی میں بیٹھا کر اسپتال لے آئیں۔“

”آپ اگر.....“

”جو میں نے کہا، اس پر عمل کرو۔ جاؤ اور مرلیضہ کو یہاں لے آؤ۔“ ڈاکٹر شاہ جی نے نیم ہراچھیٹ لہجے میں کہا اور منہ پھیر لیا۔ فاطمہ اُلٹے قدموں دوڑتی ہوئی کوشی سے نکل گئی۔

ایسے میں پتا چلا کہ اس کے ساتھ چند عورتیں اور بھی آئی تھیں جو دروازے پر ہی ٹھہر گئی تھیں۔

میں نے گھوہ کنائیں انداز میں ڈاکٹر شاہ جی سے کہا۔

”شاہ جی! اگر دوپٹے کے لیے وریام خان کی جوہی پر چلے

جائے تو کچھ مجھ سے والا تو نہ تھا۔“

اُس نے ایک نگاہ عجب مجھ پر ڈالی، کچھ سوچا، پھر استہزائیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”شہر یار! دنیا ایسی ہی ہے۔ میں اگر اپنے بیروں پر چل کر کسی مرلیض کے پاس جاؤں گا تو میرا کچھ بگڑ نہیں جائے گا مگر میں صرف اور صرف غریب اور بے کس لوگوں کے لیے اپنی توانائیاں خرچ کرتا ہوں۔ خصوصاً وہ جن کے پاس مرلیض کو ہسپتال لانے کے لیے سواری کا انتظام نہیں ہوتا۔ وریام خان کے پاس کار ہے۔ وہ چاہتا تو مرلیض کو یہاں تک لاسکتا تھا مگر وہ محض اپنی بڑائی کو حیثیت دینے اور نور پور والوں کو یہ سمجھانے کے لیے مجھے بلا رہا ہے کہ وہ مجھے بلانے کی قدرت رکھتا ہے۔“

”شاہ جی! آپ کے نہ جانے سے مرلیض کو نقصان پہنچ رہا ہے، نہ کہ وریام خان کو۔“ میں اپنے موقف پر بے ضرر رہا۔ وہ بولا۔ ”چھوڑو اس تذکرے کو، کیا تم نے فاطمہ کے رویے پر غور کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! وہ بے چاری سخت پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس سے بات کرنی بھی مشکل ہو رہی تھی۔“ ”ہاں..... مگر وہ پریشان کس کے لیے تھی؟ اُن لوگوں کی اولاد کے لیے جنہوں نے اُس کے کئے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر سخت سے مزہ پھیر لیا تھا۔ زخم خراب ہو گیا، بدبو آنے لگی تو اُس پر اپنی حویلی کے دروازے بند کر لیے اور اپنے بچوں کو اُس کے گھر جانے سے منع کر دیا..... انہی لوگوں کے لیے وہ ننگے پاؤں، ننگے سر دوڑی چلی آئی..... شہر یار! یہی خامی معاشرے کے سدھار میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جھٹلانے اور ٹھکرانے والے کو ٹھکرایا جائے، بے عزت کرنے والے کو بے عزت کیا جائے تو وہ اپنی اوقات میں لوٹ آتا ہے۔ ٹھوکروں کی زد میں رہ کر بھی خوشامدیں کی جائیں، جھوٹی کچی تعریفیں کی جائیں تو وہ انسانی مقام سے پھسل کر فرعونیت کی پستی میں لڑھکنے لگتا ہے۔“

مجھے بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کون بیمار ہوا تھا؟ کچھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شاہ جی کی بات سنی، کچھ اتفاق ہوا، کچھ اختلاف بھی رہا مگر میں شاید اس وقت اس بحث کا تحمل نہیں تھا۔ بولا۔ ”میں میڈیکل کٹ لے آؤں؟“ کٹ ہسپتال کی مرکزی عمارت میں، ڈاکٹر شاہ جی کے دفتر میں پڑی رہتی تھی۔ ڈیوٹی کے اوقات کے بعد ضرورت پڑنے پر میں منتقل ہسپتال کو کھول کر اسے آٹھلا تا تھا۔ میری عدم موجودگی میں یہ کام ہسپتال کا چوکیدار سرانجام دیتا تھا۔ ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلا کر اجازت دی اور میں

چابیاں اٹھا کر کونوی سے نکل آیا۔

میں کٹ نکال کر ہسپتال کی سیڑھیاں اُتر ہی رہا تھا کہ کھلا میں گیٹ عبور کر کے وریام خان کی کار ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوئی۔ میرے قریب پہنچ کر کار کی عتی کھڑکی سے وریام خان نے جھانک کر دو بنگ لہجے میں کہا۔ ”اوئے شہرے! ڈاکٹر کہاں ہے؟“

(اوئے شہرے! ڈاکٹر کہاں ہے؟) میں نے کوارٹری طرف اشارہ کیا۔ ”ڈاکٹر صاحب اپنی کونوی پر ہیں۔“

اُس نے ”ہونہ“ کہہ کر سر اندر کر لیا اور کار بائیں طرف مڑ کر کونوی کی طرف تیز رفتاری سے بڑھ گئی۔ مجھے وریام خان کے چہرے پر کھٹکی کے آثار مترج دکھائی دیے تھے اس لیے میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر شاہ جی کی خیر نہیں۔ اُس نے وریام خان کی حکم عدولی کی تھی اور اب اُسے اپنے اس عاقبت نا اندیش رویے کی سزا بھگتنا تھی۔ میں تقریباً دوڑتے ہوئے کار کے پیچھے پیچھے کونوی کے دروازے تک پہنچا۔ وریام خان کا رستہ اتر کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اندہر ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کیا وہ اکیلا یہاں رہتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”جی جی! خانی! آپ اندر آ جائیں۔“ میں دروازہ عبور کر کے کھلے کھن میں آ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی کو چارپائی پر بہ دستور مطالعے میں غرق پایا۔ میں نے گا کھنکار کر اسے متوجہ کیا۔ ”شاہ جی! خان جی آئے ہیں، آپ سے ملنے کے لیے۔“

اُس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ایسے ہی وقت میں وریام خان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہمارے قریب پہنچ گیا۔ خشکس آکھوں سے ڈاکٹر شاہ جی کو گھورتے ہوئے اکھڑ لہجے میں بولا۔ ”فاطمہ قسائین تمہیں بلانے کے لیے آئی تھی۔“ ڈاکٹر شاہ جی نے کتاب بند کر دی، چارپائی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، قد سے لمبے لمبے روئی سے بولا۔ ”ہاں! آئی تھی۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ مرلیض کو یہاں لے آئے۔ مرلیض کے بجائے آپ تشریف لے آئے۔ خوش آمدید!“

”میں نے تمہیں کسی دعوت پر نہیں، مرلیض کو دیکھنے اور اس کا علاج کرنے کے لیے بلا بھیجا تھا۔ چلو میرے ساتھ اور چلی کو دیکھو..... اُس کے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔“ وریام خان کے لیے کاشا اشتعال اثر اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میں نے آستنی سے کہا۔ ”چلیں ڈاکٹر شاہ جی! چند منٹوں کی تو بات ہے۔“

شاہ جی نے ایک نگاہ سرزنش مجھے دیکھا، پھر وریام خان کو مخاطب کر کے بولا۔ ”اپنا لہجہ درست کریں۔ میں آپ لوگوں کا ملازم نہیں ہوں اور نہ ہی کسی کارعب و دبہ برداشت کرتا ہوں۔ آپ جس گاڑی میں آئے ہیں، اُسی گاڑی کی ایک سیٹ پر مرلیض کو بٹھا کر لایا جاسکتا تھا۔ اب براہ کرم جائیں اور اُسے یہاں لے آئیں۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ ہاں! مجھی خدا خذو استہزائی ہوئی تو آپ کو لینے کے لیے آنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔“

شاہ جی کے لہجے میں غیر معمولی خنجر اڑتا تھا۔ ”کیا مطلب؟ کیا تم میرے ساتھ نہیں چل رہے؟“ وریام خان نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

”یقیناً نہیں..... وقت ضائع مت کریں اور مرلیض کو یہاں لے آئیں۔ یہ ہسپتال ہے، یہاں ضرورت کی تمام دوا ہیں اور آلات موجود ہیں، وہاں کچھ بھی دستیاب نہیں ہے۔“

وریام خان ایسے جواب کا عادی نہیں تھا۔ اُس کی صورت چند لمحوں میں ہی بگڑ کر رہ گئی۔ قدم بڑھایا، آنکھیں دکھائیں اور دانت چب کر بولا۔ ”مجھیں میرے ساتھ جانا ہوگا۔“

”مجھے ایسی کوئی مجبوری لاحق نہیں ہے خان صاحب!“

شاہ جی کا لہجہ بہ دستور ہے۔ پروائی سے پڑتا تھا۔

میں ایسی صورت حال میں پہلی مرتبہ اُس کا شخصی استحکام ملاحظہ کر رہا تھا جو میرے لیے باعث حیرت تھا۔ عین ممکن تھا کہ وریام خان اپنی سرشت کے مطابق ڈاکٹر شاہ جی پر حملہ آور ہو جاتا مگر خیر گزری کہ کونوی کے دروازے میں جھانک کر ڈاکٹر شاہ جی نے یہ آواز بلند کیا۔ ”خان جی! چھوٹا خان بی بی کو اپنی کار میں لے آیا ہے، کیا اُسے اندر بلاؤں؟“

وریام خان مشتعل سانپ کی طرح چھکار پلٹا، چیخا۔ ”میں ڈاکٹر کو لے کر حویلی میں آ رہا تھا، تم لوگوں نے کیوں نیرمان بی بی کو تکلیف دی۔“

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر شاہ جی کے لبوں پر مخصوص زہریلی مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے لمبی سانس پھینچوں میں اُتار کر میڈیکل کٹ چارپائی پر رکھ دی۔ دھنکھول کر اُس میں موجود آلات اور ادویات کو دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی معیت نے مجھے ڈھنچھڑایا تھا۔ پٹی کرنا، دیکھا لگا اور چھوٹے موٹے امراض کی تشخیص و علاج پر مجھے قدرت حاصل ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے فوری طور پر مطلوبہ امینول توڈرک سرخ میں بھر لیا۔

بہرام خان اور فاطمہ قسائین سہارا دیے بی بی کو اندر لے آئے۔ میں نے بی بی کو دیکھا تو میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس رہ گئی۔ وہ اساتھی جسے میں نے گزشتہ شب میں بالکل تندرست اور چہکتے کودتے دیکھا تھا۔ اس وقت اُس کی حالت واقعی بہت زیادہ خراب تھی۔ اُن کے ساتھ آئے ہوئے دوسرے افراد کونوی کے باہر ہو گئے جبکہ وریام خان کا ڈرائیور بھی سر جھکائے کونوی سے نکل گیا۔ اب وریام خان، اُس کا بیٹا، فاطمہ قسائین، میں اور ڈاکٹر شاہ جی چارپائی پر لٹائی گئی اساتھی کے چہرے اطراف میں کھڑے تھے۔

وریام خان نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”اوئے شہرے! تم بھی جا کر باہر بٹھرو۔“

میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سرخ میڈیکل کٹ کے کٹے ڈھکن پر دھری اور سر جھکا کر جانے لگا۔ ایسے میں ڈاکٹر شاہ جی نے مجھے روک لیا۔ ”تم کہاں جا رہے ہو، ادھر آؤ، میری مدد کرو۔“

میں رگ گیا۔ چابی بھرے کھلونے کی طرح جس کی اچانک چابی ختم ہوئی ہو۔ اُس کے ہاتھ کے اشارے پر مرلیض کے قریب ہو گیا۔ وہ اساتھی کی ہسٹری لے رہا تھا۔ کیا کھایا، کب کھایا اور دو کھان محسوس ہو رہا ہے، وغیرہ۔ میں دانت پیچھ کر کراہتی اور ترپتی اساتھی کو دیکھ کر بلاوجہ بے چین ہو رہا تھا۔ مجھے اُس پر ترس آ رہا تھا۔ وریام خان بھی مضطرب تھا۔ بار بار دریافت کر رہا تھا۔ ”خطرے کی بات تو نہیں؟“

ڈاکٹر شاہ جی کوئی جواب دے بغیر اپنے کام میں مشغول رہا۔ پیٹ کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔ ”شہر یار!“

”جی شاہ جی!“

”فورسی سی پاس روڈ..... انجیکٹ نہر آئی وی پلیز۔“ میں نے سرعت سے سرخ آٹھائی۔ وریام خان کے بیٹے بہرام خان کو مخصوص طریقے سے اساتھی کو باوجود سختی سے پکڑا یا اور کپڑا ہٹا کر انگلی کی مدد سے ورید کو اُبھارنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری یہ کوشش غیر ارادی اور نا فہمیدہ تھی کیونکہ اساتھی کا زوکی نیگلوں رگیں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے سوئی بازو پر رکھی۔ ایسے ہی وقت میں میری نگاہ اُس کے چہرے پر پڑی۔ وہ نیم سراسیمگی کے عالم میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایک تانے کو ہماری نگاہیں چار ہوئیں، پھر میں نے اپنی توجہ انجیکٹ ہونے والی دوا کی طرف مبذول کر لی۔

ایک عجیب طرح کی تانائوس، بھجان خنجر کیفیت مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی نے مزید دوا انجیکشن ملا کر

ماس میں لگانے کا حکم صادر کیا۔ میں قیصل میں مشغول ہو گیا مگر میرا ذہن گلاب کے پھول کی طرح نرم و ملائم بازو کے لمس پر آنک کر رہ گیا۔ شاہ جی کے حکم پر میں نے اُن کت لڑکیوں اور عورتوں کے بازوؤں میں ٹپکے لگائے تھے مگر آج تک کسی بھی لمس میں اتنی جاندار گرفت اور خطرناک تندی نہیں دیکھی تھی۔ دوسرے بازو کے اوپر والے حصے میں سوئی چھوٹے ہوئے میرے ہاتھوں میں واضح ارتعاش موجود تھا۔

ڈاکٹر لگانے کے بعد ارادتنا زیادہ دیر تک شانے کو سہلاتا رہا پھر پیچھے ہٹ گیا۔ دس منٹ کے دورانے میں اس اشانت ہوئی۔ اُس کے چہرے کی غیر معمولی سرخی کم ہوتی گئی اور اگلے پانچ دس منٹ میں وہ چار پانی پر آٹھ بھی۔ ڈاکٹر شاہ جی نے پوچھا۔ ”جی بیٹا! محسوس کرتی ہو؟“

اُس نے بے ساختہ پیٹ پر ہاتھ پھیرا، ہونٹوں کو زبان سے غم کیا اور بولی۔ ”درد ہے تو کسی مگر بہت کم ہے، چلوں پھروں کی تو ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تو اللہ کا نام لے کر چلو پھرو اور اپنے ڈاکٹر انکل کے سرکاری گھر کا وزٹ کرو۔“ شاہ جی کے چہرے پر بھی ہمار دکھائی دینے والی معصومی مسکراہٹ دیکھنے لگی۔

”انکل! پہلے بھی اتنی شدت کا درد نہیں ہوا تھا۔“

”پریشانی کی بات نہیں ہے بیٹا! کھانے پینے میں بے پروائی.... اور کھانے کے اوقات میں تبدیلی کی وجہ سے بدقسمتی ہو جاتی ہے۔ دیگوں میں تیز مصالحے والا سالن تیار کیا جاتا ہے۔ معدہ ایسے کھانے کا عادی نہیں ہوتا، اس لیے جسم کی طرف سے شدید نوعیت کی مزاحمت دیکھنے میں آتی ہے۔“

ڈاکٹر شاہ جی نے تفصیل سے بتایا۔

یہ پُر قصاص مجھے قدم بہ قدم حیران کرتا رہتا تھا۔ مجھے کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اسے آج تک مجھ نہیں پایا تھا۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ وہ کس بات پر خوش ہوگا، کس پر ناراض اور کس بات پر خاموش رہے گا۔ اُس کے رد عمل کا کل ازل وقت اندازہ کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ وریام خان کے مقابلے میں سیدہ پیر ہونے والا، اُس سے بڑا اور ہمیں زیادہ مضبوط دکھائی دینے والا ڈاکٹر منور، اس کے مقابلے معصوم بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ چہرہ اندرونی آسودگی کے گل رنگ لمس سے مالا مال تھا۔

میں اس کے پہلو میں چار پانی کے پائنتی کی جانب بیٹھا چورنگا ہوں سے کسی تلی کے مانند کمرہ کراٹھوئی اس کو دیکھتا رہا۔ وہ پوری کوشی کو دیکھ بھال آئی اور فاطمہ کے قریب کھڑے ہو کر بولا، ”چلیں؟“

”تم اب بالکل ٹھیک ہونا؟“ وریام خان ابھی متفکر تھا۔

”جی انکل..... میں فٹ ہوں۔“ وہ بولی۔ وریام خان کھڑا ہو گیا۔

جاتے جاتے رک کر پلٹا بچھتی ہوئی نگاہیں ڈاکٹر شاہ جی پر گاڑ کر بولا۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا۔ ساگر میں رہ کر مگر مجھ سے بیز رکھنے والا آٹھ (مشکل) میں بڑ جاتا ہے۔“

شاہ جی نے جواباً مسکرا کر کہا۔ ”مگر مجھ کو بھی خطا رہنا چاہیے۔ بدقسمتی کی صورت میں اُسے اپنے معالج کے پاس ہی آنا پڑتا ہے جو علاج کے جہانے اُس کے نوکیلے دانت بھی کھینچ سکتا ہے۔“

”نوکر، نوکر ہی ہوتا ہے خواہ سرکار کا ہی کیوں نہ ہو۔ سیانے کہتے ہیں کہ نوکر کی کر کے پیٹ پالنے والے کو انڈر زیب ہی نہیں دیتی۔“ وریام خان کے لہجے سے عیاں دھمکی کو میں بھی محسوس کیے بنانا نہ رہا۔

”ہاں..... ٹھیک کہتے ہیں آپ، مگر آپ کو شاید علم نہیں کہ میں نے فائدہ کشی کو پہلے ہی اپنا اڑھٹا چھوٹا بنا رکھا ہے۔ رہی بات نوکر کی، تو آپ لوگوں کے اختیار میں فقط اتنا ہے کہ نیل جوں کر کے میرا اس اسپتال سے کسی اور اسپتال میں تبادلہ کر دیا سکتے ہو۔ جی مانے تو تیار نہ کرادو۔ میں جہاں بھی جاؤں گا، ایسی ہی کوشی اور اسپتال میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اُن گنت غریب اور دو چار فرعون میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔“ شاہ جی کے لہجے میں جی آ میز پھر والی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ”ہاں! یہ ممکن ہے کہ یہاں میری جگہ پر آنے والا ڈاکٹر اپنی رہائش گاہ میں ہی اختیار رکھے۔ ڈیوٹی کے بعد اسپتال میں آپ لوگوں کو ایک آدھ شیر مار کر گولی دینے والا بھی نہیں ملے گا۔“

”شاید تمہیں علم نہیں ہے کہ تمہارے پاس لائی جانے والی کون ہے ورنہ تم اتنا اونچا نہ بولتے..... ہاں! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

”میں واقعتاً نہیں جانتا مگر یقیناً یہ آپ کی عزیزہ ہے۔ یہ نور پور کی رہنے والی نہیں ہے۔“

”یہ سردار حیدر خان کی بیٹی ہے۔ حیدر خان کو تو تم جانتے ہو گے..... ہیں نا؟“ وریام خان کا لہجہ پھر اہوا تھا۔

”شاید آپ بلوچ نگر والے سردار حیدر خان کی بات کر رہے ہیں۔“

”ہاں! میں اُسی کی بات کر رہا ہوں۔ اگر اُسے تمہاری بہن دھری کا پتا چل گیا تو وہ تمہیں کھڑے پیر نوکر سے لٹکوا

دے گا۔“ وریام خان کی آنکھیں شعلہ باتیں۔

زہر خند مسکراہٹ ڈاکٹر شاہ جی کے لبوں پر تیر گئی۔ اُس نے اپنے تئیں سردار وریام خان کی دھمکی کا مکمل اور مختصر جواب دے دیا تھا جو اپنے مفہوم انگیز متن کے ساتھ وریام خان سمیت ہر شخص پر آشکار ہو گیا تھا۔

وریام خان کا بیٹا اپنے باپ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں صورت حال سے آگاہی مانگنے لگا۔ باپ نے جواباً سال بننے کو دیکھا اور پھر دھمکی آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کوشی سے نکل گیا۔ اسانے ڈاکٹر شاہ جی کو سلام کیا، اجازت چاہی اور مسکرا کر کہا۔ ”انکل! اویت قاری، آئی شیل کم بیک نمون!“

”او کے مائی سن! آئی کیئر باؤٹ یو.....“ ڈاکٹر نے چار پانی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

اسانے ایک طائرانہ نگاہ مجھ پر ڈالی۔ سلام، شکریہ یا کچھ اور..... بہر حال کچھ مفہوم آمیز تاثر اُس کی آنکھوں سے ایک ثانیے کو ہی ہٹا ہوا تھا پھر اُس نے وریام خان کی تھلید میں قدم بڑھا دیے۔ گاڑیوں کے دروازے بند ہونے، گاڑیوں کے اشارت ہونے اور چلے جانے تک میری نگاہیں کوشی کے کھلے دروازے کے خلاف ہی رہیں۔ اس کے لہر کر نکلنے کا آخری منظر کئی ساعتوں تک ٹھہرا رہا، پھر ہولے ہولے تحلیل ہو گیا۔

دور سے ملنے والی، حسن کی ایک جھلک پر جینے والا کھلاا اگر میرے ساتھ ہوتا یا میری جگہ پر ڈاکٹر شاہ جی کو اسٹ کر رہا ہوتا تو یقیناً اس کے دروازے سے نکلے ہی ایٹھوں کے بنے فرش پر ڈھیر ہو گیا ہوتا۔ اُس کے جنوں کو دیکھتے ہوئے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ حسن کے دیدار کی اتنی طویل مہلت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

دن دھندلا گیا۔ شام اُتر آئی۔ میدان صاف ہونے پر شاہ جی نے مجھے بانہ سے پکڑ کر اپنے پاس بیٹھایا، سمجھایا۔ ”شہر یار! پڑھنے سننے اور دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں نے ہمیں بار بار سمجھایا کہ کسی بھی انسان کو فرعون بنانے میں مرکزی کردار اُس کے ارد گرد بسنے والے لوگ ہی ادا کرتے ہیں۔ کوئی از خود اتنا بڑا غیر فطری بہر وپ اختیار نہیں کر سکتا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مرلیفہ کون ہے، یہ ضرور جانتا تھا کہ اس کے لیے نور پور کا کچھرا ہوا خانزادہ ویلوگی کی ہر حد عبور کر سکتا ہے مگر یہ ضروری تھا کہ اُسے اسپتال میں لایا جاتا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو نور پور کے غریبوں کے دل پر اس کی مزید دھاک بیٹھ جاتی کہ جو ڈاکٹر کی کوسیدہ منہ بلانا پسند نہیں کرتا، وہ خان کے ایک ہی بلا دے پر سر کے بل دوڑا چلا آیا۔ میں کسی کے ساتھ نا انصافی نہیں کر سکتا۔ غریب اپنے

بہروں پر چل کر میرے پاس آتا ہے تو امیر کو بھی ایسا کرنا ہوگا۔ اُسے بے رعایت بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی کار پر سوار ہو کر میرے پاس آئے۔ میں سوائے ناگزیر حالات کے، کسی کے گھر نہیں جاؤں گا۔“

”خان زاوی پیار بھی تو تھی ناں!“ میں نے ہولے سے کہا۔

”پیارھی مگر اتنی نہیں کہ وریام خان کی حویلی سے اسپتال تک نہ پہنچ سکتی۔ تم نے دیکھا، یہاں کی دیہاتی غریب عورتیں کس طرح اپنے لاغر اور بیمار بدلوں کو اپنی طاقت سے کھینچتے ہوئے مجھ تک پہنچ جاتی ہیں۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں؟ کیا اُن کے بدلوں میں سرایت کرتے ہی بیماری اپنی نوع اور شکل بدل لیتی ہے؟ نہیں شہر یار! ایسا نہیں ہے۔ مجبوری سب کچھ کرواتی ہے۔“

گفتگو میں کچھ توقف آ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی خاموش رہا، پھر بولا۔ ”تم نے نہیں دیکھا، میں نے دیکھا ہے کہ شہروں میں امیر زادیاں انکنڈیشنڈ گاڑی پر شاپنگ مال جاتی ہیں۔ اپنے ملازموں کی مدد سے شاپنگ کرتی ہیں۔ اُن کے انتخاب کو شاپنگ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ملازم سامان اٹھا کر ڈکی میں ڈالتے ہیں، اتارتے ہیں اور جب وہ گھر پہنچ کر گاڑی سے قدم زمین پر رکھتی ہیں تو بے ساختہ اُن کے لبوں سے نکلتا ہے کہ ہائے گاڈ! آج تو ٹھکن کے مارے برا حال ہو گیا ہے..... پھول اٹھاتی ہیں، کلائی میں بل آ جاتا ہے۔ بالوں کا بھرا گردن تھکا دیتا ہے۔ منگتے جوتے اڑیاں مٹل دیتے ہیں۔ یہاں کیا ہوتا ہے؟ ایک عورت، جس کی فرنیٹیٹ عین وہی ہے، منہ اندر چرے مونیٹیوں کو چار ڈال کر دو دھ دھتی ہے اور پورے گھر کو ناشا کرواتی ہے۔ برتنوں کی دھلائی سے فارغ ہوتے ہی بھیتوں میں چلی جاتی ہے۔ سارا دن کپاس چنختی ہے، چار کاٹتی ہے، گوڑی کرتی ہے اور گھر واپس آ کر شام کا کھانا تیار کرتی ہے۔ رات گئے سونے کے لیے لیٹتی ہے تو اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے کہ اللہ سوہنا! اسدہ کریں..... گھر والا موچپوں کو بل دے کر کہتا ہے کہ سارا دن پڑی اینڈٹی ہو، بد عیر ہلا لیا کرو تو نیند جلد آ جایا کرے گی..... یہ فرق وہی ہے جو انسان دشمن قوتوں نے ہر دو انسانوں کے بیچ حاصل کر دیا ہے۔ اسے ختم کرنے کا اب ایک ہی طریقہ ہے کہ جو تنہا ہونا چاہتا ہے، اُسے تنہا کر دیا جائے۔ بس!“

میں یک تک اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ منہ پھٹ انسان تھا، بد تمیز، لگی لپٹی کے بغیر سیدی بات کہہ دینے والا، اپنے دل میں غریبوں کے لیے کتنا نرم گوشہ رکھتا تھا۔ شاید کسی لالہ

مست و خاک بر کادل امیر زادے کی پسیلوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے میڈیکل کٹ میں سامان ترتیب کے ساتھ سینا اور کٹ بغل میں داہے ڈاکٹر شاہ جی کی گولی سے نکل آیا۔

کھال کے کٹے پر کھالے کو براہمان پایا۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا ادھر آن نکلا تھا۔ اُسے شاید اس کی بیماری کا علم نہیں ہوا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”کل برات چار بجے واپس روانہ ہوئی تھی۔ پانچ بجے تک کبھی مہمان بھی رخصت ہو گئے مگر میں اپنی دکان کے باہر بیٹھا رہا۔ خواہش تھی کہ اُس کی ایک جھلک دیکھ لوں مگر شاید خدا کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر چلی ہی نہیں۔ باپوس ہو کر میں گھر جا کر لیٹ گیا۔ آج بھی سارا دن دکھائی نہیں دی۔“

”تو کیا تم نے آج کام سے چھٹی کی ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں یار! گاڑی کو بڑی محنت سے خراب کرنا پڑا تھا۔“ ”کیا اس کو ایک مرتبہ قریب سے دیکھنے کے بعد بھی دیکھنے کی حسرت تمہارے دل میں موجود ہے؟“ میں نے چھیڑا۔ ”تم نے مجھے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر خدا ایک بار اُسے قریب سے دیکھنے کا موقع دے دے، آئندہ اُس کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔“

”ابھی تو پتا چلا ہے کہ وہ کتنی خوب صورت ہے۔“ وہ شرارت آمیز لہجے ایمانی سے بولا۔ ”میرے کانوں میں ابھی تک اُس کی آواز گونج رہی ہے۔ اُس کی آواز اُس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے شہرے!“

”اُس نے گانا گایا تھا؟“

”ہاں تو۔۔۔۔۔ ہندی والی رات اُس نے ڈانس کرنے کے ساتھ ساتھ گانا بھی گایا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے۔۔۔۔۔“

میں نے شرارت سے ٹوکا۔ ”جیسے ساری کی ساری دنیا ایک لخت گنگنا لگی ہو۔۔۔۔۔ ہے نا؟“

اُس نے ہرگز برا نہیں مانا، بولا۔ ”ہاں یار! اُس کی آواز بڑی سربلی تھی۔ کسی بھی گلوکارہ کی آواز اُس کے جتنی خوب صورت نہیں ہے۔“

میں نے تقبی انداز میں سر ہلایا، پوچھا۔ ”اُس نے کون سا گیت گایا تھا، یاد ہے؟“

”میں تھاں مہندی دا چائی کھڑی ہاں۔۔۔۔۔ میں تاں پھلاں والی سچ سچائی کھڑی ہاں۔۔۔۔۔“ اُس نے اپنی جھوٹی آواز میں سر لگانے کی کوشش کی تو میں بہ صد کوشش بھی اپنے

حلق سے برآمد ہونے والے قہقہے کو روک نہیں پایا۔

ایسے ہی وقت میں میرے عقب میں امیر نواز کی آواز گونجی۔ ”اے کیوں حلق بھاڑ کے ہنس رہے ہو؟ منہ بند کرو وگرنہ میرے سبھی ڈھور ڈنگر (موسیٰ) پریشان ہو جائیں گے۔“

میرا خون چہرے کی رگوں میں سمٹ آیا۔ میں نے ارد گرد دیکھا مگر امیر نواز دکھائی نہیں دیا۔ گردن موڑ کر عقب میں دیکھا۔ تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر کھال کے خم کے عین اوپر ڈری فارم کے شیڈ کے غیر معمولی بڑے روشن دان میں سے جھانکتا ہوا امیر نواز کا چہرہ دکھائی دیا۔ عافیت کی سانس حلق سے خارج ہوئی۔ اتنی دور کھڑا ہونے والا ہماری گفتگو بقیہ ناس نہیں پایا تھا۔ میں نے کھالے کو دیکھا۔ اُس کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ”سردار کی گامیں پھینسیں جنوں جھوٹوں سے نہیں ڈرتیں، میری آواز سے کیا پریشان ہوں گی۔ تم بتاؤ اس وقت شیڈ میں کیا کر رہے ہو؟“

”ڈاکٹر مہدی ویسٹین لگانے کے لیے آیا ہوا ہے۔ اُس کے ساتھ ہوں۔“ امیر نواز نے کہا اور اُس کا جھانکتا ہوا چہرہ غائب ہو گیا۔

”شکر ہے، اُس نے ہماری گفتگو نہیں سنی۔“ کھالے نے کہا۔

”نہ سننے ہوئے بھی سمجھا گیا ہے کہ آئندہ یہاں پیٹھ کر راز کی باتیں مت کرنا۔ شیڈ میں کھڑا ہونے والا ہماری بات چیت نہیں سن سکتا مگر جو بلی کی اس دیوار کے پار کھڑا ہو کر سننے والا قیامت ڈھا سکتا ہے۔ سچ کہتے ہیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

وہ سمجھ گیا، بولا۔ ”آئندہ ہم یہاں پیٹھ کر اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔“

میں نے کہا۔ ”ہمیں یہ تذکرہ کہیں بھی چھیڑنا نہیں چاہیے۔“

اُس نے سر جھکا لیا مگر آنے والے دنوں میں یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اُس منہ جبین کے ذکر سے پھلتی ہوئی پروقا رہیں تھا۔ جہاں بھی ہم دونوں ملتے، اسامہ ہماری ساعتوں میں اور بساط گوپائی پر آن براہمان ہوتی۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہوا کہ حیات خان کی جو بلی کے پچھوڑے کی عمومی نشستوں میں وہ غیر حاضر ہوئی اور میری خواہش کے باوصف کبھی بھولے سے بھی ہمارے درمیان نہیں آئی۔

ایک دوپہر میں، جب میں اپنے کیمت کو پانی لگا رہا تھا،

کھالاست چال چلتا ہوا میرے پاس آن پہنچا۔ بشر سے برہمی ٹپک رہی جس کی وجہ سے اُس کی سنولائی بوئی رنگت میں مزید گہرا پن شامل ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”خیریت تو ہے؟“

وہ میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے پریشانی لاحق ہوئی کیونکہ اُس کا رویہ میرے لیے ناشناس تھا۔ قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”مجھے توقع نہیں تھی کہ تم ایسا کرو گے۔“

”کیا مطلب؟ میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جو تم یوں منہ پھلا کر بات کرنے لگے ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تمہیں معلوم ہے ناں کہ میں اس کو کتنا چاہتا ہوں؟“ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں تمہاری بے وقوفیوں سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔“

”یہ بے وقوفی نہیں ہے۔۔۔۔۔“ وہ جبر بولا۔

”جھٹکل مندی سہی، آگے بولو!“ میں نے کہا۔

”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ وہ بیمار ہو کر ڈاکٹر شاہ جی کے پاس لائی گئی تھی جہاں تم نے اُسے ٹیکے بھی لگائے، اُس کو غور سے دیکھا بھی اور۔۔۔۔۔“

میرے لبوں سے قہقہا اعلیٰ پڑا۔ ”کیا اور؟“

”تم نے اُسے چھوا، اُس کا بازو تھاما اور مجھے بتایا تک نہیں۔“ اُس کی شکل دیدنی تھی۔

میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”یار کھالے! مجھ سے واقعی غلطی ہوئی۔ اصل میں میرے نزدیک یہ کوئی اہم واقعہ نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے بارے میں جو خیالات اور جذبات تمہارے دل میں جگہ بنائے بیٹھے ہیں، وہ میرے دل میں نہیں ہیں، میں نے تو اس واقعے کو عام نوعیت کا ہی سمجھا تھا۔ اُس وقت میرے دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ کسی نہ کسی طرح تمہیں ڈاکٹر شاہ جی کی گولی پر بلا لوں، مگر اتنی مہلت ہی نہیں تھی۔“

اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر وٹ (پگ ڈنڈی) پر بٹھا دیا۔ خود میرے پہلو سے پکڑ کر پیٹھ گیا۔ بڑے اشتیاق سے بولا۔ ”اچھا! چلو یہ بتاؤ کہ وہ کیسی ہے؟“

”وہ پیٹ کے درد کے مارے دہری ہو رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کائنات دہری ہوئی جا رہی ہو۔۔۔۔۔“

وہ میری شرارت کو بھانپ گیا۔ شکایت آمیز لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یار اسید کی طرح بتاؤ ناں!“

”میں کیا بتاؤں کہ وہ کیسی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”جس وقت وہ ڈاکٹر جی کے پاس لائی گئی تھی، اُس وقت اُس کا چہرہ تکلیف سے بگڑا ہوا تھا۔ چار پانی پر لینی پل پر مل کھاری تھی۔“

”تم نے اُسے ٹیکے بھی تو لگائے تھے ناں!“

”ہاں!“ میں نے اُس کے ٹیکس کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔

”پھر؟“

”کیا پھر؟“

”پھر بتاؤ ناں کہ وہ کیسی تھی؟“ وہ زچ ہو کر بولا۔

”تم نے اُسے جابل اور گورہا۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کیسی تھی۔ جیسی اور پوری دوسری لڑکیاں ہیں، وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ ناک، کان، آنکھیں، ہاتھ اور پیر۔۔۔۔۔ سب لوگوں کے ایک جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔“ میں اُسے ستانے کے اس سہارے موقع کو کوتاہی کے حق میں نہیں تھا۔

وہ مجھ پر شکایت بھری نگاہ ڈال کر خاموش ہو گیا۔ سائڈ والی جیب سے سگریٹ اور ماچس نکالی۔ اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ سلگائی، لمبا کش پیچھے پھڑوں میں اتارا اور دھواں اگلنے ہوئے بولا۔ ”اچھا یار! تیری مرضی۔“

وین کی خرابی کا بھانپنا بڑی مشکل سے تم تک پہنچا ہوں۔ مجھے آج ہی اسامہ کے بیمار ہونے کی کہانی شوں کی پھونپی نے سنائی۔ تم نہیں سمجھ سکتے، مجھے تم پر کتنا غصہ آیا تھا۔ اگر تم اُس وقت میرے سامنے ہوتے تو میں تمہاری درگت بنا دیتا مگر میں کھلا ہوں ناں! میں جھلا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ تم میرے یار نہیں ہو سکتے کیونکہ تم اُسی خاندان کے پڑھے لکھے فرد ہو۔ میں جابل ہوں، کمین ہوں اور وین کا دیہاڑی دار ڈرائیور ہوں۔ تمہاری یاری ڈاکٹر شاہ جی سے ہو سکتی ہے، امیر نواز سے ہو سکتی ہے یا کسی بھی خاندان کے ساتھ تمہاری جوڑی جگ سکتی ہے، میرے ساتھ نہیں۔۔۔۔۔“

اُس کے چہرے پر افسردگی اور اضطراب کے واضح آثار جھلملانے لگے۔ یہ اُس کا پرانا جھکنا تھا۔ میں اُس کے چہرے کے پل پل بدلتے تاثرات کو بغور دیکھتا رہا، پھر قہقہہ بار ہو گیا۔ اُس کے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”بکواس بند کرو اور میری طرف منہ کر کے اپنی محبوبہ کے حسن کے قہیدے سنو۔۔۔۔۔“

وہ جھٹ سے میری طرف متوجہ ہو گیا۔ بولا۔ ”یار شہرے! ٹھیک ٹھیک اور آسان لفظوں میں بتانا۔“

میں نے اُسے فاطمہ قاتین کی اطالی آمد سے لے کر وریام خان کی دھمکیوں تک، من و عن بتا دیا۔ وہ بڑے انہماک سے سن رہا تھا، پھر میرے خاموش ہونے پر بے اختہ

بولاً۔ ”دوسروں کو چھوڑو، اسامہ کے بارے میں بتاؤ۔“
 ”تو اب تک کیا تیرے باپ کا قصہ لیے بیٹھا رہا ہوں؟“ میں نے تپک کر کہا۔
 ”میں نے اپنے باپ کو ہمیشہ لوہا کوٹنے ہوئے دیکھا ہے، اُسے چھوڑو، جس کے بارے میں میں پوچھ رہا ہوں اُس کے بارے میں بتاتے رہو۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 میں نے اُس کی فرمائش اور ناوقت آمد کی غرض وغایت کو مد نظر رکھتے ہوئے اسامہ کے نین وفتوش، چال ڈھال پر حرف بہ حرف گفتگو کی بباط بچاؤ دی۔ ڈاکٹر شاہ جی سے مستعار مالک کر پڑی ہوئی کتابوں نے میری قوت بیان کو خاصا ہمیز کر دیا تھا جس کا میں نے سب پر فائدہ اٹھایا۔ گاہے یہ گاہے مجبور عاشق نادار، خالد محمود عرف کھالے کے ہاتھ میں کسی تھما کر کپاریوں میں پانی بھی بدلوایا۔ اُس نے کسی مزاحمت کے بغیر میرے احکامات کی تعمیل کی کیونکہ میں ہر حکم سے قبل اپنے تحریری بیان کو پڑھ کر نظر سے پرکھ دیتا تھا۔ یوں جیسے پی ٹی وی والے ڈرامے کو کسی ایسے موڈ پر روک دیتے تھے جو آئندہ قسط دیکھنے کے شوق اور تجسس کو ہوا دیتا تھا۔
 میرا بیان ختم ہوا ہی تھا کہ وہ بے ساختہ بول پڑا۔ ”کیا اُس نے میرے بارے میں پوچھا تھا؟“
 میں نے اپنا سر تھام لیا۔ جڑبڑ ہو کر بولا۔ ”ہاں! اُس نے ڈاکٹر شاہ جی سے کہا تھا کہ اُس کے پیٹ میں درد خالد لوہا عرف کھالے کو دیکھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ میرا ماں جایا ہے، اُسے پکڑ کر فوراً میرے رو بہ رو پیش کیا جائے۔“
 وہ شرمسار سا ہو گیا اور دوسرا سگریٹ سلگائے لگا۔
 میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر شاہ جی نے دریام خان کی کچھوں یہاں کے ناز میں سے ہوا ایسے نکالی تھی کہ وہ جاتے ہوئے بھی ’شوشون‘ کر رہا تھا۔ دھمکی دے کر گیا ہے کہ وہ سردار حیدر خان کو ڈاکٹر کے ناروا رویے کے بارے میں بتا دے گا۔“
 کھالے نے کندھے اچکا۔ ”سردار حیدر خان اُسے چٹکی بجانے کی دیر میں نوکری سے نکلا دے گا۔“
 ”میرا خیال ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔“
 ”وہ کیوں؟“
 ”میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر شاہ جی کے پیچھے بھی کوئی بہت بڑا آدمی موجود ہے۔ دیکھو کھالے! کوئی بھی شخص جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، دریام خان جیسے ڈیرے کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا۔ اُس نے تو نہ صرف اونچی باتیں کی ہیں بلکہ اُس نے دریام خان کی دھمکیوں اور لال

پلے چلے کی بھی پروا نہیں کی اور نہ ہی سردار حیدر خان کے نام سے ہراساں ہوا۔ وہ مجھے کہتا رہتا ہے کہ یہ نام نہاد ڈیرے اور خان محض بھوکے چبوتے ہیں۔ انہیں بیروں تلے مسل دینا چاہیے۔ یہ یہ ظاہر بہت مضبوط مگر درحقیقت انتہائی بزدل اور خوف زدہ لوگ ہیں۔ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ ان کے ملبوسات اچلے اور کلف لگے ہیں مگر ان کے اندر گناہوں کی دلدلیں، خوف کی سلولیں اور بے ایمانیوں کے ان گنت داغ لگے ہوئے ہیں۔“
 ”پڑھا کھالے نا! پڑھے لکھے لوگ تو کتابی باتیں کرتے ہیں۔ کتابیں محض غلطوں میں ذہنی رتی ہیں اور دریام خان جیسے ڈیرے باتیں کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔“
 کھالے نے اپنی دانست میں بڑے پتے کی بات کی تھی۔
 انہی لوگوں کی مسلط کردہ لاقانونیت اور غیر اخلاقی اقدار نے واقعتاً کتابتیں تھانے والی باتیں کاٹ رکھی تھیں اور کتابوں میں لکھے قوانین، ضابطوں، اخلاقی پیرائوں اور مذہب کے ہر پہلو کی تفسیر پر استہزائیہ تضحیکیں لگائی تھیں۔ معاشرے کی آسودگی اور بھائی چارے کے بدن پر وہ چمکے لگاتے تھے جن سے لکھ پڑھنا سورا پھوٹتے تھے، خون رستا تھا اور تکلیف کا احساس دیتا وہ انہیں بے خبر کیے رکھتا تھا۔ سردار حیدر خان کے بارے میں پورا علاقہ جانتا تھا کہ جس پولنگ اسٹیشن میں اُسے شکست کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اُس بستی کے لوگوں کی شامت آجاتی تھی۔ وہاں بجلی کی بندش، پٹواری کا بڑا عداوت رویہ، بستی کے سرکاری ملازمین کے آئے روز دور افتادہ علاقوں میں تباہی اور تھانہ کلچر کی ہٹ دھرمیاں معمول بن جاتی تھیں۔ وہ بہت مستم مزاج فطرت کا مالک تھا۔ معمولی نوعیت کی حکم عدولی پر بھی برا بھونچتا ہو کر انسانیہ کی حدیں عبور کرنے پر تل جاتا تھا۔ کھالاٹھیک کہتا تھا کہ ڈاکٹر شاہ جی کا علم اور غریب پر درویشی کی دن اُس کے لیے معصیت کا باعث بن جائے گا۔
 ”اسانے اور کچھ کہا تھا؟“ کھالا پھر عشق پٹواری پر چڑھ گیا۔
 ”ہاں!“ میں نے کہا۔ ”اُس نے جاتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی سے کہا تھا کہ وہ بھی اُس سے ملنے کے لیے آئے گی۔“
 ”کب؟“
 ”جب اُس کا جی چاہا۔“
 ”ڈاکٹر شاہ جی نے پھر کیا کہا؟“
 ”انگریزی میں کچھ کہا تھا، مجھے سمجھ نہیں آیا۔“

”کیسے ہو سکتا ہے؟ تم مجھے بتانا نہیں چاہتے ہو۔“
 ”یہی کہا ہوگا کہ ٹھیک ہے، جب جی چاہے، آجانا۔“
 میں نے جان چھڑانا چاہی۔
 ”کیا وہ واقعی اسپتال میں آئے گی؟“ کھالا پڑ اشتیاق تھا۔
 ”میرا خیال ہے کہ ضرور آئے گی۔“
 ”تم دھیان رکھنا، جب بھی آئے، مجھے ضرور بتانا۔“
 ”اگر اس وقت تمہارا اجازت فریشی موڈ کے اڈے پر لینڈ کر چکا ہو تو کیسے اطلاع کروں گا؟“ مجھے اُس پر ترس آیا۔
 وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر معنوی بے پروائی سے بولا۔
 ”چلو! بعد میں بتا دینا۔“
 ”یہی کہہ دیکھی ہے؟“
 ”کیوں اس مت کرو۔ اب میں چلتا ہوں، کافی دیر ہو گئی ہے۔“
 اس کا ذکر تمام ہوتے ہی کھالے کو اپنی وکیل اور اڈے پر بیٹھی ہوئی سواریاں یاد آئیں جو اُسے کوس رہی ہوں گی۔ تقریباً دوڑنے کے سے انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے میری نگاہوں سے اوچھل ہو گیا۔ میرا کام بھی ختم ہونے والا تھا۔ پانی باغیچے کے لیے میرا ’وارہ شریک‘ کالا بزار کی کندھے پر رکھے نکلے پر کھڑا تھا اور ہاتھوں کے اشاروں کنایوں سے مجھے میرا وقت ختم ہونے کی اطلاع دینے لگا تھا۔
 سردار دریام خان اپنے ذہن میں عداوت کے انگارے بھر کر اسپتال سے نکلا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق اُن انگاروں کی تمام تر ٹینک سردار حیدر خان تک پہنچ گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہفتے کے دن شام کو پانچ بجے کے لگ بھگ اسپتال کا چوکیدار خادم حسین بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب تمہیں بلارہے ہیں۔“
 ”خیریت تو ہے؟“ میں نے غام سے انداز میں استفسار کیا کیونکہ چوکیدار عمومی طور پر مجھے بلانے کے لیے میرے گھر آیا کرتا تھا۔ بعض اوقات کسی پیشکش کی آمد پر پشپریا کوئی بھی معاون ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود نہیں ہوتا تھا تو مجھے بلایا جاتا تھا۔
 خادم نے کہا۔ ”ذرا جلدی کرو، بڑے صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔“
 میں تعجب ہوا۔ ”کون بڑے صاحب؟“
 ”ڈی ایچ او صاحب!“ اُس نے قدرے تامل سے کہا۔

میں اُس کے ساتھ ہی اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔
 ڈاکٹر شاہ جی کی کونجی کے باہر چند اینٹوں کی روش پر سرکاری جیب کھڑی دکھائی دی۔ میں سبز نمبر پلیٹ والی اس سفید جیب کو پہلے بھی کمر مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر عرفان حمید کو بھی جانتا تھا جو ضلعی آفیسر تھا اور دو تین مرتبہ اسپتال کا عمومی معائنہ کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔
 میں صحن میں برہان ضلعی افسر کے سامنے رُکا اور سلام گوہا۔ ڈاکٹر شاہ جی اور ضلعی افسر کے علاوہ دو تین اور بھی افراد چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جن سے فردا فردا سلام لینے کے بعد میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔
 شاہ جی نے کہا۔ ”یہ نوجوان اُس وقت یہاں موجود تھا جب ایم بی اے صاحب کی بیٹی کو یہاں لایا گیا۔ یہ اُس وقت بھی نہیں تھا جب اُس کی بیماری کی اطلاع دینے اور دریام خان کا حکم سنانے کے لیے فاطمہ نامی عورت بھاگتی ہوئی آئی تھی۔“
 کبھی لوگ میری طرف استغماہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر عرفان حمید نے اپنی غیر معمولی مونچھوں کو چھپرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں بھئی جوان! کیا نام ہے تمہارا؟“
 میں نے کہا۔ ”شہر یار!“
 ”کیا کام کرتے ہو؟“
 ”بچہ کا مائدہ سنا تھا۔“
 ”میں کاشت کاری کرتا ہوں۔“
 ”کیا جب ڈاکٹر منور علی شام کو دریام خان نے بلوایا تھا تو تم یہیں تھے؟“
 ”جی سر! میں اُس وقت یہاں موجود تھا۔“ میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔
 ”مجھے تفصیل سے پورا واقعہ بتاؤ۔“
 میں اپنی دانست کو بروئے کار لاتے ہوئے داستان گوئی کرنے لگا۔ میں نے غیر ارادی طور پر یہ احتیاط برتی کہ میرا بیان کسی بھی لحاظ سے ڈاکٹر شاہ جی کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔
 میرے خاموش ہونے پر ڈاکٹر عرفان حمید نے کہا۔ ”کیا مریض کی حالت بہت زیادہ خراب تھی؟“
 میں نے کہا۔ ”نہیں سر! وہ اپنے پیروں پر چل کر آتی تھی۔ لاڈلی ہونے کی وجہ سے اُس نے مای فاطمہ کا سہارا لے رکھا تھا۔ معمولی نوعیت کی بدھن تھی، ہیپتہ نہیں تھا اور نہ ہی حالت خراب تھی۔“
 ایسے میں ڈاکٹر شاہ جی نے اپنے مخصوص سنجیدہ، کسمیر اور بے نیازانہ لہجے میں کسی کو باخصوص مخاطب کیے بغیر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میری پوزیشن واضح ہو چکی ہے۔ میں نے پہلے بھی

ضلعی افسر سرعام کر رہا گیا۔ دوسرے اشخاص چپکے چپکے کر کے لگے۔ کچھ توقف کے بعد ضلعی افسر نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”چلیں ٹھیک ہے، آپ سفید کاغذ پر معذرت نامہ تحریر کر دیں۔ میں انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔“

میں نے بے ساختہ ڈاکٹر شاہ جی کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ میری توقع کے عین مطابق مخصوص زہریلی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر تیر گئی۔ سرفنی میں ہل گیا، لبوں پر شعلہ سا بھڑک گیا، بولا۔ ”آپ میرے آفسیر ان چارج ہیں اور سرکار کہتی ہے کہ آپ کا حکم بجالاؤں۔ آپ کے ساتھ ساتھ میں اپنے ضمیر اور ایمان کا بھی تابع فرمان ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی اس لیے مجھے معافی نہیں مانگنی چاہیے۔ میں اُس کے حکم پر سر جھکا تا ہوں اور واشگاف الفاظ میں انکار کرتا ہوں کہ میں کسی ایرے غیرے سے معافی نہیں مانگوں گا اور اُس جرم پر ندامت کا اظہار نہیں کروں گا جو میری دانست میں جرم نہیں، میری شخصیت کا اعزاز ہے۔ انکوائری بھگت چکا، شوکانہ نوٹس کا تحریری جواب دے چکا، اب ٹھکانہ سزا سنبھالنے کو تیار ہوں۔ میں فیس (Face) کروں گا۔“

ڈاکٹر شاہ جی کی گفتگو کے آخری جملوں سے اتنی درشتی اور زہر باری مترشح تھی کہ میں دم بخود رہ گیا۔ عمومی طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ عوام الناس کے سامنے بانس پر چڑھنے والا اپنے مجاز افسروں کے بیروں کی زمین میں اتر جاتا ہے مگر وہ ایسا ثابت نہیں ہوا تھا۔

”شاہ جی! آپ کی ہٹ دھرمی آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔“ ضلعی افسر نے واضح دھمکی دی۔

”پردہ انہیں۔“ میں ڈاکٹر ہوں، لوگوں کا علاج کرنا میرے فرائض میں شامل ہے مگر بے ایمان اور جھوٹے لوگوں کی نوکری کرنا اور ناپسندیدہ امور کو انجام دینا مجھ پر واجب نہیں ہے۔ نوکری نہ سہی، کوئی چھوٹا موٹا کلینک بنا کر بیٹھ جاؤں گا، تب دیکھوں گا، مجھے کون روکتا ہے۔“ شاہ جی نے سخت لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر عرفان حیدر چند ثانیوں تک اُسے برہم نگاہوں سے گھورتا رہا، پھر یک لخت مفہام نہ انداز میں گویا ہوا۔ ”میں آپ کی عزت کرتا ہوں، یہ جانتا ہوں کہ آپ راضی نہیں، بے ایمان نہیں اور نہ ہی مجھی آپ نے اپنے پیشہ وارانہ فرائض میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ دریا میں رہ کر مگر مجھ سے سیر نہیں رکھا جاسکتا۔ سردار حیدر خان عوامی نمائندہ ہے۔ اسمبلی میں بیٹھتا ہے۔ جس ڈیسک پر وہ بول سکتا

اپنے تحریری بیان میں بجا طور پر لکھا ہے کہ میں ڈیوٹی اوقات کے بعد مریضوں کو دیکھنے اور ان کا علاج معالجہ کرنے کا پابند نہیں ہوں۔ چونکہ میں یہاں رہائش پذیر ہوں اور میں نے کوئی کلینک نہیں بنا رکھا، اس لیے یہ طور انسانی ہمدردی مریضوں کا معائنہ کرتا ہوں اور انہیں ابتدائی طبی امداد دیا کرتا ہوں۔ میں نور پور کے کسی بھی گھر میں خواہ وہ سردار حیات خان کا ہو یا وریام خان کا، جانا پسند نہیں کرتا۔ رہی بات مجھ پر دباؤ ڈالنے کی یا ایم پی اے کے نام پر دھمکانے کی، تو نور پورے دلوں سے عرض گزار ہوں کہ مجھے اس کی ہرگز پروا نہیں ہے۔ میرا تبادلہ کیا جائے تو بھی میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں! یہ ضرور کہوں گا کہ اگر مجھے نور پور سے ٹرانسفر کیا جائے تو کسی ایسی جگہ بھیجا جائے جہاں کی متعلقہ کمیونٹی میں سردار اور خان قسم کے فرعون موجود نہ ہوں وگرنہ آپ کو پھر انکوائری اور تبادلہ کی لے زحمت سے دوچار ہونا پڑے گا۔“

”شاہ جی! کیا آپ اپنے آپ کو تھوڑا بدل نہیں سکتے؟“ ڈاکٹر عرفان حیدر کے لہجے میں منت اور ناگواری کا ملا جلا تاثر موجود تھا۔

”کیا میں نے کچھ غلط کیا؟“

”یہ غلط رویہ ہی تو ہے شاہ جی! آپ اپنی کیونٹی کے معزز اور معروف لوگوں کو ہمیشہ ناراض رکھتے ہیں۔ سردار حیدر خان نے میرے آفس میں پہنچ کر میری انسٹل کی ہے۔ دیکھیں ناں! اگر آپ وریام خان کے بلانے پر دو گھنٹی کے لیے اُس کی حویلی میں چلے جاتے تو کیا قیامت آ جاتی؟ علاج تو آپ نے یہاں بھی کیا، وریام خان سے منہ ماری الگ ہوئی، کیا فائدہ ہوا؟“

”میں کسی کے گھر میں جانا پسند نہیں کرتا۔“ شاہ جی نے کہا۔

”براہِ مجبوری جانے میں ہرج بھی کیا ہے؟“

”نہ جانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اُن کے گیراجوں میں کاریں موجود ہیں، زر خرید ڈرائیور اور ملازم دستیاب ہیں۔ انہیں غریبوں کے لیے بنائے گئے اسپتال اور تعینات کیے گئے ڈاکٹر کے پاس آنے یا بلانے کی احتیاج نہیں ہے۔ وہ مظہر گڑھ، ڈی ایچ کیو میں، کسی نئی اسپتال میں یا کہیں بھی جاسکتے ہیں۔ میں کسی کو روکتا نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے ان خانہ آدوں کے تاخر خیرے اٹھانے کی کوئی ضرورت ہے۔ مجھے جو کہنا تھا، کہہ دیا، اب اس موضوع پر کچھ بھی کہنا پسند نہیں کروں گا۔ آپ کوئی اور بات بھیجئے، کوئی اور حکم صادر کیجئے۔“ ڈاکٹر شاہ جی کا لہجہ اعلیٰ تھا۔

استفسار کیا۔ ”تو کیا آپ کا تبادلہ کر دیا جائے گا؟“
 اُس نے کندھے اچکائے۔ ”ہاں! یہ بھی یا رہاں لوگوں کی عنایت ہوگی ورنہ ممکن ہے مجھے معطل کر دیا جائے۔“
 ”معطل؟ یعنی نوکری سے فارغ؟“ میں دم بخود رہ گیا۔
 ”نہیں! دفتر بلاوا، انکوائری اور پھر تین ماہ کی بے سود نجل خواری کے بعد یہ صدا احسان بھائی..... اُس کے یوں پر مخصوص مسکراہٹ تیری۔“
 ”تو بہت غلط ہوا شاہ جی!“ میرے لیوں سے نکلا۔
 ”ہاں! مگر دیکھا جائے گا۔ ممکن ہے، سردار حیدر خان کو ڈاکٹر عرفان مطمئن کر لے اور بات یہیں ختم ہو جائے۔“
 ”اللہ کرے!“

”تم کیوں پریشان ہو گئے ہو؟“
 ”مگر آپ کا یہاں سے تبادلہ ہو گیا تو.....؟“ میرا اندیشہ میرے لیوں پر چل گیا۔
 ”تو کیا ہوگا؟ یہاں کوئی اور ڈاکٹر آ جائے گا۔ میں جہاں جاؤں گا، قسمت میں ہوگا تو کوئی اور شہر یا رہنے ل جائے گا۔ بس!“
 مجھے دکھ ہوا۔ ڈاکٹر شاہ جی کے سپاٹ اور جذبات سے قطعی عاری لہجے نے مجھے آن واحد میں مایوس کر دیا۔ میں اُس کے ٹرانسفر کے اندیشے میں پریشان ہو رہا تھا جبکہ اُسے میری کوئی پروا نہیں تھی۔
 اُس نے میرے تاثرات کے تغیر کو بھانپ لیا، میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکرایا اور جازم لہجے میں بولا۔ ”بھی جانے والے کا ڈھک نہیں کرتے، بس! الوداع کہہ کر آنے والے کا خوش دلی سے استقبال کرتے ہیں۔ تم اچھے انسان ہو، یقیناً تمہیں اچھے انسان ہی ملیں گے۔“
 میں خاموشی سے اُسے ایک نگ دیکھے گیا۔ وہ اب پوری طرح سنبھل چکا تھا اور اُسے ہرگز کوئی خوف یا پریشانی نہیں رہی تھی۔ میں نے اجازت چاہی اور کوشی سے نکل آیا۔
 اگلے دن میں نے اس واقعے کا تذکرہ کھالے سے کیا۔ وہ فکر مند ہو گیا۔ بولا۔ ”شہرے! اپنے ڈاکٹر کی خیر مانو۔ سردار دریام خان اور سردار حیدر خان اُس پر وار کریں گے۔ ڈاکٹر شریف آدمی ہے، ان لیے ہاتھ والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“
 ”میں بھی تو دعائے گننے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا نا!“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”یہاں خربوزے چوری کرنے والے کو سزائے موت کا حکم نامہ تھا یا جاسکتا ہے میرے جگری یار! کیا بات کرتے ہو۔ ہاں! اگر کہیں ڈاکٹر کی اتنی ہی فکر لاحق ہے تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے مت رہو۔ میری مالتو تو اپنا پورا یا ستر اٹھا کر شاہ جی کی تو پھر یہ لوگ اپنے کارندوں کے ذریعے ڈاکٹر پر وار کریں گے جو بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“
 میں حیرت سے بولا۔ ”کیا مطلب؟“
 ”تم بڑے بھولے ہو۔ دیکھتے ہو، سمجھتے نہیں ہو۔ تمہارے خیال میں سردار حیدر خان کو لوگ ووٹ ڈالتے ہیں اور وہ جیت جاتا ہے۔ ہے ناں؟ جی سادہ اور معصوم لوگ بھی سمجھتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جہاں بھی سیدھی انگلیوں سے ٹکلا دکھائی نہیں دیتا، سردار حیدر خان وہاں اپنی انگلیاں میزمری کر لیتا ہے اور اُس کے پالتو غنڈے دندناتے ہوئے اپنے مورچوں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی ووٹ بچ دیتا ہے، کوئی ڈر کر ہائی بھر لیتا ہے اور جو آکر جاتا ہے اُس کی گردن میں سے سر بے کے ساتھ ساتھ ہڈی بھی نکال لی جاتی ہے۔ ایکشن کے بعد وہی غنڈے کامل توجہ کے ساتھ سرگرم ہو جاتے ہیں۔ اُن لوگوں سے ابھی ہاتھوں کے ساتھ نمٹتے ہیں جنہوں نے سردار حیدر خان کا دل دکھایا ہوتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ ڈاکٹر شاہ جی نے بھی سردار کا دل دکھادیا ہے۔“
 مجھے کھالے کی دانش بھری باتوں پر حیرت ہوئی۔ یہ اعتراف تو مجھے تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ دنیا کے پلن سے آگاہ تھا، یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ان سرداروں کے جھکنڈوں کا بھی ادراک رکھتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”یعنی تمہارا خیال ہے کہ سردار حیدر خان کے پالتو غنڈے ڈاکٹر شاہ جی کو ماریں پھینک دیں گے؟“
 ”اُس کی ہڈی پہلی ایک کر دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی بغیر نمبر پلیٹ والی گاڑی اُس کی موٹر سائیکل کو پکڑتی ہوئی گزر جائے۔“ کھالے کا لہجہ بڑا ہولناک تھا۔ ”رات کے ستانے میں کوئی وردناک فوج ابھرے اور صبح لوگ منہ میں انگلیاں داہے بے رحم ڈاکٹروں کے ہاتھوں قتل ہونے والے ڈاکٹر شاہ جی کا آخری دیدار کر رہے ہوں.....“
 مجھے جھجھکی آگئی۔ کھالے کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ”یہ مٹوس منہ بند کر دیا! کیا بیک بک لگا رہی ہے۔ اللہ نہ کرے کہ شاہ جی پر کوئی آنچ آئے۔ وہ نور پور کا سمیٹا ہے، غریبوں کا سچا بھروسہ ہے اور نہایت بے غرض بندہ ہے۔ اُس نے اتنا بڑا جرم تو نہیں کیا کہ اُسے قتل کر دیا جائے۔“

”یہاں خربوزے چوری کرنے والے کو سزائے موت کا حکم نامہ تھا یا جاسکتا ہے میرے جگری یار! کیا بات کرتے ہو۔ ہاں! اگر کہیں ڈاکٹر کی اتنی ہی فکر لاحق ہے تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے مت رہو۔ میری مالتو تو اپنا پورا یا ستر اٹھا کر شاہ جی

میں نے تعجب سے کہا۔ ”کیوں شاہ جی! آپ اس طرح کیوں سوچتے ہیں۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں، سچا ہیں، آپ کی خدمت کرنا تو پورے نور پور کا فرض ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے لوگوں کی شعوری سطح کم ہے جبکہ میں چار جماعتیں پڑھ چکا ہوں۔ آپ کو قریب سے دیکھتا ہوں، وہ دور سے دیکھتے ہیں، فرق تو ہے ناں۔ ویسے بھی، میں فارغ اوقات میں آپ کے ہاں آتا ہوں۔ ٹھوڈا ہاتھ بید ہلا لینے سے میرا کیا بگڑتا ہے؟“
 وہ سر جھکائے کھانا کھانے میں مشغول رہا اور میری ننان اسٹاپ باتوں کا جواب ہوں، ہاں میں دیتا رہا۔
 کھانے سے فارغ ہو کر بولا۔ ”شہر یار! میری تمام نوکری کا یہی دورانیہ جو نور پور میں اب تک گزارا، عافیت اور خاموشی کا ہے۔ مجھے میری تمام سرورس کے دوران فرعونوں نے چین سے سانس نہیں لینے دیا۔ بھائی بلاوا، کبھی انکوائری تو بھی مجھے معطل کیا گیا حالانکہ میں نے اپنے فرائض میں کہیں کوتاہی کا ارتکاب نہیں کیا، کبھی میری اسے سی آرمیں کوئی نہیں برتی اور..... اور تو اور..... میری اسے سی آرمیں کوئی نہیں، فراڈ یا رشوت کی شکایت درج نہیں ہے مگر میں اس معاشرے میں اُن فٹ ہوں۔ میں انسان تو ہوں مگر انسانوں جیسا نہیں ہوں۔“

سانس لے کر بولا۔ ”گلتا ہے، یہاں بھی تمہارے ڈاکٹر شاہ جی کا دانہ پانی تمام ہو چکا ہے۔ اس مسافر کو پھر جتنی مسافت دریغ ہے اور یقیناً میں جہاں بھی بھیجا گیا، وہاں میرے انتظار میں غریب اور لاچار لوگ جھولیوں پھیلائے سچائی تلاش کرتے پھرتے ہوں گے اور وڈیرے اپنی کینٹینوں سے اپنے رچہ رچال کر گھبات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ آہ! نہ اس دنیا کو بدلنا منظور ہے اور نہ ہی یہ ڈھیت شخص مالکِ تغیر ہے۔“
 ”کیا آپ کی مرضی کے بغیر آپ کا یہاں سے ٹرانسفر کیا جاسکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہوں! مجھے پنجاب کے کسی بھی جی ایچ یو میں بھیجا جاسکتا ہے۔ ٹھکانے رولز کے مطابق تو مجھے ضلعی حدود سے باہر نہیں بھیجا جاسکتا مگر ایسا شخص اُس جگہ پر ہو سکتا ہے جہاں قانون کی بالادستی ہو، جہاں انسانی حقوق کا احترام واجب ہو..... یہاں نہیں۔ یہاں صرف اُس کے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے جس کے پاس ووٹ کی طاقت ہو، اثر و رسوخ کا تازیانہ ہو کہ جب جی چاہا، نکال کر مقابل کے منہ پر دے مارا۔“
 مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں

ڈاکٹر عرفان اپنے دونوں ہاتھ چارپائی کی بانہ پر رکھ کر زیر لب بڑبڑایا اور کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے سے بے بسی اور نیمہ برہمی کا استرجاع عیاں تھا۔ اپنے ساتھیوں کو اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”شاہ جی! میں کوشش کروں گا کہ آپ کے خلاف کوئی ٹھکانہ کارروائی عمل میں نہ لائی جائے مگر یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ سردار حیدر خان آپ سے سخت ناراض ہے اور وہ ایسا شخص ہے جو اپنے مخالفین کو معاف کرنے کی رواداری نہیں رکھتا۔ آپ کے لیے دعاگو ہوں اور مشورہ دیتا ہوں کہ اپنا دھیان رکھیے گا۔ کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ یا غیر متوقع صورت حال پیش آسکتی ہے۔“
 ڈاکٹر شاہ جی نے قدرے بے پروائی سے سر جھکا اور انہیں کوشی کے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ واپسی پر اُس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز کلیروں کا چال سا تپا ہوا تھا۔ بڑبڑاہٹ کے سے انداز میں بولا۔ ”اچھا نہیں ہوا مگر خیر سنا..... اچھا ہوا کب ہے کہ اب قسمت پر لگے ہو۔“
 اُس کے ایک بے ساختہ فقرے نے اُس کی زندگی کی تمام تر تھکاوٹوں اور محنتوں کا احاطہ کر دیا تھا۔
 میں نے ماحول کی کینڈی کو دودھ کرنے کے لیے اُسے متوجہ کیا۔ ”آپ نے کھانا کھالیا ہے؟“

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے۔“
 میں اُس کے روکتے رہنے کے باوجود کچن میں گھس گیا۔ کچن میں ضرورت کا تمام سامان موجود تھا۔ میں جانتا تھا فرنیچ میں اور کچھ ہوتا ہے، انڈوں کی خاصی تعداد ضرور موجود رہتی ہے۔ میں نے جلدی جلدی انڈوں کا سانس تیار کیا، گندھا ہوا آٹا فرنیچ سے نکال کر دو تین روٹیاں پکیں اور تقریباً نصف گھنٹے کی مشقت کے بعد ڈاکٹر شاہ جی کو کھانا پیش کر دیا۔
 وہ بولا۔ ”شہر یار! تم جب میری خاطر اتنی تکلیف اٹھاتے ہو تو مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔“

کی کوئی پر چلے جاؤ کسی وقت، کبھی کبھار ہوسکتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر شاہ جی کو قائل کرو کہ وہ رات کو کھانا نہ رہے، ہر وقت چوکنا رہے اور اگر ممکن ہو تو رات کو کسی دوست کے ہاں شب گزاری کے لیے چلا جایا کرے۔“

کھالے نے مجھے اور بھی بہت کارآمد باتیں سمجھائیں۔ میں دھڑکنے والے دل سے اس کی دل دہلانے والی باتیں سن رہا تھا، پھر میں نے اپنے تئیں یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ میں کبھی بھی صورت میں ڈاکٹر شاہ جی کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا اور اس کی حفاظت کروں گا۔ دلی کہ نہاں خانوں میں یہ خدشہ بھی کلہاڑا تھا کہ میں اپنی کم مائیگی کے باعث سردار حیدر خان جیسے باسرخ آدی کے مقابلے میں ڈاکٹر شاہ جی کی نیندیں کراؤں گا۔ کھالے نے مجھے حوصلہ دیا اور میری سنے دوسے مدد کا وعدہ بھی کیا۔

چند دن عافیت میں گزرے۔ ایک صبح جب میں گھر میں بیٹھا چائے کا پیالہ شلم میں اتار رہا تھا، سردار یام خان کا پیغام مجھے موصول ہوا۔ فاطمہ قسانین اپنی غیر معمولی باریک اور شوخ آواز میں مجھے بتلا رہی تھی کہ وہ یام خان نے مجھے اپنی حوصلی پر فوراً جتنے کا حکم صادر کیا ہے۔ میں اُسے پسند نہیں کرتا تھا مگر اپنی ناپسندیدگی کے اظہار اور اس کی حکم عدولی کی جرات بھی نہیں رکھتا تھا۔ میں نے ماسی فاطمہ کو چلنا اور ناشتا کرنے کے بعد حوصلی پہنچ گئی۔

سردار ابھی تک حوصلی کے اندر تھا۔ میں دارے میں رکھے ہوئے بڑے پائیوں والے ہمارے پر پیٹھ گیا۔ میری نظروں کے سامنے سردار یام خان کے دارے کی بیرونی چار دیواری کے اوپر دھلی کے پار ایستادہ بخت خان کی خوب صورت حوصلی داغ تھی۔ چلے پیلے اور سرخ کلر کاٹنیں استرجاز بڑا دل کش تھا۔ بخت خان بہت وجہ بہ، باذوق اور نفاست پسند انسان تھا مگر اُس کا رویہ بہت ناشائستہ اور جاہلانہ تھا۔ غرور اور نفوت نے اُسے گاؤں بھر میں تنہا کر رکھا تھا۔

سردار و یام خان اُس سے کھیل زیادہ بڑا اور سفاک انسان تھا مگر وہ لوگوں میں محل کر رہتا تھا۔ در پردہ ظلم کرتا تھا، سرعام محبت کا پرچار کرتا تھا۔ وہ اور نور پور کا نمبر دار سردار حیات خان مقامی سیاست کے امم مہرے تھے۔ سردار حیدر خان کی پچھائی ہوئی سیاسی بساط پر پوری دل جمعی سے مکمل کھیلنے اور اُسے فتح پائی سے ہم کنار کرتے ہوئے اپنے لیے ظلم اور بربریت کے دروازے کھول لیتے۔ نور پور اور نواح میں ہونے والے ہر تنازعائی واقعے کے پس منظر میں انہی دونوں بڑوں کی چالاکیاں اور سازشیں موجود ہوتیں اور جب فریقین جذباتی حماقتوں کے زیر اثر اپنی پوچی بے دردی سے لٹا بیٹھتے

تو پھر انہی کے داروں پر پہنچ کر انصاف کے لیے متمسک ہو جاتے۔ میں نے اُن کثرت پختیاں دیکھ رکھی تھیں۔ کبھی سردار حیات خان کے ڈیرے پر تو کبھی سردار و یام خان کے دارے پر۔ ہر پختیا کا ایک سا انجام ہی دیکھا تھا۔ جو سردار نے جاپا، وہی فیصلہ مسلط کر دیا گیا۔ بعض اوقات تو ایسے ایسے فیصلے بھی ڈنگے کی چوٹ پر کر دیے گئے جن کی اجازت نہ تو مذہب دیتا تھا اور نہ ہی دنیا کے کسی معاشرے کی کوئی اخلاق ساز کتاب۔۔۔۔۔

علی بخش عرف ملنگی سردار و یام خان کے ڈیرے پر حقہ پانی بھرنے پر مامور تھا۔ وہ چائے کا پیالہ اٹھائے میرے پاس آیا۔ مجھے تھمتے ہوئے بولا۔ ”شہرے خان! تیرا چاچا کہہ رہا تھا کہ تم نے پڑھائی مکمل کر لی ہے اور اب نوکری کے چکر میں ہو؟“

میں نے چائے کا گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ہمارے کے سر بالیں رکھے ہوئے حقے کو اپنی جانب کھینچ کر بے سبب جھپٹتے ہوئے بولا۔ ”دور جانے کی کیا ضرورت ہے، یہاں کسی خان کے ہاں مٹی ٹھہر جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”یہ کام مشکل ہے، مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔“

”واہ جی واہ! یہ مٹی گیری بھی کوئی مشکل کام ہے، اچھی خاصی ٹوہر ہوتی ہے شے کی، جو چاہے کرے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔“

”مجھے ایسی ٹوہر کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں از حد اختصار سے کام لے رہا تھا کیونکہ میں ادیب عمر ملنگی کی چرب زبانی اور نفوت گویائی سے بہ خوبی واقف تھا۔ بات سے بات نکالنے کا ہنر اُسے وراثت میں ملا تھا۔ گاؤں کے بڑے کہتے تھے کہ اُس کا باپ اُس سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ خود ملنگی اپنے باپ کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے بتایا کرتا تھا کہ کیسے اُس کے باپ نے پختیا میں کسی جھوٹے کو سچا۔۔۔۔۔

خبات کیا اور کچے کو جھوٹا ثابت کیا تھا۔ وہ اپنے مرحوم باپ کی نفوت بیان پر استدلال لاتے ہوئے یہ بھول بیٹھتا تھا کہ وہ اپنے منہ سے اپنے باپ کو بے ایمان اور مکار ثابت کرتا تھا۔ ”مجھے خان نے کیوں بلایا ہے؟“ وہ ایک نکلے کو چلم کے نچلے حصے میں ڈال کر کھمتے ہوئے بولا۔

”یہ تو خان کو ہی بتا ہوگا۔“

”اگر وہ تجھے اپنے ہاں مٹی ٹھہرانے کی بات کرے تو اُس کی بات مان لیتا۔ میری ماؤ، سراسر فائدے کا کام ہے۔

موج ہی موج ہے۔“ اُس نے پھر اپنے انداز کے لیے بنیاد پر کھڑی کی جانے والی عمارت کو چونا چاٹی کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بند مٹی پر ٹھوڑی ٹکا کر دارے اور زنان خانے کی درمیانی دیوار کے دیدار بخش روزن کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے سامنے بیٹھ کر کھالے نے اساکو دیکھا تھا اور مجھے بھی دیدار کی خیرات میں سے حصہ دیا تھا۔ روزن دکھائی نہیں دیا۔ میں ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ صفحے کی گنجائش باڑھ کی وجہ سے دیوار کا وہ حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

”پریشان دکھائی دیتے ہو، کیا بات ہے؟“ ملنگی نے مجھے کریدنے کی کوشش کی۔

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

ایسے ہی وقت میں سردار و یام خان بوسکی کے بے داغ سوٹ میں، پیروں میں تلے دار کھنسا پہنے موچوں کو گل دیتے ہوئے دارے میں قدم ریزہ ہوا۔ ماحول میں بڑی خوش گوار اور جھنجھکی خوشبو پھیل گئی۔ یہ کسی فیتھی اور غیر ملکی پرفیوم کا اعجاز تھا جس کی غالباً پوری کی پوری شیشی اُس نے اپنے اوپر اندر رکھی تھی۔ میں نے روایتی انداز میں ادب سے کھڑے ہو کر سلام کیا، اُس کے براجمان ہونے کے بعد ہمارے پر پیٹھ گیا، بولا۔ ”جی خان جی! آپ نے مجھے یاد کیا تھا۔“

”اوجھڑ پوھو! اسوکیاں گلاں کیتیاں کر، وقت وچ نہ پاپا کر سانوں بیڈھیاں ٹھہریاں توں۔۔۔۔۔“ و یام خان نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ وہ بڑی ٹھٹھٹ سرائیکی بولی بولتا تھا۔ سر پر کلف دار طرہ درست کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ایک خاص بات کے لیے تمہیں بلایا ہے۔ تم نور پور کے ہاسی ہو، پڑھے لکھے ہو اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارا نقصان ہو۔ رب سوہنا کر م کرے، وہ حکم دیتا ہے کہ غریبوں مسکینوں کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھنا چاہیے۔ اس لیے تمہارے ساتھ میں نے بھی آکھے موٹہ بات نہیں کی۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو اپنا سوتر، ہائے کیا دیر بندہ تھا، جتنی امام بخش خان یاد آ جاتا ہے۔ بڑا پیارا اور سنگت باش انسان تھا پڑے چارہ ٹھوڑی حیاتی مانگ لیا تھا۔ میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اُس کے بولنے کا انتظار کیا۔ میں ابھی تک اپنے طلب کیے جانے کا سبب بھانپ نہیں سکا تھا۔

ملنگی نے حقے کی تے جھپی رومال سے صاف کی اور گھما کر خان کے سامنے کر دی۔ اُس نے ایک دو گونگرا میں کشید

کیں، مجھے نظروں ہی نظروں میں ٹٹولا اور بولا۔ ”شہرے پترا میں نے تمہیں اُس دن ڈاکٹر کی کوئی پر دیکھا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ تمہارے جیسا سمجھ دار انسان اُس خبیث اور بے ایمان ڈاکٹر کے پاس کیا کر رہا ہے۔ کیا تم اُس کی شاگردی میں ہو؟“

میں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی خان جی! میں نے اُس سے اسپتال سیکھ لی ہے۔ اب میں چھوٹی مونی بیمار یوں کا علاج معالجہ کر لیتا ہوں۔“

”جب میں نے فاطمہ قسانین کو اُس کے ہاں بیٹھا تھا تم وہیں تھے؟“ اُس کی کریدتی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

”جی!“

”وہ خبیث میرے بلانے پر آیا کیوں نہیں تھا؟“

”وہ کہیں بھی نہیں جاتا۔ وہ کہتا ہے کہ اُسے چوبیس گھنٹے اسپتال میں رہنا چاہیے، کب کیا ہو جائے، خبر نہیں ہوتی۔“

میں نے اپنی داستان میں بڑی معقول بات کی۔

”ماسٹر ولی محمد کی بیٹی جی بڑی بیڑوں سے گری تھی تو وہ بھاگا چلا آیا تھا۔ ہمیں زیناں کے ساتھ اُس کے۔۔۔۔۔“

”ناں خان جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے غیر ارادی طور پر اُس کی بات کاٹ دی۔

ماسٹر ولی محمد ریٹائرڈ ڈیپٹ ماسٹر تھا۔ میں اُس سے دو سال تک ٹیوشن پڑھتا رہا تھا۔ وہ بہت تخلص اور دین دار آدمی تھا۔ اُس نے بھی میرے سمیت کسی بھی پڑھنے والے سے ٹیوشن فیس وصول نہیں کی تھی۔ اُس کے ہاں چند پیادائیں ہوا تھا۔ اوپر تلے چار بیٹیاں خدا نے دے رکھی تھیں مگر اُسے بھی قسمت پر قسمت بنانے والے پر میں نے شک کی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ انہی بیٹیوں کی مناسب تربیت کا صلہ اُسے خدا جنت میں شاد نعل کی صورت میں دے گا۔ اُس کی بیٹی زیناں دو ماہ قبل چوٹی سیزمی سے گر پڑی تھی۔ سیزمی کا بچلا ڈنڈا اُس کی کمر میں اس شدت سے لگا تھا کہ اُس کا بچلا دھڑ ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔ ولی محمد نکلے پیر دوڑتا ہوا اسپتال پہنچا تھا اور ڈاکٹر کو کھڑے آیا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے زیناں کا معائنہ کیا، ابتدائی طبی امداد دی، اپنے ڈسپنسر کو کیمج کر ڈی ایچ کیو اسپتال سے ایسیو بیٹنس منگوائی اور زیناں، اُس کی ماں اور باپ کو اسپتال روانہ کر دیا تھا۔ چند دنوں میں وہ ٹھیک ہو گئی تو پھر لالچی کے سہارے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسپتال آ جایا کرتی تھی۔ وہ اب بھی ڈاکٹر شاہ جی کے زیر علاج تھی۔

مجھے و یام خان کی سوچ پر گھٹن آئی۔ نگاہ شکایت اُس

پہ ڈالی اور کہا۔ ”خان جی! ڈاکٹر شاہ جی ایسا شخص نہیں ہے۔
پاکہ زبان کا بھلا دھڑکن ہو گیا تھا، اسے کسی بھی طرح
ہسپتال نہیں لایا جاسکتا تھا، اس لیے ڈاکٹر اپنے آلات سمیت
ماسٹری کے گھر تک چلا آتا تھا۔“

”مگر میں نے سنا ہے کہ زبان اب بھی ہر دو بجے
چوتھے روز ہسپتال جاتی رہتی ہے اور بہت دیر تک ڈاکٹر کے
کمرے میں بیٹھی رہتی ہے۔ کیا یہ جھوٹ ہے؟“
”نہیں! یہ سچ ہے۔ وہ آتی ہے، اپنا معائنہ کرتی ہے
اور دو بجے لے کر گھر چلی جاتی ہے۔ اس کے ہمراہ بھی ماسی
فاطمہ ہوتی ہے، کبھی اس کی ماں اور کبھی غفوران! وہ کبھی اکیلی
نہیں آتی۔“ میں نے وضاحت کی۔

”غفوران؟ علم دین پٹواری کی وی؟“
”نہیں۔ استاد کھالے کی چھوٹی بہن غفوران۔“ میں
نے کہا۔ ”کئی مرتبہ زبان میری موجودگی میں وہاں آ چکی
ہے۔ ڈاکٹر اسے بیٹی کہہ کر بلاتا ہے۔ وہ ہر لڑکی کو بیٹی یا دچی
کہہ کر پکارتا ہے۔“

”تم ڈاکٹر کی اتنی طرف داری کیوں کرتے ہو؟“ خان
کا لہجہ خاصا سرد ہو گیا۔ اسے شاید میرے سلی بخش جوابات
نے مضطرب کر دیا تھا۔

”خان جی! مجھے اس کی طرف داری کرنے کی کوئی
ضرورت نہیں۔ میں نور پور کا رہنے والا ہوں، وہ پتا نہیں کہاں
کا دسٹیک ہے، مجھے اس سے سوائے ہنر کے کیا لیتا ہے۔ سچ
بات کرتا ہوں کہ وہ بہت نیک اور اللہ لوک آدمی ہے۔ کسی
کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ کسی کو برا نہیں کہتا اور نہ
ہی کسی سے ڈرتا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے
علاوہ کوئی بھی ڈاکٹر اس ہسپتال میں آج تک رہائش پذیر
نہیں ہوا۔ جو بھی تعینات ہوتا تھا، ہمتوں شکل نہیں دکھاتا
تھا جبکہ یہ چوتیس گھنٹے موجود رہتا ہے۔ اتوار کے دن بھی اگر
کوئی آجائے تو اس کا معائنہ کرتا ہے اور ہسپتال کھول کر
دوا لگے دیتا ہے۔ کیا یہ نور پور کی خوش بختی نہیں ہے؟“ میں
نے پختی مرتبہ ہمت پکڑتے ہوئے پوری فصاحت سے اپنا
مدعا بیان کیا۔

”اُسے میری تقریر اچھی نہیں لگی۔ پیشانی ٹھکن آلود
ہو گئی۔ ہاتھ لہرا کر بولا۔ ”بس گودا! میں نے تمہاری بہت
ساری بکواس سن لی۔ مزید سننا نہیں چاہتا اور تمہیں حکم دیتا
ہوں کہ تم آئندہ ہسپتال نہیں جاؤ گے۔ ڈاکٹر کی چالوئی نہیں
کرو گے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم اُسے کھانا بنا کر دیتے ہو،
کوادر کی صفائی سہرائی کرتے ہو اور پکڑے لٹے بھی دھو تے

ہو۔ مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ میری برادری کا خان زادہ، خواہ
غریب ہو یا مسکین، کسی کمین اور خبیث بندے کی خدمت
خاطر کرے۔ کیا وہ تمہیں تنخواہ وغیرہ بھی دیتا ہے؟“
میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ باندھ کر
بولا۔ ”خان جی! آپ میرے بڑے ہیں، بالی باپ ہیں۔
مجھے یہ خوشی احساس ہے کہ میں آپ کا رشتہ دار اور برادری
وال ہوں مگر آپ سے بہت کم اور غریب ہوں۔ اگر میں
اُس کی خدمت کرتا ہوں تو یہ میرا معاملہ ہے۔ میں اُس کی
نہیں، اُس کے سینے میں بھرے ہوئے علم اور انسان دوستی
کے جذبے کو سلام کرنے جاتا ہوں۔ آپ نہیں جانتے، میں
جانتا ہوں کہ وہ اس دور کا ولی ہے، اللہ کا بہت پیارا انسان
ہے۔ آپ نہیں مانتے کہ اسے اور میں مونا بھی نہیں چاہتا مگر یہ
ضرور چاہتا ہوں کہ آپ اُس کے اور میرے بیچ کوئی دیوار
کھڑی نہ کریں۔ جیسے کام چل رہا ہے، چلتے دیں اور ڈاکٹر کی
حکم عدولی کو اُن کا مسئلہ نہ بنائیں۔ رہی بات تنخواہ کی، تو مجھے
تنخواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اُس کے کام کاج کرتا
ہوں۔ میں تو سردار حیات خان کے کھاتوں کو بھی مفت میں
سنبھال لاکرتا ہوں۔ امیر نواز کے کام کاج بھی کرتا ہوں۔ وہ
مجھے کچھ بھی نہیں دیتے۔ ڈاکٹر خدمت کے بدلے میں مجھے
پڑھاتا ہے۔ مجھے سبق دیتا ہے۔ میں پرائیوٹ طور پر ماسٹرز
کرتا چاہتا ہوں اس لیے مجھ پر کوئی پابندی عائد نہ کریں ورنہ
میں حکم عدولی پر مجبور ہوں گا۔“
”اُسے میرے واضح انکار کی توقع نہیں تھی۔ چند لمحوں
تک مجھے شعلہ بار نظروں سے گھورتا رہا، پھر بیٹ پڑا۔ غیظ
و غضب نے اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا
تھا۔ اُس نے مجھے نہ صرف کمین، غریب اور بے غیرت
کے القابات سے نوازا بلکہ اپنی سرشت کے مطابق غلیظ
گالیاں بھی دیں۔“
”اچانک ملنگی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اوئے ملنگی! اس
احسان فراموش کیڑے کو دھکے دے کر حویلی سے نکال دے
اور اس کے چاچے کو پکڑ لا۔ اُس سے پوچھوں کہ ایسے احسان
فراموش اور کینے بندے کو اُس نے اپنے گھر میں کیوں ڈال
رکھا ہے۔ چل اوئے غیبت! میری آنکھوں سے اوجھل
ہو جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں تم کیسے اُس شخص کے پاس جاتے
ہو۔ واہ! میں ماسٹرز کرتا چاہتا ہوں۔ ہا! ہا!“
”احسان تفحیک سے میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ غلطی
میری ہی تھی۔ جانتا تھا کہ وہ بہ ظاہر انسان مگر بہ باطن بیٹھڑیا
ہے۔ مجھے اُس کے منہ لگنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے

معالے کو سلجھانے کی اپنی کوشش کی۔ ”خان جی! آپ تو
بلاوجنہ راض۔۔۔۔۔۔“
”کہاناں! دفعان ہو جاؤ اور دوبارہ اپنی منھوں شکل مجھے
نہ دکھانا۔“ اُس نے پھاڑ کھانے کے سے اعداد میں کہا۔
میں غدا حال اور پڑمردہ قدموں سے اپنے وجود کو رکھنا
ہوا حویلی سے نکل آیا۔ میں نے ملنگی کو دھکے دینے کی زحمت
سے بچالیا تھا۔ حویلی سے نکل کر گھر تک پہنچنا محال ہو گیا۔ اُس
فرعون صفت وڈرے نے چاچا چراغ کو بلا کر ڈانٹنے اور برا
بھلا کہنے کا ارادہ کر رکھا تھا اور طلب کیے جانے پر چاچے کو نہ
جانے دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے چاچی
اور بہنوں کو دریاغ خان کی دھمکیوں اور گلی گلوچ کے بارے
میں بتایا تو وہ بھی گھبرا گئیں۔ نور پور میں رہتے ہوئے دریاغ
خان کو ناراض کرنا بڑا آٹھن اور ہلاکت خیز کام تھا جو بس نادانی
کی بدولت سرانجام دے آتا تھا۔ کبھی نے اپنے اپنے انداز
میں مجھے کوسا کہ مجھے خان کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنا
چاہیے تھیں۔ وہ بڑا تھا اور مجھے اپنی اوقات میں رہ کر محض نجی
خان جی ہی کہنا زیب دیتا تھا۔

ملنگی نے دو پہر سے پہلے ہی چاچا چراغ کو کھیتوں میں جا
پکڑا اور خان جی کی عدالت میں پیش کر دیا۔ جب دو پہر کو
چاچا چراغ گھر میں داخل ہوا تو اُس کی حالت خاصی غیر عادی
میں نے چورنگا ہوں سے اُسے دیکھا تو کٹ کر رہ گیا۔ اُس کا
چہرہ بھی فرط تفحیک سے سرخ تھا۔ کافی دیر تک چارپائی پر سر
پیوڑائے بیٹھا رہا۔ چاچی اُس کی پائنتی کی جانب پٹختی اُسے
خاموشی سے دیکھتی رہی، جب وہ قدرے سنبھل گیا تو بولی۔
”کیا بات ہے؟ تم کچھ تریا یاد ہی پریشان دکھائی دیتے ہو۔“
اُس نے میری طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ”پوچھ لو اپنے

اُس سے، بھرے دارے میں میری پکڑی اچھالی گئی،
مجھے برا بھلا کہا گیا۔۔۔۔۔۔“

وہ فرط اشتعال و بے بسی سے اپنا جملہ بھی مکمل نہ کر پایا۔
چاچی نے ولا سا دیا۔ ”نادان ہے، برے بھلے کی تیز نہیں
رکھتا۔ تم نے خان جی کو کھانا کھاناں کہ۔۔۔۔۔۔“
”خاک سمجھا؟“ چاچے کا لہجہ بھرا گیا۔ ”اُس نے
میری کوئی بات سنی ہی نہیں، بس ماں بہن کی گالیاں دیتا رہا
اور بار بار کہتا رہا کہ میں دیکھوں گا، اب کیسے وہ ہسپتال میں
قدم رکھتا ہے۔ میں نے اسے کئی بار کہا کہ ہسپتال جانا پھوڑ
دے، یہ نہیں مانا۔ آج اس کی ضد کی وجہ سے مجھے یہ دن
دیکھنا پڑا۔“

میں سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ عداوت اور بے بسی کی ملی جلی

کیفیت مجھ پر حاوی تھی۔ کہتا بھی تو کیا کہتا؟ کافی دیر بعد
میرے لبوں سے پھوٹا۔ ”چاچا! میں نے کوئی غلط بات نہیں
کی۔ میں نے اُسے یہی بتایا تھا کہ میں ڈاکٹر کے پاس پڑھنے
کے لیے جاتا ہوں۔ اُس نے ڈاکٹر اور ماسٹری کی بیٹی زبان
پر تہمت لگائی تھی جس پر میں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر ایسا آدمی نہیں
ہے۔ بس وہ میری بات سنتے ہی مجھے سے اکھڑ گیا۔ ٹھیک
ہے، اُس نے اپنے گھر بلا کر میری اور تمہاری بے عزتی کی
ہے، خدا ہمیں بھی کوئی موقع دے گا کہ اُس کی پکڑی ہمارے
پیروں تلے ڈلے گی۔“

چاچا میری بات سن کر ہنرک اٹھا۔ اُس کے منہ میں جو
الم غم آیا، اُس نے مجھے کہہ سنایا۔ اُس نے بھی میرے
ہسپتال جانے پر پابندی عائد کر دی اور مجھے دریاغ خان کی
حویلی پر جا کر معافی مانگنے کا حکم صادر کر دیا۔

میری آنکھوں کے سامنے مقابل چٹانوں کی طرح
ایستادہ ڈاکٹر شاہ جی کا چہرہ لہرا گیا۔ اُس نے معافی نہیں مانگی
تھی۔ معزول ہونے پر خود کو آمادہ کر لیا تھا۔ میں نے بھی آن
کی آن میں فیصلہ کر لیا۔ مجھے نور پور سے نکالا جاسکتا تھا، مجھے
ہنجارت میں مجرم بنا کر کھڑا کیا جاسکتا تھا اور بس!۔۔۔۔۔۔ شاہ جی کو
اگر ہزاروں روپے کی نوکری کی فکر نہیں تھی تو اُس کے ’مرید‘ کو
کیا فکر لاحق ہو سکتی تھی۔ سچی میں نے کہا۔ ”چاچا! میں زندگی
میں بھی خان کی حویلی پر معافی مانگنے کے لیے نہیں جاؤں گا۔“
”تمہیں جانا ہوگا۔۔۔۔۔۔ دیکھ سرور مائی! اپنے پتر کو سمجھا
لے، اسے حویلی پر بھیج دے ورنہ ہم سب کے لیے بہت بُرا
ہوگا۔“ چاچا چراغ خاصا برا بیچتہ ہو گیا تھا۔

میں نے پھر انکار کیا۔ ایسے میں پروین میرے قریب
ہو گئی۔ میرے گالوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”بھائی! ضد نہ کر۔
دیکھ! سب لوگ پریشان ہیں۔ میرا تیرے سوا اور ہے بھی
کون؟ تجھے کچھ ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ اللہ کا نام
مان۔۔۔۔۔۔ دیکھ شہرے! میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“
میں ٹھٹک گیا۔ پروین کی آنکھوں میں موٹے موٹے
آنسو تھے وہ لچائی اور ماسحت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی
تھی۔ ایسے ہی وقت میں مجھ پر جہان اور اک کھلا۔ شاہ جی
اور اپنی حیثیت کا فرق معلوم ہوا۔ اُس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا
جس کے آنسو اُسے شکست سے دو جا کر کرتے۔ جس کا ڈھک
اُسے نہ لاتا۔ جبکہ میری ایک بہن تھی جس کا اُترا ہوا چہرہ مجھ
سے ہر بات منوا سکتا تھا۔

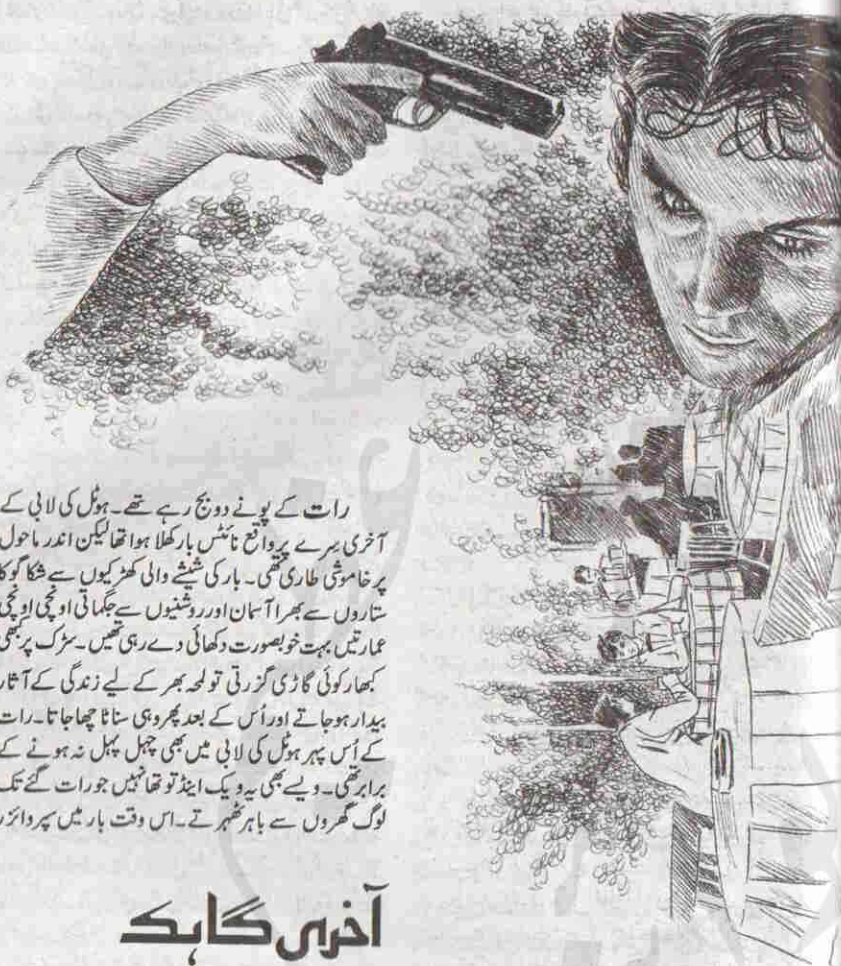
مختصر پھیل کر دل و دماغ کو اپنے حصار میں لینے لگا۔
میں نے پروین کے آنسو پوچھے، ولا سا دیا اور خاموشی سے سر

جھانکا۔ چار پائی کی دلوں نے بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔
میں انتہائی کھانا کھانے بغیر گھر سے نکل آیا۔ میرا رخ نور
پور کے وکین اسٹینڈ کی طرف تھا۔ میری توقع کے مطابق
کھانے کی وکین اسٹینڈ پر موجود تھی اور شیڈ وڈ کی سی ٹاکی سے
دیکھنا نہ چھپنے والا بوٹ چکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے
بیشو لہار کو سلام کیا، دکان کا عقبی دروازہ عبور کیا اور کھالے
کے گھر میں داخل ہو گیا۔ ماسی صفو پہلو میں پانی کا بھرا ہوا
گھڑا ڈبا نے دیوار کے ساتھ بڑی چوٹی گھڑوئی کی طرف جا
رہی تھی۔ کھالے کی بہن خالدہ صحن میں تھی ہوئی تار پر دھلے
ہوئے گیلے کپڑے پھیلائے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھ کر
ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”سلام صاحب جی! بڑے دنوں
کے بعد راستہ بھولے ہیں آپ!“
وہ بہت شریر اور کھنڈری لڑکی تھی۔ کھالے سے محض دو
سال چھوٹی تھی۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود ایسی باتیں کر جاتی
کہ سننے والا بخود بخود جاتا تھا۔ عمومی طور پر مجھے ”بھائی“ جبکہ
چھپڑنے کی غرض سے ”صاحب جی“ کہا کرتی تھی۔ میں نے نیم
دلی سے سلام کا جواب دیا اور کھالے کے کمرے میں گھس گیا۔
کھالے کو بہتر پر نیم دراز پایا۔
وہ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ بولا۔ ”خیر نہیں لگتی سہن جی!“
میں ٹوٹی بانہہ والی کرسی کھینٹ کر اس کی چار پائی کے
قریب ہو بیٹھا۔ اس نے بلند آواز میں بانگ لگائی۔ ”بلو! آب
تو چائے بنلا، دیکھ، تیرا دوا جو بھی آ گیا ہے۔“
گھر میں خالدہ کو پیار سے بلو کہہ کر پکارا جاتا تھا۔
وہ جواب چلائی۔ ”صاحب جی کو تو چائے پینے کے سوا اور
کوئی کام ہے ہی نہیں۔ جب کہیں سے نہیں ملتی تو یہاں بھاگا چلا
آتا ہے اور کہتا ہے میں ملنے کے لیے آیا ہوں۔“ تھوڑے
سے کپڑے رہ گئے ہیں، تار پڑا لوں، بھر چائے بنلاؤں
کی۔“
کھالہ زیر لب مسکرایا۔ ”بڑی بھلی کڑی ہے۔ ذرا خیال
نہیں کرتی، کیا کہنا، کیا نہیں کہنا ہے۔ چلو پھوڑو! صفر پر آؤٹ
ہونے والے بے سواری جیسا منہ کیوں بنا رکھا ہے؟“
میں نے طویل سانس لی اور اُسے ”الف“ سے ”یے“ تک
تمام رواد کہہ سنائی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بڑی توجہ اور
انتہاک سے سنتا رہا۔
میرے خاموش ہونے پر بولا۔ ”تم نے بڑی غلطی کی
شہرے! تمہیں کیا ضرورت تھی خان کے سامنے شاہ جی کی
وکالت کرنے کی، کہہ دیجئے، آئندہ نہیں جاؤں گا، مگر دیکھ بھال
کر جاتے رہتے۔ خیر! اب بھی ایک راستہ ہے۔“

”وہ کون سا؟“ میں جلدی سے بولا۔
”تم جا کر امیر نواز سے بات کرو۔ وہ تمہیں لے کر حیات
خان کے پاس چلا جائے گا۔ تم اُسے قائل کرنا۔ امید ہے وہ
تمہاری بات سمجھ جائے گا اور وریام خان کو سمجھا کر ٹھنڈا کر
دے گا۔“ کھالے نے کہا۔
مجھے حیرت ہوئی۔ کھالے نے کیسے چٹکی بجاتے ہی میرا
مسئلہ حل کر دیا تھا۔ وہ بولا۔ ”مجھے یہ خان لوگ کھالہ کہتے
ہیں۔ تم بھی کہتے ہو مگر تم پیار سے کہتے ہو، وہ نفرت سے کہتے
ہیں۔ مجھے خالہ محمود نہیں کہیں گے۔ تمہیں بھی کھار شہر
بار کہہ لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک ان
لوگوں نے تمہیں اور تمہارے گھرانے کو اپنے قبیلے سے نہیں
ٹکالا۔ اگر تم ایسے ہی ان کے سامنے آتے رہو گے تو وہ دن
دور نہیں جب تمہارا خاندان ان لوگوں کی برداشت سے باہر
ہو جائے گا اور تم لوگوں کو نور پور سے دیس نکالا دے دیا
جائے گا۔ میں نے کئی مرتبہ تمہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ
تم پڑھ لکھ کر کوئی افسر فٹنر کیل جاؤ اور اپنی بہن کو لے کر کسی
شہر میں، کسی اور گاؤں میں، جہاں ایسے وڈیرے اور خان
زادے نہ ہوں، نکل جاؤ۔ تم میری بات ماننے نہیں ہو۔ مل
چلا تے رہو گے، بھیتوں کو پانی دیتے رہو گے تو یہ لوگ تمہارا
خون چھڑ کر تمہیں کھٹکھا کر دیں گے پھر یہ گالیاں دیں گے، تم
سہ نہیں اٹھاؤ گے۔ یہ جو تے ماریں گے، تم جو تے اٹھا کر
انہیں تھماؤ گے۔ جیسے میرا باپ اور میں ہاتھ باندھ کر
کھڑے ہوتے ہیں ان کے دربار میں، ایسے ہی تم اور تمہاری
آنے والی نسل دست بستہ ہوگی۔ پھر تم بلوچ نہیں رہو گے،
کینین گئے جاؤ گے۔ جیسے میرا خاندان!“
وہ بہت گہری بات کر گیا تھا۔ میں نے تعجب سے دیکھا۔
میزکر پاس ڈرائیور کے منہ سے ایسی باتوں کا جھڑنا حیران کن
دکھائی دے رہا تھا۔
میں نے کہا۔ ”تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں؟ یہی
باتیں تو ڈاکٹر شاہ جی کرتا ہے۔“
وہ بولا۔ ”وہ سی سائی اور کتا ہی باتیں کرتا ہے۔ میں تن پر
بیٹے ہوئے واقعات کے نتیجے بیان کرتا ہوں۔“
ایسے میں خالدہ چائے کے دو پیالے نسبتاً میلی سی ٹرے
میں رکھ کر لے آئی۔ چار پائی پر ٹکا کر رکھتے ہوئے بولی۔ ”لے
صاحب جی! خالص دودھ میں پتی ڈال کر لائی ہوں۔ چوہے
تو اٹش کر اٹھو گے۔“
کھالے نے آنکھیں دکھائیں۔ ”ابھی تو تم کہہ رہی تھیں
کہ گھر میں دودھ نہیں ہے، اب دودھ پتی بنالائی ہو۔ چکر دیتی

”ہو؟“
”نہیں بھائی! تم خاموش رہو۔ یہ میرا اور صاحب جی کا
مسئلہ ہے۔“ وہ شرارت پھری مسکراہٹ میری طرف اُچھال کر
بولی۔ ”پروین کیا کر رہی تھی؟“
میں نے جھوٹ بولا۔ ”کوہاٹی کر رہی تھی۔“
”ابھی سے ہی؟“ اُس کی آنکھیں شرارت سے چلنے
بجھنے لگیں۔
”کیا مطلب؟“ میں نے غموں۔
”اپنی غزالہ سے جا کر پوچھ لو، تفصیل سے بتا دے گی۔“
”اس سے کیا پوچھوں؟“
”یہی کہ لڑکیاں کوہاٹی کب کرتی ہیں؟“ وہ منہ پر ہاتھ
رکھ کر دیکھی کھی کرنے لگی۔
کھالے نے ڈانٹا۔ ”چل دفع ہو، جا کر کپڑے دھو۔
دماغ ہے یا شیطان کا گھر ہے۔“
اُس پر ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کھٹکھٹا کر ہنسی اور
پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر لہراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں کھیا
گیا۔
کھالہ بولا۔ ”اُس کی بات سمجھو؟“
میں سمجھ گیا تھا مگر دانستہ ہی میں سر ہلایا۔
وہ بولا۔ ”جب لڑکیوں کی ہنسی ہوئی ہے یا شادی طے
پا جاتی ہے تو وہ اپنے جینز کا سامان تیار کرنے بیٹھ جاتی ہیں۔
جادوئیں کا رشتی ہیں، سرخانے بناتی ہیں اور کپڑوں پر موتی
ٹانگنے بیٹھ جاتی ہیں۔“
میں ہنسیکے ڈوسکر دیا۔ مجھے یہ موضوع مضطرب کرتا تھا۔
چائے پینے کے بعد اُھر اُھر کی باتیں کرنے کے بعد میں
کھالے کے گھر سے نکل آیا۔ حیات خان کے دروازے پر پہنچا۔
امیر نواز کا پتا کیا۔ پتا چلا کہ وہ جیت شاہ کے مزار کی طرف گیا
ہے۔ جیت شاہ کا مزار میرے گھر کے جنوب مشرق میں واقع
تھا۔ مزار کے بیرونی احاطے میں اُسے نہ پا کر میں مقبرے میں
داخل ہو گیا۔ اُسے جیت شاہ کی سبز نقش چادر میں لپیٹ کر بڑی ہی
قبر کے پہلو میں دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑے دیکھا۔
میں جو تے اُٹار کر اُس کے پہلو میں کھڑا ہو کر اُس کے
فارغ ہونے انتظار کرنے لگا۔ کن آنکھوں سے اُسے دیکھا۔
تعجب ہوا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں، آنکھوں کے گوشوں سے نم
پانی کی دو ٹپکریں پھوٹ کر رخساروں تک آگئی تھیں اور ہونٹ
بالکل ساکت تھے۔ ساکت ہونٹوں پر دل کی لڑش چھا کر تھی
ہے۔ وہ بھی دل ہی دل میں کچھ مانگ رہا تھا، کچھ طلب کر رہا
تھا۔ مجھے یہ امیر نواز بڑا عجیب لگا۔ کہاں وہ جو شراب کے نشے

میں دھت اول فول بکھا ہوا، لڑکیوں کے جذبات خیر تہ کرے
کرنا ہوا ہے ووا امیر زادہ اور کہاں مزار پر شاہوں سے ترچہ لے
لب بست کھڑا ہو، طلب گار، امیر نواز!
کانی دی گر زرتی۔ اُس پر طاری کیفیت میں کوئی تغیر واقع
نہیں ہوا تو میں نے کھار کر اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔
اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا اور پھر آنکھیں
بند کر لیں۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے
پر کھیرے، ایسی سانس کھینچوڑوں میں اُتاری اور آنکھیں کھول
دیں۔ اُسے شاید اپنے رونے کا احساس نہیں ہوا تھا، قدرے
ٹپٹکی ٹپکی آواز میں بولا۔ ”ہاں بھی شہرے! کیسے آتا ہوا؟“
میں نے کہا، ”یہ کیا ماجرا ہے؟“
”کیا؟“
میں نے اُس کی نم آنکھوں میں اشارہ کیا تھا۔
”بس ویسے ہی دل بھرا آیا تھا یار، وگرنہ رونے کی بات تو
کوئی نہیں تھی۔“ اُس نے نیم آزدگی سے کہا۔
ہم دونوں مقبرے سے نکل کر ٹپکتے ہوئے پختہ احاطے
کے شمالی گوشے کی طرف آ گئے۔ میں نے اُسے ماسی قاطر کے
ڈاکٹر شاہ جی کے پاس آنے، اطلاع دینے اور بعد ازاں وریام
خان کے پُر اشتعال روپے تک سارا ماجرا کہہ سنایا۔ میرے
خاموش ہونے پر وہ بولا۔ ”آب تم کیا چاہتے ہو؟“
میں نے کہا۔ ”وریام خان مجھ سے ناراض ہے، میں چاہتا
ہوں کہ وہ ناراض نہ رہے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔“
”مشکل ہے!“ وہ نیم مایوسی سے بولا۔
”مگر بڑا خان اُسے سمجھائے تو وہ۔۔۔۔۔“ میرا اشارہ حیات
خان کی طرف تھا۔
”خیر! تم فکر نہ کرو، میں اب جی سے بات کر لوں گا۔ ڈاکٹر
شاہ جی والا کیا قصہ ہے؟“
”کیا مطلب؟“
”یہ زیناں والا کیا چکر ہے؟“
میں نے زیناں اور ڈاکٹر کے باہمی تعلق کی نوعیت پر دو
لوک موقف اختیار کیا۔ جو جی تھا، بیان کر دیا۔
وہ بولا۔ ”نہیں یہ نہ ہو کہ چاچا خان اس کہانی کو نمک مرچ
لگا کر نور پور کے گھر گھر میں پہنچا دے۔ تم یہاں کے لوگوں کو تو
جانتے ہی ہو، بات کا ٹکڑا بنانے میں دیر نہیں کرتے۔ زیناں پر
انگلیاں اٹھنے لگیں گی اور ڈاکٹر شاہ جی کا یہاں رہنا دشوار
ہو جائے گا۔“
میں نے کندھے اُچکائے۔ ”اس کا حل بھی تمہی کو ڈھونڈنا
ہوگا۔“



رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ ہوٹل کی لابی کے آخری سرے پر واقع نائٹس بار کھلا ہوا تھا لیکن اندر ماحول پر خاموشی طاری تھی۔ بار کی شیشے والی کھڑکیوں سے شے گاؤ کا ستاروں سے بھرا آسمان اور روشنیوں سے جگمگاتی اونچی اونچی عمارتیں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ سڑک پر بھی کبھار کوئی گاڑی گزرتی تو لہجہ بھر کے لیے زندگی کے آثار بیدار ہو جاتے اور اُس کے بعد پھر وہی سناٹا چھا جاتا۔ رات کے اُس پہر ہوٹل کی لابی میں بھی چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی۔ ویسے بھی یہ ویک اینڈ تو تھا نہیں جو رات گئے تک لوگ گھروں سے باہر نہ ہوتے۔ اس وقت بار میں سپردا نگر

آخری گاہک

محمد عرفان

بعض مناظر انسان کے حافظے میں کچھ اس طرح رچ بس جاتے ہیں کہ ان سے صرف نظر ممکن ہی نہیں ہوتا... اس نے بھی نظر چرائے کی بہت کوشش کی مگر اس کی گہری نظروں سے بیچ نہ سکا۔ وہ جو ماہر نشانہ باز تھا، اگر کسی کی نظروں کا شکار ہو جاتا تو تمام عمر اسے اسی حصار میں رہنا پڑتا اور یہ اسے ہرگز منظور نہ تھا۔

بل بل ہوئی گردش تیز کرتی..... ایک سسٹی فیکر کمانی

”شاہ جی نے بڑی غلطی کی۔ کیا تھا، دو گھڑی کو چلا جاتا اور میرے کو دیکھ آتا۔ اب چاہے وہ یام کو یہ ایڈوانس بھی حاصل ہے کم لیتے، اس سردار حیدر خان کی بیٹی بھی۔ بیٹی بھی وہ جس پر اس کا باپ اور بھائی جان وار تے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، ابھی چاہے وہ یام خان نے سردار حیدر خان تک یہ ہاجرا اپنے مخصوص اشتعال انگیز انداز میں نہیں پہنچایا ورنہ اب تک ڈاکٹر شاہ جی کو نوٹور پور کی گلیوں میں سر دھ جانور کی طرح گھینا جا چکا ہوتا، اُس کی بڈی پہلی ایک کر دی گئی ہوتی۔“ امیر نواز کے لہجے میں کھمبیر تانھی۔

ایک سردنا مانوس کی لہر میرے تن بدن میں اتر گئی۔ میں نے اُسے بڑے رساں سے باور کرایا کہ ڈاکٹر شاہ جی کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے ورنہ نور پور صحت کی غیر معمولی سہولتوں سے محروم ہو جائے گا۔ وہ خود بھی ڈاکٹر شاہ جی کا فین تھا۔ اُس کی دل سے عزت کرتا تھا۔ اُس نے مجھے دلاسا دیا۔ چونکہ وہ ابھی کچھ دیر مزار میں ہی رہنا چاہتا تھا اس لیے میں اجازت لے کر جیت شاہ کے احاطے سے نکل آیا۔ میرے دل پر پڑے ہوئے پوجہ میں خاطر خواہ کی واقع ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ امیر نواز بہت کم وقت میں اس ابھی ہوئی تھی کو کلبھا کر ڈاکٹر شاہ جی کو محفوظ کر دے گا۔

رات کو کھانے سے فارغ ہوتے ہی چاچا چراغ مجھے ایک بار پھر سمجھانے بیٹھ گیا۔ زمانے کی اونچ نیچ، جمع تفریق اور معیشتوں کے تفاوت کا فلسفہ میرے ذہن میں اتارنے لگا۔ میں سر جھکا کر سنا رہا۔ چاچا اپنی زندگی کے تجربات کا ٹچوڑ پیش کر رہا تھا جبکہ میں غیر محسوس انداز میں کھالے کی باتوں کو دل ہی دل میں ڈھرا رہا تھا۔ دونوں کی باتوں میں تضاد تھا۔

کھالا کہتا تھا، ایک بار جھکنے والا زندگی میں کبھی سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہیں ہو پاتا۔

چاچا سمجھا رہا تھا کہ پھل سے لدی ہنسی ہی جتنی ہے۔ جس شاخ پر پھل نہیں لگتا، وہ جھکتی نہیں بلکہ ہواؤں کے دوش پر تڑپتی چلتی رہتی ہے۔ کھالے کی باتیں دل کو گتھیں، چاہے کی باتیں کھولیں اور انجینی می محسوس ہوتی تھیں۔ ایک طرف فتنوں کی اس نشست میں چاچا اور پروین نے بھی حصہ ڈالا۔ میں نادان نہیں تھا مگر اُس گھڑی نادان بنا بیٹھا بن رہا تھا، اثبات میں سر دھن رہا تھا۔ وقتی طور پر اسی خاموشی میں ہی عافیت تھی۔

رات بھر ستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ذہن بار بار ڈاکٹر شاہ جی کی طرف چلا جاتا۔ وہ مجھے بہت پیارا تھا۔ اُسے پہنچنے والے

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

اٹھ اٹھ اور ایک بار ہینڈلر جیری موجود تھا۔ باقی عملہ چھٹی کر چکا تھا۔ ویسے کچھ دیر پہلے یہاں خاصا ہنگامہ تھا۔ بینک کے دس ملازمین پر مشتمل ایک گروپ ترقی کا جشن منانے کے لیے یہاں جمع تھا۔ وہ پینے پلانے کے ساتھ اونچی آواز میں قہقہے لگا رہے تھے۔ پندرہ منٹ پہلے ہی وہ اٹھ کر گئے تھے، جس کے بعد سے بارش خاموشی کا راج تھا۔

”تم جاؤ تو گھر چلے جاؤ، میں کام نسا کر بار بند کر دوں گا۔“ جیری نے پیر وائرڈ ہیلروں کو پیش کی۔ اسے یقین تھا کہ اب کوئی یہاں نہیں آئے گا۔ اس وقت وہ ایک، ایک کر کے سارے گلاس دھو کر قرینے سے ریک میں لگا رہا تھا۔ ”تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی نا؟“ یہ پیشکش سن کر ڈیلروں جھوم اٹھا تھا۔ مگر جاتے جاتے پھر بھی اُس نے اخلافا پوچھ لیا۔

”ارے نہیں دوست..... جلدی سے گھر جاؤ، بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔“ جیری نے اسے یقین دلایا اور گلاس دھو رہا۔

شکا کو کے مقامی قوانین کے تحت و یک اینڈ پر صبح پانچ بجے جبکہ عام دنوں میں چار بجے تک بار بند کر دینا لازم تھا مگر عام دنوں میں رات بارہ بجے ہی بار میں سناٹا چھا جاتا تھا۔ بھی بکھار ہوئی میں ٹھہرنے والا کوئی گا بک آجاتا ورنہ تو خاموشی ہی چھائی رہتی تھی۔ اُس وقت بھی ہال میں صرف ایک ادیبہ مخلص بیٹھی رہا تھا۔ ڈیلروں کے جاتے ہی وہ آخری شخص بھی اٹھ گیا۔ یعنی خاموشی سے وہ پچھلے گھنٹا بھر سے بیٹھا تھا، اتنی ہی خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی بارگاہوں سے مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ جیری سوچ رہا تھا کہ بس جلد از جلد سٹانی تھرائی مکمل کر لے تو وہ بھی گھر جائے اور سو جائے۔ ویسے بھی وہ آج شام یہ سوچ کر آیا تھا کہ رات جلدی ہوئے گا۔

جیری کام نمٹانے میں لگا ہوا تھا کہ اسی دوران میں ایک دروازہ قامت شخص اندر داخل ہوا اور بار کو خالی دیکھ کر خشک کر دروازے میں ہی ٹھہر گیا۔ ”آ جاؤ۔“ جیری نے اسے رکتے دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بکثت کہیں رات کالی نہ کر دے۔“ لگتا ہے آج بھی جلدی سونا نصیب میں نہیں ہے۔ ”غیر متوقع گا بک کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں اُس پر لعن طعن کرنے لگا۔ نووارد گا بک عمہ گھر تراش خراش کے مٹوٹ میں لمبوس تھا۔ چہرے مہرے اور لباس سے وہ مہذب اور دولت مند لگ رہا تھا۔ جیری کا اشارہ دیکھ کر وہ اطمینان سے آگے بڑھا اور گاؤنٹر کے ساتھ ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

جیری ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس ریک میں رکھ کر تو لیا سے ہاتھ پوچھتے ہوئے اُس کی طرف بڑھا۔ اس کے لبوں پر کاروباری مسکراہٹ بھی ہوئی تھی۔ ”کیسے..... کیا لینا پسند کریں گے آپ؟“ اس نے نووارد کے بالکل قریب ہو کر شائستہ لہجے میں پوچھا۔

”پنیر میں تلے ہوئے زیتون کے ساتھ.....“ یہ کہتے ہوئے نووارد اُسے اپنا آرڈر لکھوانے لگا۔

”ابھی لاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کو مڑا۔

”سنو.....“ گا بک نے پیچھے سے آواز دی۔

”کیسے؟“ جیری نے پلٹ کر پوچھا۔ ویسے بھی رات کے اس پہر جب وہ گھر جانے کا سوچ رہا تھا، یہ گا بک اسے عذاب سے محروم نہیں ہو رہا تھا۔

”مجھے زیتون بہت پسند ہیں۔ دو چار زیادہ ڈال دینا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ”تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی نا؟“ اس نے اس انداز سے یہ بات کہی، جیسے اُسے آرڈر دینے پر ندامت ہو رہی ہو۔

”بالکل بھی نہیں۔“ جیری نے ایک بار پھر مصنوعی کاروباری مسکراہٹ لبوں پر سجائی تھی۔ ویسے اس کا خیال تھا کہ گا بک خاصا مالدار ہے۔ رات کے آخری پہر کے آخری گا بک سے اُسے بھاری پلٹ مل سکتی تھی۔

”لیجیے۔“ دیکھ کر بعد جیری اس کے سامنے گلاس رکھ رہا تھا۔

”بہت عمدہ۔“ گا بک نے خشکی بھری اور پھر زیتون کا ایک دانہ منہ میں ڈال کر کہنے لگا۔ ”ہیش کی طرح شاندار اور لذت یز۔“

جیری نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے آگے بڑھ کر اپنے کام نمٹانے میں لگ گیا۔ آخری گا بک اپنے شغل میں مصروف تھا۔

”بڑی خاموشی ہے یہاں پر۔“ جیری کھڑکی کے پردے برابر کر رہا تھا، تب اُس نے کہا۔

”جی ہاں.....“ یہ کہنے کے لیے جیری کو ایک بار پھر مسکراتا پڑا تھا۔ ”رات کے تقریباً دو تینتے والے ہیں اور یہ مشکل کی رات ہے۔“ وہ یہ باور کروانے کی کوشش کر رہا تھا کہ

ایک اینڈ نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے گا بک کا اتنا زیادہ احترام کرتے ہیں کہ اپنی نیند تک قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

”مشکل کی رات نہیں، بدھ کی علی الصباح.....“ گا بک

”بہت شکر ہے تمہارا۔“ یہ سن کر اس نے کہا۔ ”تو چلو،“

اسی بات پر میری طرف سے ایک بہت شاندار ڈرنک بناؤ اپنے لیے۔“ اس نے جیری کو پیش کی۔ ”گھر مت کرو، بل میں دوں گا اور ہاں میرے ساتھ بیٹھ کر بیو۔ اکیلے پیتے ہوئے مزہ نہیں آ رہا۔“

جیری دوسرے بار ہینڈروں کی طرح فطری طور پر بہت باتونی تھا اور اس وقت باتیں بنانے کے موڈ میں قطعی نہیں تھا مگر اس نے میک کی دعوت یہ سوچ کر قبول کر لی کہ چلو کون سا جیب سے کچھ جا رہا ہے۔ ویسے بھی جب تک وہ بیٹھا ہے، اسے یہاں ہونا ہی ہے تو کیوں نہ خشکیاں بھرتے ہوئے وقت گزارا جائے۔ یہ بار ہوں کی ملکیت تھا اور عموماً رات گئے تک کھلا رہتا تھا۔

”اور سناؤ، کیا حال ہیں؟“ وہ گلاس لے کر کاؤنٹر کی دوسری طرف بیٹھ میک کے سامنے والے اسٹول پر بیٹھ گیا تو اُس نے رسوا پوچھا۔ وہ بات سے بات نکال کر وقت گزاری کا ماہر تھا۔ یہ سن کر جیری زبان سے تو کچھ نہ بولا البتہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

”میں نے سنا ہے یہاں پچھلے ہفتے کچھ کوئی گزربڑ ہوئی تھی؟“ اسے خاموش دیکھ کر میک نے سوال کیا۔

”ہاں، وہ کچھ ایسا ہی ہے۔“ جیری نے گول مول جواب دیا۔

”کیا ہوا تھا؟ کچھ بتا سکتے ہو اُس واقعے کے بارے میں۔“

میک کی فرمائش سن کر وہ دل ہی دل میں جھٹلا کر رہ گیا۔ پچھلے ایک ہفتے کے دوران وہ پکڑوں بار لوگوں کو یہ قصہ سنا چکا تھا۔ آج بھی دو چار لوگوں نے اس واقعے کا سرسری تذکرہ کیا تھا لیکن میک ان سب سے الگ تھا۔ وہ ڈرنک کی قیمت پر اس کا دماغ کھانے کو کھلا ہوا تھا۔ ”کوئی جلتی جی یہاں پچھلے ہفتے۔“ جیری نے خشکی بھری اور بے تاثر لہجے میں کہا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ واقعہ سننے بغیر چچا نہیں چھوڑے گا۔ ”ایک آدمی مارا گیا اور بس!“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور دیکھنے لگا کہ یہ سن کر میک کے تاثرات کیا ہیں۔

”ارے چھوڑو یار..... کیا بات کرتے ہو۔“ میک نے لپکتے ہوئے کہا۔ ”آدمی کو گولی مار کر قتل کر دیا، یہاں اس پر جھوم بارشیں۔“ اس نے گلاس والے ہاتھ کو اوپر اٹھا کر تھوڑا سا لہراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ یہ قصہ سچا ہے۔“

”وہ یہاں مرا تھا، اس جگہ پر۔“ یہ سن کر جیری نے میک کے دائیں ہاتھ پر رکھے اسٹول کی طرف اشارہ کرتے

”میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہوتا چاہیے؟“ اس نے گلاس کو خالی ہوتا دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اور کیا لینا پسند کریں گے آپ؟“ جیری نے دونوں کہنیاں بار کاؤنٹر پر رکھیں اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ارے سنو..... تمہارا نام کیا ہے؟“ اچانک اس نے موضوع بدل دیا اور اٹھ کر گاؤنٹر پر آکر پوچھنے لگا۔

”جیری تھا اس۔“

میں ہوں میک۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا داہنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھا یا اور نہایت گرم جوشی سے جیری کا ہاتھ ہوا ہاتھ تمام لیا۔ ویسے تو جیری کم باتونی نہیں تھا مگر رات کے اس پہر وہ خاصا تھک چکا تھا۔ اس وقت اسے کسی اجنبی گا بک سے باتیں کر کے وقت گزاری کی قطعی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو بس جلد سے جلد بستر میں لیٹ کر نیند کی وادی میں کھوجانا چاہتا تھا مگر میک کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اسے نیند کے بجائے وقت گزاری کا بہانہ چاہیے تھا۔ شاید اسی لیے وہ اپنے کمرے سے اٹھ کر بار میں آ بیٹھا تھا۔

”لگتا ہے تمہارا کام ختم ہو چکا؟“ میک نے گہری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کام تو ختم ہو چکا۔“ جیری نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تو گھر جانے کی تیاری ہے۔“ اس نے غماز آؤد لہجے میں کہا۔

”کیا سب جا چکے؟“

”ہاں..... اب میں بھی یہاں ہوں اور وہ بھی آپ کی خدمت کے لیے۔“ کہیں گا بک کو یہ بات بُری نہ لگے۔ اس لیے وہ یہ کہہ کر مسکراتے لگا۔

”کوئی دو گھنٹے بعد“۔ جبری نے گلاس سے ہنسل بھرتے ہوئے کہا۔ میک نے ایک گلاس کی آفر کی تھی اور اب وہ موفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہنسلے شروب کا دوسرا گلاس بھر کر بیٹھا ہوا تھا۔ ”وہ بے پولیس نے یہ کہہ کر اس جگہ کو طیر کر دیا تھا کہ یہاں ایسی کوئی شے نہیں ملی، جس سے تفتیش میں مدد مل سکتی ہے۔“ یہ کہہ کر جبری نے اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ بے پولیس بھی گولیاں مقتول کے جسم میں پیوست تھیں۔ پوسٹ مارٹم میں وہ خود ہی نکل آئیں، یہاں ایسا کیا رکھا تھا کہ جس سے پولیس کو کچھ پتا چل سکتا۔“ اس نے ایک بار پھر قاتلین پر نظر ڈالی۔ ”یہاں تو صرف خون، الٹی میزین اور نوٹے گلاس تھے۔“

”ہوں..... س..... س.....“ میک نے یہ سن کر ہنکارا بھرا۔ ”مجھے اندازہ ہے کہ اس وقت یہاں کیا حالت ہوگی۔“ ”سب کچھ تیس تیس ہوا تھا۔“ جبری نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو باہم رگڑتے ہوئے کہا۔ موسم بہار کے باوجود رات کا یہ چہرہ خاصا غمناک تھا۔ ”سنو.....“ جبری نے اس کی طرف جھٹکتے ہوئے اسٹے آہستہ سے کہا کہ کہیں کوئی سن نہ لے، حالانکہ اس وقت بار بار بالکل خالی تھا۔

”گھو.....“ میک نے اس کا راز دارانہ انداز محسوس کر لیا تھا۔ اس نے بھی آگے جھک کر سر کوٹھی کی۔ ”جس رات یہ واقعہ ہوا، اس سے اگلی رات صفائی کے دوران مجھے یہاں سے ایک شے ملی تھی۔“ اس نے ہاتھ سے میک کی عقی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ اس دیوار کے ساتھ بار کا ڈنٹر جڑا ہوا تھا۔

”وہ کیا چیز تھی؟“ میک نے تجسس سے پوچھا۔ جبری کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں چمک آئی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جبری اسے ایسی بات بتانے والا ہے جس کا ذکر اس نے کسی اور سے اب تک نہیں کیا ہوگا، جیسی تو اس کا انداز راز دارانہ تھا۔

”وہ میرے خیال میں.....“ جبری نے بات ادھوری چھوڑ دی اور کچھ سوچنے لگا۔ وہ جس شے کا تذکرہ کرنے جا رہا تھا، اس کے لیے مناسب الفاظ اسے نہیں مل رہے تھے۔ ”کیا ہے وہ؟“ جب چند لمحوں تک وہ کچھ نہ بولا تو میک نے بے تابی سے سوال دہرایا۔

”وہ کوئی گلوب جیسی شے تھی۔“ جبری نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

”گلوب جیسی.....“ مین کر میک نے حیرت سے کہا۔

”وہ جیسے نشو رول ہوتا ہے نا۔“ ایسا لگ رہا تھا جیسے

اب بھی وہ اس شے کو بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش میں ہے۔

”وہیے وہاں سے یہاں تک کا فاصلہ بیس فٹ تو ہوگا نا۔“ اچانک جبری نے موضوع بدل دیا اور ہاتھ سے سمت کا تعین کرتے ہوئے پوچھا۔

”تقریباً۔“ میک نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ یہ بات اس نے محسوس کر لی تھی کہ جبری نے اچانک بات بدلت دی ہے مگر کیوں؟ وہ یہ نہیں جانتا تھا لیکن اس کو سچ میں ٹوکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جبری نے یہ سن کر منہ سے تو کچھ نہیں کہا، صرف کندھے اچکا دیے۔

”جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو تم یہیں کھڑے تھے؟“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جبری یہ بات پہلے بھی اسے بتا چکا تھا لیکن نہ جانے کیوں میک نے ایک بار پھر اس سے تصدیق کے انداز میں پوچھا۔

”بالکل ٹھیک۔“ اس نے میک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اتنا قریب تھا جتنا کہ اس وقت تم اور میں ایک دوسرے کے نزدیک تھیں۔“

”تم کہہ رہے تھے کہ جسے گولیاں لگیں وہ تو بیٹھے بیٹھے ہی مر گیا مگر وہ نشانہ باز اس وقت کہاں تھا؟“ میک نے پھر ایک عجیب سا سوال کیا۔ مین کر جبری کے دماغ میں ایک بار پھر ہلکا سا جھماکا ہوا۔ تیسری بار اس نے قاتل کو نشانہ باز کہا تھا مگر کیوں؟ یہ بات اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وجہ پوچھ لوں مگر یہ سوچ کر چپ رہا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ اس کی ناراضی کا مطلب ہپ سے محرومی اور اب تک باتوں میں صرف ہونے والے وقت کا ضائع ہونا تھا۔ جبری کو بھاری ہپ کی امید تھی اور اب وہ اپنے وقت کی سرمایہ کاری ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”کیا وہ وہاں تھا؟“ جبری کو خاموشی دیکھ کر اس نے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اچانک جبری کے دماغ میں ایک اور جھماکا ہوا۔ اس نے جس انداز میں یہ بات کہی تھی وہ بالکل پولیس والوں جیسا تھا۔ ”میک..... تم کرتے کیا ہو؟“ جبری نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔ اسے اب اس پر کچھ شک ہونے لگا تھا۔ جس انداز میں وہ باتیں کر رہا تھا، اس ایک ہفتے کے دوران میں ہی نے بھی اس انداز میں اس کی نقل کی زوداد جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”ایڈوٹائزنگ مار ٹینگ۔“ اس نے بے تاثر لہجہ میں

کہا۔ ”ہاں تو یہ بتاؤ کہ جس نے پستول سے فائر کیا ہے، اس کا کیا پتا؟“ اس نے جبری کے سوال کا مناسب جواب دینے سے گریز کیا اور ایک بار پھر اپنی بات پروا نہیں آگیا۔ ”گولیاں چلانے کے بعد وہ نہایت آرام سے آگے بڑھا اور یہاں کا ڈنٹر پر پستول رکھ کر واپس چلا گیا۔“ جبری نے جملہ لے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ میک کے بارے میں اس کا شک یقین میں بدلنا جا رہا تھا۔

”تم سنجیدہ نہیں ہو سکتے؟“ اس کے یہ ظاہر احقانہ جواب سے میک نے بھانپ لیا تھا کہ اب وہ زچ ہونے لگا ہے۔ اس لیے اس نے استفسار یہ لگا ہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سرسری طور پر اس قصہ کو جاننے کے بجائے کسی خاص مقصد کے تحت اسے کر رہا ہے۔

”میں پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ وہ پستول کا ڈنٹر پر رکھ کر ٹھٹھا ہوا چلا گیا تھا؟“ جبری نے اس بار قدرے محتانت سے جواب دیا۔

”اوکے۔“ اس بار میک اس کا جواب سن کر مطمئن نظر آیا۔ ”اس نے پستول کس جگہ پر رکھی تھی؟“

”وہاں، جہاں بیٹھے ہو؟“ اس کے داہنی جانب۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس جگہ کی نشاندہی کی۔

”لوگوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی؟“ ”ایک تو اس وقت بارش لوگ تھے، دوسرے کہ پہلی گولی چلتے ہی سب بھاگ کھڑے ہوئے تھے اپنی اپنی جان بچانے کے لیے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر ہلکی مگر اہم طاری تھی۔ ”وہ بے پولیس بھی پستول ہاتھ میں ہو تو کون قریب آتا ہے۔“

”اس نے پستول یہاں کیوں چھوڑ دی، وہ اسے ساتھ بھی لے جاسکتا تھا؟“ میک نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کا جواب تو وہی بتا سکتا ہے۔“ جبری نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

”پستول سے کچھ پتا چلا؟“ ”نہیں.....“ جبری نے جواب دیا۔ ”پولیس سرانخرساں بتا رہا تھا کہ گولیاں چلاتے وقت اس نے ہاتھوں پر دستاں پہنے ہوئے تھے۔ پستول پر آنکھوں کے نشانات بھی نہیں تھے اور سر پر بھی مٹائی گیا تھا۔“

”وہیے عجیب بات ہے کہ وہ اپنی پستول چھوڑ

بے چین روح

منخوا ایک بہت بڑی گاؤں تھا۔

اس کا کوئی دوست ایسا نہیں تھا جسے اس نے گالی نہ دی ہو، کوئی پیٹرش ایسا نہ تھا جس سے اس نے لڑائی مول نہ لی ہو۔ کوئی مالک ایسا نہ تھا جس کی اس نے بے عزتی نہ کی ہو۔ بظاہر وہ ترقی پسندوں سے خوش نہیں تھا نہ غیر ترقی پسندوں سے۔ نہ پاکستان سے، نہ ہندوستان سے نہ بالکل سام سے، نہ دوس سے۔

جانے اس کی مضطرب، بے قرار دے جین روح کیا چاہتی تھی؟ اس کی زبان بے حد سچی تھی، انداز بیان تھا تو کڑوا، کسلا اور خاردار بشر کی طرح تیز اور بے رحم۔ لیکن آپ اس کی گالی کو، اس کی سچ گالی کو، اس کے تیز فوکیلے خاردار الفاظ کو ذرا سا کھرچ کر تو دیکھیے۔ اندر سے زندگی کا بیٹھا مٹھاس چپکے لگے گا۔ اس کی نفرت میں محبت تھی، عریانی میں سر پوشی۔ آہر پانچہ ہفتوں کی داستانوں میں اس کے ادب کی سخت پنہاں تھی۔ زندگی نے منخوا سے انصاف نہیں کیا لیکن تاریخ ضرور اس سے انصاف کرے گی۔

(کرشن چندر)

مرسلہ: عمن حیاس باہر، ادا کاؤ

گیا۔ جب وہ پستول چھوڑ کر جہارے کہنے کے مطابق غیر مسلح ہو کر واپس جا رہا تھا، تب تو لوگ اسے پکڑنے کی کوشش کر سکتے تھے؟“

”مگر تم تو یہیں پر تھے؟“ میک نے قہقہہ لگای کی۔ ”میں تو اس وقت یہ سب دیکھ کر اپنے اوسان کو بیٹھا تھا۔“ جبری نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے تو لگ رہا تھا کہ بس! اب میں بھی گیا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے جبر جبری لی اور بات مکمل کر کے سر کو جھکا دیا جبکہ وہ اس لمحے کی خوف زدہ کرنے والی بیباک بادوں کو ذہن سے جھٹک کر دور پیچھے دھکیلا جاتا ہے۔ ”وہیے تم ہی ٹھیک کہہ رہے ہو اسے پکڑنے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”خیر..... جو ہوا، سو ہوا، اب کیا کر سکتے ہیں۔“ ”تم جانتے ہو جب گاڈ قاور کے انگیل نے پولیس میں اور ایک شخص کو گولیاں مار کر ہلاک کیا تھا۔“

”کون مانگیں۔“ جیری نے یہ نام سنتے ہی میک کی قطع کلائی کی۔ اُس کی آنکھوں سے حیرت جھلک رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے قصے میں میک کا یہ مانگیں کہاں سے آچکا۔ ”گاؤ فادر.....“ میک نے سر دھجے میں کہا اور جیری کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اب بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔ ”میں قلم گاؤ فادر کی بات کر رہا ہوں۔“

”اوہو..... تو یہ بات ہے۔“ یہ سن کر جیری نے گہری سانس لی۔ ”میں تو حیران تھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟“

”جب گاؤ فادر میں مانگیں رہے تو ران میں پولیس کیشن اور وہاں موجود دوسرے شخص کو گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے، تب وہ بھی اسی طرح اطمینان سے آگے بڑھ کر میز پر پستول رکھتا ہے اور سکون سے چلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔“

”ہاں یاد آگیا۔“ جیری نے یہ مد اعلت کی۔ ”میں نے یہ قلم کافی عرصے پہلے دیکھی تھی۔“

”یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔“

”مگر قلم میں تو مانگیں اندر داخل ہو کر گولیاں چلاتا ہے مگر وہ تو یہاں بیٹھا ہوا تھا۔“ جیری نے مڑ کر ایک طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے ڈرنک بھی لیا تھا۔“

”تو گلاس.....“

”اُس پر سے بھی اگلیوں کے نشانات غائب تھے۔“

جیری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے وضاحت کی۔ اچانک اسے غلت محسوس ہوئی۔ وہ قصے کو بیان کرتے ہوئے میک کے سوالوں کے جوابات میں بہت کچھ بھول گیا تھا۔ اسے لگا کہ میک اسے بزدل سمجھے گا کہ خالی ہاتھ قاتل کو پکڑنے کے لیے بھی آگے نہیں بڑھا۔ اس لیے اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”جو کچھ ہوا، وہ اتنا اچانک اور خوف زدہ کر دینے والا تھا کہ پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کروں۔“ جیسے ہی میرے حواس ذرا بحال ہوئے، میں نے فوراً پولیس کو نوٹن کر دیا۔ انہیں آنے میں پندرہ منٹ لگے۔ میرے لیے یہ پندرہ منٹ پندرہ سال جتنے طویل تھے۔“ وہ یہ باور کروانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بزدل نہیں ہے مگر اچانک ہونے والی واردات سے وہ حواس باختہ ہو گیا تھا۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ جیری کی آنکھوں کے سامنے زندگی میں پہلی بار کوئی قتل ہوا تھا۔ ”میں مقتول کے سین برابر میں کھڑا تھا۔ میں تو اُس وقت یہی سمجھا کہ قاتل شاید میری بھی جان لے لے گا مگر اسے اپنے نشانے کا اچھی طرح پتا تھا، بھی تو وہ اپنا کام پورا کر کے فوراً چل دیا۔“

یہ سن کر میک کچھ نہ بولا، صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اُس نے ڈرنک کے بعد گولی چلائی۔ اس کا مطلب ہے کہ پینے کے بعد گلاس کا ڈنٹر پر رکھا تھا۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

”ہاں..... مگر اس پر اگلیوں کے نشانات نہیں تھے؟“

”جیری.....!“ یہ سن کر میک نے اُسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

”وہ..... وہ.....“ جیری اکتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”جب میں نے پولیس کو نوٹن کیا تو اُس کے بعد بے دھیانی میں وہ گلاس دھو کر بھی رک پر لگا دیا تھا۔“

اس نے بات بتائی۔ وہ یہ کہتے ہوئے خاصا گڑبڑا گیا تھا۔

”اچھا.....“ میک نے اسے گھورا۔ ”قتل کا اہم ثبوت اور تم نے صاف کر دیا۔“ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ ”تم نے یہ بات پولیس کو بھی بتائی تھی؟“

”ہاں..... شاید نہیں۔“ میک کے غیر متوقع سوالات نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ ”اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔“ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بات مکمل کی۔ خشکی کے باوجود اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوئی تھیں۔

میک نے کچھ نہیں کہا البتہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بے دستور معنی خیز انداز میں مسکراتا رہا۔ یہ دیکھ کر جیری کچھ اور پریشان ہو گیا تھا۔ ”کیا کروں، عادت سی ہوئی ہے۔“ جونہی کوئی گندا گلاس دیکھا، جھٹ سے اٹھا کر دھویا اور ریک میں لگا دیا۔ اُس دن بھی کچھ ایسا ہوا تھا۔ گھبراہٹ میں خیال ہی نہیں رہا۔“ جیری کو کچھ خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس لیے اب وہ قتل کا دلچسپ قصہ سنانے کے بجائے اپنے دفاع پر اتر آیا تھا۔ رات ڈھل رہی تھی لیکن اب جلدی گھر جانے کا خیال بھی اس کے دماغ سے نکل گیا تھا۔ پہلے اسے اجنبی گاہک سے بھاری پپ کی امید تھی اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس بلا سے کیسے جان بچ جائے۔

”خیر جو چاہے کہہ لو۔ یہ تمہاری عادت بن چکی ہے۔“

میک نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”عادت پڑ جائے تو آدمی کہاں رکتا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی اُس دن ایسا ہی ہوا ہوگا۔ اُس نے گلاس رکھا اور کوئی چلا دی۔ پولیس جب تک پہنچتی تھی تم نے گندا گلاس دیکھا اور دھو کر رکھ دیا۔ ویسے بھی گھبراہٹ میں غلطی تو ہو ہی جاتی ہے۔“

”ہاں۔“

”یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔“ میک نے مسکرا کر اُس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس کے بیان پر سو فیصد یقین کر چکا ہو۔

”اب برسوں سے بارشینڈر ہوں، عادت سی پڑ گئی ہے گلاس دھونے کی۔“ اسے مطمئن ہوتے دیکھ کر جیری نے لقمہ دیا۔

”ایسا ہی ہوتا ہے۔“ میک نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور خالی گلاس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں ایک، ایک ڈرنک اور لینا چاہیے۔“

”اور.....؟“ جیری نے یہ سن کر مسوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”دکھ کر نہ کرو، جلی تو میں ہی دوں گا۔ اپنا بھی اور تمہارا بھی۔“

جیری نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا اور کاؤنٹر کے پیچھے جا کر ریک سے دھلے ہوئے گلاس نکالنے لگا۔ میک گہری نظروں سے ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ کھڑکی کے پردے گرے ہوئے تھے اور ہال میں ہلکی روشنی نے ماحول کو ہراساں کرنا دیا تھا۔ سامنے ہوٹل کی لابی بھی سسٹن تھی اور وہاں بھی روشنیان مدہم تھیں۔

تقریباً پانچ منٹ بعد دونوں ایک بار بھر، ایک دوسرے کے سامنے گلاس تھے خاموش بیٹھے تھے۔

”ویسے اُن دونوں کے درمیان کچھ بات چیت ہوئی تھی؟“ کافی دیر بعد میک نے گلاس سے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ نہیں۔ بس! وہ آیا، ڈرنک لیا اور پھر گلاس خالی کرنے کے بعد اُس نے جب سے پستول نکال کر گولیاں چلا دیں۔ لیکن ہے کہ اُن کے درمیان پہلے کچھ ہوا ہو۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”ورنہ کوئی کسی دوسرے شخص کی جان کیوں لے گا۔“

جیری ایک بار پھر پر اعتماد نظر آ رہا تھا۔

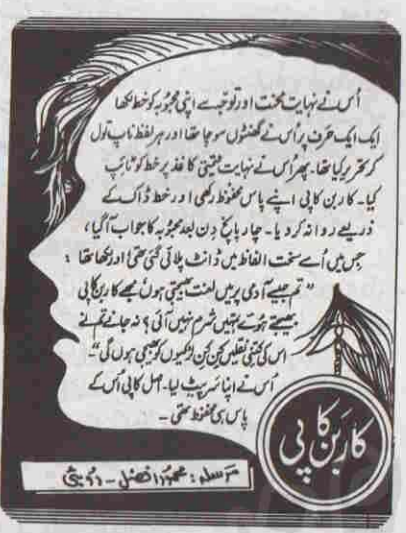
”اگر وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے تو اُن کے درمیان کم از کم ہیلو ہائے تو ہونی چاہیے تھی۔“ میک نے جیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پتی کی بات کے لیے ڈرنک کرتے وقت اُن کے پاس اتنا وقت ہو گا ہی۔“

”اُن کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی؟“ جیری نے بے زاری سے کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس جرح سے تنگ آ گیا ہے۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”میں اُن پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔“

”کیا مطلب؟“ میک نے جیرانی سے کہا۔ ”تم اُن پر کیوں نظریں رکھے ہوئے تھے۔ کیا وہ مشکوک نظر آ رہے تھے؟“



”میں یہاں کا انچارج بارشینڈر ہوں۔“ جیری نے اسے باور کرایا۔ ”یہ میرا فرض بنتا ہے کہ یہاں آنے والوں پر نظر بھی رکھوں۔“

”ہوں۔“ میک نے یہ سن کر دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تو اُس وقت بارشینڈر کتنے کا حکم موجود تھے؟“

”اب صحیح تعداد تو یاد نہیں۔“ جیری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”چھ سات گاہک تو ہوں گے۔“

”تو جب پہلی کوئی چلی تو اُن لوگوں کا ری ایکشن کیا تھا؟“

”جان بچانے کے لیے کوئی زمین پر جھکا تو کوئی دروازے کی طرف بھاگا۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”افرا تفری پھیل گئی تھی ہر طرف۔“

”ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے ایسے موقع پر۔“ میک نے تائیدی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”پھر تو کسی نے بھی گولیاں چلانے والے کو اتنی غور سے نہیں دیکھا ہوگا کہ اُس کا چہرہ یاد رہ جائے۔ ویسے بھی کسی کو کیا پتا ہوگا کہ یہ شخص ابھی گلاس رکھ کر گولیاں چلا کر شروع کر دے گا۔ بارشینڈر تو گاہک آتے جاتے رہتے ہی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لحد بھر کے لیے رک اور جیری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔

”کیوں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”ہاں لگ ٹھیک۔“ جیری نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ حیران تھا کہ اتنی رات ہو رہی ہے۔ کھڑکی تین کے ہند سے

کے قریب پہنچ چکی ہے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے اور اپنا نام میک بتانے والا واپس جا کر سونے کے بجائے اُس فصول قصے میں لگھا ہوا ہے، جس کو دو منٹ میں سننے والے دو سیکنڈز ہلا کر افسوس کرتے ہیں اور پھر اپنے کاموں میں مگن ہو جاتے ہیں مگر یہ تو بال کی کھال اُنارے میں لگا ہوا ہے۔ گلا ہے کہ اُسے جا کر سونے اور صبح اٹھ کر اپنے کام نہانے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ خود جی رہی کی اُنکھوں میں بھی نیند کا خمار چھانے لگا تھا۔

”لیکن تم اُسے پہچانتے ہو۔“ میک نے اُسے پوری بات کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔
”میں تو میں کہہ رہا ہوں کہ وہ نہیں جانتا کہ کتنے لوگ اُسے پہچان سکتے ہیں۔“
”مگر کیوں؟“

”یہ بات صرف پولیس جانتی ہے کہ میں نے اُسے دیکھا ہے اور وہ چہرہ مجھے یاد ہے۔“ جیری نے اُس کے قریب ہوتے ہوئے ہلکی آواز میں کہنا شروع کیا، میک کی یہ ظاہر پوری توجہ اُس کی طرف تھی۔ ”اگر وہ سامنے آئے تو اُسے پہچان بھی سکتا ہوں مگر یہ بات پولیس نے اخبار والوں کو نہیں بتائی۔ اسی لیے وہ نہیں جان سکتا کہ صرف ایک آدمی ہی اُسے شناخت کر سکتا ہے اور وہ میں ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔
”اُس نے یہاں خود اپنی آنکھوں سے کئی لوگوں کو پیٹھے دیکھا تھا۔ اُسے یقین ہوگا کہ ایک سے زیادہ لوگ اُسے پہچان سکتے ہیں۔ اس لیے وہ صرف مجھ سے نہ تو رابطہ کرے گا اور نہ ہی مارنے کی کوشش..... مجھ سمجھے گا۔“

”ٹھیک کہتے ہو مگر پولیس کے بعد میں تمہارا یہ راز جان گیا ہوں۔“ میک نے سنجیدگی سے کہا۔ یہ سن کر جیری لمحہ بھر کے لیے خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے پہلے پڑتے چہرے کو دیکھ کر وہ زور سے ہنسا اور دوستانہ انداز میں کہا۔ ”میں کیوں تمہیں ماروں گا۔ یہ لو مجھے پہچان لو۔ کیا میں وہی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے چہرہ آگے بڑھا دیا۔ اس نے نیک بار پھر زور دار قبضہ لگایا اور گھونٹ بھر لگا۔ اُس کی پوری توجہ گلاس پر مرکوز تھی۔ کچھ دیر پہلے جیری پر میک کی وجہ سے جوا عصابی تناؤ طاری تھا، وہ اُس کے قبضے کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا۔ جیری کو یقین ہو چلا تھا کہ یہ خوش باش گاہک وقت گزاری کر رہا ہے۔ اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ سوچ کر وہ خود کو خاصا ہلکا بھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ میک نے خالی گلاس ہاتھ بڑھا کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر جیری نے دل ہی دل میں دعا کی کہ وہ اب مزید فرائض نہ کرے۔ وہ تھک چکا تھا اور گھر جا کر لمبی تان کو سونا چاہتا تھا۔

”بڑا شان دار تجربہ رہا تم سے مل کر۔“ میک نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا وقت گزارا ہے۔“
”مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ جیری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اب یہ اٹھ کر جانے ہی والا ہے۔ اس لیے اس کے اندر کی خوشی لہجے میں مضامین بن کر آگئی تھی۔“

”اُسے واہ.....“ وہ اٹھ رہا تھا کہ اس کی نظر کاؤنٹر کی

عقبی دیوار پر شیشیوں کے طور پر لگی رائل پر پڑ گئی۔ ”بڑی شان دار چیز ہے یہ اپنے زمانے کی۔ کیا بات ہے اس رائل کی۔“ یہ کہہ کر اس نے چہرہ جیری کی طرف گھمایا۔ ”چلتی بھی ہے؟“
”نہیں۔“

”اگر اس وقت اس رائل سے ہال میں ایک گولی چل جائے تو کچھ لوگ مجھے توپ چل گئی ہے۔ بڑی آواز ہوتی ہے اس سے گولی چلتی کی۔“ میک ایک بار پھر اُس رائل کو تکیہ رہا تھا۔
”سر! آپ کے ساتھ ہاتھیں کر کے بہت مزہ آیا.....“
”اور مجھے بھی۔“ میک نے اسے بات پوری کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

”صبح کے چار بجتے والے ہیں۔“ جیری نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف نظر ڈالتے ہوئے اُس سے کہا۔ ”مجھے خوشی ہوئی اگر آپ مزید کچھ دیر یہاں رکتے مگر سی آرڈینس اور دیگر روز کے مطابق اب مجھے بار بند کرنا ہے ورنہ جرمانہ بھی لگ سکتا ہے۔“

”اوہ.....“ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”ہاتوں ہاتوں میں وقت کا دھیان ہی نہ رہا۔“ اس کا ہاتھ کوٹ کے اندر تھا۔ ”گنتا بل ۱۰؟“ اُس نے ہاتھ باہر نکالے ہوئے پچھلے۔ یہ سن کر میک دل ہی دل میں اُس کا حساب کرنے لگا۔

”یہ لو.....“ یہ سنتے ہی جیری نے سر اُپر کر کے اُس کے ہاتھ کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں بٹوے کے بجائے اعشاریہ ہاتھیں کا ساٹننگر لگا پتول تھا۔ اس سے پہلے کہ جیری اپنا پتول نکالتا یا اٹھ کر بھاگتا، میک نے نہایت ماہرانہ انداز میں، مشاق نشانہ بازی کی طرح دو گولیاں اُس کی پیشانی کے اندر اُتار دیں۔ میک اسٹول پر بیٹھے بیٹھے، پتا کوئی آواز منہ سے نکالے، لمحہ بھر میں موت کی نیند سو گیا۔ میک جلدی سے اٹھا اور کاؤنٹر کے قریب ٹنگی ہوئی تولیا اتار کر اسٹول اور گلاس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے پتول کو اچھی طرح صاف کیا اور کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ پتول کا سیریل نمبر مٹا ہوا تھا۔ دو منٹ کے اندر اندر وہ اپنا کام پورا کر چکا تھا۔

”بہت خوب، اب چلتے ہیں۔“ اس نے جیری کی طرف دیکھتے ہوئے خود دکھائی کی۔ ”بڑا ناز تھا مجھے پہچاننے کا۔ میک آپ تو اچھے اچھوں کو بے وقوف بنا سکتا ہے تو پھر تیری کیا اوقات تھی مسٹر بارٹینڈر۔“ یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور بڑبڑایا۔ ”اس بار میرے نشانے کا کوئی شکی گواہ نہیں۔“

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اللہ کی اپنے بندوں سے محبت دنیاوی مٹا سے ستر گنا زیادہ ہے تب ہی وہ ان کی رہنمائی کے لیے گاہے بگاہے نبیوں کو مبعوث کرتا رہا ہے۔ جب جب انسان نے اندھیروں کی طرف سفر شروع کیا تب تب اپنا نور اس نے دنیا میں بھیجا۔ بنی اسرائیل... ایک ایسی قوم جس پر اللہ نے اپنی نعمتوں اور رحمتوں کی بارش کر دی مگر... افسوس کہ یہ قوم لالچ، طمع اور گمراہی سے خود کو نہ بچا سکی۔ ایسے میں ہی حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا اور یہ وہ نبی ہیں جنہیں اللہ نے بادشاہت اور نبوت ایک ساتھ عطا کی... نہ صرف یہ بلکہ ان پر ہندوں کی زبان کو بھی آسان کر دیا اور آپ ﷺ کے سامنے پتھروں کو بھی زبان عطا کر دی۔ سبحان اللہ... تو کون ہے جو سبق حاصل کرے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

رضوانہ ساجد

طاوت اور جالوت سے مقابلہ کرنے والے نبی کا احوال

گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر ایسی چٹکی دھوپ لگی رہی تھی کہ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ہوا کے گرم جھکڑ اس طرح چل رہے تھے جیسے دوزخ کا دروازہ کھل گیا ہو۔ بیت لم کے رہنے والوں نے ایسی گرمی اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی لیکن یہ بھی عجیب ماجرا ہوا کہ جیسے ہی دوپہر ڈھلی اور شام کی آمد آمد ہوئی، ہوا میں ایسی ٹھنکی آگئی جیسے سردیوں کا موسم آگیا ہو۔ دھوپ ابھی پوری طرح ڈھلی نہیں تھی لیکن حدت غائب ہو گئی تھی۔ ہوا اتنی نرمی سے چل رہی تھی جیسے صحرانہ، بارغان گیا ہو۔ حضرت ایسا (یسی) نے بڑھاپے کی وجہ سے گھر سے نکلنا بالکل ہی ترک کر دیا تھا لیکن اس وقت موسم نے ایسا پلٹا کھایا تھا



”میں یہاں خود نہیں آیا ہوں۔ میں خدا کے حکم پر آیا ہوں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تجھے بیت لحمی ایشا کے پاس بھیجتا ہوں۔“

”میرے لیے شکر کا مقام ہے۔“

”یہ نہیں پوچھو گے کیوں بھیجا ہے؟“

”میری کیا مجال کہ میں خدا سے سوال جواب کروں۔“

”اسرائیل کے بادشاہ طالوت کی بادشاہت چاک کر دی گئی ہے۔ خدا مجھ سے یوں ہم کلام ہوا کہ اس نے تیرے بیٹوں میں سے ایک کو بادشاہت کے لیے چنا ہے۔ اب تو اپنے بیٹوں کو میرے سامنے لے آتا کہ میں اس ہونے والے بادشاہ کا منج کروں لیکن خبردار، جب تک طالوت تخت پر ہے کسی کے سامنے اس کا چرچا مت کرنا۔ بس یہی کہنا کہ شمول نبی یہاں قربانی کرنے آئے تھے۔“

”اے پاک نبی۔ میرے تو کئی لڑکے ہیں۔ بادشاہت کس کے حصے میں آئے گی؟“

”خداوند مجھے خود آگاہ کر دے گا۔ بس تو اپنے لڑکوں کو ایک ایک کر کے میرے سامنے لا۔“

سب سے پہلے الباب سامنے آیا۔ حضرت شمول نے اسے دیکھ کر سوچا، خدا کا مسموح اس کے سامنے ہے لیکن خدا کی رضائیں ضروری تھیں۔

خدا ہم کلام ہوا۔ ”تو اس کے چہرے اور اس کے قد کی بلندی کو مت دیکھ۔ اس لیے کہ میں نے اسے ناپسند کیا ہے کیونکہ خدا انسان کے مانند نظر نہیں کرتا۔ اس لیے کہ انسان ظاہری صورت کو دیکھتا ہے اور خداوند دل پر نظر رکھتا ہے۔“

حضرت ایشا نے دوسرے بیٹے ابیداب کو بلا یا اور اسے حضرت شمول کے سامنے سے نکالا۔ خداوند نے اسے بھی نہیں چنا۔ پھر سہ سامنے آیا۔ خدا نے اس کو بھی رد کر دیا۔ ایک ایک کر کے سات بیٹے سامنے آ گئے۔

حضرت شمول سخت ہراساں تھے۔ خدا کی جانب سے آنے والی وحی غلط نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ سب کو رد کر دیا گیا ہے۔

”کیا تیرے سب لڑکے یہی ہیں؟“ حضرت شمول نے پوچھا۔

”گھر میں یہ سات ہی تھے۔ میرے آٹھ بیٹے ہیں۔ سب سے چھوٹا ابھی باہر ہے۔ وہ بھیڑ بکریاں چرانے جاتا ہے اور اکثر اندھیرا ہونے پر ہی لوٹتا ہے۔“

”تو نے یہ بات کیوں چھپائی؟“

”وہ ابھی چھوٹا ہے برزکی کی باتوں سے اسے کیا سوار کار۔“

”جو خدا دیکھتا ہے ہماری نظروں سے اکثر اوچھل رہتا ہے۔ اسے جلد بلا بھیج۔ جب تک وہ نہیں آ جاتا ہم میں سے کوئی کھانے پر نہیں بیٹھے گا۔“

انہیں لگا کہ حضرت شمول اس بات پر خفا ہیں کہ انہوں نے آٹھ بیٹوں کی جگہ سات بیٹے کیوں ظاہر کیے۔ انہوں نے اپنے نواسے یوآب کو حضرت داؤد علیہ السلام کو بلانے کے لیے دوڑا دیا۔ یوآب ابھی چھوٹا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اندر کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ تو بس یہ جانتا تھا کہ اسے اپنے ماموں کو بلا کر لانا ہے۔ وہ اس طرف بھاگے جا رہا تھا جس راستے پر اسے امید تھی کہ

حضرت داؤد علیہ السلام واپس آ رہے ہوں گے۔

ابھی حضرت داؤدؑ آئے تھے کہ ان کے ربط سے پھوٹنے والے نغے اسے سنائی دیے۔

خداوند میرا چوپان ہے مجھے بھی تہ ہوگی

وہ مجھے ہری ہری چراگاہ میں ٹھہراتا ہے

وہ مجھے راحت کے چشموں کے پاس ٹھہاتا ہے

وہ میری جان کو بحال کرتا ہے۔

یوآب جہاں تھا وہیں رک گیا۔ اس نغے کا مطلب ہی یہ تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام گھر کی طرف واپس آ رہے ہیں وہ جب بھی گھر کی طرف لوٹتے تھے یہی نغمہ گاتے تھے، ان کا ربط اس آواز کا ساتھ دیتا تھا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ٹپکے ٹپکے اندھیرے میں اسے بھیڑیوں کا ریوڑ نظر آ گیا۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام بھی نظر آ گئے جو ربط بجاتے ہوئے ریوڑ کے پیچھے پیچھے

گھر میں دل گھبرانے لگا۔ ایسی تڑک آئی کہ باہر نکل آئے۔ اور گرد کے گھروں سے دوسرے لوگ بھی موسم سے لطف اندوز ہونے باہر آ گئے تھے۔ کچھ لوگ انہیں دیکھ کر ان کے پاس چلے آئے۔ اس وقت موسم کی تبدیلی کے سوا کسی کے پاس کوئی موضوع ہی نہیں تھا۔ سب کی ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، تعجب سب کر رہے تھے۔

”ایشا، تم نے تو بیت لحم میں طویل عرصہ گزارا ہے، تمہیں یاد ہے کبھی ایسا ہوا ہو؟“

”ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ موسم تو اپنے وقت پر بدلتے ہیں۔ ہاں ایک مرتبہ یاد ہے۔ وہ بھی میں نے دیکھا نہیں صرف سنا تھا۔ شمول نبی پہلی مرتبہ یہ شمول میں داخل ہوئے تھے تو ان کے استقبال کے لیے گرمیوں میں سرد ہوا میں چلی تھیں۔“

”اب تو سنا ہے وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اپنے شہر ”رامہ“ کے مہی نکلتے ہیں۔“

”ہاں سنا تو یہی ہے۔ کیا خبر اسرائیلیوں میں کوئی اور نبی پیدا ہوا ہو۔ یہ وہاں اس کا استقبال کر رہی ہوں۔ یا خدا بھتر جانتا ہے کوئی اور بات ہو۔“

چند لوگ اور جمع ہو گئے تھے۔ ان کے سوالات سے حضرت ایشا کلام الجھنے لگا تھا۔ مسلسل گوشہ نشینی نے انہیں مردم بے زار بنا دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ چاہتے تھے تھو جھانگیں۔ پہلے انہوں نے سوچا گھر چلے جائیں لیکن موسم انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا یا

کوئی اور بات ظہور میں آنے والی تھی۔ وہ ان لوگوں سے پچھا چمڑا کر کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ کھیتوں سے ذرا ہٹ کر زیتون اور انجیر کے درخت ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ وہ کھیتوں کے اندر سے ہوتے ہوئے ان درختوں کی طرف چلے گئے۔ درختوں کے قریب پہنچ کر انہوں نے کھیتوں کی طرف مڑ کر دیکھا۔ انہوں نے دیکھا، جتنی کی طرف سے کوئی کدھر سے پر سوار چلا آ رہا ہے۔

آج دن میں گرمی اتنی تھی کہ کوئی بھی کھیتوں میں کام کرنے نہیں آتا تھا۔ انہیں تعجب ہوا کہ یہ کون ہے جو اس طرف چلا آ رہا ہے۔ پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن بھی ہو گئے کہ ان کی طرح کوئی اور بھی سیر کے لیے نکلا ہوگا۔ وہ پھر چلے گئے۔ غیر شعوری طور پر انہوں نے

پھر مڑ کر دیکھا۔ اس مرتبہ انہوں نے اس کدھر سے سوار کو پہچانے میں دیر نہیں لگائی۔ یہ ان کا بیڑا اباب تھا جو ہاتھ کے اشارے سے انہیں بلارہا تھا۔ وہ رک گئے اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ قریب آیا تو بیت گھبرا یا ہوا تھا۔

”اباجان، آپ نے کچھ سنا۔ برکتوں کا نزول ہوا ہے۔ شمول نبی بیت لحم آئے ہیں اور ہمارے گھر اترے ہیں۔“

”کیا کہا تم نے..... ہمارے گھر اترے ہیں؟“

”ہاں، اور مجھے بھیجا بھیجا انہوں نے ہے کہ میں آپ کو بلا کر لاؤں۔ پوری بستی میں کھلبلی مچ گئی ہوئی ہے۔ ہر شخص کو تعجب ہو رہا ہے کہ وہ کیوں آئے ہیں اور ہمارے گھر کیوں اترے ہیں۔“

”باب، بات تو فکر کی ہے، وہ رامہ سے یہاں تک سفر کر کے آئے ہیں۔ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔“ پھر وہ کچھ سوچنے لگے۔ ”باب، وہ قاضی بھی تو ہیں، کوئی مقدمہ پیش ہوا ہوگا۔ اس کی تحقیق کے لیے آئے ہوں گے۔ بستی میں بہت سے لوگ لین دین میں کھیل کر رہے ہیں۔ ان کی شکایت پہنچی ہوگی۔ بہر حال چل کر دیکھتے ہیں۔“

وہ بیٹے کے ساتھ کدھر سے پر سوار ہو گئے۔ گھر کے قریب پہنچے تو بزرگوں کو صبح دیکھا لیکن اس حال میں کہ سب کے سب تھکر تھرا پڑے تھے۔ شمول نبی کا آنا کوئی عام بات نہیں تھی۔ سب ڈر رہے تھے کہ ان کے کتاہوں پر سوار ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

شمول نبی اسی لیے یہاں آئے ہیں۔ حضرت ایشا کو دیکھا تو سب کی ہمت بندھی۔ چند بزرگ حضرت ایشا کے ساتھ شمول نبی کے پاس پہنچے۔

”حضرت، ہم بہت گناہ گار لوگ ہیں۔ اگر خداوند ہم سے ناراض ہے اور ہمیں سزا دینے کا ارادہ کر چکا ہے تو ہم آپ سے پناہ کے طالب ہیں، آپ خدا سے ہماری سفارش کریں۔“

”مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو یہاں خداوند کے لیے قربانی چڑھانے آیا ہوں۔ دیکھتے نہیں کہ میرے ساتھ ایک بچہ بھی ہے۔ میں کھلی جگہ میں اس کی قربانی کروں گا۔ تم لوگوں پر خدا کی خاص برکت ہے کہ تم سب اس قربانی کی دعوت میں شریک ہو گے۔ اب اپنے اپنے گھروں کو جاؤ اور پاک صاف ہو کر دعوت میں شریک ہو جانا۔ اب مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“

لوگ خوش خوش اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ شمول نبی نے حضرت ایشا سے کہا کہ وہ دروازہ اندر سے بند کر لیں۔ انہوں نے نیل کی۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا اب کوئی نہیں رہ گیا تھا۔

”ایشا، میری بات غور سے سنتا۔“

”آپ سے خدا باتیں کرتا ہے آپ کی باتیں کیوں نہ سنوں۔“

چل رہے تھے۔ ان کی غلیل ان کے گلے میں لٹکی ہوئی تھی، کا ندھے پر تھیلا تھا جس میں یقیناً وہ پتھر تھے جو وہ غلیل میں رکھ کر چلاتے تھے۔
یوآب دوڑتا ہوا گیا اور ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ”ماموں کیا یہ خبر تمہیں حیران نہیں کرے گی کہ بزرگ شموکل نبی بیت لحم آئے ہوئے ہیں؟“
”وہ خدا کے نبی ہیں جہاں چاہیں جائیں۔ یہ خبر تم مجھے کیوں سنانے اتنی دور آگئے۔ میں جب آتا تو میں خود دیکھ لیتا۔“
”میں خود نہیں آیا ہوں، نانا جان نے مجھے بھیجا ہے۔ بزرگ نبی کہتے ہیں جب تک تم نہیں آؤ گے وہ کھانے پر نہیں بیٹھیں گے۔“

”میرے بغیر کھانے پر نہیں بیٹھیں گے؟ کیا وہ کھانا بھی کھا سکیں گے؟“
”نانا جان کہہ رہے تھے وہ خدا کے نام کی قربانی دینے بیت لحم آئے ہیں۔ ذرا چل کر تو دیکھو پوری بستی کو دعوت دی گئی ہے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے اس سے زیادہ فخر کی بات نہیں ہو سکتی تھی کہ بزرگ نبی اس کے بغیر کھانے پر بیٹھنے سے انکار کر رہے ہیں لیکن وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ان میں آخر اس کی کون سی بات ہے جو ان کا اس شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ وہ رپڑ کو جلدی جلدی ہاتھ لگتے۔ اب انہیں گھر پہنچنے کی خود جلدی ہو رہی تھی۔
وہ گھر پہنچے تو حضرت ایٹان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ انہیں لے کر فوراً حضرت شموکل کی خدمت میں پہنچ گئے۔
”جناب یہ ہے میرا چھوٹا بیٹا داؤد۔“

حضرت شموکل نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سرخ رنگ اور نیلی آنکھوں والا حسین خوبصورت لڑکا ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کی مردم شناس نظروں سے گواہی دی کہ یہی ان کا مقصود نظر ہے لیکن انہیں ”وحی“ کا انتظار تھا جس میں دیر لگ رہی تھی۔ پھر ان کے کانوں میں آواز آئی۔ ”اٹھ اور اسے مسح کر کیونکہ وہ یہی ہے۔“

حضرت شموکل نے داؤد سے کہا کہ وہ غسل کریں اور یہ لباس پہن لیں۔ وہ ایک لباس اپنے ساتھ لائے تھے جو انہوں نے حضرت داؤد کو دے دیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام لباس پہن کر آئے تو ایسا موزوں تھا جیسے یہ انہی کے لیے سلوایا گیا ہو۔ اس کے بعد حضرت شموکل نبی نے اپنے جیسے سے تیل کا سینک نکالا جس میں تیل بھرا ہوا تھا۔ وہ تیل انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے سر پر انڈیل دیا۔ اسی کوغ کرنا کہتے تھے۔

”نو جوان، اب تم خدا کے مسح ہو، اب تم طاووت کی طرح اس ملک اسرائیل کے بادشاہ بنو گے اور وقت مقررہ پر تمہیں نبوت کا منصب بھی عطا کر دیا جائے گا لیکن خبردار! جب تک یہ دونوں نعمتیں تمہیں مل نہ جائیں کسی کے سامنے اس کا چہرہ چامت کرنا۔ یہ بھی مت بھولنا کہ تمہیں مسح کیا گیا ہے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام سے تیل بنی اسرائیل میں یہ سلسلہ قائم تھا کہ حکومت ایک سبط (خاندان) سے وابستہ تھی اور نبوت و رسالت دوسرے سبط سے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جن کے اندر خدا تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں جمع کر دی تھیں۔ اس کی نوید حضرت شموکل علیہ السلام بھی دے رہے تھے اور تر آن حکیم نے بھی ذکر کیا۔

”اللہ نے ان کو حکومت بھی عطا کی اور حکمت بھی اور اپنی مرضی سے جو چاہا کھلایا۔“

حضرت داؤد علیہ السلام بچپن ہی سے خدا پر کامل بھروسہ کرنے کے عادی تھے۔ وہ پورا یقین رکھتے تھے کہ خدا ان کا رکھوالا ہے۔ وہ سوچتے تھے جس طرح میں اپنے رپڑ کو پیار کرتا ہوں اور اس کی دیکھ بھال کرتا ہوں اسی طرح خدا مجھے پیار کرتا ہے اور میری پوری حفاظت کرتا ہے۔ اس دن تو انہیں پورا یقین آ گیا تھا جب ایک ریچھ ان کے رپڑ کی طرف آ نکلا تھا اور انہوں نے غلیل میں پتھر رکھ کر ایسا تاک کر نشانہ لیا کہ ریچھ اسی وقت لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ایک پتھر سے میں نے ریچھ جیسے موزی جانور کو زخم کر دیا۔ یہ یقیناً خدا کی مجھ پر خاص مہربانی ہے۔ وہ اپنے رپڑ پر ہمیشہ شہنشاہی تحریف سے بھرے لٹے گاتے رہتے تھے۔ ان نگوں میں ایسی تاثیر تھی کہ پرندے ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ ان کی بیخیز میں ان کی طرف گردیں اٹھا کر کتنی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی تو انہیں یوں لگتا جیسے جنگل میں موجود پرندے جو کچھ بول رہے ہیں، ان کی سمجھ میں آ رہا ہے اور جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، پرندے اسے سمجھ رہے ہیں۔ خدا نے پرندوں کی بولیوں کو ان پر آسان کر دیا تھا۔ ان کے اس علم میں ابھی اور

اضافہ ہونے والا تھا۔

خدا کے لیے اسی محبت اور خدا کی رحمت کا یہی یقین تھا جس نے انہیں خدا کی نظروں میں پسندیدہ بنا دیا۔ انہیں دو نعمتیں ایک ساتھ عطا کیں یعنی بادشاہت اور نبوت کی بشارت دی۔ انہیں ایسا معیار کیا کہ حضرت شموکل علیہ السلام نے انہیں مسح کیا۔
مسح کے بعد حضرت شموکل نے کھلے میدان میں جا کر قربانی دی تاکہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ وہ قربانی دینے یہاں آئے تھے۔ لوگ ڈھول پیٹنے، طاشے بجاتے، ناچتے گاتے، خوش مناتے میدان کی طرف چلے اور قربانی کی دعوت میں شریک ہوئے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ حضرت ایٹا کے گھر میں کیا انقلاب آ گیا ہے۔ کتنی تہنیلیاں ہیں جو حضرت داؤد علیہ السلام کی شخصیت میں رونما ہو چکی ہیں۔

+++

طاووت سے پہلے بنی اسرائیل کا نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمران اور اسی لیے ہر باغی تو میں اکثر ان پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں اور بنی اسرائیل ان کا نشانہ بننے رہتے تھے۔ کبھی ان پر عسائی چڑھ آتے تھے، کبھی فلسطینی حملے کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کو لوہے کے ہتھیار تک بنانے کی اجازت نہیں تھی جن سے وہ اپنا دفاع کر سکتے۔ دوسری قوموں کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کا ہتیک صندوق (تاووت سکینہ) جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے ان کے پاس تھا، فلسطینی ان سے چھین کر لے گئے۔

یہ حملے حضرت شموکل علیہ السلام کے عہد میں بھی جاری رہے تو بنی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہم پر ایک بادشاہ مقرر کریں جس کی قیادت میں ہم ظالموں کا مقابلہ کریں۔

یہ مطالب اس لیے بھی کیا جا رہا تھا کہ حضرت شموکل بڑھاپے کی طرف گامزن تھے۔ لوگوں کو یہ فکر ہونے لگی تھی کہ اگر وہ بھی نہ رہے تو بنی اسرائیل بالکل ہی منتشر ہو جائیں گے۔ انہیں متحد کرنے والا کوئی حکمران ہونا چاہیے۔

حضرت شموکل علیہ السلام کو ان کا یہ مطالبہ ناگوار گزرا۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر تم پر بادشاہ مقرر ہو گیا تو وہ تم سب کو اپنا خادم اور غلام بنالے گا لیکن بنی اسرائیل کا اصرار بڑھتا رہا اور آخر حضرت شموکل علیہ السلام نے خدا سے دعا مانگ کر حضرت یعقوب علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے بن یامین کی نسل میں سے ساؤل (طاووت) نامی شخص کو بادشاہ مقرر کر دیا جو نہایت وجہہ اور قوی پیکر تھا۔ بہادری میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

بنی اسرائیل نے جب یہ سنا کہ بن یامین کی نسل سے تعلق رکھنے والے ایک شخص طاووت کو ہمارا بادشاہ مقرر کیا گیا ہے تو خوش ہونے کے بجائے مت بٹانے لگے۔

مورخین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک عرصے سے کہانت اور نبوت کا سلسلہ سبط لاوی میں اور حکومت و سرداری کا سلسلہ سبط یہود میں چلا آ رہا تھا۔ اب جبکہ بن یامین کی نسل میں منتقل ہونے لگا تو بنی اسرائیل کے سرداروں کو حسد پیدا ہوا۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ بادشاہ ہم میں سے کوئی ہوگا۔

حضرت شموکل علیہ السلام نے فرمایا۔ ”میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تمہاری بستی اور بزدلی تمہارے وقتی جوش اور ولولے کو کبھی بیدار نہیں ہونے دے گی۔“

حضرت شموکل علیہ السلام نے لاکھ بھایا کہ طاووت کا جنازہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا گیا ہے۔ طاووت کے پاس قوت علم بھی ہے اور طاقت جسم بھی، جو حکمرانی کے لیے ضروری چیزیں ہیں لیکن روکد بڑھتی گئی۔

”اگر طاووت کا انتخاب من جانب اللہ ہے تو اس کے لیے خدا کا کوئی نشان دکھائیے۔“ بنی اسرائیل نے مطالبہ پیش کر دیا۔ حضرت شموکل علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اگر تم خدا کے فیصلے کی تصدیق چاہتے ہو تو وہ بھی دیکھ لینا۔ وہ ہتیک صندوق (تاووت سکینہ) جس میں تورات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کے تبرکات ہیں اور جو تم سے فلسطینی چھین کر لے گئے ہیں وہ طاووت کی بدولت تمہارے پاس واپس پہنچ جائے گا۔“

حضرت شموکل علیہ السلام کی یہ بشارت آخر بڑے کار آئی اور بنی اسرائیل کے سامنے ملائکہ اللہ نے تاووت سکینہ طاووت کو پیش کر دیا اور اس طرح ان پر یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر وہ حضرت شموکل علیہ السلام کے اس الہامی فیصلے کو قبول کر لیں تو کامیابی یقینی ہے۔

اس تمام روکد کے بعد بنی اسرائیل کو انکار کرنے کے لیے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا اور الہامی فیصلے پر طاووت کو بنی

اسرائیل کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ یہ بنی اسرائیل کا پہلا بادشاہ تھا۔

بنی اسرائیل بڑے جوش و خروش سے اپنے بادشاہ کی حمایت کر رہے تھے کیونکہ وہ ان کے دشمنوں پر فتوحات حاصل کر رہا تھا۔ تمام بڑی اقوام کو مطیع کر لیا۔ بنی اسرائیل اسی دن کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس نے عونیوں پر زبردست فتح حاصل کی۔ فلسطینیوں کے خلاف جنگ کی اور انہیں شکست سے دو چار کیا لیکن بہت جلد طاقتور دانستہ نافرمان ہو گیا اور اپنی ترقی اور کامیابی کے تمام مواقع کھو بیٹھا۔ نبی اور خدا کی نظروں سے بھی اترتا چلا گیا۔ کم از کم دو مرتبہ اس نے سخت نافرمانی کا مظاہرہ کیا۔ اسے جلال میں حضرت شموئیل علیہ السلام کی آمد کا انتظار کرنا تھا مگر وہ صبر نہ کر سکا اور خود ہی قربانی چڑھا لگا۔ اسی طرح عملاتیوں سے جنگ کرتے ہوئے اس نے حضرت شموئیل علیہ السلام کی ہدایات کا خیال نہیں رکھا جبکہ اسے معلوم تھا کہ حضرت شموئیل علیہ السلام کوئی ہدایت اپنی جانب سے نہیں دیتے۔ اس نے نبی کی نافرمانی بھی کی اور خدا سے بھی لڑائی مول لی۔

حضرت شموئیل علیہ السلام نے طاقتور کو خدا کا حکم پہنچایا۔ ”رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ مجھے اس کا خیال ہے کہ عمالیتق نے اسرائیل کے ساتھ کیا کیا اور جب یہ مصر سے نکل آئے تو وہ راہ میں ان کے مخالف ہو کر نکل آئے لہذا اے طاقتور، اب تو جا اور عمالیتق کو مار اور جو کچھ ان کا ہے سب کو بالکل نابود کر دے اور ان پر رحم مت کر بلکہ مرد اور عورت سمیت سب کو اور شیر خوار گائے بیل اور بھیڑ بکریاں، اونٹ اور گدھے سب قتل کر ڈال۔“

طاقتور نے اس ہدایت کو گروہ میں باندھ لیا۔ طلائع کی وادی میں طاقتور نے اپنے آدمیوں کی گنتی کی۔ وہ دو لاکھ پیادے اور بیوہ کے دس ہزار مرد تھے۔ یہ تعداد ایسی تھی کہ طاقتور کو اپنی فتح کا یقین ہو گیا، وہ اس عظیم لشکر کو لے کر چلا اور عمالیتق جہاں آباد تھے وہاں وادی کے بیچ گھاٹ لگا کر بیٹھ گیا۔ عمالیتقوں کے علاوہ وہاں جو دوسری آبادی تھی طاقتور نے ان سے کہا کہ وہ وہاں سے نکل جائیں۔ تم سے ہماری کوئی جنگ نہیں کیونکہ جب ہم مصر سے آئے تھے، تم ہمارے ساتھ مہربانی سے پیش آئے تھے۔“ چنانچہ تمام لوگ عمالیتقوں میں سے نکل گئے۔

عمالیتق ایک قدیم اور خاندان بدوش قوم تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی تمدنی کا تجربہ ان کے اقدیم کے مقام پر بنی اسرائیل پر بلا وجہ حملے کے دوران کیا جس کے نتیجے کے طور پر خدا نے ان سے ہمیشہ جنگ کرتے رہنے کو کہا۔ جب عمالیتقوں کے علاوہ جتنے لوگ تھے، درمیان سے ہٹ گئے تو طاقتور نے ان پر حملہ کر دیا۔ یہ لوگ نہایت ظالم اور لڑنے والے تھے لیکن طاقتور خدا کی تائید سے یہاں آیا تھا اس لیے خوفناک مصر کے بعد فتح آئی کوئی۔ اس نے عالم اجاج کو زندہ گرفتار کر لیا۔ عورتوں اور بچوں کو اور مردوں کو قتل کر ڈالا لیکن فریبہ جانوروں کو دیکھ کر اس کے لشکر کی نیت خراب ہو گئی۔ انہوں نے طاقتور سے کہا، ان جانوروں کو مارنے سے کیا فائدہ۔ انہیں ہم اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔ ان کی بھیڑ بکریوں سے ہمارے ریوڑوں میں اضافہ ہوگا۔ ہم دولت مند ہو جائیں گے۔ ان کے بیل اور اونٹ ہماری بار برداری کی ضرورتوں کو پورا کریں گے۔ طاقتور نے انہیں حضرت شموئیل علیہ السلام کی ہدایت یا دلائی لیکن وہ نہ مانے۔ طاقتور بھی ان جانوروں کو دیکھ کر لپچانے لگا تھا لہذا اس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا بلکہ دوسروں سے بڑھ کر اچھے جانور خود اپنے لیے رکھ لیے۔

یہ جانور لے کر وہ اپنے محل میں آ گیا۔ اجاج بھی اس کے ساتھ تھا جسے اس نے اس امید پر قید خانے میں ڈال دیا کہ یہ خود یا اس کے لوگ جوجھ گئے ہوں گے اس کی رہائی کے لیے مال و دولت دیں گے۔ یہ کارروائیاں اتنے خفیہ طریقے سے ہوئی تھیں کہ حضرت شموئیل علیہ السلام کو معلوم بھی نہ ہوتا لیکن خدا نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔

کلام الہی نازل ہوا۔ ”میں نے طاقتور کو بادشاہ ہونے کے لیے مقرر کیا تھا لیکن وہ میری پیروی سے پھر گیا ہے۔ اس کی خبر لے اور اسے خبر دے کہ اس کی بادشاہت اس سے چھین لی گئی۔“ حضرت شموئیل علیہ السلام کو اس کی اس نافرمانی پر سخت پیش تھا۔ اسی غصے کے عالم میں انہوں نے سفر کیا اور طاقتور بادشاہ سے ملے۔ طاقتور انہیں دیکھ کر کبھی سمجھا کہ وہ جنگ کے حالات معلوم کرنے آئے ہیں۔ وہ انہیں خوش کرنے کے لیے بڑی بڑی باتیں کرنے لگا۔

”آپ کو مبارک ہو، میں نے خداوند کے حکم پر عمل کیا۔ عمالیتقوں کا قلع قمع کر دیا۔ عورتیں، بچے سب قتل کر دیے گئے۔“ ”اجاج کو قتل کر کے تم نے کہاں پھینکا؟“ ”اس کو میں زندہ گرفتار کر کے لایا ہوں۔ آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ وہ اب ہمارے قبضے میں ہے۔“

”کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ سب قتل کر دیتا۔“

”آپ اب فرمائیں، میں اب قتل کر ادوں گا۔“

”اجاج کو میرے حضور لے آ۔“

طاقتور نے اجاج کے قید سے نکالا اور حضرت شموئیل علیہ السلام کو سامنے پیش کر دیا۔

اجاج کو طاقتور نے نرم رویہ کی وجہ سے امید تھی کہ اسے معاف کر دیا جائے گا۔ وہ خوش خوش چلا آیا۔ حضرت شموئیل علیہ السلام نے اس سے پوچھا۔ ”تیرے اور طاقتور کے درمیان کیا بات ہوئی ہے؟“ اجاج نے بتایا کہ طاقتور نے اس سے بھاری رقم کا مطالبہ کیا تھا جبکہ میرے موسیٰ اس سے پہلے ہی قبضہ میں لے لیے تھے۔ اب میں رقم کا مطالبہ کیسے پورا کروں؟“ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ عمالیتق سے چھپتے ہوئے جانوروں نے یوں شروع کر دیا۔ ان کی آوازیں چاروں طرف گونجنے لگیں جبکہ طاقتور کہہ چکا تھا کہ اس نے جانوروں تک کو قتل کر دیا ہے۔

”اگر تو نے تمام جانوروں کو ہلاک کر دیا تھا تو آوازیں کیسی ہیں۔ کیا تو نے مجھے دھوکا نہیں دیا؟“

طاقتور گھبرا گیا اور بھانہ بنانے کو کہنے لگا۔ ”یہ تو وہ اچھے اچھے جانور ہیں جنہیں میں نے جینا رکھا کہ ان کو خداوند تیرے خدا کے لیے ذبح کریں۔ باقی کو تو میں نیست و نابود کر چکا۔“

”کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ سب قتل کر دیتا۔“

طاقتور کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ حضرت شموئیل علیہ السلام نے اسے ڈرایا۔ ”تو نے خداوند کی بات کیوں نہ مانی بلکہ لوٹ پر لوٹ کر وہ کام کر گزارا جو خداوند کی نظر میں برے۔“

طاقتور اب بھی ضد پر قائم تھا۔ ”میں نے تو خداوند کا حکم مانا۔ جس راہ خداوند نے مجھے بھیجا میں چلا۔ اجاج کو لے آیا۔ بھیڑ بکریاں اور گائیں لے آیا کہ خدا کی راہ میں قربان کروں۔“

”خدا کی نظروں میں خیراں برداری قربانی سے بہتر ہے اور تو نے نافرمانی کی۔ اب قربانی کرے بھی تو کیا۔“

”میں اپنے لوگوں سے ڈر گیا تھا سو یہ عظیم گناہ کر بیٹھا۔“

”تو لوگوں سے ڈر گیا، خدا سے نہیں ڈرا۔“

”میں تیری مت کرتا ہوں، مجھے بخش دے۔“

”تو نے خدا کے فرمان کو رد کیا خدا نے تجھے رد کر دیا کہ تو اسرائیل کا بادشاہ نہ رہے۔“ یہ کہہ کر حضرت شموئیل علیہ السلام نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور اٹھ کر جانے لگے۔

وہ جیسے ہی مڑ کر جانے لگے طاقتور نے ان سے کہہ کر تے کا دامن پکڑا اور اس زور سے گھسیٹا کہ دامن چاک ہو گیا۔ حضرت شموئیل علیہ السلام جاتے جاتے رکے اور کہا۔ ”خداوند نے اسرائیل کی بادشاہی تجھ سے آج ہی چاک کر کے چھین لی اور تیرے ایک بڑی کو جو تجھ سے بہتر ہے، دے دی۔“

+++

حضرت ایسا اپنے گھر میں بیٹھتے تھے کہ انہیں معلوم ہوا کہ طاقتور بادشاہ کے چند قاصدان سے ملنے بیت لحم آئے ہیں۔ ان کی آمد کا سن کر حضرت ایسا پر گھبراہٹ طاری ہوئی۔ ابھی کچھ دن پہلے حضرت شموئیل علیہ السلام یہ خوش خبری سنا کر گئے تھے کہ ان کا بیٹا داؤد طاقتور کی جگہ بادشاہ بننے والا ہے۔ ان کے دل میں یہ بات آئی کہ طاقتور کو اس واقعے کا علم ہو گیا ہوگا۔ یہ قاصد اسی کی باز پرس کرنے آئے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ داؤد کو گرفتار کر کے لے جائیں۔ وہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ وہ داؤد کو کھلو انہیں کہ وہ بیت لحم سے کہیں دور چلا جائے لیکن انکی دیر میں قاصد دروازے پر آ گئے۔ حضرت ایسا گھبرا رہے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ خداوند داؤد کو اسی راہ پر لے جا رہا ہے جس کی خوش خبری سنائی گئی تھی۔ اس کا احساس انہیں اس وقت ہوا جب ان قاصدوں میں سے ایک نے زبان کھولی۔

یہ خدا کی نافرمانی کا نتیجہ تھا کہ طاقتور ایک عجیب و غریب مرض میں مبتلا ہو گیا۔ اس پر وحشت اور دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ وہ بادشاہ تھا۔ طبیبوں کی اس کے لیے کئی ٹیس تھیں۔ فوراً علاج شروع ہو گیا لیکن مرض تھا کہ بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ بے قراری حد سے بڑھ گئی۔ راتیں نکل نہیں کر گزارنے لگا۔ طبیبوں سے مایوس ہو کر کابینوں کو بلا لایا گیا۔ طاقتور کی یہ کیفیت ہمیشہ نہیں رہتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ہوش میں تھا جب ایک کابین اس کے پاس حاضر ہوا۔

کا ہن اس سے اس کا احوال دریافت کرنے لگا۔ کاہن کی اتنی ہمت تو نہیں ہوئی کہ بادشاہ سے کچھ کہتا۔ اس نے طاہوت کے بیٹے جو ناخن کو اپنے پاس بلایا۔

”خداوند کی روح بادشاہ سے جدا ہوگئی ہے اور خداوند کی طرف سے ایک بری روح اسے ستانے لگی ہے۔ یہ دورے اسی وجہ سے پڑتے ہیں۔“

”کوئی علاج بھی تو ہوگا۔“

”ایک ایسا شخص تلاش کیا جائے جو برہم بھانے میں استاد ہو۔ جب جب یہ بری روح بادشاہ پر چڑھے وہ برہم بھانے۔ رفتہ رفتہ اس بری روح کا آئنا بند ہو جائے گا۔“

اس کے خادم پورے ملک میں پھیل گئے لیکن کوئی ایسا برہم نواز نہیں ملا جس سے ان ملازموں کی کٹھنی ہوتی آخر ایک ملازم نے بادشاہ کے سامنے داؤد کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

”میں نے بیت لحم جاتے ہوئے جنگل میں ایک لڑکے کو برہم بھانے ہوئے دیکھا ہے۔ جنگل کے خوشخوار درندے اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کا برہم بھانے ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی اس کے قریب سے گزرے اور اس کے قدم رک نہ جائیں۔ آواز بھی ایسی سریلی ہے کہ پتھر بھی پھیل جائے۔ آپ اس لڑکے کو بلا کر دیکھیں۔ وہ وہاں کے رہنے والے ایک شخص ایسا کا لڑکا ہے۔“

بادشاہ نے قائد صمد روانہ کر دیے جو اس وقت ایسا کے گھر میں بیٹھے تھے۔ سرگوشیوں میں وہ اسے بادشاہ کی حالت سے باخبر کر رہے تھے۔ حضرت ایسا اس وقت تک کچھ نہیں سمجھے تھے کہ وہ انہیں بادشاہ کی بیماری کے بارے میں کیوں بتا رہے ہیں لیکن اچانک یہ بھیج بھی کھل گیا۔

”کاہنوں نے بتایا ہے کہ کوئی ماہر برہم نواز بادشاہ کا علاج کر سکتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کا بیٹا ماہر برہم نواز ہے۔ آپ اسے ہمارے ساتھ روانہ کر دیں کہ وہ بارہاں رہ کر بادشاہ کے سامنے برہم بھانے۔“

حضرت ایسا کی آنکھیں کسی انجانے خیال سے چمک اٹھیں۔ اس کا مطلب ہے حضرت شموئل علیہ السلام کی خوش خبری پوری ہونے والی ہے۔ خدا انہیں دربار میں لے جا رہا ہے۔ یہیں سے کوئی راستہ نکلے گا۔ انہیں یہ بھی خوشی تھی کہ حضرت داؤد علیہ السلام اگر بادشاہ کے قریب چلے گئے تو ان کے بانی بیٹے بھی فوج میں چلے جائیں گے۔ انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بلانے کے لیے آؤی بھیج دیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے سنا تو انہیں بھی حضرت شموئل علیہ السلام یاد آگئے۔ اس کا مطلب ہے خدا مجھے دربار میں بھیج رہا ہے، وہ راستہ کھلتا جا رہا ہے جب مجھے بادشاہت ملے گی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کدھے پر سوار ہوئے۔ بادشاہ کے لیے کچھ تحائف بھی ساتھ لیے اور قاصدوں کے ہمراہ طاہوت کی طرف روانہ ہو گئے۔

جس وقت حضرت داؤد علیہ السلام دربار میں پہنچے۔ اتفاق سے بری روح بادشاہ پر چڑھی ہوئی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فوراً اپنی برہم بھانیاں اور ان کی مشاق انگلیاں تاروں کے ساتھ کھینچ لیں۔ پھر ان کی آواز موسیقی کے مدھمروں کا ساتھ دینے لگی۔ خدا کی عظمت کا گیت ان کے ہونٹوں پر تھا۔

اے خداوند ہمارے رب

تیرا نام تمام زمین پر کیسا بزرگ ہے

جب میں تیرے آسمان پر جو تیری دستکاری ہے

اور چاند ستاروں پر جن کو تو نے مقرر کیا غور کرتا ہوں

تو پھر انسان کیا ہے کہ تو اسے یاد رکھے

کیونکہ تو نے اسے خدا سے کچھ ہی کم تر بنایا ہے

اور جلال اور شوکت سے اسے تاج دار کرتا ہے

تو نے اسے اپنی دستکاری پر تسلط بخشا

تو نے سب کچھ اس کے قدموں کے نیچے کر دیا ہے۔

اس نغمے کی تاثیر یہی ایسی تھی کہ بادشاہ تو بادشاہ، سامعین دربار بھی مجوم رہے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دیواریں بھی رقص میں آگئی ہوں۔ اس نغمے کے آگے بری روح کیا ٹھہری۔ بادشاہ ہوش میں آیا تو اس کے ہونٹوں پر گیت کے یہ الفاظ چمک رہے تھے۔

اے خداوند ہمارے رب

تیرا نام تمام زمین پر کیسا بزرگ ہے

بادشاہ نے عسکین بھری نظروں سے برہم نواز کو دیکھا۔ اس کی تعریف کے الفاظ فراہم کرنے لگا اور بے اختیار کہہ اٹھا۔ ”تو میرا منظور نظر ہوا۔ میں تجھے خود سے جدا نہ ہونے دوں گا۔“ حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنے ریوڑ یاد آئے۔ باپ کے بڑھاپے پر نظر پڑی۔ دربار کی محض اور جنگل کی مکمل نفاذ موازنہ کیا۔

”میں گھر نہ گیا تو میرے ریوڑ کون چرائے گا؟“

”اس کی تو فکر مت کر۔ میں اس کا انتظام کر دوں گا۔ میرے نوکر تیری بکریاں چرائیں گے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام گل میں رہنے لگے۔ جب بادشاہ کو بدروح ستانے لگی، حضرت داؤد علیہ السلام اپنا برہم بھانیاں لیتے اور بادشاہ کو اذیت سے نجات دل جاتی۔

اس عرصے میں بادشاہ کے بیٹے جو ناخن سے ان کی دوستی ہوگئی۔ جو ناخن جلد ہی ان کا عقیدہ مندرت بن گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جس طرح اس کے باپ پر بدروح آتی ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کو نیک روح اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور اسے نغمے سکھاتی ہے۔

بادشاہ تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ اب ہونٹوں گزر جاتے اور اسے برہم بھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بادشاہ کو اب ان کی خدمت کی ضرورت نہیں رہی تو انہوں نے بادشاہ سے بیت لحم واپس جانے کی اجازت مانگی۔ بادشاہ کو ان کی فرقت اب بھی گوارا نہیں تھی۔ اس نے ان سے کہا کہ اب وہ اس کے محل کے محافظوں میں شامل ہو جائیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام یہ سن کر ہنسنے لگے۔

”میں نے ہتھیار چلانے کا ہنر سیکھا ہی نہیں تو محافظ کیسے بن جاؤں۔ برہم بھانے سے تو دشمن نہیں بچے گا۔ ہاں البتہ میرے تین بھائی آپ کی فوج میں ہیں۔ باقی چار کو بھی لڑائی بھڑائی کا بہت شوق ہے، آپ چاہیں تو ان چاروں کو بھی اپنے پاس بلا لیں اور مجھے اجازت دیں۔ جب آپ یاد کریں گے میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

طاہوت نے سوچا، اس کے تمام بھائی میرے پاس چلے آئیں گے تو اس کا بھی آنا جانا لگا رہے گا۔ خدا راستے بناتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے ان کی سفارش قبول کی اور ان کے بانی چار بھائی بھی اس کی فوج میں آگئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام بیت لحم واپس آگئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اس عرصے میں لوکن کو خیر باد کہہ کر عہد شباب میں قدم رکھ چکے تھے۔ وہ زیادہ قد آور نہیں تھے لیکن جوانی نے ان کے اعضا کو مضبوط بنا دیا تھا۔ حسن و جمال میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کے دن ایک مرتبہ پھر وادیوں کی چراگاہوں اور مکلی فیضوں میں گزرنے لگے۔ وہ خوش تھے کہ خدا نے انہیں دوبارہ قدرتی مناظر کے حسن سے لطف اندوز ہونے کا موقع عطا کیا ہے۔ یہی بھی سوچتے ضرور تھے کہ کل میں رہ کر آگئے لیکن سخت تو لانا نہیں۔ پھر خدا کی فیصلے کے انتظار میں صبر کر لیتے تھے۔ ابھی شاید وقت نہیں آیا۔ جب وقت آیا تو خداوند کوئی بندوبست کر دے گا۔

طاہوت کا حال بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ اسے بھی حضرت شموئل علیہ السلام کا خیال آ جاتا تھا جو یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ اس کی بادشاہت چھین کر کسی اور کو دے دی جائے گی۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ وہ شخص اب تک تو آیا نہیں۔ اس نادان کو کیا خبر تھی کہ وہ شخص آیا بھی اور جائزہ لے کر چلا بھی گیا۔ پھر ایک خبر ایسی آئی کہ ہر خیال دل سے نکل گیا۔ اس کے جاسوسوں نے اسے خبر دی کہ فلسطین دوسری کئی قوموں کے ساتھ مل کر اسرائیل پر حملہ کرنے والے ہیں۔

شاید وہ اسباب مہیا ہونے والے تھے جو حضرت شموئل علیہ السلام کی پیش گوئی کو حتمی نتیجے تک لے جانے والے تھے۔ دشمن کی تیاریوں اور تعداد کو دیکھ کر طاہوت نے بھی جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ طاہوت نے بنی اسرائیل کو پیغام عام دیا کہ دشمن سے مقابلے کے لیے نکلیں۔ قومی معاملہ تھا۔ فلسطینی ہر اسرائیلی کے دشمن تھے۔ فوج کے علاوہ ایک بڑی تعداد عام لوگوں کی جمع ہوگئی اور سب مل کر مقابلے کے لیے نکلے۔ اتنی بڑی تعداد دیکھ کر طاہوت خوش ہو گیا کہ وہ یہ جنگ ضرور جیت لے گا لیکن خدا کو اسے نچا

دکھانا تھا۔ اسی لیے اس کے دل میں یہ بات آئی کہ مقابلے سے پہلے اپنے آدمیوں کو آزمایا جائے چنانچہ جب یہ گروہ ایک ندی کے کنارے پہنچا تو طاوالت نے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ اس نہر کے ذریعے تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ کوئی شخص اس سے جی بھر کے پانی نہ پیے۔ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ خدا کی جماعت سے نکال دیا جائے گا البتہ سخت پیاس کی حالت میں گھونٹ بھر پانی پی کر حلق تر کرنے کی اجازت ہے۔

مفسرین کہتے ہیں، یہ واقعہ نہراوردن پر پیش آیا۔

جب لشکر ندی کے پار ہو گیا تو جن لوگوں نے پانی پی لیا تھا وہ کہنے لگے ہم میں فلسطینیوں سے مقابلے کی طاقت نہیں۔ یہ لوگ طاوالت کا ساتھ چھوڑ کر جانے لگے۔ ہزاروں کی تعداد سیکڑوں میں رہ گئی۔

بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ براہین عازر فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے کہ اصحاب بدر کی تعداد اصحاب طاوالت کے برابر ہے۔

طاوالت کی بہادری نے یہ گوارا نہیں کیا کہ واپس جانے۔ وہ کم تعداد کے باوجود آگے بڑھتا رہا اور ایلہ کے مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ فلسطینی ایک مقام شوکہ کے قریب جمع تھے۔ یہ دونوں جگہیں کوہستانی تھیں۔ ایک طرف کے پہاڑ پر فلسطینی ڈیرے ڈالے ہوئے تھے، دوسری طرف کے پہاڑ پر اسرائیلی مقابلے کے لیے تیار تھے۔ درمیان میں وادی تھی۔

دونوں فریق انتظار کر رہے تھے کہ پہل کون کرتا ہے۔

فلسطینیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ طاوالت وادی میں اترنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا، کمال تو یہ تھا کہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود فلسطینی بھی حملے میں پہل کرنے سے سہرا رہے تھے۔ اس تذبذب میں ایک مہینہ گزر گیا۔

اسفران کو یہ دیکھ کر تعجب ہو رہا تھا کہ طاوالت میں وہ جوش و خروش نہیں جو کسی ہوا کرتا تھا۔ لگتا تھا اسے جنگ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ ایک مہینے میں خوراک بھی ختم ہونے لگی تھی۔ طاوالت اس کا بھی کوئی انتظام نہیں کر رہا تھا۔ کبھی بھی فوجیوں کے عزیز واقارب کھانا پینچا دیتے تھے۔ طاوالت کے افسروں نے کئی مرتبہ اس کی توجہ اس طرف مبذول کرانی لیکن اس پر ایسی افسردگی طاری تھی کہ سننے کے باوجود کوئی قدم نہیں اٹھا رہا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا کہ ایک روز ایک دیو قامت انسان فلسطینیوں کے لشکر سے نکلا۔ اس کا قد چھ ہاتھ اور ایک بالشت تھا۔ اس کے سر پر پیش کا خود تھا اور پیش ہی کی زورہ پہنے ہوئے تھا جو تول میں بائچ پزار مشال کے برابر تھی۔ اس کی ٹانگوں پر پیش کے دو ساق پوش تھے اور اس کے دونوں شانوں کے درمیان پیش کی برچی تھی۔ ایک شخص سہرے لے اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی طاوالت کے لشکر پر کچکی طاری ہو گئی۔ وہ ابھی اس کی طرف خوف زدہ آنکھوں سے دیکھ ہی رہے تھے کہ اس کی آواز گونجی۔ آواز ایسی تھی کہ وادی سے پہاڑ تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ اسرائیلیوں کو لکار رہا تھا۔ اس کا نام جالوت تھا۔

”اے غیرت اسرائیلیو! کیوں دیر کرتے ہو۔ اگر تم میں کوئی مرد ہے تو میرے مقابلے پر آئے اگر وہ مجھ سے لڑے اور مجھے قتل کر دے تو تم تمہارے خادم ہو جائیں گے اور اگر میں اسے قتل کر دوں تو تم ہمارے خادم ہو جائے۔

سن لیا تم نے! کوئی مرد نکلا اور میرے مقابلے پر بھیجیو۔“ اس کے بعد اس کا قبیلہ اس طرح کو گنجا جیسے ایک ساتھ بہت سے پتھر لڑھکا دیے ہوں۔ پھر سناٹا ہو گیا۔ وہ انسان نادیدہ وادی میں کھڑا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ کوئی اس کے مقابلے کو آئے۔

طاوالت کے لشکر میں کسی کو اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھتا۔ طاوالت بھی سر جھکا کر اپنے خیمے کی طرف لوٹ گیا۔ اب وہ خود ہی خود بڑبڑا رہا تھا۔ ”مجھے شوکل علیہ السلام کی بددعا لگی ہے۔ خدا نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ میری بہادری کہاں رخصت ہو گئی۔ اگر خدا نے مجھے چھوڑ دیا ہے تو میں بھی اسے چھوڑتا ہوں۔ اب جالوت جانے اور بنی اسرائیل۔“

خدا نے طاوالت کو چھوڑ دیا تھا لیکن اسرائیلی قوم کو فراموش نہیں کیا تھا۔ طاوالت کی جگہ کسی کو یادشاہ بھی تو مقرر کرنا تھا اور اس کا انتخاب ہو چکا تھا۔ یہ تھے حضرت داؤد علیہ السلام۔

(جاری ہے)

ماخذات: قصص القرآن، قصص الانبیاء، تورت

سینسٹرس ڈائجسٹ 242 مارج 2012ء



جہانسا

سليم انور

سیر کو سوا سیر... یہ تو پردہ کا حصہ رہا ہے یہ اور بات کہ قصے بدل جاتے ہیں... وہ بھی جب ایک ادھوری کہانی کو پورا کرنے نکلی تو کتنے ہی کرداروں سے ملاقات ہوئی اور پھر اسے وہ کردار بھی مل ہی گیا جس کی اسے تلاش تھی۔

طرح کی بساط پر ایک کھلاڑی کا حیرت انگیز انجام

وہ ایک پرکشش نوجوان لڑکی تھی جو نے تلے قدم اٹھاتے ہوئے عزم انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ نہ دائیں جانب دیکھ رہی تھی نہ بائیں جانب۔ اس کی نظروں کا رخ سیدھ میں تھا جیسے اپنی منزل کے بارے میں وہ یقین ہو اور اسے اپنی منزل تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس نے عمدہ لباس پہنا ہوا تھا اور خوش ذوقی و شائستگی اس کی شخصیت

سینسٹرس ڈائجسٹ 242 مارج 2012ء

سے ماں تھی۔ وہ اس قسم کی لڑکی تھی کہ اسے جو بھی دیکھتا،
 بچے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ گویا وہ ذہن پر چھا جانے والی
 شخصیت کی حامل تھی۔
 وہ سڑک پر چلتے ہوئے بالآخر اس عمارت تک پہنچ گئی
 جس میں کلنگر اینڈ اینگل ہارٹ کے دفاتر تھے۔ عمارت کے
 سامنے وہ کچھ دیر کے لیے رگ گئی اور نیچے قائم ریٹورنٹ کی
 کھڑکی کے شیشے میں اپنے عکس کا جائزہ لینے کے بعد وہ دوبارہ
 چل پڑی۔ اس مرتبہ اس کا رخ عمارت کے داخلی دروازے
 کی جانب تھا۔ وہ سڑکیاں چڑھ کر کلنگر اینڈ اینگل ہارٹ کے
 دفتر میں داخل ہو گئی۔ استقبال پر پہنچ کر اس نے خوشگوار لہجے
 میں دریافت کیا۔ ”کیا مسٹر کلنگر موجود ہیں؟“
 یہ غور جائزہ لیا۔ ”کیا تم نے اپنا مفت لے رکھا ہے؟“
 کیروولینا نے پوچھا۔
 ”نہیں۔ بس انہیں یہ بتا دو کہ میں یہاں ان سے وہ
 لینے کے لیے آئی ہوں جو ان پر میرا واجب ہے۔“
 اس جواب پر کیروولینا نے تیریاں چڑھائیں۔ وہ اس
 فرم میں تیس سال سے زیادہ عرصے سے سیکریٹری کے فرائض
 سر انجام دے رہی تھی۔ وہ اب اتنی تجربہ کار ہو چکی تھی کہ بہت
 کم شیشائی تھی اور کوئی بھی اس کی رعب دار شخصیت کو نظر انداز
 کر کے اس کے مالکان تک براہ راست پہنچنے کی جرأت نہیں
 کرتا تھا۔ وہ قدرے درشت لہجے میں بولی۔ ”مجھے نہیں معلوم
 کہ تم کیا چاہتی ہو، لیکن.....“
 ”تم نے مجھے نہیں پہچانا، کیروولینا۔ ہے نا؟“
 لڑکی کی اس بات نے کیروولینا کو پریشان تو نہیں کیا
 البتہ وہ شش و پنج میں پڑ گئی اور مشتہی ہو گئی کہ وہ لڑکی اس کی
 چوٹی سے گریز اب ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔
 ”کیا میں نہیں جانتی ہوں؟“ کیروولینا نے پوچھا۔
 وہ انجمن میں پڑ گئی تھی کیونکہ روزانہ ہی ان کے دفتر
 میں بہت سے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان میں سے اکثر
 بے چارے مسٹر کلنگر کی توجہ کے طالب ہوتے تھے کیونکہ مسٹر
 اینگل ہارٹ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس کے بعد اب دفتر
 میں مسٹر کلنگر ہی باقی رہ گئے تھے۔ کیروولینا نے یہ سوال اس
 لیے کیا تھا کہ وہ یقین کر لینا چاہتی تھی کہ کہیں وہ کسی ایسے کا
 راستہ تو نہیں روک رہی جس کے پاس اس کے علاوہ لڑکی دیے
 ملاقات کرنے کا قانونی حجاز ہو۔ اس کے علاوہ لڑکی دیے
 بھی بے حد معصوم لگ رہی تھی۔
 لڑکی یہ سن کر مسکرا دی۔ ”اس سے فرق نہیں پڑتا۔

ایک اچھی سیکریٹری کے مانند مسٹر کلنگر کو میرا پیغام پہنچا دو۔“
 لڑکی نے اس اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی تھی کہ کیروولینا
 فوری طور پر اپنی چوکی فراموش کر بیٹھی۔ اس نے سوچا کہ اس
 بات کا فیصلہ مسٹر کلنگر پر چھوڑ دے، آیا وہ اس لڑکی سے ذاتی
 طور پر ملاقات کرنا پسند کرتے ہیں یا نہیں۔
 کیروولینا اس لڑکی کو استقبال پر چھوڑ کر مسٹر کلنگر کے
 کمرے میں چلی گئی۔
 جب کیروولینا نے اپنے پاس کو اس لڑکی کے بارے
 میں بتایا تو کلنگر نے پوچھا۔ ”کیا اس نے اپنا نام بتایا ہے؟“
 کلنگی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔
 کیروولینا اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ”نہیں،
 سر۔“
 کلنگر نے اس جواب پر جب اسے گھور کر دیکھا تو وہ
 بوڑائی۔ ”لیکن میرا خیال ہے سر.....“
 ”اوہ نیور مائنڈ!“ کلنگر نے اس کی بات کاٹ دی۔
 پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر میز سے گھومتے ہوئے اس کے پاس
 آ کر ایک لمبے کے لیے توقف کیا، پھر دروازے کی جانب
 بڑھ گیا۔
 ابھی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا کہ کیروولینا کو
 اپنے پاس کے حلق سے ایک ہلکی سی حیرت زدہ چیخ سنائی
 دی۔ ”اوہ مائی گاڈ! کیروولینا۔ 911 پر فون کرو۔“
 کیروولینا یہ سن کر ٹپکی فون کی جانب ہلکے تو اس کی پٹنلی
 میز کے کنارے سے ٹکرائی۔ وہ بوڑھے ہوئے فون کے
 پاس پہنچی اور ریسورسپنڈ کر 911 کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔
 فون کرنے کے بعد کیروولینا تیزی سے استقبال کی
 جانب ہلکی۔ مسٹر کلنگر کے کمرے سے نکل کر اس نے دیکھا کہ
 وہ اس کی استقبال کی میز کے سامنے فرش پر بیٹھے ہوئے ہیں۔
 فرش پر وہ لڑکی چاروں خانے چپ پڑی ہوئی تھی جو مسٹر کلنگر
 سے ملاقات کی جگہ تھی۔
 ”اوہ مائی گاڈ! کیا ہوا مسٹر کلنگر؟ جب میں آپ کو اس
 کی آمد کا بتانے کے لیے آپ کے کمرے میں گئی تو یہ بالکل
 ٹھیک تھا کہ تھی۔ اسے کیا ہوا؟“
 ☆☆☆
 کیروولینا اس سہ پہر بھی اعصابی بیجان میں مبتلا تھی
 جب وہ سرانخ رساں ان کے دفتر میں داخل ہوا۔
 کیروولینا نے ایک جھپٹی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔ یہ وہی
 سرانخ رساں تھا جو پہلے بھی یہاں آچکا تھا۔ اب یہ یہاں کیا
 لینے کے لیے آیا ہے؟ کیروولینا نے دل ہی دل میں سوچا۔

اس سے جیستر کہ کیروولینا کو کچھ کہنے کا موقع ملا، وہ
 پوچھ بیٹھا۔ ”تمہارے پاس موجود ہیں؟“
 ”موجود تو ہیں لیکن میں نہیں سمجھتی کہ آپ انہیں اس
 وقت ڈسٹرب کریں۔ یہاں پہلے ہی ایک ٹریڈی ہو چکی ہے
 اور.....“
 اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کیروولینا کی بات
 کاٹ دی اور بولا۔ ”مجھے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم
 ہے۔ اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔“
 کیروولینا نے خود سے سوال کیا۔ کیا ان لوگوں کے
 پاس بس یہی ایک سراغ رساں ہے؟ اسے اس شخص سے کچھ
 چرخی ہو رہی تھی۔
 پستہ قد، بے ڈھنگا، تاحہ میں وہ سیاہ شیطانی اٹالین
 سگار اس انداز سے دب کر تھا جیسے وہ پہلی مرتبہ یہاں آیا ہو۔
 البتہ اسے کم از کم اس بات کا احساس ضرور تھا کہ اس نے اس
 بدبودار سگار کو سلگایا نہیں تھا۔
 کیروولینا قدرے تدبیر کے بعد اپنی میز سے اٹھی
 اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مسٹر کلنگر کے کمرے کے
 دروازے تک پہنچ گئی۔ پھر اس نے دروازے پر آہستہ سے
 دستک دی۔
 ”ہیں؟“ اندر سے مسٹر کلنگر کی آواز ابھری
 ”سراخ رساں اینڈرسن آئے ہیں، سر۔“ کیروولینا
 نے بلند آواز سے کہا۔
 اندر سے مسٹر کلنگر کی غراہٹ نما آواز سنائی دی۔
 ”انہیں اندر بھیج دو کیروولینا۔“
 کیروولینا نے مسٹر کلنگر کے کمرے کا دروازہ کھولتے
 ہوئے سرانخ رساں کو سر کی جنبش سے اندر جانے کا اشارہ
 کیا۔ جب سرانخ رساں کمرے میں داخل ہو گیا تو کیروولینا
 نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا لیکن فوری طور پر اپنی استقبال پر
 کی نشست پر واپس نہیں چلی بلکہ دروازے سے کان لگا کر
 کھڑکی ہو گئی۔
 اس لڑکی نے زہر کھا کر خود کو مار ڈالا تھا۔ اس
 زہر خورانی سے مسٹر کلنگر کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ کیروولینا اسی
 اچنبھے میں تھی۔
 ”آپ کو معلوم ہے کہ وہ لڑکی مر چکی ہے؟“ سرانخ
 رساں اینڈرسن نے بیٹھنے کی بجائے کھائش کے بغیر خود ہی کرسی
 سنبھال لی اور مسٹر کلنگر سے مخاطب ہوا۔
 ”اچھا.....؟ بے چاری۔“ کلنگر نے میز پر سے ایک
 پین اٹھالیا اور اسے اپنی انگلیوں میں کھانا شروع کر دیا۔ پھر

اقوال حضرت علی کرم اللہ وجہہ
 ☆ جنت امید سے نہیں ملے گی۔
 ☆ مجھے بہت افسوس ہوتا ہے جب انسانوں کے
 جاننے سے پہلے پرندے جاگ جاتے ہیں۔
 ☆ جس پر احسان کر داس کے شر سے بچو۔
 ☆ مجھے مریضوں کے روزے اور سردیوں کی نماز بہت
 پسند ہے۔
 ☆ کوئی تمہارا دل دکھائے تو ناراض نہ ہونا کیونکہ یہ
 قدرت کا قانون ہے کہ جس درخت پر زیادہ میٹھا پھل ہوتا
 ہے اسے لوگ زیادہ پتھر مارتے ہیں۔
 ☆ ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی
 کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں۔ چھوٹے چھوٹے
 پتھروں سے ہی ٹھوکر کھاتا ہے۔
 ☆ باشعور اور پختیر لوگوں کے درمیان دوستی کا رشتہ
 خون کے رشتوں سے کہیں زیادہ قریب تر اور گہرا ہوتا ہے۔
 ☆ اچھے دوست اور زندگی کے سمنر جب بھی ناراض
 ہوں انہیں مان لینا چاہیے کیونکہ بیچ جب بھی نوبت ہے تو اس کے
 دانے جن لے جاتے ہیں۔
 ☆ باہر انسان کی عزت اور اس سے محبت کرو کیونکہ ہر
 انسان کے اندر خدا کی کوئی نہ کوئی صفت ضرور موجود ہوتی
 ہے۔
 ☆ پڑھائی خاموش ہونے سے کم بھر کرنے سے ختم
 اور شکر کرنے سے خوشی میں بدل جاتی ہے۔
 مرسلہ: شکر عباس بارہ اوکاڑہ

لگا ہوا اٹھارہ اینڈرسن کی جانب دیکھا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے
 کہ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ اسے
 زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ تم تو جانتے ہو کہ اس کے
 باپ نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا اور.....“
 ”وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟“ سرانخ رساں اینڈرسن
 نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے پوچھ لیا۔
 ”مجھے نہیں معلوم۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ اس
 نے میری سیکریٹری کو بتایا کہ وہ یہاں کچھ لینے کے لیے آئی
 ہے۔ مجھے اس بات کا ذرہ برابر بھی آئینہ یا نہیں کہ اس کا کیا
 مطلب تھا۔ میں نے تو اس کے باپ کی تدفین کے بعد سے

تدقین؟ کیرو لینا یہ سن کر چونک گئی اور تب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ لڑکی کون تھی۔ وہ جیفری تھی، مسٹر کلنگر کے پارٹنر مسٹر اینگل ہارٹ کی بیٹی۔ ”اودہ بے چاری جیفری اور میں نے اسے پہچانا تک نہیں!“

اندر سراغ رساں اینڈرسن نے جیسے اچکاتے ہوئے مسٹر کلنگر سے پوچھا۔ ”کیا آپ اس بارے میں پر یقین ہیں؟“

”ہاں۔ میں پر یقین کیوں نہ ہوں؟“

یہ سن کر سراغ رساں اینڈرسن نے اپنا سر مسٹر کلنگر کی جانب اس طرح تان لیا جیسے وہ کوئی ہتھیار ہو۔ ”میں اس لڑکی کی پاٹ بک میں ایک تحریر ملی ہے۔ میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ اس نے آپ کے آفس میں زہر کھا لیا تھا۔“

”تحریر؟ کسی تحریر؟ میں سمجھا نہیں۔“

”اس تحریر میں اس نے آپ پر ایک الزام لگایا ہے۔“

سراغ رساں اینڈرسن نے بتایا۔

”کیسا الزام؟“

”اس کا کہنا ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ دست دراز کی ہے۔“

”کیا؟“ کلنگر کے ہاتھ سے سین چھوٹ گیا اور وہ اپنی کرسی پر بے ساختہ پیچھے کھسک گیا۔ اس کی کرسی پیچھے دیوار سے جا لگی اور چہرہ پیکا پڑ گیا۔

کیرو لینا نے جب یہ سنا تو اسے اپنی ٹانگیں بے جان سی محسوس ہونے لگیں۔ اس نے بے ساختہ اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کھلی گئی پیچ کو بلند ہونے سے روک لیا جو اس کے لبوں تک آئی تھی۔

یہ ناقابل یقین بات تھی۔ مسٹر کلنگر ایک باعزت اور ٹیک نام شخص تھے اور شادی شدہ بھی تھے۔ وہ ایسی حرکت ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔

”کیا تم مجھے گرفتار کرنے کے لیے یہاں آئے ہو؟“

کلنگر نے سراغ رساں سے پوچھا۔

”وہ لاش کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں۔“ سراغ رساں اینڈرسن نے کہا۔ ”مگر اس الزام کی تائید میں کوئی ثبوت سامنے آیا تو پھر آپ بہت بڑی مشکل میں مبتلا ہو جائیں گے میرے دوست! میرے پاس اس وقت تو آپ کی گرفتاری کا کوئی وارنٹ نہیں ہے۔ میں تو یہاں آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔“

”کیا مجھے اپنے وکیل کو طلب کرنے کی ضرورت ہے؟“ کلنگر نے جانتا جاہا۔

”مگر آپ سے یہ جرم سرزد ہوا ہے جس کا الزام آپ کے پارٹنر کی بیٹی نے آپ پر لگایا ہے تو بہتر یہی ہوگا کہ آپ ابھی اس کا اعتراف کر لیں۔ اس اعتراف کے لیے آپ کو اپنے وکیل کو طلب کرنا ہوگا۔ کیا آپ اس بارے میں خود کچھ کہنا چاہتے ہیں؟“ سراغ رساں اینڈرسن نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

☆☆☆

کلنگر نے ایک اور جام تیار کر لیا۔ عام طور پر وہ زیادہ پینے سے گریز کرتا تھا لیکن یہ کوئی عام حالات نہیں تھے جس کی بنا پر وہ جام پہ اینڈرل رہا تھا۔

اسے اس حقیقت کا یقین تھا کہ اس نے اپنے پارٹنر اینگل ہارٹ کی بیٹی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ لیکن از روئے واقعات شہادتوں نے ایک سے زیادہ آدمیوں کو جیل بھیج دیا تھا۔ اس بیجان کی بنا پر اس کے پیٹ میں مروڑ سا ہور ہوا تھا اور ہاتھ کا تپ رہے تھے۔

اسے یہ بھی یاد نہیں آیا تھا کہ دست دراز کی کا وہ واقعہ کب پیش آیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پوسٹ مارٹم سے کیا نتیجہ اخذ ہوگا اور کیا اس الزام کی تصدیق ہو جائے گی۔ البتہ اسے یہ علم ضرور تھا کہ اسے اس روز جیفری سے نہیں ملنا چاہیے تھا۔ بادی انکسٹر میں ان کی یہ ملاقات اسے مجرم قرار دینے کا موجب بن سکتی تھی۔

اس نے سراغ رساں اینڈرسن سے جھوٹ بولا تھا کہ اس کے پارٹنر مسٹر اینگل ہارٹ کی تدفین کے بعد سے اس کی ملاقات جیفری سے نہیں ہوئی تھی۔ جیفری نے اسے فون کیا تھا اور اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کلنگر کو اب اس بات کا احساس ہور ہوا تھا کہ اسے جیفری سے ملنے کے لیے جانا نہیں چاہیے تھا۔ کم از کم وہاں نہیں جہاں اس نے اسے بلا لیا تھا۔

اسے خود اتنی عقل ہونی چاہیے تھی کہ وہ ملاقات کے لیے اسے اپنے دفتر میں بلا لیتا۔ اس کے بجائے وہ اس ہوٹل میں چلا گیا تھا جہاں جیفری قیام پزیر تھی۔ لوگوں نے اسے وہاں ہوٹل میں دیکھا تھا۔ سخت ہوا، وہ خود سے بڑبڑایا۔

”یہ تم ہو جس نے غبن کیا ہے۔“ وہ اس سر پہر ہوٹل میں ملاقات کے دوران اس پر برس پڑی تھی۔ ”میرے باپ نے خود کٹی کر لی جیکہ وہ رقم انہوں نے خرد برد نہیں کی تھی۔ تم نے وہ رقم خرد برد کی ہے۔ تم نے سازش کے طور پر ثبوت

دہاں رکھ دیے اور ان پر جھوٹا الزام لگا دیا۔ ان کی موت کے ذمے دار تم ہو۔ تم اور صرف تم!“

یقیناً کلنگر نے یہ الزام رد کر دیا تھا۔ جیفری کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ کلنگر نے اس بارے میں بے حد جالا کی سے کام لیا تھا۔ غبن کے تمام ثبوت اس کے پارٹنر کو مل کر تھے۔ وہ اس معاملے میں بے حد کمزور ثابت ہوا تھا۔ اس نے جیفری اور اس کے الزام پر خوب قہقہے لگائے تھے۔

تب جیفری کی شہنی کے مانند اس پر جھپٹ پڑی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی، اس کے چہرے پر پینچے مار رہی تھی اور دیوانہ وار اس پر ضربیں لگا رہی تھی۔

کلنگر نے ہوٹل کے کمرے سے نکل بھاگنے میں ہی عافیت جانی تھی۔ وہ ہال سے دوڑتے ہوئے لابی تک چلا گیا تھا اور جیفری اس کے تعاقب میں لابی تک چلی آئی تھی۔

یہ منظر درجن بھر لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس واقعے کے مبینی شاید موجود تھے۔ سراغ رساں اینڈرسن کو یہ بات پتا چلتا لابی تھی۔ وہ یہ یقین کر لے گا کہ دست دراز کی کا واقعہ اسی وقت پیش آیا ہوگا۔ اس وقت یہ بات اہمیت کی حامل نہیں ہوگی کہ بادی انکسٹر میں جھوٹ کوچج ثابت کرنا پڑ رہا ہے۔

اسے میں کسی نے کمرے کے بند دروازے پر دستک دی۔ پھر تاب کھانے کی آواز ابھری۔ کلنگر نے خود کو اپنی اسٹڈی میں بند کر رکھا تھا اور اندر سے تالا لگا دیا تھا تاکہ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

”کلنگر کیا تم اندر موجود ہو؟“ یہ اس کی بیوی تھی جو آوازیں دے رہی تھی۔

”اودہ، کتنے شرم کی بات ہے۔ وہ کیا سوچے گی۔“

غبن سے زیادہ بدترین جرم آبروریزی تھا جس کا ارتکاب اس نے نہیں کیا تھا۔ وہ تو صرف غبن کا مرتکب ہوا تھا۔ ”سب کچھ ٹھیک ہے لیو۔ اب مجھے ایک ضروری کام آج ہی نشتانا ہے، اس لیے چاہتا ہوں کہ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

”کیا تم واقعی ٹھیک ہو؟“

”ہاں ڈیئر۔ مجھے قدرے پرائیوٹ کی درکار ہے۔ میرا کام جلد ہی منٹ جانے گا۔“

کلنگر کی یقین دہانی نے اس کی بیوی کو مطمئن کر دیا اور وہ پلٹ گئی۔ کلنگر کو اپنی بیوی کے قدموں کی چاپ اسٹڈی سے دور ہوتی اور ہال کی جانب جاتی سانی دی تو اسے قدرے

جیرانی ہوئی۔ اس کی بیوی نے خلافت تو قع زیادہ احتجاج نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ اپنی اسٹڈی میں خود کو بند کر لینا کلنگر کا معمول نہیں تھا۔

کلنگر نے ایک اور جام بھرا اور غٹا غٹا اسے پی لیا۔ پھر اس نے اپنی میز کی دراز کھولی۔ وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی اسے جھرجھری سی آگئی۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے؟ اس نے سوچا۔

لیکن نہیں۔ اس لڑکی کی بات پر سب یقین کر لیں گے۔

اس نے ایک سر آدہ بھرتے ہوئے دراز کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ لیکن دراز میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہی وہ رک گیا۔

کیوں نہ ایک اور جام ہو جائے؟

☆☆☆

سراغ رساں اینڈرسن نے بے یقینی کے انداز میں سر ہلایا۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنے کپلوں پر جماتے ہوئے ایک بار پھر کمرے کا یہ غور جائزہ لیا اور دوبارہ سر ہلانے لگا۔ آخر کیا بات کسی شخص کو اس قسم کی حرکت پر اکساتی ہے؟ اسے لوگوں کے احقر پن پر ہمیشہ ہی جیرانی ہوا کرتی تھی۔ اس مرتبہ بھی وہ جیران کھڑا حالات پر غور کر رہا تھا۔

اس سے قبل کہ تحقیق کے نتیجے میں غبن کا کوئی نتیجہ نکلے اور حتمی ثبوت سامنے آئے، اینگل ہارٹ نے گلے میں پھندا ڈال کر خود کشی کر لی تھی۔

اس کی بیٹی نے زہر کھا لیا تھا اور اپنے پیچھے یہ الزام چھوڑ گئی تھی کہ اس کے باپ کے پارٹنر نے اس کی آبروریزی کی تھی۔

اور اب کلنگر نے خود کو ہلاک کر لیا تھا۔

اور یہ جتنا سب سے مشکل ترین کام تھا۔ وہ لڑکی بہ ظاہر اپنے باپ کے غم میں اپنے آپ سے نہیں رہی تھی۔ اس نے کلنگر پر الزام کیوں لگایا تھا، یہ بات ہر ایک کی سمجھ میں ہے۔ آسانی آ سکتی ہے۔ البتہ کلنگر کو کس چیز نے اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ اپنی جان لے لے؟

اس نے تو لڑکی پر مجرم مانہ جملہ نہیں کیا تھا بلکہ کسی نے بھی اس کی آبروریزی نہیں کی تھی۔

اس لیے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور لیبارٹری تجزیے سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ جیفری اینگل ہارٹ مرتے دم تک کنواری تھی۔

سوچے بازی

احمد اقبال

سودا کوئی بھی بڑی قوت خرید ہے تو کیا خوشی کیا غم... کیا موت کیا زندگی... کچھ بھی تو مشکل نہیں مگر... ایک دن یہی خوش فہمی انسان کی بھول ثابت ہوتی ہے جب سامنے دریا ہو اور کوئی بوند بھی نہ پاسکے، جب چراغ سر پر ہو اور اندھیرے کا دائرہ انسان کو قید کر لے... جب سامنے منزل ہو اور قدم اٹھانے سے انکاری ہو تو بلندی سے پستی کا سفر کچھ مشکل نہیں رہتا۔ وہ جو پریت پریت اپنی منزلوں کی تلاش میں نکلے تھے جب قدموں تلے خاک بھی نہ رہی تو خدا کی قدرت کا احساس جاگا... روپ بدلتی اس دنیا میں جانے کتنے بیرونی صبح و شام تماشا کرتے ہیں اور اتنی جاتی یہ رتیں جانے کتنے پیغام چھوڑ جاتی ہیں مگر کون ہے جو انہیں سمجھے... کہیں زرد پتے وقت گزر جانے کا احساس دلاتے ہیں تو کہیں پھونکنے کو نپل سے موسم کے پلٹنے کی نوید ملتی ہے... کوئی اونچی اڑان بھر کر بھی عاجزی میں رہتا ہے تو کوئی پستی میں بھی تکبر سے فلک کو تکتا ہے... پل پل بدلتی اس دنیا میں وہ بھی سزائے موت کا ایک ایسا ہی قیدی تھا جسے لمحہ بہ لمحہ موت کی جانب بڑھنے والا پر قدم جانے کیوں زندگی کی طرف ہلتا محسوس ہو رہا تھا... جانے یہ اس کا توکل تھا یا یقین کہ اسے موت کا کھیل بھی ایک مداری کا تماشا محسوس ہو رہا تھا مگر... جب کوئی دو جمع دو کو پانچ کرنے والا اچانک صفر پر کھڑا ہو جائے تو کون ہے جو اس کی تہی دامانی کی انتہا معلوم کر سکے۔ حسن کی ایک ایک ادا خریدنے والا پیار کا ایک سچا احساس تک نہ خرید سکا۔

اپنے انجام سے بے خبر چند معتبر..... نادانوں کا انجام پر گھر

سزائے موت کے منتظر قیدیوں کی آہنی سلاخوں والی کوٹھریاں آنے سے آگے نہیں۔ درمیانی چٹوڑی چوڑی راہداری میں گشت کرنے والے سچ اور باوردی گارڈ کے لیے یہ اپنے اٹھائیس سالہ دور ملازمت کا سب سے زیادہ حیران کن مشاہدہ تھا۔ اس نے درجنوں قیدیوں کو تختہ دار کی جانب جاتے دیکھا تھا، ان میں سے اکثر لے جاتے تھے کیونکہ موت کا خوف وقت مقرر سے بہت پہلے ان پر جاگتی کے عذاب کی طرح مسلط ہو جاتا تھا اور عملاً وہ مرنے سے پہلے ہی مر جاتے تھے۔

سوائے قیدی نمبر تین سو دو سید اکبر حسین کے۔ ایک بار پھر وہ اس کی کوٹھری کے سامنے سے گزرا تو اکبر نے اسے روک لیا..... ”لو صوفی صاحب..... سگریٹ پیو۔“

صوفی نے رک کر سگریٹ لے لی۔ اکبر نے اپنے طلائی لائٹر سے اس کی سگریٹ جلائی۔ ”ایسا لگتا ہے کہ تم کچھ

کہنا چاہتے ہو۔“

صوفی نے اسے غور سے دیکھا۔ ”ہاں، تم اتنے مطمئن اور پرسکون کیوں ہو..... کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہاری زندگی کے صرف چند گھنٹے باقی ہیں؟“

اکبر مسکرایا۔ ”یہ تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”یعنی اب بھی تمہیں اُمید ہے کہ کوئی معجزہ رونما ہوگا اور تم پھر زندگی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔“

”اے معجزے ناممکن تو نہیں ہیں۔“

صوفی نے ٹی ٹی میں سر ہلایا۔ ”تمہارے لیے یہ وقت ہے تو بیک کا.....“

اکبر ہنس پڑا۔ ”یار تمہیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ آخری وقت کی توبہ کے بارے میں کیا کہا گیا ہے..... یہ قبول نہیں ہوتی۔“

”بندے کو خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا

چاہیے۔ یہ جو اللہ کی کتاب آپ کو دی گئی ہے، اس کی تلاوت کریں۔“

قیدی نے ایک طویل کش لیا۔ ”یار صوفی! ایسی مقدس الہامی کتاب کس کے گھر میں نہیں ہوتی، میری عمر دس گیارہ برس ہوئی جب میں نے اسے پہلی بار ختم کیا تھا۔ بڑی قریب ہوئی تھی، مجھے ابھی تک یاد ہے۔ گھر میں ایک نہیں اس کتاب مقدس کے چار نسخے تھے۔ ایک کے سامنے میں میری ماں رخصت ہوئے آئی تھی، دوسرا مونے حروف والا میرے دادا پڑھتے تھے، ان کے انتقال کے بعد اسے بھی ریشمی کوٹے والے جزدان میں لپیٹ کر آٹھ فٹ اونچے طاق پر رکھ دیا گیا تھا۔ وہاں تیسرے جزدان میں تیس یارے الگ الگ بھی رکھے رہتے تھے جو کسی کے مرنے پر قرآن خوانی کے لیے نکالے جاتے تھے۔“

”ہاں۔۔۔ ایک چوتھا نسخہ جو میری ماں کے مدینے سے لائی تھی، جب وہ حج کر کے آئی تھی، لیکن حاصل کیا ہوا؟“

”گارڈز چوکا۔“ حاصل کیا ہوا۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ بعض گھروں میں شاید اس سے بھی زیادہ تعداد میں قرآن کے نسخے ہوں گے، بیش قیمت اور نادر۔۔۔ ساری دنیا میں جیسے مقابلہ ہے، چھوٹے سے چھوٹا، بڑے سے بڑا۔۔۔ چاندی کے اور سونے کے حروف والا قرآن موجود ہے، مگر فائدہ۔۔۔؟“

گارڈ نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔

قیدی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ بتاؤ صوفی صاحب کہ کوئی میزیکل کی تمام کتابیں خرید لے، کیا ان کو پڑھے اور سمجھے بغیر وہ ڈاکٹر بن سکتا ہے؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟“

”تو پھر قرآن کو پڑھو اور سمجھے بغیر کوئی مسلمان یا انسان کیسے بن سکتا ہے۔ یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی، کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ آجانی تو کیا میں یہاں آتا۔“

گارڈ نے سر ہلایا۔ ”کیا تم واقعی خوفزدہ نہیں ہو؟“

ایک لمحے کے لیے اکبر کو خیال آیا کہ وہ گارڈ کو کچ بتا دے۔۔۔ اب اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ایک معمولی گارڈ پر اشتباہ راز سے اس کا پلان تو ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ”نہیں صوفی صاحب۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ وہ وقت ابھی بہت دور ہے۔“

”کمال ہے تین کھٹے تمہیں بہت کتے ہیں؟“

اکبر نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔ ”اگر میں کہوں۔۔۔

کہ میں نے اپنے لیے مزید زندگی کی ہلکت خرید لی ہے۔“

صوفی کا ٹھک ٹھک لین میں بدلنے لگا قیدی کا دماغ چل گیا ہے۔ نامکین مفروضات اس کے لیے یقین بن گئے ہیں، درد کا حد سے گزرتا ہے دوا ہو جاتا۔۔۔ ”کسی باتیں کرتے ہو تم۔!“ اس نے ہمدردانہ آغوش سے کہا۔

قیدی نے اصرار کیا۔ ”یار صوفی۔۔۔ ایسا ہوتا ہے، کچھ لوگ صاف کل عمر کے مجرم ہوتے ہیں، گواہ ثبوت سب کچھ پیش کیے جانے کے باوجود کوئی سیشن جج انہیں صاف بری کر دیتا ہے اور پراکسیکوشن اس کے خلاف ایک ٹیکل نہیں کرتا، یہ کیا ہے۔۔۔ غریب آدمی کے پاس رشوت دینے کے پیسے نہیں ہوتے تو پچاسی کا پچھدا لے لیا ہونے کے باوجود اس کے گلے میں فٹ کر دیا جاتا ہے۔۔۔ ایک کیس کا مجھے معلوم ہے، رحم کی درخواست منظور کرانے کے لیے ایک شخص نے کروڑوں لاکھ کے سفارش پہنچائی تھی۔“

صوفی نے ڈاڑھی کھینچی۔ ”چلو یہ بھی چھوڑو، جن کے پاس دولت کی قوت خرید ہوتی ہے، وہ منتول کے وارڈوں کو خون بہا دے کر اپنے لیے زندگی خریدتے ہیں یا نہیں۔۔۔ وہ دیت کی رقم برحالتے جاتے ہیں، لالچ غالب آتا جاتا ہے، انتقام کے جذبات کمزور پڑتے جاتے ہیں۔ جو خرید سکتا ہے وہ زندگی بھی خرید لیتا ہے۔“

صوفی نے جاتے جاتے کہا۔ ”دولت تو تمہارے پاس بھی کم نہیں تھی۔“

قیدی ہنسا۔ اس نے گارڈ کے طنز کی تضحی کو نظر انداز کر دینا ہی مناسب جانا تھا۔ یہ تو اس گارڈ سمیت سب نے ہی دیکھا تھا کہ گرفتاری کے روزِ اول سے آج تک اس نے دولت سے اپنے لیے آرام و آسائش کی ہر سہولت حاصل کی تھی اور ایک اسی پر کیا منحصر۔۔۔ ہر وہ شخص جو اپنی جیب میں مال رکھتا ہے صرف دکھاوے کی جیل کا شکار ہے۔ جیل کے اندر اسے رہائش کے لیے گھر جیسی سہولت حاصل رہتی ہے۔ اس کا کھانا گھر سے آتا ہے، اسے نوکر چاکر، اخبار، ٹی وی اور موبائل فون سے لے کر شراب و شباب تک زندگی میں رنگ بدلنے کے تمام لوازمات فراہم کیے جاتے ہیں۔ کچھ تو ایسے بھی تھے جو ہر چھٹی والے دن یا عید، بقرعید پر اپنے گھر چلے جاتے تھے اور حاضری کے وقت پھر موجود ہوتے تھے۔

جو کسی نے نہیں دیکھا تھا اور نہ جان سکتا تھا وہ اپنی زندگی کا سودا تھا جو اس نے ایک کامیاب بزنس میں کی طرح بہت دیکھ بھال کے۔۔۔ ٹھوک بجا کے اور اپنے فائدے کو فائدہ پہنچی سمجھ کے کیا تھا۔

جو اس نے بھی نہیں کیا تھا۔

مونٹی کارلو کے ”تاج“ جیسے عالی شان، پریش اور جگمگاتے کیسیوز Casinos میں لاکھوں لاکھ تفریح میں سستی خیزی لانے والوں کی بات الگ ہے۔

ننانوے اعشاریہ ننانوے فیصد جواری وہ غریب ہوتے ہیں جو کچھ کیے بغیر راتوں رات امیر بن جانا چاہتے ہیں۔ لاٹری، پرائز بونڈ، شہرہ دار سونے کو دو گنا کر دینے والا کرمانی عمل، نذرانہ اور مدھون خزانے کا سراغ دینے والا کوئی نقش سب جنگی بجائے میں بدبختی کو خوش بختی میں بدل دینے کی آرزو کے سراب ہیں۔

✽✽✽

زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا یہ سبق اس نے بھی تجربات سے حاصل کیا تھا۔ کچھ اپنے لیکن زیادہ اپنے آس پاس بسنے والوں کے۔۔۔ ان سے سچ نتیجہ اخذ کرنا اس کے غیر جذباتی مشاہدے اور اس کی عقل، ذہانت کا کرشمہ تھا۔۔۔ اور یقیناً یہ انتہائی غیر معمولی صلاحیت خدا نے اسے بلا وجہ نہیں دی تھی۔

بہت کم عمری میں اس نے عملی زندگی سے وہ سبق حاصل کرنے شروع کر دیے تھے جو اس کی عمر کے بچوں کو اسکولوں اور مدرسوں میں پڑھائی جانے والی کسی کتاب کا حصہ نہیں تھے۔

لاہور کی جس غریب بستی کے ایک چھوٹے سے مکان میں اس نے ہوش سنبھالا وہاں اس کا باپ پہلے ایک چھوٹی سی مسجد میں صرف موذن تھا۔ یہ امر اڑی تقریر تھی جو اس نے محض خوش گلو ہونے کی بنیاد پر حاصل کی تھی۔ اس کا سید اصغر حسین کو کوئی معاوضہ نہیں ملا تھا۔

وہ ایسا کوئی بچہ وقت نمازی بھی نہیں تھا۔ ایک زمانے میں اپنی مالی پریشانی اسے ایک خود ساختہ پیر کے پاس لے گئی جو آدھی رات کے بعد خود رنگ کا ڈبا اور برش لے کر لاہور کی دیواروں پر اپنے اشتہار لکھتا تھا۔ ظاہر ہے ان اشتہاروں میں بھی انسان کی ساری عروبیوں کو دور کرنے کے ایسے دعوے ہوتے تھے جو (خود بابت) خدا کی کے برابر تھے۔ ترقی، کامیابی، دولت مندی، امپار شہ، اولاد فریہ۔۔۔ سب کچھ ماہر علوم افلاک سائنس کامل مراد والا کے اختیار میں تھا۔ اس نے وہ سب رکھو لیا جو اصغر کی جیب میں تھا۔ پانی میں گھول کر پینے کے لیے ایک نقش دیا اور نقین کر دی کہ ڈاڑھی رکھو اور نماز پڑھو۔

سودیشی ریل کا سفر

کچھ بچے تھے یاسات سمجھ یاد نہیں، لیکن اس رو کو سبوشن پر ہونے کی سچی سچی ہوتی ٹکٹ کی ٹکڑی ابھی بندھی کیڑی بگمگم کر لکھ خانے کے سوتے تھے۔ جب عابد اڑا رہا تھا اس نے تھوڑا دبا سے کوئی تیس برس پہلے کا سٹیشن پر کھڑا تھا۔ عیانیہ کا سٹیشن یاد آیا لیکن کورکرا سٹیشن تیار نہیں۔ بعض پڑیاں تو رنگ آدھی تھیں۔ جو سکتا ہے اکثر بزنس کے دوسرے کی کیفیت ہو۔ لیکن ہمیں یہی گمان ہو کہ اگر بڑوں کے ہانے کے بعد سے ان بڑوں پر کوئی ریل نہیں آئی، انہی بھی دعووں والا پڑا ہوا دھن کے چمک چمک کرتے جو ہم نے بچپن میں دیکھے تھے۔ اور جن کی پیچ پر لونٹ کی طرح کو ان نگہ کرتے تھے۔ ہانے پاس فضا دھو دھو چھلے چھلے کر رہی تھی جس کے نئے نئے کی سہرت تھی۔ کراچی اور لاہور کے ایک ایک باس میں جتنا بار تھا تھیں یاد دو ہفتہ ایک اس میں ایک دوسری تھیں۔ دو دس تین سرنگ میں ایک ایک لگا لگا ہیل کی نوکریاں، صراحیان، نمائندہ دان وغیرہ۔ اس کو دیکھتے ہوئے ہم جیسے دس سالوں کے بچے ایک کئی بہت تھے۔ لیکن ہمیں دیکھتے ہی چار چار ٹھکر ٹھکر قلی جھانکے آتے۔ ایک نے ہمارا ریل ٹکٹس تھا۔ جس میں دو قیسیں اور دو بچا تھے۔ ایک نے ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ لگا ہوا ایک ایک اخبار تھا، ایک کتابی اسے اٹھانے پر مصحف اور ڈاکٹر اخگر حسین کے ہاتھ میں پھری کیسل کی غریب کی ڈلی تھی ایک اس کے سر پہلے ہوا۔

✽

ابن بطوطہ کے تعاقب میں۔ ابن افشار۔

مالی حالات میں تو کیا انقلاب آتا۔ پیر صاحب کے کہنے پر اس نے باقاعدگی سے نماز پڑھنی شروع کی اور ڈاڑھی بھی دکھ لی۔ تقسیم سے پہلے بھی وہ مشرقی پنجاب کے ضلع گودا سپور میں خانہ بدوش تھی زندگی گزارتا تھا اور سارا سال میلوں ٹھیلوں میں یا گاؤں دیہات کے حزاروں پرگا کر روزی کما تا تھا۔ وہ میرا کئی کہلاتے تھے اور یہ ان کا خاندانی پیشہ تھا لیکن اسے بپ اور ایک بھائی کے مقابلے میں اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تجربے کا نکھار آتا گیا۔ خود اسے گانے میں سرور کے ساتھ کھینکنا کا

اٹوٹھا احساس ملتا تھا اور وہ سننے والوں کو ولہانہ انداز میں مجھوم کر رہتا تھا۔ یارش کرتے دیکھتا تو خود اس پر وجد طاری ہو جاتا اور وہ چٹان لے کر سننے والوں کے درمیان پہنچ جاتا تھا۔ جب اس نے ایک آنجانے حسن کے کہنے پر عارفانہ کلام گانا شروع کیا تو دوسروں کی جگہ پر اس پر سکون اور نگوں کی بارش ہونے لگی تھی وہ ”جگنی“ تھا۔ وہ سننے والوں کے ساتھ اور سننے والے اس کے ساتھ رقص کرتے تھے۔ اس کا باپ بہت خوش تھا۔ تمام عمر حرات سے میراثی کہلانے کے باوجود وہ غربت کی لکیر کو پار کر کے خوشحالی کے حصار میں قدم نہ رکھ پایا تھا۔ اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ مزاروں کے عمارت یا میلوں کے انتظام لے جاتے تھے۔ بیٹے نے اچانک کا یا پلٹ دی تھی۔ اب انتظام اور عمارت اس کے محتاج ہو گئے تھے اور وہ اپنی شرائط پر جاتا تھا۔ بڑھتے بڑھتے اس کا حصہ کل آمدنی کے نصف تک پہنچ چکا تھا۔ اسے زمیندار، جاگیردار شادی بیاہ کی تقریبات میں بھی بلانے لگے تھے مگر لاہور کی فلم نگری جانے کا اس نے ابھی نہیں سوچا تھا۔

اچانک ملک تقسیم ہو گیا۔ وہ حالات سے بے خبر نہیں تھا لیکن ایک تو شہروں کی سیاست کا اثر دیہات کے میلوں یا مزارات کے عرسوں پر نہیں پڑتا تھا، دوسرے عام احساس یہ تھا کہ گورداسپور کو پاکستان میں شامل کیا جائے گا۔ ملک اسلامی ہوگا تو ان تقریبات کو فروغ ملے گا جہاں وہ عارفانہ کلام گانے کا دھبہ وصول کر سکے اور دام بھی۔ اللہ اسی طرح مہربان رہے تو وہ داتا کی نگری میں اپنی آواز کا جادو جگانے یا پاکستان میں باغیہ شکر گنج کے عرس پر۔

اچانک سب ختم ہو گیا۔ گورداسپور کو بھارت کے حوالے کر دیا گیا اور مسلمان سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہجرت پر مجبور ہوئے۔ اس کا سارا خاندان ختم ہو گیا۔ باپ پہلے قتل ہوا، ماں نے راہ میں دم توڑا اور اس کی لاش وہیں بے گورون پڑی رہی۔ قافلہ آگے بڑھ گیا۔ اس کی دو بہنوں کا اغوا سرحد پار کرنے سے پہلے ہوا، جب وہ واہگہ کی سرحد کے پار پہنچا تو اکیلا تھا۔

شہر میں ہاتھ پیر مار کے اسے ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا تو اس نے ارد گرد کے دیہات کا رخ کیا۔ حالات ابھی تک خراب تھے۔ میلے اجر گئے تھے اور عرس کی تقریبات میں قوال حاوی تھے۔ اپنی اچھی آواز کے باعث اسے موقع ضرور ملا لیکن پیسہ بہت کم ملا۔ وہ ہمت ہارنے والا شخص نہیں تھا، اس کی عمر پچیس سال کی اور وہ سختی برداشت کرنے کا بے

پناہ حوصلہ رکھتا تھا۔

دو سال میں اس نے اپنے قدم جمائے۔ حالات بہتر ہوئے تو تقریبات کی روٹیں بھی لوٹ آئیں لیکن اسے وہ خاندانی اجارہ داری والا پس منظر ملا جو گورداسپور اور نواح میں اس کی کامیابی کا ضامن بن گیا تھا۔ یہاں حسد کا جذبہ اس کے ہم پیشہ لوگوں کو اس کے خلاف لاتا رہا۔ اس نے پھر بھی مقابلہ جاری رکھا۔ ابھی وہ گورداسپور کی ڈسے داریوں سے آزاد تھا اور اس کی اکیلی جان کے لیے وہ آمدنی کافی تھی جو کھتی بڑھتی رہتی تھی۔

یہاں بھی وہ کم ذات میراثی تھا لیکن عزت کے بارے میں اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ نوشہ قدرت تھا جسے بدلائیں جاسکتا تھا۔ اچھی کمائی ہوتی رہے، اس کے لیے یہی بڑی کامیابی تھی۔ آمدنی اتنی ہو کہ وہ شادی کر لے اور اپنا گھر بنالے۔ آگے بچوں کا نصیب کہ وہ زندہ رہنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔

وہ تیس سال کا تھا جب شادو نے اس کی زندگی میں قدم رکھا اور اس کا رخ بدل دیا۔ ساہیوال کے ایک بہت دولت مند زمیندار نے اسے اپنے بیٹے کی شادی کے موقع پر طلب کیا۔ اس کا نام چودھری بشیر تھا اور زمینوں کے علاوہ اس کے پاس نیلی بار کے علاقے کی مشہور نسل کی سینکڑوں بھینسیں تھیں جن کا دودھ وہ ذاتی تعلقات کی بنا پر اوکاڑہ کے ملٹری ڈیری فارم کو سپلائی کر دیتا تھا۔

وہ چودھری کے ڈیرے پر حاضر ہوا تو شہر کے مضامات کا علاقہ ہونے کے باوجود وہاں بڑی گہما گہمی تھی۔ درجنوں معصوم مزارع اور کمیون شادی کے انتظامات میں بھی مصروف تھے۔ اپنی آمد کی اطلاع کرانے کے بعد وہ گھنٹوں انتظار میں کھڑا رہا۔ کسی کو بھی فرصت نہ تھی کہ اس سے پانی کو بھی پوچھتا۔ لوگوں کی مشکوک سوالیہ نظریں اس پر ضرور پڑتی رہیں۔ کئی بار اس سے پوچھا گیا کہ وہ کیوں کھڑا ہے اور جواب دینے پر خواہ مخواہ ڈانٹا گیا کہ ایک طرف ہوجا۔ جب اس کی جیش ہوئی تو چودھری نے کہا۔ ”اصغر۔۔۔۔۔ تو نے بیچا یا نہیں۔۔۔۔۔؟“

”نہیں جناب عالی۔۔۔۔۔ گستاخی معاف۔۔۔۔۔“

”ہم گورداسپور آئے تھے۔ اپنا ایک یار تھا ادھر۔۔۔۔۔ اس کے باپ کی برسی پر تو نے گایا تھا، آج رات جشن ہے، شاہی قلعے سے لاہور کی تاجپے والیاں بھی آئیں گی۔ بس آج رونق لگا دے۔۔۔۔۔ انعام ملے گا۔ اوئے اسے کچھ کھانے پینے کو دو۔۔۔۔۔ میراثی ہے تو کیا، بندہ ہے آخر۔۔۔۔۔ مرنے والا ہو رہا ہے۔“

چودھری کی بات پر خوشامدی ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اصغر خاموشی سے سلام کر کے نکل آیا۔ اس کے لیے یہ سلوک غیر متوقع نہیں تھا۔ عزت داروں کی محفل میں ہر میراثی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ اس سے بھی بدتر وہ بھانڈے تھے جو اکیس محفل میں جگت بازی کرتے تھے۔ وہ رٹے رٹے جملوں پر سب کا مذاق اڑاتے تھے جس کا کوئی برائیں منانا تھا اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو جوتے بھی مارتے جاتے تھے۔ جوتا درحقیقت صرف تلا ہوتا تھا جس کے مارنے کا بھی مخصوص انداز تھا، اس سے آواز بہت پیدا ہوتی تھی مگر جس کی چستروں ہوتی تھی اس کو چوٹ نہیں آتی تھی۔ عزت کے کمترین درجے پر کھسکے فائز تھے جن کا شمار انسانوں میں بھی نہیں تھا۔

اصغر کو رات تک میراثیوں، بھانڈوں کے ساتھ ایک گوشے میں سرگرم پھینا پڑا۔ وہ سب خاندانی رئیسوں، جاگیرداروں کی محفل تھی۔ حضرات ایک طرف صوفوں پر ڈھیر تھے اور خوب پی پلا رہے تھے۔ خواتین کافی فاصلے پر ان کے مقابل برائے نام باریک سے پردے کے پیچھے جمع تھیں اور درمیان کا سارا تماشا ملاحظہ کر سکتی تھیں۔ سچ کی جگہ تیس فٹ لمبی چوڑی تھی جس پر قاتلین بچھا ہوا تھا۔

لاہور سے چارنا چنے والیاں آئی ہوئی تھیں۔ وہ سب بھرے جسموں والی جوان اور خوبصورت خواتین تھیں جنہوں نے خوب سرفی پاؤ ڈھونڈا ہوا تھا اور لباس ایسا زیب تن کیا تھا کہ جب رقص ہوتا تو جوانیوں جھلکے جیسے دھکن کھولنے سے سوڈے کی بوتل سے جھانک چھلکتا ہے۔ پہلے دو نے فلمی گانے تن ڈولے میرامن ڈولے پر ایک ساتھ رقص کیا۔

دوسرے دور کی رقاصائیں اپنا ٹانف لاتی تھیں۔ کم لباسی کے باعث ان کا رقص مردوں کے لیے زیادہ ہوشیار اور خواتین کے لیے شرمناک تھا۔ اصغر حیران تھا کہ آخر انہوں نے کپڑے پہنے ہی کیوں ہیں۔ اچانک چودھری نے ملا لگے کورک دیا۔ ”اوئے یہ کیا رہیں رہیں کر رہے ہو؟۔۔۔۔۔ چل اوئے اصغر۔۔۔۔۔ آ جا اپنی جگہ کے ساتھ۔“

اچانک طلب کیے جانے پر اصغر بڑا کے اٹھا اور چٹان لے کر وسط میں پہنچ گیا۔ ابھی وہ سنبھلا ہی نہیں تھا کہ رقص کرنے والی لڑکیوں نے ٹکڑے اعتراض اٹھا دیا۔ ”ہم جگنی پر ڈانس نہیں کرتے۔“

چودھری بشیر کا پارا چڑھ گیا۔ ”کیوں۔۔۔۔۔ جگنی کا تھی ہے تمہیں؟“

کھڑا ہو گیا۔ ”مائی باپ۔۔۔۔۔ ہم مولائی کی شان میں گائی جانے والی جگنی کے ساتھ ایسی بے ادبی نہیں کر سکتے۔“

چودھری کا جوابی رد عمل سامنے آنے سے پہلے زائد سے کسی نے نہ آواز بلند کیا۔ ”یہ بات تو ہے۔“

اس کی تاکید مردانہ حصے میں موجود ایک بزرگ نے اپنی ریش سفید پر ہاتھ پھیر کے فرمائی۔ ”چل پتر بشیر۔۔۔۔۔ اس کو رہنے دے۔ خوشی کے موقع پر بندہ جانتے بوجھتے گناہ گار ہو۔ کیا فائدہ۔۔۔۔۔“

چودھری نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”او میرا شیا۔۔۔۔۔ چھوڑ اپنی جگنی، کوئی اور چیز نکال پھرتی ہوئی۔“

اصغر نے مودبانہ کہا۔ ”جناب عالی۔۔۔۔۔ سب صوفیانہ کلام ہے میرے پاس۔۔۔۔۔“

”جا پھر کسی عرس میں۔۔۔۔۔ ادھر شادی میں کیا لینے آ گیا؟“ چودھری نے برہمی سے اس کو دھک ہونے کے لیے کہا۔

اصغر کو پہلی بار بے عزتی کا احساس ہوا۔ بے عزتی اس کی نہیں۔۔۔۔۔ اس کے فنی کی ہوئی تھی جو اس کا اثاثہ تھا۔ جگنی کا کہ ہی اس نے نام کیا تھا۔ سارا زمانہ اسی کا دیوانہ تھا۔ وہ ایک کونے میں سرکھاتے سوچتا رہا۔ گناہ کی بات وہ کر رہے ہیں جو سرے پاؤں تک گناہوں کی دلدل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شراب کے نئے میں دھت ہیں۔ فاحشہ گورتوں کو نکال چارے ہیں۔ اس سنجری کی بات کو غلط نہیں کہا جاسکتا مگر جگنی تو رقص کے بغیر کئی جگہ جاسکتی تھی۔

خواتین کی طرف سے کسی نے فرمائش کی۔ ”اس کے لیے بھی دہی کا ٹانف پھیرے والا۔۔۔۔۔“

ڈانسرز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”ٹھیک ہے۔“

مردانہ حصے میں سے چند آوازیں آئیں۔ ”سپیرے کو بھی بلاؤ۔۔۔۔۔“

اب ڈانسرز کو کہنا پڑا۔ ”اللہ معاف کرے چودھری صاحب۔۔۔۔۔ سانپ سے ڈر لگتا ہے جی۔۔۔۔۔ ان کا تو واقف ہے پر رئیس کی وجہ سے۔ ہمیں کاٹ لیا تو۔۔۔۔۔“

پر رئیس والی بات درست تھی مگر کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ سپیرے نے کہا۔ ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ نہیں کاٹا۔“

”کاشٹے والا ہوتا تو ہم سب کے سچ میں لانے دیتے۔ ان کے زیر ہرے دانت نکالے ہوتے ہیں۔“

چودھری نے کہا مگر ڈانسرز ریشی نہ ہوئیں۔ انہوں نے بھی

”چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے۔“ پر ڈانس کیا لیکن نفسیاتی طور پر ان کی حریف نے میدان مار لیا تھا۔ دوسری پر فارمنس زیادہ اچھی تھی لیکن انہیں نیچا دکھانے کے لیے پہلی دو ڈانسز نے پھر سامنے آ کے سامپوں کے ساتھ اپنا رقص پیش کیا اور اس بار سامپوں کے ساتھ زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا کیونکہ انہیں نہ صرف داخل رہی بلکہ ان پر نوٹ بھی برس رہے تھے۔ پیچھے ہٹ جانے والی ڈانسز کو اس وقت پھر موقع ملا جب پیپر ڈانس کرنے والوں کے پاؤں تاپتے تھے اور ہاتھ مال سینٹے سینٹے تھک گئے۔

اصغر جی کی اذان تک بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔ اس بزم طرب میں شاید وہ اکیلا ہی دل گرفتہ تھا۔ اسے پھر کسی نے نہیں بلایا۔ وہاں کوئی بھی اس کا صوفیانہ کلام یا جگتی سننے کے موڈ میں نہیں تھا اور درمیان میں جو وقفہ آیا اس میں بھانڈ بگلت کرتے رہے اور ڈانسز کو آرام کرنے کا موقع مل گیا۔

اصغر کو بزم حریہ پر عزتی کا سامنا کرنا پڑا جب وہ انعام حاصل کرنے کی امید میں چودھری کے سامنے چلا گیا۔ وہاں بھانڈ بھی تھے، کھسے بھی اور میرانی بھی۔ چودھری کے ساتھ اس کا بیٹا بھی بیٹھا ہوا تھا جس کی شادی کا جشن تھا۔ چودھری ایک گڈی میں سے سوسو کے نوٹ گئے بغیر الگ کرتا تھا اور انعام لینے والا اسے اور دلہا کو دعائیں دیتا آگے بڑھ جاتا تھا۔

اصغر کو دیکھتے ہی چودھری کا موڈ بگڑ گیا۔ ”اوئے..... تو کیا لینے آ گیا، کیا تیرا بار ہے تو نے..... حلق سے آواز بھی نہیں نکالی، انعام کس بات کا..... چل ہٹ ادھر سے۔“

اصغر خاموشی سے ہٹ گیا۔ اس کی جگہ خیرات مانگنے والا بھی ہوتا تو خالی ہاتھ نہ جاتا۔ وہ چودھری کے ڈیرے سے لکٹا تو غصے اور احساس ذلت سے مغلوب تھا۔ وہ سیدھا سڑک پر گیا اور بس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی جیب میں مشکل سے واپسی کا کرایہ تھا۔ اتنی جتن نہ بس بھی اور نہ بس اسٹاپ والا ڈھابا کھلا تھا۔

ابھی چندہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کسی نے پیچھے سے اسے پکارا۔ ”اوئے اصغر..... کدھر جا رہا ہے تو؟“

”کیوں؟..... اتنی بے عزتی کر کے خالی ہاتھ واپس بھی نہ جاؤں۔“

”اوئے چھوڑ عزت بے عزتی کو۔“ پیچھے سے آنے والے نے کہا۔ ”آ میرے ساتھ..... آج اپنے شاہ صاحب کا عرس ہے، بڑے شاہ صاحب کا..... ابھی جو گڈی نشین ہے..... ان کے والد تھے۔“

عرس میں اس گاؤں کے علاوہ ادھر ادھر سے آئے ہوئے معتقد بھی تھے، عرس کے لیے ایک قوال باری بھی آئی ہوئی تھی لیکن اصغر نے عارفانہ کلام کے بعد جگتی شروع کی تو رنگ محفل بدل گیا۔ آہستہ آہستہ وجد میں آنے والے بھول گئے کہ یہ کوئی رقص طرب نہیں برسی کا اجتماع ہے۔ ابتدا ایک باریش بزرگ نے کی جو شاہ صاحب کا مستند خاص ہونے کے باعث ان کا خلیفہ کہلاتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے اور دونوں ہاتھ اٹھا کے درمیان میں آگیا اور ناپچے لگا۔ اس کے ساتھ شاہ صاحب کے دیگر مرید آگئے اور شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان پر ”حال“ طاری ہے جو ایک روحانی کیفیت کا نام ہے۔ کسی نے ناپچے والوں کو نہیں روکا..... اصغر کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ اسے اندازہ بھی نہ ہوا کہ وہ کتنی دیر سے گارہا ہے۔

بالآخر شاہ صاحب کے اشارے پر ہی بے خودی اور خود فراموشی کا یہ طوفان ختم ہوا۔ اصغر جب شاہ صاحب کی قدم بوسی کے لیے بچھا تو بلا ارادہ گر گیا۔ شاہ صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کسی کو اشارہ کیا۔ اسے سرخ رومال میں لپیٹ کر کچھ دیا گیا۔ اس نے بعد میں کھول کے دیکھا تو اس میں ایک ٹوٹی اور بیخج جو شاہ صاحب حج سے واپسی پر کئے مدینے سے لائے تھے، کے علاوہ دو ہزار روپے نقد تھے اور ایک سونے کی انگوٹھی جو بڑی بیگم صاحبہ کا انعام تھی۔

اس قدر دانی نے اصغر کے سارے گلے شکوے دور کر دیے جو اسے چودھری کی حوصلی میں قدر ناشکی کے سبب ہوئے تھے۔ عرس کی تقریب نماز مغرب پر تمام ہوئی، لنگر کی دیک سے ٹھٹھے چاول کھانے اور دودھ کا گلاس چڑھانے کے بعد اصغر پر غنودگی کا حملہ ہوا۔ وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ فرش پر ایک دیوار کے ساتھ لیٹا اور سو گیا۔ عقیدت مند اس وقت بھی مزار کے طواف میں مصروف تھے۔ چادریں چڑھا رہے تھے اور منت مان کے دعا مانگ رہے تھے۔

آدھی رات کے بعد اصغر کو یوں لگا جیسے کوئی شانہ ہلا کے اسے جگانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کے سر کھمایا تو ایک سایہ سار دروازے کی طرف لپکتا نظر آیا۔ چوڑیوں کی ٹھنک نے اصغر کو بھادیا کہ سایہ کی عورت کا ہے۔ وہ دروازے میں مل بھر کے لیے رہی اور اس نے ہاتھ سے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا تھا۔

اصغر نے ادھر ادھر بے سدھ پڑے لوگوں کی طرف دیکھا۔ اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر بھی تاریکی مگر وہ اصغر کو اچالے کی دیوار کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔

”کیا بات ہے؟ کون ہے تو؟“ اصغر نے قریب جا کر

پوچھا۔ وہ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے کھڑی تھی۔ ”شاہو ہے میرا نام۔ میں تجھے کچھ بتانے آئی ہوں۔“

”ایسی کیا بات تھی جو دن میں نہیں بتائی جا سکتی تھی، کسی نے دیکھ لیا تو بدنامی تیری ہوگی، میں بھی مارا جاؤں گا۔“ وہ ہنسی تو اصغر کو یوں لگا جیسے چوڑیاں بھر گئی ہیں۔

”انتہات ڈر..... کچھ نہیں ہوگا، کیسا مرد ہے تو۔ بیٹھ ادھر آرام سے۔“

اصغر نے اس کا نرم ہاتھ اپنی کلائی پر محسوس کیا اور اس کی ساری محارمت جواب دے گئی۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

”تیری آواز میں بڑا جاوہ ہے۔“ وہ بولی۔

”بس یہی بتاتا تھا، اس کے لیے تو آدھی رات کو کھڑے سے نکلے اور مجھے جگا دیا۔ تو پاگل ہے کیا۔“ اصغر کی گویائی بحال ہوئی۔

اس نے اصغر کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ ”کل بھی میں چودھری کے ڈیرے پر بھی، انہوں نے بڑی زیادتی کی تیرے ساتھ لیکن انہیں جگتی سے زیادہ بھریوں کو بچانے کا مزہ آ رہا تھا۔“

اب اصغر کی نظر اندھیرے میں دیکھنے لگی تھی۔ اس کے مقابل اٹھارہ بیس سال کی بھمرے بھمرے جسم اور گول چہرے والی ایک لڑکی تھی۔ اس کا دوپٹا گلے میں ہار کی طرح بڑا ہوا تھا اور وہ اس کے لیے گئے سایہ بالوں کو بکھرا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ اس کے گورے پاسانوں پر رنگ کا اس تاریکی میں اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اصغر کو اس کے روپ سے زیادہ اس کے اعتماد نے مسحور کیا تھا۔ وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے اصغر سے پرانی شناسائی ہے اور ان کے یوں ملنے میں نہ کوئی بات معیوب ہے اور نہ خطرے کی۔

”آج شاہ صاحب نے مجھے دو ہزار روپے نقد انعام دیے ہیں، سونے کی ایک انگوٹھی بڑی بیگم صاحب سے ملی ہے۔“

”چودھری صاحب تک یہ خبر پہنچ گئی ہے۔ اب تیری خیر نہیں۔“

اصغر بھونچکا رہ گیا۔ ”کیا، مطلب؟“

”چودھری اور شاہ صاحب کی آپس میں گتی ہے۔“

”کس بات پر؟“

”چھوڑا اسے۔ مجھے بھی اتنا ہی پتا ہے کہ بڑے چودھری صاحب نے بڑے شاہ صاحب کا مرید بننے سے

تیرے ساتھ ہوا اس کی اطلاع شاہ صاحب کو مل گئی۔ انہوں نے موتے سے قائمہ اٹھایا اور تجھے برسی پر بلایا۔ مقصد چودھری کو یہ احساس دلانا تھا کہ اسے بندے کی قدر نہیں اور یہ جو انعام ملا ہے تجھے۔ یہ بھی چودھری کو ذلیل کرنے کے لیے ہے۔ کچھ لوگ یہی کام کرتے ہیں..... انہوں نے یہاں شاہ صاحب کو چڑھایا کہ چودھری کا تو خاندان ہی ایسا ہے، آج بھی وہ جگتی گانے والے پر ایک بھری کے ننگے ناچ کر تڑپ دیتے ہیں۔ یہاں سے جانے والوں نے چودھری کو اکسایا کہ آپ نے جس میرانی کو نہ نہیں لگایا تھا اسے شاہ صاحب نے دو ہزار روپے کر آپ کو بے عزت کیا ہے۔ جیسے آپ کے سہمان کو بھوکا سونا پڑا تو شاہ صاحب کے کھرے حلوا آجائے..... ورنہ ایک میرانی کی اوقات سو بچاس سے زیادہ نہیں۔ مقصد تو آپ کے منہ پر جو تار مارنا تھا۔“

اصغر دم بخود بیٹھا اسے پلک جپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ ”بھرا ب کیا ہوگا شاہو؟“

اس نے خوشخبری دینے کے انداز میں کہا۔ ”کل چودھری صاحب بھی تجھے ہلا کے انعام دیں گے۔“

”اچھا..... یعنی دو ہزار کے مقابلے میں چار۔“

اصغر کی باجھیں خوشی سے کل گئیں۔

وہ اسے حیرانی سے دیکھتی رہی۔ ”کیا تو واقعی اتنا بے وقوف ہے، جتن جوتے پڑیں گے تجھے دو ہزار..... ہو سکتا ہے تیرا منہ کالا کر کے اور گدھے پر بٹھا کے تیرا جلوس نکالا جائے۔“

اصغر کا رنگ اڑ گیا۔ ”کیوں؟..... میرا کیا قصور ہے؟“

”تیرا قصور یہ ہے کہ تو میرانی ہے۔ کم ذات، غریب اور کمزور۔ شاہ صاحب کا کوئی کیا گاڑ سکتا ہے۔ جرم تیرا بنا دیا جائے گا کہ بلایا چودھری صاحب نے اور تو ہو گیا شاہ صاحب کی طرف۔ چودھری صاحب کو بے عزت کرانے۔“

”شاہو..... چودھری نے مجھے نہ عزت دی تھی نہ اتنی دور بلا کے کوئی انعام، میرے پاس تو واپسی کے پیسے بھی نہیں تھے۔“

”اب کہا جائے گا کہ تو نے بے مبرے پن کا مظاہرہ کیا۔ اگر تو ظہر تا تو چودھری صاحب ایسے گئے گزرے بھی نہیں کہ تجھے خالی ہاتھ لوٹا دیتے۔ وہ بھی بیٹے کی شادی کے موتے پر..... وہ دو کے بجائے چار ہزار دیتے۔“

255

اصغر گھبراہٹا۔ ”کیا میں شاہ صاحب کو بتا دوں؟“ وہ ہنسی۔ ”پاکل..... وہ کچھ نہیں کرنے والے، ساڈ لڑتے ہیں، تا تو کچھ جانتے ہیں مینڈک۔“

”پھر بتانا..... میں کیا کروں؟“ اصغر کو اس لڑکی نے اپنے پر سکون۔ پراعتاد اور بے تکلف اپنائیت کے انداز سے محور کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اسے حالات کی پوری خبر دی تھی۔ اسے اصغر کی آواز اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ تمام خطرات مول لے کر اسے خبردار کرنے چلی آئی تھی اور اس خیال سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھی کہ کسی نے اسے یوں اصغر کے ساتھ بیٹھا دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ گاؤں کی کوئی لڑکی اتنی سمجھ دار یا نڈر بھی ہو سکتی ہے، اصغر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اگر بہت ہے۔“ شادو اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تو آ جا میرے ساتھ۔“ وہ کپڑے جھاڑ کے بولی۔ ”میں تجھے بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔“

کسی حذرزدہ شخص کی طرح وہ شادو کے پیچھے چل پڑا۔ وہ سنہیل سنہیل کے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، اونچے نیچے راستوں پر ٹیلیوں اور جھاڑیوں سے دامن بچاتی آگے چلتی گئی۔ بڑے شاہ صاحب کا حزر بستی کے باہر ایک نہایت اونچی جگہ پر تھا، بستی کے اور مزار کے درمیان مسجد تھی۔ شادو نے آخری بار مزار کے دیکھا اور اصغر نے اس کے سفید ہموار دانتوں کو سکراہٹ سے روشن دیکھا۔

”میں یہاں رہتی ہوں۔“

اصغر پھر بھونچکا رہ گیا۔ ”اس مسجد میں.....؟“

”ہاں..... آ جا آ جا..... ڈر مت..... میرا ابا یہاں امامت کرتا ہے، یہ مسجد اسی نے بنائی تھی، گاؤں والوں کی مدد سے۔“ اس نے ایک بند دروازے کی کنڈی کھولی۔

”یہ میرے پیدا ہونے سے بھی پہلے کی بات ہے، اب تو میری ماں کو مرے بھی دس سال ہو گئے، اللہ کا شکر ہے کہ پرانی ریش کے باوجود شاہ صاحب نے اپنی ڈیڑھا اینٹ کی مسجد الگ نہیں بنائی، حالانکہ وہ بنا سکتے تھے، اب بھی جمعہ نہیں ہوتا ہے۔“

اصغر نے اس چھوٹی سی مسجد کو دیکھا جو اس وقت تاریک تھی۔ اس کا مین خاصا بڑا تھا۔ اس میں دو چار سونمازی ایک ساتھ کھڑے ہو سکتے تھے۔ مسجد کا ایک مینار تھا اور ایک گنبد..... اس کی عمارت چوڑائی کے رخ پھیلی ہوئی تھی۔

”پیش امام صاحب اس وقت کہاں ہیں؟“ اصغر نے بڑی مشکل سے سوال کیا۔

”وہ سو رہے ہیں۔ اتنا مت ڈر، اگر وہ جاگ گئے تب

بھی کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اٹھ کے مجھے تلاش کرنے باہر نہیں نکلیں گے، فجر کی اذان تک..... ابھی تو دو بجے ہیں، بیٹھ جا یہاں۔“ وہ دیوار کا سہارا لے کر اس تاریک گوشے میں جھپٹا کے بیٹھ گئی جہاں کتنی کی دودو یار لٹی تھیں۔

اصغر نے کسی پناہ تار کیے ہوئے شخص کی طرح اس حکم کی بھی تعمیل کی اور دوسری دیوار سے ٹیک لگا کے شادو سے چند فٹ دور بیٹھ گیا۔ ان کے درمیان خاموشی کا ایک مختصر وقفہ حائل ہوا۔ پھر شادو نے کہا۔ ”تو سوچ رہا ہے کہ آخر مجھے کسی کا ڈر کیوں نہیں، میں کیسے کہہ سکتی ہوں کہ اس وقت میرا باپ بھی نہیں آ سکتا۔“

اصغر نے گھڑے جیسا سر ہلا دیا۔

”اس کی طرف سے مجھے اجازت نہ ہوتی، تو یہ ناممکن تھا۔“

اصغر کے لیے یہ بے خبری میں ہونے والے ہم کے دھماکے سے کم نہ تھا۔ ”اجازت.....؟“ آواز اس کے حلق میں جھنک گئی۔

شادو نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔“

”کیا پوچھ لیا تھا؟ یہ کہ میں اصغر میراثی سے ملنے جاؤں؟ یہ کیا معاملہ ہے شادو..... باتوں سے تو مجھے بہت سیدھی بتائی جاتی ہے، مجھے کسی مصیبت میں نہ ڈال دینا۔ میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ ماں نہ باپ..... اور نہ بھائی بہن۔“

شادو کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ”رہنے کا کوئی ٹھکانا ہے یا وہ بھی نہیں.....؟“

”ابھی تک تو نہیں ہے، اکیلا آدمی ہوں۔ یہی میرا روزگار ہے، گھوم بھر کے لوگوں کا دل بہلانا..... میرے باپ دادا بھی یہی کام کرتے تھے، میں بھی میراثی ہوں ذات کا..... گا بجا کے روزی روٹی کما تا ہوں۔ گھر کا کیا کروں گا، جہاں رات ہو جائے کوئی ٹھکانا تلاش کر لیتا ہوں، اب ہاتھ میں کچھ پیسے آگئے ہیں تو.....“ وہ کہنا چاہتا تھا کہ اپنا گھر بسانے کی سوچ رہا ہوں مگر اس نے خود کو روک لیا۔ ”پرتو یہ سب کیوں پوچھ رہی ہے؟“

وہ دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے بیٹھی رہی۔ ”میں کیسی گنتی ہوں تجھے.....؟“

اصغر کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ ہکھلانے لگا.....

”کیسی..... کیسی کیا مطلب..... اچھی ہے، بلکہ بہت اچھی ہے۔“

”شادی کرے گا مجھ سے.....؟“ شادو نے اسی سانس لے لے میں اپنے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

اصغر کی زبان گنگ اور جسم منطوق ہو گیا۔ ایک خیال اسے یہ آیا کہ لڑکی کے روپ میں یہ کوئی بدروح نہ ہو جو پلک جھپکنے میں غائب ہو جائے۔ اسے ہوش آئے تو وہ وہیں حرار کے اندر پڑا ہوا۔ اس کی نظر بے خیالی میں شادو کے پیروں کی طرف گئی، اس نے سنا تھا کہ چڑیلوں کے پیرا لٹے ہوتے ہیں۔ وہ اسی طرح ویرانوں میں پھنکتی پھرتی ہیں، حسین عورت کا روپ دھار کے بھولے بھگتے مسافر پر اپنا جادو چلاتی ہیں اور ان کا کچھ نکال لیتی ہیں۔

شادو کی آواز اس کے کانوں میں دور سے آئی۔

”میرے ابا نے تجھے چودھری کے ڈیرے پر دیکھا تھا، اس وقت جب چودھری نے تجھے بیٹھک میں بلایا۔ وہ بھی وہاں تھے، کل رات کے لیے انہوں نے چودھری سے معذرت کر لی تھی، ظاہر ہے اس قسم کی تقریب میں ان کا کیا کام..... وہ چودھری کو شادی کے موقع پر ہونے والی بے ہودگی اور بے شری سے روک نہیں سکتے تھے۔ وہ سب ابا کے نزدیک غیر شرعی اور گناہ تھا، انہوں نے خود کو روک لیا..... جانتے ہیں کہ جس قسم کی زندگی چودھری جیسے لوگ گزارتے ہیں، اس سے ان کو کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ اپنی عزت بچاتے ہیں تاکہ مسجد میں امامت کرتے رہیں اور لوگوں کو روزہ نماز کی تلقین بھی..... لیکن چودھری نے بڑی یتیم کے ذریعے کھلوا لیا کہ پیش امام کی جگہ شادی میں مجھے ضرور آنا ہوگا، ایسا اس نے کیوں چاہا، اس کی وجہ بھی میں بتاؤں گی..... کل چودھری کے بیٹے کا نکاح ابا کو پڑھانا ہے، اس سے پہلے ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔“

”یہی بات.....؟“ اصغر بولا۔

”میری پوری بات سن لے، پھر تجھے خود ہی سمجھ آجائے گی۔ ابا کی عمر تو اتنی زیادہ نہیں، پچاس سے کچھ اوپر ہے۔ شادی کے بعد ماں چوبیس سال اس کے ساتھ رہی، پہلے اسی حجرے میں تھی، پھر اس کے ساتھ ایک کمر اور بنوانا پڑا۔ ان کی پہلی اولاد میرا سب سے بڑا بھائی تھا، وہ تین سال کا تھا کہ تالے میں ڈوب کے مر گیا۔ بارشوں کے بعد پانی کا ایک ریلہ آیا تو اسے بھی بہا کے لے گیا۔ پھر دو لڑکیاں ہوئیں، دونوں شادی ہو گئیں، ایک رات میری ماں کو بخار ہوا۔ دونوں بعد وہ مر گئی۔ میں اس وقت دس سال کی تھی، بڑی بہنوں نے صرف قرآن پڑھا تھا..... ماں کے مرنے سے ابا ڈر گیا کہ وہ بھی نہ رہا تو میرا کیا بنے گا، اس نے مجھے خود

پڑھایا۔ وہ کہتا تھا کہ تعلیم عورت کا زیور نہیں، ہتھیار ہوتا ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو اس سے وہ اپنا دفاع کر سکتی ہے۔ اکیلی بھی دنیا سے لڑ سکتی ہے۔ کہتے ہیں نیت نیک ہو تو اللہ بھی مدد کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابا بھی میری بہنوں کے مقابلے میں خدا نے مجھے اتنی اچھی صورت نہیں دی جتنا اچھا دماغ دیا ہے۔ تعلیم میں میری دلچسپی نے ابا کو بھی حیران کر دیا۔ میں ایک کے بعد دوسری کلاس کی کتابیں ختم کرتی گئی، اگر میں چاہتی تو میٹرک کا امتحان پاس کر لیتی لیکن یہاں نہ اسکول ہے اور نہ کوئی پڑھانے والا..... شہر زیادہ دور نہیں لیکن وہاں ہمارا کوئی نہیں اور میرا گاؤں سے ہر روز اسکول آنا جانا ناممکن تھا۔ یہ بات مجھی نہیں رہ سکتی تھی۔ میں چودھری کے گھر میں یا شاہ صاحب کے گھر کی عورتوں سے بات کرتی تو وہ میری شکل دیکھتی رہ جاتی تھیں، میری بہت سی باتیں تو ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی ہوں گی..... بات مردوں تک پہنچی، میری یہ اچھائی ہی میری بد نصیبی بن گئی۔ پہلے دو ٹکے چھ لفظوں میں اور پھر واضح الفاظ میں میرے باپ سے میرا رشتہ مانگ لیا گیا۔ چودھری نے پہل کی۔ ابا نے ٹالا کہ جناب وہ تو ابھی بچی ہے۔ چودھری کی بات سنی تو شاہ صاحب کیسے پیچھے رہتے۔ انہوں نے ابا کو بلا کے میرے لیے پیغام دے دیا۔ دونوں کا موقف ایک ہی تھا کہ اتنی عزت آج تک گاؤں کے کسی اور بندے کو نہیں ملی۔ مطلب سمجھ رہا ہے نا تو..... وہ مسجد کے پیش امام کو بھی رتے میں اپنا ہم پل نہیں سمجھتے، وہ کیسی اہم اور کم ذات نہ تھی، ان کے برابر کا بھی نہیں اور اس کی بیٹی جو ملی کی یتیم ہوئی تو اس کا سامی مرتبہ کتنا بلند ہو جائے گا۔ ابا بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ سچ میں چودھری کے بیٹے کی شادی اور شاہ صاحب کے ابا کا عرس شریف آ گیا، ابا کو کچھ مہلت مل گئی۔ انکار وہ کس کو کرے۔ دونوں ایک جیسے خطرناک حریف..... دونوں عمر میں مجھ سے دگنے، پہلے سے بعد شرعی عذر پر چوٹی لے آئیں گے۔“

شادو بچہ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ بات اصغر کی سمجھ میں آ چکی تھی مگر بہت سے سوالات اب بھی جواب طلب تھے۔

”چودھری کے گھر میں جو تیرے ساتھ ہوا۔“ شادو، اصغر کے کسی سوال سے پہلے ہی بولنے لگی۔ ”میں نے ابا کو بتایا ابا کو بہت افسوس ہوا۔ کہنے لگے کہ چودھری نے بڑی زیادتی کی۔ وہ اچھا بندہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ چودھری سے بات کر رہا تھا بڑی تسلی سے..... بڑے مہذب طریقے

لگا ہے پڑھا لکھا بھی ہے۔“
 اصغر نے لٹی میں سر ہلایا۔ ”میں نے تو اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔“
 ”عرس میں ابا خود بھی تھا۔ اسے تو ایسا سننے کا بڑا شوق ہے لیکن میں نے دیکھا، جب تو گھر رہا تھا تو ابا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے بعد میں پوچھا تو بولا کہ عارفانہ کلام کا اثر دل پر ہوتا ہے اور اس نوجوان کی آواز بھی حلق سے نہیں دل سے نکل رہی تھی۔ میں نے بھی تعریف کی۔ میں تعریف میں کچھ زیادہ ہی بول گئی۔ وہ بھی تو باپ ہے میرا۔ سمجھ گیا کہ گانے سے زیادہ مجھے گانے والا اچھا لگا ہوگا۔ اس نے سرسری اعزاز میں اور بھی چند سوال کیے اور باتوں باتوں میں میرے دل کا حال جان لیا۔ عشا کی نماز کے بعد اس نے مجھے پاس بٹھا کے پوچھا۔ ”پتر شادو۔۔۔ ایک بات پوچھوں۔ سچ بتائے گی؟“
 میں نے کہا۔ ”پہلے بھی جھوٹ بولا ہے آپ سے؟“
 انہوں نے کہا۔ ”بول بھی نہیں کتنی تھی۔ بولے گی تو پکڑی جائے گی۔ تجھے جھوٹ بولنا نہیں آتا، یہ اصغر کیسا لگا تجھے؟“
 میں تو گھر گئی۔ ”کیسا لگا۔ کیا مطلب ابا۔۔۔؟“
 ”اچھا لگا تو بتا دے۔ سو گہرا تو جوان ہے، اللہ نے آواز میں بڑا سوز دیا ہے، مجھدار ہے اور مہذب ہے۔ تو اس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔“
 میری زبان گنگ ہوئی۔ ”مگر ابا۔۔۔ اس کا کیا پتا۔۔۔“
 ”پتا کر لے، جا پوچھ لے اس سے۔ اگر تو اسے پسند کرتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ میری کو تو میرے جیسی بیٹی کو پسند نہ کرے، اگر وہ ہاں کہے تو اسے لے آنا اپنے ساتھ۔ میں تم دونوں کا نکاح پڑھا دوں گا۔ اس سے پہلے کہ دونوں طرف سے حلقہ کرنے والے نمبر سے تیری یونیاں لوجیں، عزت آبرو کے ساتھ یہاں سے نکل جا۔ میں نے اس کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہیں کی، وہ خوش رکھے گا تجھے۔“
 اصغر کی ہنسنے کی طرح بیٹھا تھا۔ ”مگر شادو، میں تو میرانی ہوں۔ میری ذات۔۔۔“
 ”ابا کی ذات بات کو نہیں مانتا۔ مسلمان سب ایک ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ سب اللہ کی مخلوق ہیں اور سب گلہ گو مسلمان ہیں۔ برتری کسی کو ہوگی تو حق پر نہ کہ نسب پر۔ نہ عربی کو کسی پر نہ گورے کو کالے پر۔۔۔“

اصغر نے ایسا باتیں پہلے نہیں کئی تھیں۔ ”مگر دنیا میں ایسا نہیں ہے شادو۔۔۔“
 ”دنیا میں تو بہت کچھ نہیں ہے۔“ شادو نے چمک کے کہا۔ ”مگر جو ہمارے نبی پاک ﷺ نے کہا ہے وہ غلط تو نہیں ہو سکتا۔“
 اس نے سر ہلایا۔ ”اگر وہ ایسا باتیں کرتا ہے، تو یہ چودھری اور شاہ جی اسے برداشت کیسے کرتے ہیں؟“
 شادو نے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر جواز بنالیا۔ ”وہ خود بھی ایسا باتیں سب کے سامنے نہیں لکھا۔ جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اب تو بول، تو کیا کہتا ہے؟ جواب دے میری بات کا۔۔۔“
 وہ شادو کو ہلکا رہا۔ شادو نے اپنے گھٹے سمیٹے اور ٹھوڑی ان پر لگا دی، اندھیرے میں بھی وہ شادو کی آنکھوں میں ستارے سے چمکتے دیکھ سکتا تھا۔ اصغر کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان پاتا تھا، صرف ایک لفظ تھا جو اس کے حلق میں آکے اٹک گیا تھا۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ لفظ بول سکے۔ بول نہیں سکتا تو گردن ہلا کے اقرار کر لے۔ بتا دے کہ اسے اپنی خوش قسمتی پر ابھی تک اعتبار نہیں آیا ہے۔ آخر زندگی میں اس نے کون سی ایسی شے کی تھی جس کا انجام خدا نے شادو کی صورت میں دیا۔ اس کی اوقات ہی کیا ہے۔
 ”تو ڈرتا ہے؟“ اس نے شادو کی ردھی ہوئی آواز سنی۔ ”سمجھ گئی تیرا جواب کیا ہے۔ جا، چلا جا۔“ وہ اٹھنے لگی۔
 اچانک اصغر میں وہ ہمت لوٹ آئی جس کا اعزاز وہ خود اسے بھی نہیں تھا۔ اس نے شادو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میری خاموشی کا غلط مطلب لیا تو نے۔ میں جاؤں گا، چلا جاؤں گا یہاں سے مگر تجھے ساتھ لے کر۔ سوچ رہا تھا میں تیرے باپ کے بارے میں۔“
 شادو نے ایک انگلی سے آنسوؤں کے وہ قطرے جھک دیے جو اس کی آنکھوں سے رخساروں پر اتر آئے تھے۔ ”اس نے مجھ سے کہا تھا۔ میری فکر مت کر شادو، میرے مولانا نے بڑی عزت دی مجھے اپنے بندوں کی نظر میں، اب تمھوڑی سی رہ گئی ہے۔ وہ بے عزت ہو کے بھی گزار لوں گا۔ وہ تو جانتا ہے کہ میں نے کتنا دکھ کوئی کام نہیں کیا۔“
 ”ہم اسے بھی ساتھ لے جائیں گے۔“
 ”وہ نہیں جائے گا، مجھے معلوم ہے۔“ شادو پھر پرسکون ہو گئی۔
 ”کیا بتائے گا وہ لوگوں کو؟“

”وہی جو بچ ہے، اسے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔ میں نے شادو کو رخصت کر دیا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ گئی۔ یہ کوئی گناہ کی بات نہیں، سنت رسول ﷺ ہے۔“
 ”یہ چودھری اور شاہ جی۔۔۔ یہ اسے معاف کر دیں گے؟ اس بے عزتی کو کیسے برداشت کریں گے کہ تیرے باپ نے ان پر ایک غیر کم ذات اور لاوارث میرانی کو ترجیح دی؟“
 ”اس کے پاس جواب کے لیے بہت دلائل ہیں۔ ایک باپ ہی اپنی بیٹی کا برا بھلا سوچ اور سمجھتا ہے۔ جس کے ساتھ چاہے اسے رخصت کرے۔ اور اس کے پاس بڑے مضبوط گواہ ہیں، وہی جو نکاح کے گواہ ہوں گے۔ جو کہیں گے کہ اس نکاح میں جبر کو دخل نہیں اور نہ لالچ کو۔ ایک اس کے بچپن کا ساتھی ہے، ریٹائرڈ اسکول ماسٹر۔ دوسرا اس کا یار جو شہر میں پوسٹ میں تھا۔ فیکری نماز میں جو چند لوگ باقاعدگی سے آتے ہیں، ان میں سے دو بھی شامل ہیں لیکن اصل میں تو میرے باپ کو تحفظ بھی ایسی کے گھر سے ملے گا۔ چودھری اور شاہ جی کے گھر سے۔۔۔ ان کی پہلی خاندانی بیویاں بڑی مضبوط ہیں، وہ نہیں چاہیں گے کہ جس خواہش کا اظہار انہوں نے ابا سے کیا تھا، اس کا کلم ان کی بیویوں کو ہو اور جو ان اولاد کی نظر میں ان کی کرکری ہو۔“
 اصغر نے آہستہ سے شادو کا نرم و نازک سر ہاتھ اپنے بڑے بڑے ہاتھوں کے درمیان رکھ لیا۔ ”کیا واقعی اب بھی تو میرا جواب سنا چاہتی ہے؟ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ میرے ہاتھ میں تیرا ہاتھ ہے، اسے چھوڑ سکتا ہوں میں، میں جاہل سہی پاگل نہیں ہوں لیکن ایک سوال مجھے بھی کرنا ہے تجھ سے۔“
 شادو نے نظر اٹھائی۔ ”پوچھ لے۔ کچھ دیر میں جبر ہو جائے گی۔“
 ”زندگی میں کبھی تجھے اتنی غلبت میں کیے گئے فیصلے پر افسوس تو نہیں ہوگا؟ ابھی کیا ہے میرے پاس۔۔۔ لیکن میں وعدہ کر سکتا ہوں کہ دنیا کی ہر خوشی تیرے قدموں میں ڈال دوں گا، آج میں مان گیا کہ جوڑے آسمانوں پر پہنچے ہیں، دیکھ نقد پر مجھے کہاں لے آئی۔ بس یہ نہ کہ بعد میں۔“
 ”بند میں کیا ہوگا۔ اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔“
 اصغر۔۔۔ چل اب جا اور اس دروازے پر دستک دے۔
 شادو نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ”دائیں ہاتھ والا میرا کمر ہے، ابا سے بات کر لے۔“
 اصغر گھبراہٹ۔ ”بات کر لوں، کیا۔ کیا کہوں ان

سے۔۔۔؟“
 شادو مگرانی تو اس کے متوجہ جیسے دانت پھر چمکے۔ ”پاگل، میرا ہاتھ نہیں مانتے گا ابا سے۔“ وہ ایک دم پٹلی اور دیوار کے ساتھ چلتی اپنے کمرے میں غائب ہوئی۔ وہ بحر زدہ سا کھڑا رہا، کسی نے آج تک اس ادا سے پاگل کہہ کے اسے سچ پاگل نہیں کیا تھا۔
 وہ تذبذب، خوف، اشتیاق، امید اور ناامیدی کے جذبات سے مطلوب دوسرے دروازے پر کھڑا رہا۔ یہ چند سیکنڈ اس پر بہت بھاری تھے، یہ ناقابل تصور فیصلہ کا لمحہ تھا جب اسے معلوم ہو جاتا کہ خواب تھا جو بھی ہم نے دیکھا جو بھی سنا افسانہ تھا۔ یا حقیقت ایسی ہی تھی کہ نقد پر نے اس کے نام لاٹری میں شادو جی شریک حیات نکال دی تھی۔ کسی سبب اور وجہ کے بغیر خدا اس پر اتنا مہربان ہو گیا تھا۔ اسے تو سوچتے پر بھی اپنی کوئی شے یاد نہیں آتی تھی۔
 بالآخر اس کے ہاتھ نے آہستہ سے زنجیر والی کڑی کو ہلایا اور اس کے دل کی دھڑکن جو پہلے تیزی جیسے بند ہوئی۔ پھر دروازہ کھلا اور اس نے اپنے مقابل ایک خجف و زار عمر رسیدہ شخص کو دیکھا جس کے سر، جھریوں سے بھرے چہرے کی ہڈیوں اور مٹکی بنیان سے دکھائی دینے والے مرقع سینے کے تمام ہال بالکل سفید ہو چکے تھے۔
 اس نے اپنی وحشت لانی نظروں سے اصغر کو دیکھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ ”آجا اصغر۔۔۔ بیٹھ ادھر۔“
 سلام کر کے اصغر اس کے ساتھ ہی چار پائی کی پٹی پر ٹک گیا۔ کچھ دیر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ عرس کا عاٹیسے کرے، پھر اس نے پڑیوں کی جھنکار سنی اور درمیانی دروازے کی طرف دیکھا جو ایسے تو بند تھا مگر اس کی نظر نے شادو کو کسی جھری سے جھانکتے دیکھا۔ چونکہ وہ دروازہ غائب ہو گیا اور شادو اپنی تمام عشا کی اور سن کے ساتھ اس کے سامنے آ گئی۔ گونگے بنے کیوں بیٹھے ہو، بولو۔ بولو۔ اصغر۔۔۔ اس نے شادو کی آواز کو اپنے کانوں میں رس گھولنے لگا۔
 لیکن اس کی ہمت لوٹ آئی، اس نے مولوی صاحب کے کھنٹوں پر ہاتھ رکھا۔ ”مولوی صاحب۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔“
 اصغر میرانی۔۔۔ آپ سے شادو کا رشتہ مانگتے آیا ہوں، کیونکہ اس دنیا میں میرا اور کوئی نہ تھا جو یہ کام کرتا، میں ہرگز اس کے لائق نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں، کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔ مگر میں اسے خوش اور سادھی رکھ سکتا ہوں۔“
 مولوی صاحب نے اپنا رزتا ہوا ہاتھ اٹھایا اور اس

جن

ایک سردار صاحب نے ایک گاڑی کو روکنے کے لیے اشارہ کیا۔ گاڑی رک گئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد دیکھتے ہیں کہ گاڑی میں ڈرائیور موجود نہیں اور گاڑی خود بخود چل رہی ہے۔ سردار بہت پریشان ہوئے اور ڈر گئے کہ گاڑی کو جن چلا رہا ہے۔

نزدیکی بیٹروں پر گاڑی کی اور تھوڑی دیر بعد ایک پسینے سے شرابور شخص گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے لگا تو سردار بولا۔ ”یہاں نہ بیٹھو یہاں جن بیٹھا گاڑی چلا رہا ہے۔“

وہ صاحب غصے سے بولے۔ ”اے اخروٹ کے بچے میں 2 کلو میٹر سے دھکا لگا رہا ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ گاڑی جن چلا رہا ہے۔“

لا علاج

ڈاکٹر مرلیش کو چیک کرنے کے بعد اس کی بیوی سے۔

”آپ کے شوہر شیک ہو سکے ہیں۔ اگر آپ ان کا خیال رکھیں۔ پریشان نہ کریں، لڑائی نہ کریں اور ان کی خدمت کریں۔“

شوہر: ”ڈاکٹر نے کیا کہا؟“

بیوی: ”تم لا علاج ہو۔“

پریشانی

ٹرینک سارجنٹ نے ایک موٹر سائیکل پر سوار 4 طالب علموں کو دیکھ کر غصے سے کہا۔ ”اے ڈیل سواری پر پابندی ہے اور تم چار، چار سواری ہو۔“ ڈرائیونگ کرنے والا لڑکا پریشانی سے پیچھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اے پانچواں کہاں کر گیا۔؟“

مرسلہ: سدھارتھ، جو دھور، کیر والا

رہل گیا۔ احاطے میں اس جیسے تیس چالیس خاندان آباد تھے، کم خرچ ہونے کے ساتھ یہ جگہ ان کی موجودہ ضروریات کے لیے کافی تھی اور یہاں وہ محفوظ بھی تھے۔

جان کی حفاظت پہلا مسئلہ تھا۔ اصرہری جانتا تھا کہ چودھری یا شاہ صاحب کے جاسوس اسے لاہور میں کہاں تلاش کریں گے۔ وہ محاربات پر چاہیں گے اور میلوں کا رخ کریں گے۔ قوالوں سے اور میلوں میں گانے والوں سے پوچھیں گے۔ اصرہری انہیں کہاں لگا۔۔۔۔۔ لیکن کب تک۔۔۔۔۔ بالآخر انہیں یقین آجائے گا کہ اصرہری ان کی توقع سے کہیں زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ چٹا لے کر جتنی گانے آیا اصرہری گاؤں کی سب سے قیمتی لڑکی نکال لے گیا۔

شادو نے گھر سنبھالنے ہی اصرہری زندگی کا سارا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پہلے تو اس نے اصرہری کو گھر میں قید کر دیا۔ وہ گھر کا سودا سلف یا ضرورت کی کوئی چیز لینے دھرمپورے کے بازار سے آگے نہیں جاسکتا تھا اور یہاں بھی وہ برقعہ اوڑھ کے اس کے ساتھ جاتی تھی۔ ”ابھی ہمارے پاس اتنا ہے کہ تجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ ابھی۔۔۔۔۔ لیکن شادو۔۔۔۔۔ میں کام نہیں کروں گا تو تزارا کیسے ہوگا؟“

”کام؟۔۔۔۔۔ کون سا کام۔۔۔۔۔ اب میں تجھے وہ مراشیوں والا کام تو کرنے نہیں دوں گی، ادھر ادھر پھر کے گانے گا۔“

”مگر مجھے تو وہی ایک کام آتا ہے۔“

”کام بہت ہیں۔۔۔۔۔ یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اب میں بھی تیرے ساتھ ہوں، کیا مجھے بھی ساتھ لیے پھرے گا اور ابھی نہ سہی، ایک نہ ایک دن انہیں معلوم ہو جائے گا جو میری تیری جان کے دشمن ہیں۔ میرا کوئی خیال نہیں تجھے۔“

”اچھا بتائیں کہ کروں؟“

”بتاؤں گی جب وقت آئے گا۔ پہلی بات یہ کہ خیردار جو آئندہ خود کو اصرہری میرانی کہا۔۔۔۔۔ اب تو سید اصرہری حسین ہے۔“

وہ بھونچکا رہ گیا۔ ”سید اصرہری حسین۔۔۔۔۔“

وہ ڈانٹ کے بولی۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ اور تیرے باپ کا نام بھی سید دلاور حسین تھا۔۔۔۔۔ کوئی بھی پوچھے یہی بتانا ہے۔“

”مگر یہ تو بڑے۔۔۔۔۔ گناہ کی بات ہوگی۔“

”چل رہے دے گناہ ثواب۔۔۔۔۔ تو بھولا نہیں ہے

دو ف ہے، جب پاکستان بنا تھا۔۔۔۔۔ تو تیرے جیسے بہت تھے جو ادھر کی زمین شہر ہوتے تھے، نان، موہنی، پٹلی

واپس نہ لے جائے، آگے لے جائے۔ یہاں سے سترہ کوس پر جو سڑک ملے گی۔۔۔۔۔ وہ ملتان نہیں مخالف سمت بھی لاہور لے جائے گی۔“

اصرہری فرار کی اس حکمت عملی کو سمجھ گیا تھا۔ شاہ جی کے کارندے اسے بس اسٹاپ سے واپس لے گئے تھے۔ آج چودھری کے کارندے بھی انہیں وہیں سے اٹھا لیتے۔ اب وہ ملتان جانے والی سڑک کا رخ کریں گے۔ دور تک ان کی تلاش میں جائیں گے۔ مولوی صاحب نے جس گاؤں کا ذکر کیا تھا وہ مولاداد، ٹانگے والے کی سرسرا تھی اور وہ اکثر وہاں چلا جاتا تھا۔ وہ گزشتہ رات ہی آیا تھا۔ اصرہری نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا مگر وہ جانتا تھا کہ مولوی صاحب نے اسے کیا ذمہ داری سونپی ہے اور ان کے ایک شاگرد کی حیثیت سے وہ اپنا فرض نبھاتا تھا۔

جب دو گھنٹے بعد وہ گاؤں کے باہر سے گزرنے والی سڑک کے کنارے اترے تو مسلسل آنسو بہاتی شادو نے کہا۔

”ابا کا خیال رکھنا مولاداد۔۔۔۔۔ اور اپنا بھی۔۔۔۔۔“

”کسی بڑے بھائی کی طرح مولاداد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔“ فکر ہی نہ کر کر بیٹھے، جاتی رہا رکھا۔ اور تانگے کو موڑ کے واپس لے گیا۔ اس وقت تک سورج بہت اوپر آ گیا تھا۔ شادو منہ سر چادر میں لپیٹ کر کھڑی تھی اور اصرہری یہاں کوئی نہیں پہچانتا تھا، وہ چار دوسرے مسافروں کے ساتھ بس میں سوار ہوا اور تین گھنٹے میں لاہور پہنچا تو ایک بالکل بدلا ہوا آدمی تھا۔ قدرت نے اچانک اسے ذمہ دار بنا دیا تھا۔ اب وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ بوی تھی اور اس کے سامنے وہ مستقبل تھا جس میں ان کے بچے تھے اور ان کی پرورش کے مسائل تھے۔ انہیں بڑا کرنے، تعلیم دلوانے اور ان کی شادی کرنے تک۔

لیکن فوری مسئلہ اس کے لیے ایک گھر کا حصول تھا، خواہ وہ ایک کمرائی ہو جہاں وہ اپنی بوی کو رکھ سکے۔ وہ وقت نہیں رہا تھا جب وہ کسی بھی خاندان کے چوتھے پر، کسی بھی مسجد میں، کسی بھی پارک کی بچ پر یا ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں قلیوں کے فرش پر سو جاتا تھا۔

اسے بڑی حیرانی ہوئی جب لاہور پہنچ جانے کے بعد یہ سارے مسائل جن کو وہ بہت بڑا سمجھ رہا تھا خود بخود حل ہو گئے۔ اس کے پاس دو ہزار نقد تھے۔ پہلے سے یہ انداز کی ہوئی پونجی کو ملا کہ یہ دو ہزار ہو جاتے تھے۔ ہزار کی وہ انگوٹھی جو اسے انعام میں ملی تھی۔ اسے دھرمپورے میں ایک احاطے میں ایک کمرے کا گھر صرف سو روپے ماہوار کرایے

کے سر پر رکھ دیا۔ ”میں جانتا ہوں، مجھے اس کا اشارہ مل گیا تھا جو سب کا مشکل کشا ہے۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ تو بیچھ میں وضو کر لوں، اذان کا وقت ہو گیا ہے۔“

اصرہری نے سر اٹھایا۔ ”مولوی صاحب، اجازت ہو تو۔۔۔۔۔ میں اذان دے دوں؟“

مولوی صاحب نے سر ہلایا۔ ”جادے۔۔۔۔۔ پوچھتا کیوں ہے۔“

اصرہری وضو کیا اور صحن کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ جس گلے سے پہلے چرچلی گانے نکلتے تھے۔ اللہ نے توفیق دی تو اسی سے عارفانہ کلام کی صدا نکلی تھی جو دلوں میں اتر گئی تھی۔ بابا بھٹے شاہ کی کافیلوں سے جتنی تک اس کی آواز نے روح کے تاروں کو جھنجھوڑا تھا۔۔۔۔۔ آج اس سے آواز اذان نکلی تو جیسے ہفت افلاک تک اس کی بازگشت پہنچی۔

جب اذان ختم ہوئی تو اصرہری آنکھوں میں آنسو تھے، پیش امام صاحب دروازے میں ساکت کھڑے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے دوسرے دروازے میں شادو بیت بنی کھڑی تھی، پھر نمازی آنے شروع ہوئے۔ انہوں نے پوچھا،

”یہ کس کی آواز اذان تھی؟ اور مولوی صاحب نے بڑے

غیر سے اسے ملوایا۔“ ”یہ اصرہری ہے، میرا ہونے والا داد۔۔۔۔۔“

نماز کے فوراً بعد گواہوں کی موجودگی میں پیش امام صاحب نے شادو کو اصرہری کے نکاح میں دے دیا۔ نمازی چلے گئے تو انہوں نے شادو کا ہاتھ اصرہری کے ہاتھ میں تھمایا۔

”اب تم جاؤ، تم تو اللہ کی امان میں دیا۔“

اصرہری نے کہا۔ ”لیکن آپ۔۔۔۔۔؟“

”میری فکر مت کرو، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ خطرہ تمہیں

ہے اور مت بھولو کہ تم اکیلے نہیں ہو۔ تمہیں شادو کو بھی

پہچانا ہے، اس خبر کو پھیلنے میں دیر نہیں لگے گی، غضب ناک

بھینڑیوں کا غول تمہارے پیچھے آئے گا۔۔۔۔۔ اس لیے جتنی

جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔“

شادو اس سے چٹ کر رونے لگی۔ ”تم بھی چلو

ہمارے ساتھ۔“

انہوں نے پیار سے اس کے سر کو تھپکا۔ ”پاگل۔۔۔۔۔

میں کیسے ساتھ جاسکتا ہوں، مجھ میں اب اتنا دم ہی کہاں ہے

کہ تمہارا ساتھ دے سکوں۔ تمہارے سامنے پوری زندگی

ہے، میرے پیچھے اب کچھ نہیں ہے جس کی مجھے فکر ہو، تم

جاؤ۔۔۔۔۔ اجالا پھیلنے سے پہلے نکل جاؤ۔۔۔۔۔ اور دیکھو۔۔۔۔۔ ہوا کی

سمت میں مت جانا کہ کتنے بوسو گئے تم تک پہنچ جائیں، شادو

جاتی ہے مولاداد تانگے والے کا گھر۔۔۔۔۔ اس سے کہنا تمہیں

تھے۔ جو سب نے انہوں نے صدیوں کی ذلت کا بوجھ اصرہی پھینک دیا۔ سرحد کے پار۔ انہوں نے موٹے سے فائدہ اٹھایا اور یہاں آکے معزز ہو گئے۔ انہوں نے اپنی آنے والی قسوں کو بھی عزت دار کر دیا، کون جانتا تھا یہاں انہیں۔ نام اور پیسے ہی نہیں، ولدیت تک بدل لی انہوں نے۔ کناہ گار تو وہ تھے جو اللہ کے بندوں کو اس طرح بے عزتی کا طوق پہنا کہ خود عزت دار بن جاتے تھے۔ جیسے ہندو ذات بات کو مانتے ہیں، براہمنی مقدس ہیں اور اچھوت ناپاک، جنم نسبت پر۔ اسلام تو سب کو مساوی درجہ دیتا ہے، بات سمجھ میں آ رہی ہے تیری؟“

اس نے کھڑے جیسا سر ہلایا۔ ”مگر شادو، میں کروں گا کیا۔“

”وقت آئے گا تو میں بتاؤں گی۔ سب کچھ کر سکتا ہے تو جو تیرے جیسا وہ تھا پاؤں، وہ انھوں اور ایک سروالاکر رہا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”سمر، میں کچھ ہونا چاہیے مگر مجھ سے نہیں۔“

اصغر نے محسوس کیا کہ نام کی بات نہیں، اس کی زندگی میں سب کچھ بدل گیا ہے، کچھ بھی نہیں رہا جو اس کا اپنا تھا۔ یہ جادو کرنے والی شادو تھی۔ اصغر کو وہ ایک خوبصورت عورت سے زیادہ کوئی جادوگر کی لکھی تھی جو سب کچھ کرنے پر قادر تھی، وہ بھی جو اسے نامکمل لگتا تھا اور وہ بھی جو اس کے وہم و گمان میں کبھی نہ آیا تھا۔ وہ خوش بھی تھا لیکن ڈرتا بھی تھا اور شادو اس کے اندر کا ڈر نکال کے اس میں اعتماد بھرنے پر کمر بستہ نظر آتی تھی۔ اس کی باتیں اصغر کو چکرا دیتی تھیں۔

وہ پوچھتا تھا۔ ”کہاں سے لیکھ لی ہیں تو نے یہ باتیں، کس نے بتائی ہیں، کتابوں میں تو یہ سب نہیں ہوتا۔“ وہ ہنسی۔ ”سب سے بڑی کتاب ہے زندگی اور اسے آدمی پڑھتا ہے عقل سے۔ تجربے سے۔ دیکھ کر اور لیکھ کر۔“ کنوئیں کا مینڈک کنوئیں میں پیدا ہوتا ہے اور کنوئیں میں ہی مر جاتا ہے، وہ دیکھ اوپر آسمان کی طرف۔ اتنی باندی پراٹھنے والے پرندے کی نگاہ کہاں تک دیکھ رہی ہے اور کیا دیکھ رہی ہے؟“

پندرہ دن بعد ایک دن اصغر نے دیکھا تو وہ گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی، اصغر کا دل بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا شادو۔۔۔ ابا یاد آ رہا ہے؟“

اس نے آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں اٹھائیں۔

”انہوں نے ابا کو مار دیا اصغر۔۔۔ اسی دن مار دیا۔“

اصغر کے دل کو ایک دچکا لگا۔ ”مارو یا۔۔۔ کس نے؟“

”قاتلوں نے اور کس نے۔۔۔ اس نے مجھے تیرے حوالے کر دیا تھا۔ بڑی بے عزتی کی کھی عزت داروں کی۔۔۔ اسے سزا تو ملنی ہی تھی، کسی کو ترس تک نہ آیا اس بوڑھے آدمی کا سر کھڑی سے دو ٹکڑے کرتے ہوئے۔۔۔ وہ تو ویسے ہی مرنے والا تھا، وہ مجھے ان ہوس پرست بھیڑیوں کے آگے ڈال دیتا تو کچھ نہ ہوتا۔“ وہ پھر بھوٹ بھوٹ کے رو نہ لگی۔

اصغر نے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔ مت رو شادو۔۔۔ دعا مانگ ان کی مغفرت کے لیے۔۔۔ مگر تجھے یہ بات بتائی کس نے؟“

”مولاداد نے۔۔۔“

”وہ آیا تھا یہاں؟“ اصغر چو کنا ہو گیا۔

”وہ یہاں کیسے آ سکتا تھا۔ اس کا ایک ماما یہاں رہتا ہے۔۔۔ اس نے مجھے ایک پرچے پر اس کا نام لکھ کر دیا تھا۔ اس کی پرچوں کی دکان ہے۔“

”تو کبھی؟“

”نہیں۔۔۔ اس کا فون نمبر یاد کر لیا تھا میں نے۔۔۔ آج پیسے دے کر اسے فون کیا اور پوچھا تو اس نے کہا کہ مولاداد سے اسے تو معلوم ہو گیا مگر وہ مجھے کیسے بتاتا۔۔۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں۔۔۔ میں نے بھوٹ بھوٹ دیا۔۔۔ کہا کہ کس دن آؤں گی۔“

”سچ مجھے بڑا دکھ ہوا، تیرا تو باپ تھا۔۔۔“

”نہیں اصغر۔۔۔ وہ آہستہ سے بولی۔ ”میرا بھی باپ نہیں تھا وہ۔۔۔ اس نے مجھے پالا ضرور تھا۔“

اصغر اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ ”پھر۔۔۔ تمہارا باپ کون تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔۔۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی جب مجھے اس گھر میں لایا گیا تھا۔“

”اور مولوی صاحب نے بھی نہیں بتایا کبھی؟“

”وہ ضرور بتاتے۔۔۔ اگر انہیں معلوم ہوتا، وہ چاہتے تو یہ بات بھی مجھے نہ بتاتے کہ میں کسی اور کی بیٹی ہوں۔ انہیں یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ دوسرے لوگ بتا دیں گے، یا میرا اصل باپ آ جائے گا۔ ایسے گول گول دیدے ست گھماؤ۔۔۔ مولوی صاحب کی بیوی نے کچھ نہیں کیا تھا، میری اصل ماں کو بھی کوئی نہیں جانتا۔“

”یہ کیا بات کو گھبرا رہی ہو۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”یہ کونسا کچھ گھبرا رہی ہو۔ جیسے ابا نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو چھپا سکتا تھا۔“

میں بھی تم سے چھپا لیتی۔۔۔ یہ ابھی زیادہ دن کی بات نہیں تھی کہ اس نے مجھ کو ایسا کہا۔ اس نے مجھے بلایا اور کہا بیٹا شاہدہ پروین۔ ایک کڑوی کوئی ہے جو میں مجبوراً تجھے دے رہا ہوں۔ جانتا ہوں یہ زہر ہے لیکن وقت آنے پر تیری جان بچانے کے لیے یہی سچ کام آئے گا۔ دیکھ یہ بدیت چودھری اور ہوس کا مارا شاہدہ جی۔۔۔ یہ اس لیے تیرا تھا مجھے سے مانگ رہے ہیں کہ تجھے وہ میری بیٹی سمجھتے ہیں۔ اگر تجھے بچانے کی اور کوئی صورت نہ رہی تو میں ان کو یہ سچ بتا دوں گا پھر دیکھوں گا وہ کیسے تجھے بھول کر دیتے ہیں۔ ابا نے مجھے بتایا کہ جب اس کی آخری بیٹی کی پیدائش کا وقت آیا تو نہ جانے کیا خرابی پیدا ہوئی، ہلائی مردہ پیدا ہوئی۔ وقت سے پہلے نہ ان کی بیوی کو اندازہ ہو سکا اور نہ اس دانی کو جو بھی کھار آ جاتی تھی اور اس رات بھی وہی آتی لیکن ان کی بیوی کو اچانک درد اٹھا۔۔۔ باہر بارش ہو رہی تھی لیکن وہ دانی کو بلانے گئے مگر وہ کسی دوسرے گھر میں تھی۔ چودھری کے گھر میں اس کی دوسری بیوی کے ساتھ۔۔۔ اور فوراً انہیں آسکتی تھی لڑکی پیدا ہوئی تو ماں کو اندازہ ہو گیا کہ اس میں زندگی کے کوئی آثار نہیں۔ اس وقت تک صبح ہو چکی تھی اور بارش بھی ختم ہو گئی تھی۔ ابا نے اسے ایک کپڑے میں لپیٹا اور دفن کرنے کے لیے قریب ہی قبرستان میں لے گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ زمین نرم ہے، خود ہی گڑھا کھود کر مردہ بچی کو گاڑ دے گا۔ وہاں میں پڑی تھی۔ میرے رونے کی آواز نے اسے متوجہ کیا اور وہ اس مردہ کو دفن بھول کے مجھے بچانے کی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے ظلم پڑھتے ہوئے مجھے اپنی پکڑی کھول کے اچھی طرح لپیٹا اور گھر لے آیا۔ مجھے اپنی بیوی کے حوالے کر کے وہ پھر گیا اور مردہ بچی دفنادی۔ جب وہ لوٹ کے گھر آیا تو یہ بات اس کی بیوی نے کہی۔ اگر ہم کسی کو بھی نہ بتائیں تو سب اسے ہماری بیٹی سمجھیں گے۔ میرا باپ بھونکا رہ گیا۔ اس نے کہا۔

”تمہیں معلوم ہے، تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم کسی اور کے کناہ کی پرورش کی ذمہ داری لے رہی ہو۔ بیوی نے کہا۔ کناہ تو اب کا معاملہ اللہ جانے۔ میں تو اسے بچا کے باعزت زندگی گزارنے کا موعظ دے رہی ہوں۔ ابا نے کہا کہ معلوم نہیں یہ کس کا کناہ تھا جو اسے مرنے کے لیے قبرستان میں پھینک گیا۔ اس کی بیوی نے کہا کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ موت اور زندگی کسی بندے کے ہاتھ میں نہیں۔ جسے ہم زندہ دیکھتا چاہتے تھے اسے ایک سانس کی زندگی نہ ملی۔ اور جس کو وہ سبک دل ماں باپ یا پاپ مارنا چاہتا تھا اسے بچانے کے لیے خدا نے تمہیں بھیج دیا۔ اس میں بچی کا کیا قصور ہے اگر کناہ گار ماں

باب تھے۔۔۔ بچے تو محسوس ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ابا قائل ہو گیا اور اپنی بیوی کی قدر و منزلت اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہو گئی۔ انہوں نے مجھے اپنی بیٹی کی طرح پالا اور ہو سکتا ہے مجبوری نہ ہوتی تو مجھ پر بھی اس راز کا انکشاف بھی نہ کرتے۔ جس کے ماں باپ کا پتا نہ ہوا اسے دنیا کیا محنت ہے۔ حرامی۔ یہ بات مجبوری میں شاہدہ جی کو اور چودھری صاحب کو بتانا پڑتی تو وہ مجھ سے ایسے دور بھاگتے جیسے میں گندگی کی پوٹ ہوں، اپنی عالی کسی پر انہیں براغور ہے۔ اپنے عزت دار خون میں وہ گندے خون کی آمیزش کرتے۔ کیا معلوم میں کسی چھاری کی اولاد تھی یا بھگتی کی کیا بات ہے، تم خاموش کیوں ہو؟“

اصغر چونکا۔ ”میں سوچ رہا ہوں، یہ بات تم نے مجھے کیوں بتائی؟“

”اس لیے کہ مجھے تم پر اعتماد تھا۔ کہ تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

اصغر نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ”تم میرے لیے شادو ہو اور بس۔۔۔ مجھے اس سے کیا کہ تمہاری ماں کون تھی اور باپ کون تھا۔۔۔ تم سے اچھی اور کوئی شادو کیسے ہو سکتی ہے خواہ وہ کس کی لکھی ہوئی ہو۔۔۔“

شادو نے شرارت سے کہا۔ ”اور اگر کسی دن آگے میرے اصل ماں باپ۔۔۔ پھر؟“

”پھر کیا۔۔۔ میں انہیں ساس سرمان لوں گا۔“

شادو نے کہا۔ ”میرے اور تمہارے سوا اب یہ کوئی نہیں جانتا کہ شادو کون ہے اور کس کی بیٹی ہے۔ میرے اصل ماں باپ نے تو فرض کر لیا ہو گا کہ جس کو وہ اپنے کناہ کا شہر جانتے ہوئے بارش میں باہر پھینک آئے تھے، ایک قبرستان میں۔ وہ لوٹ کے زندہ انسانوں کی دنیا میں پہنچ گئی تھی۔“

اصغر کی نظر میں اس دن کے بعد سے اپنی بیوی کی عزت اور بھی زیادہ ہوئی۔ یہ بات بھی پرانی ہو گئی۔ اصغر مسلسل بیکاری سے تنگ آ چکا تھا اور اسے مستقبل کی فکر بھی ہو رہی تھی۔ ان کا سرمایہ اب نصف رہ گیا تھا۔ باقی انہوں نے گھر داری کی ضروریات اور اپنے لیے کپڑے وغیرہ خریدنے پر خرچ کر دیا تھا۔ شاہدہ اسے سخت مزدوری کے لیے بھی گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ وہ کناہ تھا کہ میں چھوٹوں کی ریزی لگا سکتا ہوں۔ باغ جناح میں پانچ سلاک ہوں، اسٹیشن پر فلی بن سکتا ہوں مگر شادو کو ڈرتا تھا کہ وہ باہر نکلا تو پکڑا جائے گا۔ اپنی شناخت چھپانے کے لیے اس نے ڈاڑھی بھی

رکھ لی تھی جو تین مہینے میں ایک مہلت سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ ایک دن وہ نہ جانے کہاں سے آئی تو برقعہ اتار کے بستر پر لیٹ گئی۔ ”میں اسپتال گئی تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ تم ماں بننے والی ہو۔“ اس نے یوں کہا جیسے کسی گناہ کا اعتراف کر رہی ہو۔

اصغر نے خوشی سے چنچ ماری۔ ”جج..... یعنی میں باپ.....“

”میں اصغر تم نہیں..... باپ اس کا وہ ہے۔“ وہ مجرم لہجے میں منہ چپکا کے بولی۔

آواز اصغر کے حلق میں پھنس گئی۔ ”وہ کون.....؟“ وہ قہقہہ مار کے اٹھ بیٹھی۔ ”صدر پاکستان۔ ذرا اپنی شکل دیکھو..... پاگل..... رونے والی ہو رہی ہے۔“ شادو کا ہنسنے پر تھک رہا تھا۔

اصغر سخت خفیف ہوا۔ ”پاگل تو میں ہوں..... مگر کیا تم نے.....؟“

وہ اٹھ بیٹھی۔ ”ستونہم اپنے بچے کے سامنے اپنے ماضی کا کوئی حوالہ نہیں دیں گے۔ اب تم کام کرو گے مگر اپنے بچے کو بڑا آدمی بنانے کے لیے۔ ہم جا رہے ہیں یہاں سے۔“

”کہاں جا رہے ہیں..... اور کیوں.....؟“

”سب پتلاں جانے لگے ہیں۔ آہستہ آہستہ۔ گھر بھی دیکھ آئی ہوں، اس سے بہت اچھا ہے۔ کھلی جگہ ہے اور صاف ستھری بھی..... جیسے ہمارا گاؤں تھا۔ کمرے دو ہیں لیکن کرایہ اتنا ہی ہے۔ پانی سامنے مسجد سے لانا ہوگا، بجلی ابھی نہیں ہے مگر لگ جائے گی..... بات کر لی ہے میں نے مالک مکان سے۔ تم اب سید اصغر حسین شاہ ہو..... یاد رکھنا.....“

اصغر نے سر ہلایا۔ ”کون ہے مالک مکان..... تم کیسے جانتی ہو اسے.....؟“

”میں تو تمہیں بھی نہیں جانتی تھی، آم کھاؤ بیڑ مت گنو..... پاگل، وہ ہے پیش امام ایک مسجد میں..... اور اکیلا ہے، مکان بھی اسی کا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا باپ بھی امامت کرتا تھا، بس وہ ایک دم موم ہو گیا..... ہاتھ رکھ دیا میرے سر پر کہ پھر تم میری بیٹی بھی ہو، اب تم دیکھنا میں کیسے جذباتی آسمان کرنی ہوں اس کا..... میری باتوں سے متاثر تو وہ ہو ہی گیا تھا۔ جج کا ابا بنا لوں گی تو کرایہ خاک لے گا ہم سے..... مکان بالآخر ہمیں مل جائے گا، خدمت کروں گی اس کی..... دونوں وقت پکا کے کھلاؤں گی، بیوی اس کی بھی نہیں ہے..... بچے ہیں۔“

اصغر بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔ ”تم تو بڑے

خفنگار عزائم رکھتی ہو، اسے بھی پھانسی لیا۔“ شادو ہنسی۔ ”تم جیسے سائنس کو پا کر لیا تو وہ بے چارہ کیا ہے، بیمار بڑھا۔ تم وہ کرتے جاؤ جو میں کرتی ہوں..... مجھ دیکھنا۔“

شادو کو ایسا کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اصغر اس کا بندہ بے دام تھا۔ اس کے اشاروں پر چلنے والی ہو چکی تھی۔ وہ اس کے لیے اچھا سوچ رہی تھی تو یہ اس کی محبت کا ثبوت تھا۔

انہوں نے اپنا تمام اسباب ایک ریڑھے پر لاوا اور دیا پار شادو سے بھی آگے ایک نواحی بستی میں پہنچ گئے جہاں گھر بن رہے تھے۔ شروع کے حصے میں آبادی پوری تھی۔ گلیوں میں بجلی پانی سب کچھ تھا، آگے نہیں لگتے ابھی کچھ بھی تھے مگر لگتا تھا کہ ان کی جگہ بھی مکان لے لیں گے۔ زیریں مکان بہت تھے اور یہ نیچے درجے کی آبادی تھی، مکان تین سے پانچ مرلے کے تھے۔ مسجد اسی آبادی کی ضرورت کے لیے وجود میں آئی تھی اور ابھی چھوٹی تھی۔ شادو کو یہاں آگے یوں لگا جیسے وہ لوٹ کے اسی گاؤں میں پہنچ گئی ہے جہاں اس کی ساری زندگی گزری تھی۔

شادو کے دل میں بڑے ارمان تھے۔ عزت دار زندگی کے۔ عیش و آرام کی زندگی کے..... ویسی ہی جیسی چودھری یا شاہ جی گزارتے تھے اور وہ جانتی تھی کہ یہ زندگی کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اپنی زندگی سے اس نے جو سبق حاصل کیے تھے وہ بڑے سچ تھے۔ یہ دہرے معیاروں کی دنیا بھی، جو شریف اور پائیدار، حق حلال کی روزی پر نہیں رکھنے والے اور صراطِ مستقیم پر چلنے والے تھے وہ عزت دار نہیں تھے اور عیش و آرام تو دور کی بات ہے، زندگی کی بنیادی آسائشوں سے بھی محروم تھے۔ عزت دار وہ تھے جو منافقت کی دہری زندگی گزارتے تھے۔ خود حلال و حرام، جائز ناجائز میں تفریق کے قائل نہ تھے مگر دنیا کو اس کی تقنین کرتے تھے۔ وہ غریبوں کا خون چوستے تھے مگر سب کے سامنے مزدور کی اجرت اس کا پیرنا خشک ہونے سے پہلے ادا کرنے کی بات ضرور دہراتے تھے۔

بدنام شہر نے جہاں نیچے سے اوپر تک سب فریب کار تھے اور منشیات کے زہر سے نسوانیت کی آبرو تک دولت کمانے کے تمام ذرائع کسی احساس گناہ یا کسی یوم جزا و سزا کے خوف کی پروا کیے بغیر اختیار کرتے تھے۔ لیکن شادو نے دیکھ لیا تھا کہ ہوس کی تباہی نے کس طرح گاؤں، دیہات کی فضا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ منافقت اور فریب کے عیار جو پاری ہی وہاں بھی کامیاب تھے۔

شادو کے ذہن کا منفی رد عمل حالات کا نتیجہ تھا۔ اس کا وجود ہی گناہ کا ثمر تھا اور کوئی اخلاقی جواز نہیں رکھتا تھا..... اصغر کے ساتھ زندگی کا سرفروختی تو توں کا ملاپ تھا جن سے شادو نے شہت نتائج حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

نئے گھر میں ٹھکل ہوئے ہی شادو نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ پرانے وقتوں کی وہ روایت باقی نہ رہی تھی جب ہر گھر سے مسجد میں کھانا جاتا تھا۔ یہ کھانا مسجد میں ضرورت کے تحت قیام کرنے والے مسافر دن کا پیٹ بھرتا تھا۔ وہ رات کو مسجد میں سوتے اور صبح نہا دھو کر اپنے کام کرنے لگ جاتے تھے۔ اب مسجدوں میں رات کے وقت قفل پڑ جاتے تھے کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں چور نہ صف چھوڑتے تھے اور نہ نکلاک.....

پیش امام صاحب کے لیے ایک دو گھروں سے کھانا بھجوا جاتا تھا لیکن ابھی وہ بھول جاتے تھے تو مولوی صاحب پانی کی برکی خدا کا شکر بجالاتے اور سو جاتے تھے۔ وجہ گھر میں کوئی تقریب ہوتی تھی یا کوئی ایسی ہی مصروفیت..... مگر ان کی حیثیت اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ کھانا مانگنے جائیں حالانکہ اپنے بچپن میں وہ محلے کی مسجد کے تاپینا موزوں کے ساتھ گھر گھر سے آتا مانتے بھی جاتے رہے تھے۔

پہلے ان سے ہی شادو نے مولوی صاحب کو پیغام بھجو دیا کہ اب وہ تینوں وقت کا کھانا اپنی بیٹی کے گھر کھائیں گے۔ ان کا پرکھنے کا کار رانگن گیا۔ شادو کے خلوص سے مجبور ہو کر صبح کا ناشا کرنے کے لیے نماز فجر کے بعد۔ دوپہر کے لیے ظہر کے بعد اور رات کا کھانا کھانے کے لیے عشا کے بعد آتے۔

شادو نے دن میں اصغر کو زبردستی نماز یا جماعت کے لیے مسجد بھیجا تھا اور مولوی صاحب کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے اس کو وارد سے تعارف حاصل کیا جو خود آگے بڑھ کر سب سے ملا تھا۔ اپنا نام سید اصغر حسین شاہ بتا کے کہا تھا کہ وہ محلے میں نیا آیا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد مولوی صاحب دک گئے۔ ان کی عمر ستر سال کے لگ بھگ تھی اور صحت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ شادو کی خدمت گزاری نے انہیں ادا اس کروا دیا تھا۔ کھانے کے بعد شادو نے ان کے سامنے چائے رکھی تو انہوں نے خود ہی چمکا کر وہ کون ہے اور اس کے والد کہاں امامت کرتے تھے؟

شادو کی کہانی تیار تھی۔ اس نے سب کچھ درست بتایا سوائے اصل جانے رہا بش کے..... اس نے یہ بھی نہیں بتایا

کہ وہ پیش امام صاحب کی اصل اولاد نہیں تھی اور نہ یہ کہ اس کی شادی کن حالات میں اصغر سے ہوئی تھی۔ ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی۔ بھائی تھا نہیں، ابا بعد میں گزر گئے۔ اب مسجد پر ان کی ایک مخالف سیاسی شخصیت نے قبضہ کر لیا ہے اور وہاں اپنا پیش امام رکھ لیا ہے جس کا عقیدہ بھی مختلف ہے۔

شادو نے ایک متاثر کرنے والا منظر اپنے شوہر سید اصغر حسین شاہ کو بھی دے ڈالا۔ اس کا تعلق گورداسپور کے ایک اعلیٰ گھرانے سے تھا مگر وہ سب پاکستان آتے ہوئے قتل ہو گئے۔ اصغر نے ایک یتیم خانے میں پرورش پائی مگر ان کے ظلم اور غیر اخلاقی رویے سے بددل ہو کر بھاگ آیا۔

شادو کے ابا نے اسے پناہ دی اور وہ اسی مسجد میں موزوں رہا۔ اس کا گھر بہت اچھا تھا، فارغانہ کلام اور حمد و نعت بہت اچھی پڑھتا تھا۔ مولوی صاحب نے موزوں پا کے اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی تو اصغر نے اپنی ذمہ داری خود اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اپنی بیوی کے ساتھ لاہور آ گیا۔

مولوی صاحب بہت متاثر ہوئے۔ اپنے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ جب وہ بڑے ہوئے تو ان پر باہر جانے کی دھن سوار ہو گئی۔ وہ خود اس وقت ایک پرائمری اسکول میں ذہنیات پڑھاتے تھے اور ان کی گزر بسر بہت تنگی میں ہوتی تھی۔ لڑکوں نے بڑی مشکل سے میسر کیا۔ ان کی ماں بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے خود اپنے بچوں کو بگاڑا، انہیں کہا کہ یہ باپ تو ہمیں قحط کے سبق کے سوا کچھ دینے سے رہا۔ اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے ہمیں خود ہی دنیا میں کچھ کرنا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غلط صحبت میں پڑ گئے۔ پھر چھوٹے موٹے جرائم میں پولیس کے ہاتھ لگے۔ وہ کبھی بھی گھر آتے تو یاں کو نیکشت خاصی رقم دے جاتے تھے۔ میں پوچھتا تو کہتی تھی کہ تم آم کھاؤ، بیڑ مت گنو۔ تمہارے ہی بچوں کی کمائی ہے۔ میں اس کمائی سے ہمیشہ دور رہا۔ بالآخر باہر نکلنے میں کامیاب رہے اور امریکا پہنچ گئے۔ چار سال بعد انہوں نے ہمیں بھی بلا لیا لیکن میں نے انکار کر دیا..... میری بیوی چلی گئی۔ اس بات کو بھی میں سال ہو گئے۔ اب کچھ پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔ نہ انہیں معلوم ہے کہ میں زندہ ہوں یا نہیں۔ بیوی کو میں نے طلاق نہیں دی تھی۔ شرعاً وہ آج بھی میری بیوی ہے۔“

اصغر کو دی افسوس ہوا لیکن شادو نے اپنی حکمت عملی طے کر لی تھی۔ ”بڑھتی ہے ان کی اور کیا.....“ وہ آہ بھر کے بولی۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ کی صورت میں مجھے پھر اپنا باپ مل گیا ہے۔“

ان کے جانے کے بعد اصغر نے پوچھا۔ ”آخر تم اس اکیلے بوڑھے سے جذبات سے کیوں کھیل رہی ہو؟“ وہ بگڑ گئی۔ ”بے وقوفی کی باتیں مت کیا کرو مجھ سے۔۔۔۔۔ کتنی میں اور کیا تھی میری زندگی۔۔۔۔۔ تو یہ بھی نہیں جانتی کہ میں کس کی ناجائز اولاد ہوں، پیدائش کے وقت ہی میرے قاتل خود میرے ماں باپ بن گئے تھے۔ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کرنے کے بعد مجھے چھینک کر وہ پھر پارسا بن گئے۔ وہ عورت کنواری رہی اور یوم ستر سے پہلے کسی کو اس کی تقدیس پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں ہوگی۔“

”شادو میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“
”اور تم خود کو دیکھو۔ تمہاری اگلی پچھلی نسلوں کو ذلت کے سوا کیا ملا۔ اب میں اپنی اولاد کے لیے اس دنیا سے سب کچھ چھین لوں گی، عزت بھی، عیش آرام بھی۔۔۔۔۔ اور تم کو میرا ساتھ دینا ہے، ورنہ میں قتل کروں گی تمہیں۔۔۔۔۔ آئی سمجھ میں میری بات۔۔۔۔۔“

اصغر نے ہمیشہ کی طرح گھڑے جیسا سر ہلایا۔ رات کو شادو اس سے چٹ کر روتی رہی۔۔۔۔۔ اصغر اسے چکارتا رہا۔ ”رو مت شادو۔۔۔۔۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔“

اگلے دن اتفاق ایسا ہوا کہ اذان دینے والا جوان بیمار پڑ گیا۔ اصغر نے اجازت طلب کی اور اذان دی تو اس کی آواز کا گون دور دور تک جس کے کانوں میں پڑا اس کے لبوں سے بے اختیار ”سبحان اللہ“ نکلا۔ کسی مطالعے یا جنت کے بغیر اذان دینے کی سچ وقت ذہن داری اصغر کو سونپ دی گئی۔ خود اس مومن نے برائیاں مانا جس سے یہ اعزاز چھین گیا تھا۔

آہستہ آہستہ شادو کی ہدایات پر اصغر نے مسجد کے انتظامی امور میں ”بہتری“ کے لیے اقدامات پر توجہ دی۔ مسجد کی کچھ بنیادی ضروریات کے طور پر نئی صفیں بچھانے کا کام شروع ہوا جو قائلین کی طرح نہیں، لائسن بدل گئیں۔۔۔۔۔ نیا اسپیکر سسٹم آیا، وضو خانے میں ٹائل اور نئی چوکیاں، ٹونیاں نظر آئیں۔

ظاہر ہے اس سے مسجد کے حسن اور شان و شوکت میں اضافہ ہوا۔ اس کے لیے چندے کی اینٹل پونہ ز اور بیگز کی صورت میں کی گئی اور مسجد کے دروازے پر چندے کا مقفل صندوق بھی رکھ دیا گیا۔ خود خدیش امام صاحب کے لیے ان امور کی نگرانی ممکن نہ تھی۔ اصل انتظام اصغر کے ہاتھ میں آیا۔ اس نے تمام عطیات ایک ہاتھ سے لے کر امام صاحب کو دیے تو دوسرے ہاتھ سے اخراجات وصول کر لیے۔۔۔۔۔

چندے والی تجوری کے تالے کی ایک ہی جالی تھی جس سے مولوی صاحب خود ہی ہر جمعے کو دم نکالتے تھے اور اصغر اسے شکر کر کے اس کا اندراج کرتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ تجوری کی دوسری جالی اصغر کے پاس ہے۔ وہ رات کے وقت اتنی رقم نکال لیتا تھا کہ بیٹے کا اوسط خراب نہ ہو، اس میں نامعلوم خیر حضرات پانچ ہزار بھی ڈال گئے۔ کئی مرتبہ اصغر کو بیر چیک ملے جو اس نے مختلف بینکوں سے کیش کرائے۔

شادو نے اصغر سے پیسا پیسا رکھوایا اور ساری رقم بہت دور شہر کے ایک بینک اکاؤنٹ میں جمع ہوتی چلی گئی۔ اکبر کی پیدائش تک مسجد عملاً اصغر کے انتظام میں آجی گئی اور اس کی ظاہری خوبصورتی سے زیادہ اندرونی آرائش نے لوگوں پر بڑا اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ علاقے میں پانی اور بجلی کے بعد گیس کی لائن پڑی تو آبادی بھی تیزی سے بڑھی۔ مکانات بننے کی رفتار میں اضافہ ہو گیا اور خالی پلاٹ کم ہونے لگے۔ اس موقع پر شادو نے اصغر کو سونپ کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اتفاق سے مسجد کے ایک طرف پلاٹ ابھی خالی تھا اور دوسری طرف صرف چار دیواری بنا کے چھوڑ دی گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ ایک کے مالک کی وفات ہو چکی ہے اور اس کی دو بیویوں کے اور ان کی اولادوں کے درمیان وراثت کی جنگ چل رہی ہے لیکن انہیں اس مضامنی ہمتی کے پانچ مرلہ والے پلاٹ کا علم ہی نہیں تھا۔ وہ لاہور میں کین آبادی ایک کوشی اور والٹن کی طرف ایک پولیٹری فام کی تیسرے پر مقدمے بازی میں مصروف تھے۔ شادو نے بہت سوچ سمجھ کے دوسری بیوی کا انتخاب کیا جو زیادہ لاپٹی تھی اور جس کی ابھی صرف ایک اولاد تھی۔ ایک ایجنٹ کی معرفت فروخت کے معاملات طے پائے اور وہ پلاٹ کو مسجد کے نام پر وقف کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے نصف قیمت کو بھی لا لائے جس کا بہت سمجھا۔

ڈرا سے یہ تھا کہ بجلی بیوی کو پتا نہ چل جائے۔ دوسرے پلاٹ کے مالک پر مسجد یعنی جس کا سربراہ اصغر تھا، اخلاقی دباؤ ڈالا کہ وہ پلاٹ مسجد کے لیے وقف کر دے اور ثواب دارین حاصل کرے۔ دلائل سے شاید وہ قائل نہ ہوتا لیکن اس کی عمر رسیدہ ماں نے کہا کہ مسجد کا نام اس کے مرحوم شوہر فاروقی کے نام پر مسجد فاروق رکھا جائے تو وہ پلاٹ وقف کیا جاسکتا ہے۔ یہ شرط منظور کرنی گئی اور چند مہینوں میں مسجد کے رقبے میں نیا گنا اضافہ ہو گیا۔ اگلے چار سال میں مسجد کی توسیع ہوئی۔ تعمیر کے لیے سرے سینٹ کا عطیہ حاصل کرنے کے لیے بھی ہم چلائی گئی۔

ہر جمعے کے خطبے کے علاوہ دونوں عیدوں پر نمازیوں سے جذباتی اینٹل سے بہت کام کیا۔ بجلی کے سامان سے ٹانگوں اور کھڑکی دروازوں کی فراہمی تک کارخیز اور ثواب دارین کے جذبات کو خوب ابھارا گیا۔ سارے معاملات کی نگرانی کے لیے ایک کمیٹی ضروری مگر اس میں عداوہ لوگ شامل کیے گئے تھے جو صرف نماز جمعہ میں باقاعدگی سے آتے تھے لیکن عشا میں بھی پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ سب مصروف لوگ تھے جو ہر جگہ ہر وقت موجود نہیں رہ سکتے تھے اور انہیں مولانا اصغر حسین کی انتظامی صلاحیت پر بھی اتنا ہی اعتماد تھا جتنا ان کی ایمانداری پر۔۔۔۔۔

اصغر نے زبان خلق سے پہنچنے کے لیے حساب کتاب ضرور رکھا لیکن اس طرح جیسے انکم ٹیکس سے بچنے والے رکھتے ہیں۔ مسجد کے پیش امام بھی بہت خوش تھے کہ شادو جیسی بیٹی اور اصغر جیسے داماد نے انہیں اتنی شاندار مسجد بنا دی جو اب جامع مسجد کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ عید بقرعہ پر اس میں قتل دھرنے کی جگہ بنی رہتی تھی اور نمازیوں کے لیے چھت پر صفوں کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

اللہ کے کھر کے حساب کتاب میں غبن پر اصغر کے ضمیر نے ابتدا میں کچھ احتجاج کیا تھا۔ پھر وہی ہوا جو دولت مندی کے دنیاوی احساس غرور میں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اسے نہ احساس گناہ کہ پشیمانی رہی اور نہ احساس جرم کی پریشانی۔۔۔۔۔ شادو کا پڑھایا ہوا سبق پرانا ہو چکا تھا، یہ سبق پڑھنے والا اب خود استادوں کا استاد تھا۔

تجربے سے اصغر کو اندازہ ہو گیا کہ صرف وہی نہیں، مسجد کو ذاتی جاگیر بنانے والے ہر جگہ مصروف عمل ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنے فرتے کے عقائد کو فروغ دینے کے لیے قلعہ بندی کر رہے تھے تو کچھ دوسروں کے سیاسی مفادات کے لیے مسجد کو استعمال کرتے تھے۔ طریقہ کار ہر جگہ ایک ہی تھا۔ غاصبانہ قبضہ شرمناک جائز تھی۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ قانون کی مدد سے کسی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کو شہید کرا سکے یا اس کے خلاف مہم بھی چلا سکے۔

اب کسی کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عام یقین یہی تھا کہ شادو اس مسجد کے پیش امام کی بیٹی ہے اور مولانا اصغر ان کے داماد ہیں جو انہی کے گھر میں رہتے ہیں۔ شادو نے جذباتی کمزوری کے ایک لمحے میں پیش امام صاحب سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ کھر کو اس کے نام کر جائیں گے اور پھر ایک روز قانونی دستاویزات ان کے سامنے رکھ دیں تو انہوں نے دستخط کرتے ہوئے ذرا بھی برا نہیں منایا۔ ان کی اپنی

اولاد اور بیوی کا فر ملک امریکا کی شہری بن چکی تھی اور اس تعلق کی دنیاوی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ شادو نے تو یہی آل ہونے کے باوجود اپنا تعلق کا حق ادا کر دیا تھا۔

شادو کے لیے اس ہمتی میں شان و شوکت کی دعویٰ گزارنا مشکل تھا۔ وہ بڑے مبر کے ساتھ پیش امام صاحب کی رحلت کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ کارخیز وہ خود بھی کرا سکتی تھی مگر اس نے رسک لینے سے گریز کیا اور انتظار کرتی رہی کہ عزرائیل خود ہی وقت مقررہ پر انہیں لے جائے تو اصغر اس ممانع پیش کار و بار کو سنبھال لے جس میں وہ ہر افائدہ تھا جو شاید دنیا کے کسی اور بزنس میں نہیں تھا یعنی دنیا کا بھی او آخرت کا بھی۔۔۔۔۔ ہم خرابو ہم ثواب۔۔۔۔۔ فکر اسے اکبر کی تھی جو اب اسکول میں داخلے کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ یہاں کوئی ٹاپ کلاس انکس میڈیم اسکول نہیں تھا جس میں اپر کلاس کے اولیوں کو ٹیگٹ بنائے آتے ہیں۔ اب وہ اس ماحول سے ٹکنا چاہتی تھی جس میں اس کے لیے کوئی چارم نہیں رہ گیا تھا۔ اب وہ اس قابل ہو چکی تھی کہ زندگی کی جن خوشیوں سے اب تک محروم رہی تھی وہ حاصل کر سکے اور اپنے بچے کو وہ زندگی دے سکے جس کے خواب تو سب دیکھتے ہیں مگر تعبیر ہر ایک کو نہیں ملتی۔

اس سے پہلے کہ ایسا وقت آتا حالات کے دھارے کا رخ پلٹ گیا۔ وہ عید میلاد النبی کے مبارک موقع پر ہونے والا جلسہ تھا جس میں ہمیشہ کی طرح اصغر نے اپنی آواز کا جادو چکایا۔ وہ جھپکی کو بھول چکا تھا۔ وہ اور قسم کا مجمع ہوتا تھا جو اس پر رخص کرتا تھا، یہاں ایک مختلف اجتماع تھا جس میں روحانیت میں ڈوبے ہوئے لوگ وجد میں آتے تھے۔ اس نے اپنی حمد و نعت سے سماں باندھ دیا اور نصف شب کے بعد تعریف و توصیف سے نوازنے والے رخصت ہو گئے تو ایک شخص جو پہلی صف میں موجود تھا اٹھ کے اصغر کے سامنے آ گیا۔

اصغر نے اسے غور سے دیکھا۔ ”نئی فرمایے۔ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟“

اس نے سر ہلایا اور ہلکے جھپکے بغیر اصغر کو گھورتا رہا۔ ”تم اصغر میری بیوی ہو۔۔۔۔۔؟“

اگر وہ پیچھے سے اس کے کان کے قریب فائر کر دیتا تب بھی اصغر کا دماغ صدے سے یوں سن نہ ہوتا۔ وہ یوں نچمد ہو گیا جیسے اسے ہزاروں دولت کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

اس کا مخاطب معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”اب مجھے تمہاری زبان سے کسی اعتراف جرم کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ تمہاری حالت بتاتی ہے کہ میں نے تمہیں پیچھے میں سے کوئی

اصغر نے بڑی مشکل سے خود کو سنبالا۔ ”کون ہو تم؟“

”رازداد..... واقف حال..... تھاب کشا..... میرے نام سے کیا فرق پڑتا ہے، مولانا اصغر حسین شاہ..... تم ہمارے گاؤں کے پیش امام کی لڑکی کو بھگا لائے تھے۔ چودھری صاحب اور شاہ جی دونوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کے.....“

”دیکھتے یہ بہتان ہے۔ پیش امام صاحب نے شرع کے مطابق میرا نکاح کیا تھا۔“ اصغر کا اعتماد بحال ہونے لگا۔ ”میں حلف بھی اٹھا سکتا ہوں لیکن اس کی کیا ضرورت ہے۔ آپ آئیے میرے گھر میں میری بیوی سے خود تصدیق کر لیجئے۔“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اگر واپس جا کے میں چودھری صاحب کو یا شاہ جی کو بتا دوں کہ میں نے ان کے مجرم کو تلاش کر لیا ہے۔“

”لاحول ولا قوۃ..... آپ مجھے بلک میل کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ کون سا جرم کیا ہے میں نے آخر؟“

اب یہ کون طے کر سکتا ہے کہ اس کے بعد جو کچھ ہوا ایک حادثہ تھا۔ وہ انتہائی جہاں ظالم کی دراز ہونے والی رسی ختم ہو جاتی ہے اور بعض اوقات بھائی کا پھندا بن کے اسی کے گلے میں فٹ ہو جاتی ہے یا بعض اتفاقات کا سلسلہ..... اس شخص نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔ ”پتا لگ جائے گا میرا ہی دے پتر.....“

اصغر اپنے اوپر نازل ہونے والی آفت ناگہانی سے شدید خوف اور دہشت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ ایک وحشی درندہ بن گیا تھا جو حضور ہو جائے تو فرار یا دفاع کی کوشش کو لاحق جان کے حملہ کر کے مرنے مارنے کی حکمت عملی اپناتا ہے۔ پھر اچانک لائن چلی گئی۔ محن میں جہاں سیکڑوں بلب روشن تھے بغلخت ایسا گھپ اندھیرا ملبا ہو گیا جس کا موازنہ قبر کے اندر کی تاریکی سے کیا جاسکتا تھا..... مگر قبر ایک تھی۔

یہ کس کی قبر ہوگی؟ اس کی اپنی یا دشمن کی..... اس سوال کا جواب اصغر بھی اپنے خلاف کیسے دیتا۔ بلک جھکتے میں اس نے دشمن کو دیوبند لیا جو اس رد عمل کے لیے تیار ہرگز نہ تھا۔ اپنی دانست میں اس نے تو صرف پتھر اٹھایا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جواب میں دست اہل اس پر قضا کا

تیر چلا دے گا۔ وہ بے خبری یا بے وقوفی میں مارا گیا۔

داؤد سے واقفیت اور حساسی طاقت میں برتری کے علاوہ اس کے اندر جانک انگڑائی لینے والی حیوانی قوت اصغر کے کام آئی۔ اس نے اپنے حریف کو یوں دیوبند کیا کہ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔ اسے کھینچ کر اندر لے گیا جہاں منبر کی سنگ مرمر سے بنی ہوئی سیڑھیاں تھیں۔ اس نے بالوں سے پکڑ کے اس کا سر اس پر مارا تو ایک کونے کی سخت دھار نے ہڈی کو پاش پاش کر دیا۔ سفید سنگ مرمر پر خون کی لالی سے گلکاری ہو گئی اور اس کے نونکیلے کونے سے مرنے والے کا مغز پھٹنے لگا مگر یہ سب اصغر نے اسے چھوڑنے کے بعد بھی نہیں دیکھا تھا۔

بجلی جیسے اچانک مٹی تھی ایسے ہی بروقت لوٹ آئی۔ تار کی کا یہ وقفہ کتنا لمبا تھا۔ اصغر کلا کا اندازہ نہ ہوا..... ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے تو یہ پتا نہ چلا کہ مرنے والے نے اپنے حلق سے موت کے کرب میں جو فریاد بلند کی تھی وہ کہاں تک سنی تھی مٹی۔ اچانک بجلی آنے پر اس نے دیکھا تو ایک لاش اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ مسجد کا منبر اس کے خون کی گواہی دے رہا تھا۔ لبو اصغر کے ہاتھوں پر ہی نہیں لباس پر بھی اعتراف جرم کی تحریر بنا ہوا تھا اور نہ جانے کیسے وہاں نمودار ہو جانے والے پیش امام صاحب مجسم سوال بنے اصغر کو اپنی وحشت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پیش امام صاحب جلے کے بعد صفوں کو پلٹ کر رکھنے والوں کی نگہانی کر رہے تھے جو ادھر ادھر پھیلا ہوا دوسرا سامان بھی سمیٹ رہے تھے۔ یہ سب محلے کے نوجوان لڑکے تھے جو ہر تقریب میں اپنی توانائی کو اس جذبے کے ساتھ بروئے کار لاتے تھے۔ پیش امام صاحب قریب ہی ایک ستون کی اوٹ میں کرسی ڈالے بیٹھے تھے اور مرنے والے کی آخری سچ سن کر لپکے تھے۔

اصغر کی عقل اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس پر دیوبندی کا غلبہ تھا۔ ایک چشم دید گواہ کو ختم کرنے میں اسے کوئی دیر نہیں لگی۔ پھر اس نے دونوں لاشوں کو منبر کے پیچھے کیا اور وہ دروازہ کھولنا چاہا جس کے پیچھے مختصر سے قطعہ زمین پر جنازے رکھے جاتے تھے۔ محراب کا دروازہ کھول دیا جاتا تھا تو مسجد کے اندر صف بستہ لوگ نماز جنازہ میں شریک ہو جاتے تھے مگر اس وقت دروازہ منقل تھا۔ نقل صرف ضرورت کے وقت کھولا جاتا تھا۔

اصغر پلٹا اور باہر نکلنے کی کوشش کی مگر پیش امام صاحب کو غیر موجود پاکے دوڑ کے ہدایات لینے کے لیے نمودار

ہو گئے۔ انہیں صورت حال کی گتھی کو سمجھنے میں دیر ضرور لگی مگر اتنی کج بھی نہیں کہ قاتل کو مسجد کا محن عبور کر کے فرار ہونے کا موقع مل جاتا..... انہوں نے ”پکڑو..... پکڑو..... کا شور مچایا تو آگے والوں نے اصغر کو روک لیا۔

ایک قاتل لگا کے محن کو دھوڑوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا تاکہ عید میلاد النبی کے جلے میں پردہ دار خواتین بھی شریک ہو جائیں۔ شادو اس قاتل کے پیچھے اکبر کے ساتھ تھی..... مگر خواتین کو اس نے مبارکباد وصول کرتے ہوئے رخصت کیا ہی تھا کہ کچھ پکاری آوازوں نے اسے متوجہ کر لیا۔ اس نے اصغر کے پکڑے جانے کا پورا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور یہ جاننے میں اسے کوئی دیر نہیں لگی کہ اصغر کیا جرم کر کے فرار ہو رہا تھا۔

بھاگ کی جہلت میں ایک منٹ میں شادو کے حواس اور اس کی عقل کا ایسی ریز بدایا۔ وہ اکبر کو لے کر بھاگی اور تیر کی طرح اپنے کوارٹر میں پہنچی۔ اس نے بڑی غلت میں اپنا اور اکبر کا ضروری سامان اور تمام اہم دستاویزات سمیٹ کر ایک سوٹ کیس پیک کیا۔ اس کے لیے نہ سوٹ کیس کو اٹھا کے لے جاتا تھا اور نہ سڑک تک جا کے کوئی رکشا یا تاکا لاتا..... لیکن اس کا شاطر ذہن کام کر رہا تھا۔ اس نے اندازہ کیا کہ پولیس کس سمت سے آئے گی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اکبر کو تھا ما اور دوسرے سے سوٹ کیس کو گھسیٹ کر مخالف سمت میں لے گئی۔ یہ ڈرائی بیگ تھا جس کا ہینڈل باہر نکل آتا تھا اور اس کے پیچھے پیسے تھے۔

سوگڑ دور جا کے اس نے ایک دروازے پر نصب گتھی بھائی۔ وہاں مشتہر کردار کا ایک شخص رہتا تھا جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کرتا کیا ہے۔ اس کی کوئی گتھی نہیں تھی لیکن اس کی گاڑی میں سے اتر کے اندر جانے والی خواتین کوئی لوگوں نے دیکھا تھا جن کو وہ اپنی رشتے دار بناتا تھا۔ شادو کو بھی..... ہر عورت کی طرح اندازہ تھا کہ غلام محمد کی نظر اس پر کیسے پڑتی ہے اور کیا ہتی ہے۔ اسے بھی کسی نے مسجد میں قدم رکھتے نہیں دیکھا تھا چنانچہ جب مسجد میں حضور ﷺ کی ولادت باسعادت کی مبارک تقریب جاری تھی تو وہ خواب غفلت میں تھا۔

اچانک شادو کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ ہونچکا رہ گیا۔ شادو نے روتے ہوئے سخت پریشانی کے ساتھ کہا کہ اس کے شوہر کے بارے میں اسے ابھی اطلاع ملی ہے کہ وہ حادثے میں شدید زخمی ہوئے ہیں اور انہیں نگہ رانگ رام اسپتال لے جایا گیا ہے۔ اس وقت تا نگہ رکشا دستیاب نہیں..... کیا وہ اسے

اسپتال پہنچا سکتا ہے۔

غلام محمد نے ایک خوبصورت عورت کی مدد کے جذبے کا مظاہرہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اللہ نکی کا اجر دیتا ہے۔ کیا پتا آج کی شکی کل اس کے التفات کا صلہ بن جائے..... اور اس سے بھی بڑھ کر..... کیا پتا وہ دراصل سوئی ہوئی طرح بھی ایسی حسینہ کا مجازی غذا ہونے کا ذرا بھی حق نہ تھا، اللہ کو پیارا ہو جائے تو.....

سوچے سمجھے بغیر غلام محمد نے کار نکالی اور نگہ رانگ رام اسپتال کے سفر پر روانہ ہو گیا..... سوٹ کیس کو اس نے فرض کر لیا کہ اسباب ضرورت ہوگا جو اسپتال میں درکار ہوگا۔ وہ ہمدردی کے جذبات کا مزید مظاہرہ کرنے کے لیے کار پارک کرنے گیا تو شادو کو گیت پر اتار گیا کہ میں ابھی آتا ہوں، گھبراہٹ..... پیچھے ایک عکسی آکے رکی جس میں کسی مریض کو لایا گیا تھا، شادو نے اپنا سوٹ کیس اس میں رکھا اور ڈرائیور کو ایک پتا دیا۔

صبح تین بجے وہ مولاداد کے ماما کو رو رو کے اپنی پتا سنار ہی تھی۔ ”مجھے بس دو چار دن کا آسرا چاہیے، پھر میں بندوبست کر لوں گی، تم پر کوئی آج نہیں آئے گی اور نہ ذمے داری..... اصغر کو مزائے موت سے میں خود بخوبی مل گئی۔“

سانجھرات کو دیر سے اس وقت پیش آیا تھا جب صبح شائع ہونے والے اخبارات کی آخری کاپی پریس میں چلی گئی تھی مگر سہ پہر تک اس دہرے سستی جیڑل کی خبر خصوصی ٹیموں کے ذریعے سارے لاہور میں پھیل چکی تھی۔ ہر اخبار نے اس جنونی قاتل کی زنجیر بکف تصویر بھی چھاپی تھی جس میں وہ حوالات کی سلاخوں کے پیچھے نظر آ رہا تھا، ایسی مبارک رات میں مسجد کے اندر ایسی گھنٹاؤں کی واردات کا ارتکاب کرنے والے کے خلاف عوام کا اور مذہبی تنظیموں کا شدید رد عمل سامنے آیا تھا۔ ہر شخص مطالبہ کر رہا تھا کہ اصغر کو چوک میں بھاسی دی جائے۔

شادو بروقت فرار ہو گئی تھی، چند گھنٹے بعد ہی اشتعال کے جنوں میں مبتلا ایک گروہ نے اس کے گھر کو گیس نہیں کر دیا تھا۔ خود مولاداد کا ماما بہت ڈرا ہوا تھا کہ کہیں شادو کی اس کے گھر میں موجودگی کا راز افشا نہ ہو جائے۔ اس نے گاؤں سے مولاداد کو بلا بھیجا۔ وہ شادو کے حق میں فریضہ رحمت ثابت ہوا۔

اس نے بڑے بھائی کی طرح شادو کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے تسلی دی۔ ”تو فکری نہ کر..... تیرا بھائی تیرے ساتھ ہے..... اللہ نے چاہا تو ہم اصغر کو بھی بچا لیں گے، تیری طرف

کہا۔

”دیکھو..... پولیس سب کچھ کر سکتی ہے۔ پہلے تو چالان کو لوبا کرے، ریمانڈ لیتی جائے۔ ریمانڈ لینے کی قیمت الگ ہے، وہ جج لے گا..... اس عرصے میں معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، پبلک کے سامنے نئے معاملات آجائیں گے۔ اس درمیان میں گواہوں کو توڑ دو۔“

”یہ تو بہت مشکل ہے۔“

وہ پھر اپنی مکروہی ہنسنے لگا۔ ”آسان تو کچھ نہیں ہوتا لی بی..... اور مفت بھی کچھ نہیں ہوتا۔ پولیس سب کر دے گی، جو ہونا تھا ہو گیا۔ کون پڑتا ہے گواہوں کے جنجال میں، ان کو منہ بند کرنے کی قیمت دیں گے تو وہ خوش خوش لیں گے۔ جن کو خمیر ایمان نے روکا، ان سے پولیس دوسری طرح ٹمنٹا جاتی ہے۔ ان کے گھر والوں کو دلدل میں بھیج لیتی ہے۔ کسی کے بیوی بچے، کسی کے ماں باپ یا بھائی بہن، ان کے پرچے کاٹ دیے جائیں تو وہ سچے گواہ کو خود ہی روک لیتے ہیں کہ تیری وجہ سے ہم جھنسنے ہیں۔ اپنی زبان بند رکھو۔ یہ پہلا مرحلہ شاید دس لاکھ کا ہوگا، گواہ ختم..... گواہ ختم تو کیس ختم، لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

”یہ قتل کا عام مقدمہ نہیں ہے..... دہرے قتل کا کیس ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ پیش امام کا کوئی طالب علم..... ان کے پیچھے نماز پڑھنے والا یا کوئی بندہ جس کو ایمان عزیز ہو اور خمیر تنگ کرے، اسے یہ آزمائش لگے اور وہ استقامت کو امتحان سمجھ کے اڑ جائے۔ ویسے تو ہر بندے کی ایک قیمت ہوتی ہے، کم یا زیادہ..... مگر کیا پتا، کچھ لوگ اس پر سیاست کریں..... پوسٹر لگائیں، جلیوں نکالیں..... بیان دیں..... کیا تمہیں معلوم ہے بعد میں وہاں کیا ہوا..... مسجد میں.....“

”ہاں..... سنا ہے اور کوئی آگیا ہے۔“

”آیا نہیں..... لایا گیا ہے، مخالف سیاسی گروہ کے ملا جو عقیدے کا اختلاف بھی رکھتا ہے۔ یہ طاقتور لوگ ہیں اور بھی نہیں چاہیں گے کہ اصغر با عزت رہا ہو کے واپس آئے اور اپنی پرانی پوزیشن پر بحال ہو جائے۔ دس ان کے بھی رکھ لو۔“

”یہ تو اب مشکل ہے..... کہ اصغر واپس جاسکے۔“

”ہاں ہے تو مشکل..... لیکن ان کی کوشش تو ہوگی کہ اس کے حامی کچھ بول ہی نہ سکیں، مولانا اصغر حسین سید سے سید سے لٹک جائیں تو آئندہ بھی خطرہ کوئی نہ ہو۔“

شادو پریشان ہو گئی۔ ”پھر کیا ہوگا؟“

تو کوئی آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھ سکتا۔“

”بھائی مولا داد..... پیسے کی فکر نہ کرنا، سب سے پہلے میرے رہنے کا ٹھکانا کرو..... پھر ہم کوئی بہت اچھا وکیل کریں گے، اصغر کی ضمانت کے لیے۔ پولیس سے پہلے معاملہ طے کرو، وہ جتنی رشوت مانگتے ہیں میں دوں گی، پھر وکیل کی فیس بھی..... میں ہر فیصلے کے خلاف اپیل کروں گی۔ ہائی کورٹ میں..... سپریم کورٹ میں.....“

مولا داد ان معاملات میں شاطر ذہن نہیں رکھتا تھا مگر اس نے ایک بندہ تلاش کر لیا، جو پولیس کے تمام معاملات طے کر سکتا تھا۔ پہلا سودا آسان تھا۔ طرم کے اعتراف جرم اور شہد و چشم دید گواہوں کی موجودگی میں تفتیش بے معنی تھی۔ اصغر کو بلا وجہ کے تشدد سے بچا کے آرام اور سہولیات فراہم کرنے کا بھاری معاوضہ بھی پولیس نے اس لیے وصول کیا کہ ان کے مطابق معاملہ ”حساس“ نوعیت کا تھا اور ان کی نوکری کے ساتھ جان بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

شادو کا اکاؤنٹ تین مختلف بینکوں میں تھا۔ پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اصغر سے کہ اس چیک سائن کرائے اور تمام رقم اپنے ایک ہی اکاؤنٹ میں منتقل کر دی جو کس آباد میں تھا۔ پھر اس نے گھر تلاش کیا اور کس آباد میں اوپر کی منزل کے دو کمرے کرائے پر لے لیے۔ مالک مکان سودی عرب میں مقیم تھا چنانچہ شادو کو آتے جاتے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔

ایک مہینے بعد وہ اپنے گوشہ گمنامی میں سیٹل ہو چکی تھی کہ مولا داد اسے ایک ایجنٹ سے ملوانے لے گیا جو بہت کچھ کرنے کا دعویدار تھا اور..... انڈر گراؤنڈ ورلڈ میں دور رس تعلقات رکھتا تھا۔ اس نے صاف بتایا کہ قانون کا راستہ خطرناک ہے۔ اس پر ہر دوسا کیا تو اصغر ایک دن تختہ دار پر کھڑا نظر آگے۔

”لاقا تو نیت کا راستہ مہنگا مگر محفوظ ہے۔“ اس نے

کہا۔

”کتنّا مہنگا اور کتنّا محفوظ.....؟“ شادو نے پوچھا۔

”لو بہن جی..... ابھی کیس عدالت میں نہیں گیا، چالان پیش ہوگا سیشن کورٹ میں، ضمانت کا تو سوال ہی نہیں۔“

”ہم اپیل میں جائیں گے۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”جہاں مرضی جاؤ، بڑے سے بڑا وکیل کر لو، ہوگا کچھ نہیں۔“

”پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟“ شادو نے بسی سے

اگر وہ لڑکا ایجنٹ مسکرایا۔ "ایمن کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک کا ڈھب ہے۔ ایک بہت مہنگا والا ہے مگر پکا۔"

"کتنا مہنگا؟"

"کوئی تیس لاکھ والا۔ سیدھا حجاج کی جیب میں۔"

یہ نیا آیا ہے، اوپر سے بہت سخت جتنا ہے مگر ہم اندر کی بات جانتے ہیں۔ وہ بری نہیں کرے گا تو عمر قید۔"

"عمر قید؟" شادو نے گھبرا کر کہا۔

"گھبرانا کیوں ہے، چودہ سال کا مطلب پانچ سال۔ زندگی تو بچ گیا۔ اندر جیل میں رعایت ملے گی۔ کیونکہ عالم لوگ ہے۔" ایجنٹ نے اپنا لب و لہجہ بدل لیا۔

"سیشن کے خلاف پراسیکیوشن اپیل میں نہیں جانے گا، ہمارا گارڈی۔ ہائی کورٹ کو نہیں بولے گا کہ اس کو ضرور پھانسی دو۔ پراسیکیوشن کو راضی کرنے کے رکھ دوں۔"

شادو پریشان ہوئی۔ "یہ تو پچاس سے بھی زیادہ ہو گئے۔"

ایجنٹ بہت کانیاں آدھی تھا۔ "زیادہ ہے تو بابا جانے دو۔ پیسا بچاؤ۔ کام آئے گا دوسرا شادی بنالیا۔ ابھی تم جوان ہے، خوبصورت ہے، اس مولوی کے مقابلے میں ایک سے بڑھ کر ایک ملے گا۔"

شادو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "خدا کے لیے ایسا مت کہو، اس بچے کا باپ ہے وہ۔"

ایجنٹ کچھ دیر شادو کو دیکھتا اور سوچتا رہا۔ "ایک ترکیب اور ہے، کورٹ کچھری سب چھوڑو۔ مولانا صاحب کو لے کر غائب ہو جاؤ۔"

"وہ کیسے؟ کوئی جاؤ ہے؟"

"جادو سب پیسے کا ہے بابا۔ پیسا دو اور دنیا کی مارکیٹ سے جو چاہو لو۔ خوبصورت عورت۔ بڑھی گھوڑی کے واسطے لال لکام، ایک دم سچا پیار۔ ایم اے، پی ایچ ڈی کا ڈگری۔ زندگی یا موت، کسی کو مرانا ہو یا بچانا ہو۔ سب پیسے کا کھیل ہے۔"

"میں اصغر کو کیسے بچا سکتی ہوں۔ یہ بتاؤ۔"

"سنو۔" تھانے سے اس کو پٹشی کے لیے کورٹ کون لے جائے گا؟ یہی گاؤ۔ یہ ملاقات کراتے ہیں پٹشی سے پہلے اور بعد میں بھی۔ ویسے تو چار ہندے جاتے ہیں، ایک بٹار بھی ہو سکتا ہے، ایک کسی وجہ سے لیٹ ہو جائے۔ پانچ پانچ لاکھ میں وہ ایسا ہی کریں گے۔ رہ جائیں گے دو، ان کو مل جائیں دس دس تو وہ پٹشی سے پہلے ہاتھ روم جانے کا موقع دیں گے۔ ہتھکڑی ایسے کھولیں گے کہ بند نظر آئے۔ ادھر

ہو گا ڈی اپنی جو اصغر کو نکال لے جائے۔ گاؤ مصل بھی ہوں گے اور گرفتار بھی۔ ہو سکتا ہے نوکری سے جاگیں، دس دس ان کا حق جتا ہے۔ مگر خرچہ دیکھو تو آدھا، صرف پچیس میں صوفی صاحب فوراً فری۔ آگے تمہارا کام، ایسے غائب ہو جاؤ کہ کسی کو بھی نظر نہ آؤ۔ اتنا بڑا ملک ہے، کراچی بھیگ جاؤ۔ ادھر پانی والا سمندر سے بڑا انسانوں کو سمندر ہے۔ اس میں گم ہو جاؤ۔ نام، ولدیت، شناختی کارڈ، حلیہ۔ سب بدل لو۔ بہت آسان ہے اور مال ہے تو ملک سے ہی نکل جاؤ۔ عیش کرو۔"

شادو نے امکانات پر غور کیا۔ "یہ تو بہت مشکل ہے۔"

"دیکھو بی بی۔ ہم جھوٹ بول کے جھوٹا دلا سادینا نہیں جانتے۔ یہ واقعی مشکل ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ پھر پکڑا جائے۔ کسی کی خبری پر یا اپنی غلطی سے، انتہائی توجہ ہو جائے گا۔ ہر تھانے میں اس کا ٹوٹو جائے گا۔"

شادو کے لیے کچھ بھی طے کرنا مشکل تھا۔ اس کا اپنا دماغ جس کی شاطری پر اسے بڑا ناز تھا، اب ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس کا واحد مشیر مولاد تھا۔ اس نے تھانہ کچھری کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے سب ہی کو دیکھا تھا مگر خود بھی ایوان انصاف کی غلام گردشوں میں خوار نہیں ہوا تھا۔ باقی سب نظام عدل کے ٹاؤٹ تھے۔ وہ گدھ جو ہر شکار پر منزلانے آ جاتے تھے۔ وہ تاڑ گئے تھے کہ شکار ایک عام گھریلو قسم کی عورت ہے جس کی پہلی بستی ہے یہ کہ دولت مند ہے۔ دوسری یہ کہ خود کو بہت ہوشیار سمجھتی ہے اور تیسری یہ کہ شوہر سے وفاداری کو اپنا ایمان سمجھتی ہے ورنہ اسے بچانے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے سے تو بہتر تھا کہ اس کے لٹکا جانے کا انتظار کرتی۔ صبر سے چار ماہ دس دن عدت کے گزارتے ہی اپنی پسند کا شوہر خرید لیتی۔ اتنے پیسے کے ساتھ تو اسے خط غلامی لکھ کر دینے والے ہی ہیرو بنی ل جاتے۔

ایسے سب لیرے اپنے چہروں پر خلوص اور ہمدردی کے نقاب ڈال کر شادو کا گھیراؤ کرنے آ گئے۔ مولاد ادکھان تک اس کا ساتھ دیتا۔ وہ پہلے ہی اپنے علاقے میں مجرم کا مددگار ثابت ہو چکا تھا اور خطرے میں تھا۔ دوسری طرف اس کی اپنی بیوی کو یقین آ چکا تھا کہ بھائی بن کے وہ شادو کے دل میں جگہ بنا رہا ہے ورنہ درحقیقت وہ پہلے سے اس پر فریفتہ ہے اور شاید کیا یقینا ان دن وہ بیوہ سے شادی کو مست قرار دے کر شادو کو گھر لے آئے گا۔

مولاد ادھی شادو کا ساتھ چھوڑ گیا تو شادو بڑی آسانی

سے لٹ گئی۔ پولیس کے اور عدالتی اہلکار جھوٹے حیلوں، بہانوں اور وعدوں کی قیمت وصول کرتے رہے۔ انہوں نے کسی گواہ کو خوف نہیں کیا۔ کچھ خود ہی گواہی کے چکر سے دور رہے مگر چشم دید گواہوں نے جو دیکھا تھا عدالت کو بتا دیا۔

جب یہ بات سنی ہوئی کہ کج کا فیصلہ سزائے موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تو ایس اور دل شکستہ شادو نے آخری داؤ پر پیسے لگا دیے۔ اس نے پٹشی کے موٹے پر اصغر کو فرار کرانے کی قیمت ادا کر دی اور باقی زندگی کے لیے شناخت بدل کے گمنام رہنے کا طے کر لیا۔ سب کچھ ہارنے سے جیتنے کی امید میں بازی کیلینا بہر حال بہتر تھا۔

ایک خوف تھا جو دن رات آسیب کی طرح اس کا چھپا کرتا تھا اور خوابوں میں بھی اسے وہ دہشت ناک مناظر دکھاتا تھا جو اس کے اعمال کی سزا تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے گناہ کیا تھے اور جرائم کیا۔ دولت کمانے کے غلط راستوں پر اس نے اصغر کو ڈالا تھا اور وہ دنیا کے نہیں دین کے نام پر چوری کا مرتکب ہوا تھا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سزا سے صاف بچ جائے۔ خدار رحمن و رحیم ہے تو جبار و قہار بھی ہے۔

جھوٹے آسروں پر شادو نے آخری وار کھیل ادا کر دیا اور وہ بھی ہار گئی۔ اصغر کو فرار کا موقع فراہم کرنے کا وعدہ بھی جھوٹا ثابت ہوا۔ اس کام کا معاوضہ وصول کرنے والوں نے اسے موقع ضرور فراہم کیا مگر پھر خود ہی اصغر کو گولی مار دی، جوان کا فرض تھا۔ کہا گیا کہ اصغر کو پولیس کی جیل سے چھڑا کر لے جانے کے لیے سب افراد نے حملہ کیا تھا مگر ملزم کی حفاظت پر مامور نفری نے اسے ناکام بنا دیا۔

اصغر بڑی رسوائی کے ساتھ دفن ہوا۔ جنازے میں شرکت کے لیے کون آتا ہے۔ پرانے گاؤں والے بھی اس کے دشمن تھے جو اسے اصغر میرانی کے طور پر جانتے تھے اور اس محلے کے رہنے والے بھی جن کے لیے وہ مولانا اصغر حسین شاہ تھا۔ مولاد ادکھ لوگوں کو انسانی ہمدردی کے نام پر لے آیا اور پولیس کی نگرانی میں ایک خیراتی ادارے نے اسے کلن دے گردن کر دیا۔

شادو اس رات اکیلی ٹیلی فون کے آنسو روتی رہی۔ پاس پڑوس میں کسی کو لمبی ہی نہیں تھا کہ وہ کسی اصغر میرانی یا مولانا اصغر حسین شاہ کی بیوہ ہے۔ اپنی شناخت کو اس نے سب سے چھپا لے رکھا تھا۔ مالک مکان سودی عرب میں مقیم نہ ہوئے تو شاید وہ اکیلی اس گھر میں رہ بھی نہ پاتی۔

اکبر ماں کو چپ کراتے اور خود بھی روتے روتے بالآخر سو گیا تھا۔ اس وقت اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے

یہ فون نمبر کسی کو نہیں بتایا تھا۔ مالک مکان نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ چاہے تو اسے استعمال کر سکتی ہے لیکن مل ادا کرتی رہے۔

اس کے ہبلو کہنے پر کسی نے اپنا تعارف کرائے بغیر بولنا شروع کر دیا۔ "دیکھو شاہد بی بی۔ ہم تو تمہاری مدد کرنا چاہتے تھے لیکن تم نے ہمارے ساتھ ہی چلا کر دکھائی۔"

شادو نے بدحواسی میں کہا۔ "کون ہو تم؟"

وہ بولتا رہا۔ "ہم نے اصغر کو فرار کرانے کے لیے بڑا خطرہ مول لیا تھا، جوڑے دار تھے وہ برطرف ہوتے اور جیل بھی جاتے۔"

"مگر انہوں نے اس کی قیمت لی تھی۔"

"اور تم نے ساتھ ہی دوسرے بندے پکڑ لیے کہ جملہ کر کے اصغر کو چھڑا لے جائیں، ان کی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی۔"

شادو چلائی۔ "یہ جھوٹ ہے، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"چھوڑو بی بی۔ اب تفتیش ہوگی تو سب سامنے آجائے گا۔ اور کون کر سکتا تھا یہ کام تمہارے سوا۔ جب تھانے میں تم کو کچھ کر کے پولیس اپنے طریقے سے پوچھے گی تو تم سب کے نام بتا دو گی، تم جیسی عورت کے لیے ایک رات بھی قیامت کی رات ہوتی ہے۔"

فون بند ہو گیا مگر شادو لرزتی رہی۔ اس کے جسم پر ایسی ککچی طاری ہوئی جیسے اسے جالا بخار ہونے والا ہے۔ اسے اور کچھ نہیں سوچا۔ ایک بار پھر اس نے اکبر کے ساتھ فرار کا راستہ اختیار کیا۔ وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر نکل گئی۔ اس کے اکاؤنٹ میں اب صرف پانچ لاکھ رہ گئے تھے جو اسے تنگے کا سہارا لگتے تھے۔ اسے وہ بات یاد تھی، کراچی میں ایک پانی کا سمندر ہے، دوسرا انسانوں کا۔ اس نے خود کو انسانوں کے سمندر کے پیر کر دیا۔

شادو نے قدرت کی سزا کو اپنا مقدر سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔ اپنی عقل اور ہوشیاری کا خلیزہ بھگت لینے کے بعد اس نے خود کو قدرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ احساس گناہ نے اس کی شخصیت کو میسر بدل ڈالا تھا۔ اب اس کا تمام وقت نماز اور تلاوت کے بعد اللہ سے اپنے تمام گناہوں کی معافی مانگتے صرف ہوتا تھا۔ ابھی وقت تھا تو یہ قبول ہو سکتی تھی۔

ایک سیاسی حکومت کا سات سالہ دور ختم ہوا تھا اور ایک اور فوجی حکومت برسر اقتدار تھی۔ تین لاکھ میں شاہدہ کو دو کروڑ کا ایک فلیٹ یوسف پلازا میں لیا گیا جو اندر سے بھی

بہت خوبصورت تھا، اس کے لیے اسے نیا شامی کارڈ بھی بنوانا پڑا۔ اس نے اپنا نام زیادہ کر لیا مگر شوہر کا نام بدلنے کی اسے ہمت نہ پڑی۔ فلپ کی رجسٹری اس کے نام پر ہوئی۔ اس کے سامنے اب ایک پورا مستقبل تھا، رقم جو بھی ایک کروڑ کی حد کو چھونے والی تھی، اب ایک لاکھ پر آگئی تھی، ایک لاکھ میں پوری زندگی نہیں گزارا جاسکتی تھی، جب دس برس کے ہوش سنبھالتے بیچے کا ساتھ بھی ہو..... شاہدہ کے پاس تعلیم بھی مگر کوئی سند نہیں تھی جو اسے کہیں پچھری ملازمت دلا سکتی، اس نے گھر پر ہی بچوں کو قرآن پڑھانا شروع کیا۔ پھر گھر گھر جانے لگی۔ اکبر کو اس نے قریب ہی ایک اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ ارد گرد کے لوگوں کو اس نے مجبوراً ایک جھوٹی کہانی بنا دی تھی جس سے وہ سب کی ہمدردیاں سمیٹنے کے قابل ہوئی تھی۔

تاہم ایک تنہائی کا عذاب تھا جو اس کو کھوکھلا کر رہا تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ قدرت نے اسے زندگی کے لیے سفر کے لیے جو سامی دیا تھا وہ اس کے اپنے گناہوں کی بھیئت چڑھ گیا۔ وہ ایک سیدھا سادہ مخلص انسان تھا جو اس کی محبت میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ اس کے سوا کسی کو دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے وہ صراطِ مستقیم پر رکھنا چاہتی تو وہ چلتا مگر وہ خود اپنی نا آسودہ خواہشوں کی اسیر تھی۔ اس نے اصغر کو ان کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ وہ خود جرم و گناہ کی اس زندگی کے آزار سے چھوٹ گیا تھا اور اپنی سزا بھگت چکا تھا۔ ایک وہ تھی کہ گناہی کے ساتھ تنہائی کی قید کا درد بھی تھی اور اس جہاں کے بعد دوسری دنیا میں اس کے لیے سخت تر عذاب تھا۔

ایک مسئلہ اکبر تھا، وہ اب اتنا بڑا اور سمجھدار ہو چکا تھا کہ ماں کو سمجھنے لگا تھا۔ اگر وہ جانتی تو شاید اسے باقی زندگی کے لیے بھی کوئی سامی مل جاتا مگر جب وہ ایسا سوچتی تو اکبر اس کی راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ شروع شروع میں اس کے معصوم ذہن میں اٹھنے والا ہر سوال اس کے لبوں پر آ جاتا تھا۔ آج آہستہ آہستہ وہ خاموش ہو گیا۔ سوال اس کی آنکھیں کرنے لگیں، ہر وقت اور ہر جگہ۔ یہ تم کیا کر رہی ہو، کیوں کر رہی ہو؟ کس کے لیے کر رہی ہو..... وہ وقت پیچھے رہ گیا تھا جب وہ پوچھ سکتا تھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟

☆☆☆

اکبر کے لیے اس کی زندگی اپنے ماضی کا ایکشن ری پلے تھی، صرف اس کا انجام مختلف ہونے والا تھا۔ ماں اس کے باپ کے لیے زندگی خرید نہیں سکتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ عورت تھی جو بویہ ہی ناقص انکس اور کمزور ہوتی ہے۔

پھر وہ ایک گاؤں سے آئی تھی اور دینا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ اسے دیا تھا وہ لوٹانے کے لیے اس نے جس مرد کی رفاقت پر انحصار کیا تھا وہ کسی طرح بھی اس کا ہمسرہ نہیں تھا۔

مرنے وقت اس کی ماں نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ یہ بوجھ قبر میں لے جاتا نہیں چاہتی تھی، اکبر نے بہت کچھ دیکھا تھا مگر بہت کچھ اس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہو چکا تھا۔ اس عورت کے ساتھ زندگی نے دو بار دغا کی۔ اسے کچھ لوگ یوں بھی سمجھ سکتے تھے کہ اس نے ایک جرم کی سزا دو بار کاٹی۔ یہ انصاف کے اصولوں کے خلاف تھا مگر وہ کتنی بھی کٹھن تھی اس نے ایک اپنی انتقامی سوچ سے مغلوب ہو کر جرم و گناہ کا راست اختیار کیا۔ دوسرے میں نے اصغر میراثی کو مولانا سید اصغر حسین شاہ بنا کے اسے بھی اس راستے پر چلا دیا۔

اس کی دوسری سزا کا زمانہ اس وقت شروع ہوا جب اس کی نا آسودہ خواہشات اور پریشانی زندگی کے خوابوں کو تعبیر ملنے کا وقت قریب تھا، جو شوہر نہ کر پاتا تھا وہ بیٹا کر رہا تھا۔ سب کچھ اچانک ہی ہو گیا۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ یوں جیسے اچانک لائٹ چلی گئی ہو، چند سیکنڈ بعد روشنی لوٹ آئی اور اس نے یہ بات بھلا دی۔ چند دن بعد پھر ایسا ہوا اور ایسا اکثر ہونے لگا تو اس نے اکبر سے ذکر کیا۔

لیکن اپنے آس پاس تاریکی محسوس کرنے کے ساتھ اسے چکر سے بھی محسوس ہوتے تھے، آخری بار تو یہ ہوا کہ وہ خود کو سنبھال نہ سکی۔ اسے یوں لگا جیسے زمین اس کے قدموں کے نیچے سے نکل گئی ہے۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہیں گر پڑی۔ ہوش آنے پر بیٹا اسے آنکھوں کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس کے خیال میں دنیا کا اندھیرہ بوجانا بصارت کی خرابی ہی ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر نے قدرے تشویش کے ساتھ اسے دوسرے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا جس نے معائنہ کیے بغیر ہی اکبر کو بتا دیا کہ علامات واضح طور پر برین ٹیومر کی ہیں، اس کی ماں کے دماغ میں سرطان کی روشنی بن گئی ہے جسے آپریشن سے نکالا جاسکتا ہے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ وہ تمام زندگی کے لیے اندھی بھی ہو سکتی ہے اور مغلوب بھی..... اگر زندہ رہی۔

یہی فی الحقیقت صورت حال واضح ہو گئی، رسولی ایسی جگہ تھی کہ آپریشن ناکرہ تھا اور اس کے بچ جانے کے

امکانات بہت کم تھے۔ مرنا اسے آپریشن نہ کرانے کی صورت میں بھی تھا اور زیادہ سے زیادہ تین ماہ بعد..... اکبر نے ایک دن سوچا اور پھر آپریشن کے اخراجات ادا کر دیے اور کاغذات پر سائن کر دیے، کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر تھا۔

ڈاکٹر نے صرف اپنی فیس کھری کرنے کے لیے آپریشن شروع کیا اور ٹیومر کو چھیننے کے بغیر کوشش ترک کر دی۔ اس نے اکبر کو صاف بتا دیا کہ رسولی بہت پگھل چکی ہے اور اس اسٹیج پر کٹانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی بڑیں جسم کے دوسرے حصوں میں نمودار ہو چکی ہیں، اس کی ماں کی زندگی مزید مختصر ہو گئی ہے۔ اکبر نے دوسرے بڑے اسپتال سے رجوع کیا۔ یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ ماں کو باہر لے جائے گا لیکن اسپتال نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس سے فائدہ کچھ نہیں ہوگا، آگے اس کی مرضی.....

اکبر نے اور خود ڈاکٹروں نے پوری کوشش کی تھی کہ شادو پر اس کے مرض کی سنگینی ظاہر نہ ہو مگر اس نے اپنی کسی چھٹی حس کی مدد سے بھانپ لیا تھا یا خود مرنا سنبھالنے اس کے کان میں سرگوشی کر کے اپنی جلد آمد کی اطلاع دے دی تھی کہ رازداری کی کوشش رازگاہ گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کی پرورش کرنے والوں نے آخری وقت آنے سے پہلے اسے سچ بتا دیا تھا کہ وہ اس کے حقیقی ماں باپ نہیں ہیں اسی طرح شادو نے اپنے بیٹے کو وہ سب بتانے کا فیصلہ کیا جو اسے معلوم نہ تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ اکبر کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ہوش سنبھالنے کی کوئی ایک عمر نہیں ہوتی۔ اکبر نے سنگین حقائق کو بہت چھپوٹی عمر سے سمجھنا شروع کر دیا تھا جب اس کے بارے میں خود شادو یہ بتاتی تھی کہ وہ بے شعور اور معصوم بچہ ہے اور اس کی عمر کے دوسرے بچے بستر علیے کرتے تھے۔ ثانی، پہلے کم کے لیے چلتے تھے اور تھکا کے بولتے تھے۔ جب ماں اسے ایک رات سوتے سے جگا کر اپنے گھر سے فرار ہوئی تھی تو رو رہی تھی اور خاموشی سے اس کی صورت دیکھنے کے باوجود وہ اس کی باتوں سے سمجھ گیا تھا کہ آپس نے اس کے باپ کو بچڑ لیا ہے، پھر یہ بھی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کے باپ نے مسجد میں دو آدمی مار دیے تھے۔ جو کچھ اس کے بعد ہوتا رہا وہ اپنے ذہن کے مطابق اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کئی بار ماں اسے ساتھ لے جانے پر مجبور ہوتی تھی اور وہ دوسروں سے اس کی گفتگو سنتا تھا۔ ایک بار بھی شادو نے اسے قاتلے میں پکچہری میں اصغر سے نہیں ملوایا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ

دوسرے بازاری

وہ کہاں ہے۔

پھر جس دن وہ دوسری بار اکبر کو اپنے ساتھ لے کر اس شہر سے فرار ہوئی تھی تو اکبر نے سمجھ لیا تھا کہ اب اس کا باپ نہیں رہا۔ اسے تمام حقائق کا علم تو نہیں تھا مگر ایک رات اس کی آنکھ کھلی تو ماں رو رہی تھی اور اس نے پوچھ لیا۔ "ماں..... کیا اب کو بھانسی ہو گئی؟" اور شادو کو یہ بات اس کے منہ سے سن کر ایسا شاک لگا تھا کہ وہ رونا بھول گئی تھی۔ "یہ تم سے کس نے کہا؟" وہ چلائی مگر دوسرے لمحے اس نے اکبر کو اپنے ساتھ پٹنایا۔ "بیٹھو ہے۔"

"پھر تم کیوں رو رہی ہو..... مجھے سب معلوم ہے ماں۔" وہ بولا اور شادو نے محسوس کیا کہ وہ نہ بچ کو چھوٹ بنا سکتی ہے اور نہ اس کا بیٹا جھوٹ کو بچ تسلیم کر سکتا ہے۔ وہ بڑی سختی کے دن تھے، اکبر کو وہ زمانہ یاد آتا تھا جب اسے لاہور کے بہت اچھے انکس میڈیم اسکول میں داخل کرایا گیا تھا جہاں صاف سترے بچے چمکتی دکتی کاروں سے اتر کے آیا کرتے تھے..... اس نے بھی ماں سے ضد کی تھی کہ وہ رکشا میں نہیں کار میں جائے گا تو اس کی ماں نے پیار سے مسکرا کے کہا تھا۔ "کیوں نہیں میرے چاند..... بس تھوڑے دن کی بات ہے، ہم بھی ویسی ہی کار لے لیں گے۔"

"اور ہماری بھی بہت بڑی کوٹھی ہوگی، جس میں آپ لان پر میرے ساتھ فٹ بال کھیلیں گی؟" اس نے پوچھا تھا۔

شادو نے چمکتی آنکھوں سے سر ہلایا تھا۔ "فٹ بال بھی اور کرکٹ بھی....."

جب کراچی میں اسے علامہ اقبال گورنمنٹ اسکول میں داخل کرایا گیا تو وہاں ہر کلاس میں ساٹھ ستر بچے ٹھونس دیے گئے تھے جو چھوٹی چھوٹی خستہ حال ڈیسکوں پر تین تین بیٹھتے تھے اور کلاس روم کی کھڑکیوں کے ٹوٹے ٹیشوں سے باہر سڑک کی ٹریفک کے شور کے ساتھ دھواں اور گرد و غبار آتا تھا اور فٹ پاتھ پر فقیر بھروئن کے نشے میں بے سادہ پڑے رہتے تھے۔

اس وقت اکبر کو گردش حالات کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے ماں سے بھی نہیں پوچھا کہ وہ چمکتی دکتی کار کہاں گئی اور وہ کوٹھی کہاں گئی جس کے لان پر وہ فٹ بال اور کرکٹ کھیلنے کا وعدہ کر چکی تھی۔ ماں بہت دگمی تھی۔ وہ اکثر روتی تھی اور اس کی صحت بھی خراب ہو گئی تھی۔ اسے خود سے زیادہ ماں کی فکر تھی کہ آخر وہ کیا کرے کہ ماں کے ہونٹوں کی ہنسی لوٹ آئے اور وہ پھر پہلے جیسی ہو جائے۔

پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا مگر ماں ہر وقت ایک ہی بات دہرائی رہتی تھی۔ ”تجھے پڑھ لکھ کے بڑا آدمی بنانا ہے اکبر۔“ پہلے وہ حیران ہوتا تھا کہ بڑا آدمی بننے کے لیے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بڑے تو سب ہی ہو جاتے ہیں۔ ہر بچہ بڑا آدمی بننا ہے، رفتہ رفتہ ماں کی بات کا دوسرا مطلب اس کی سمجھ میں آنے لگا۔ پھر تیسرا مطلب اس پر وقت اور زندگی کے تجربے نے واضح کیا جو پہلے مطلب سے یکسر مختلف تھا۔ پڑھ لکھ کے یہاں نہ کوئی بڑا آدمی بننا ہے اور نہ بنے گا۔ بڑا وہ ہے جو طاقتور ہے اور طاقت وہ نہیں ہوتی جس سے ایک پہلوان دوسرے کو چت کرتا ہے یا روڈ رو لڑکھچھ لیتا ہے، طاقت پیسا ہے۔

یہ سب سن کر اس نے پہلی بار صرف دس سال کی عمر میں سمجھ لیا تھا۔ اس دن پہلے اسے ماسٹر صاحب نے مارا کہ اس کے جوتے اتنے گندے اور پچھے ہوئے کیوں ہیں۔ کلاس کے بعد ایک لڑکے نے کہا۔ ”جوتے کیا اس کی تو نہیں بھی پھٹی ہوئی ہے۔“ اور ایک سوراخ میں انگلی ڈال کے کہیں کو پیچھے سے پچھتیک پھاڑ دیا۔ سب ہنسنے لگے تو اکبر احساسِ ذلت اور غصے میں نہیں پھاڑنے والے سے لڑ گیا، وہ زیادہ عمر کا لڑکا تھا۔ اس نے اکبر کو ڈیک پر دے مارا اور پھر اٹھایا تو ڈیک سے نکلی ہوئی کیل میں پھنس کر اس کی پتلون بھی پیچھے سے پھٹ گئی۔ لڑکے ہنس ہنس کے دہرے ہو گئے۔ ”ابے اس کی تو ہر چیز پھٹی ہوئی ہے۔“ کسی نے کہا۔

اسے مارنے والے نے کہا۔ ”جو نہیں پھٹی، میں پھاڑ دوں گا۔“ اکبر روتا ہوا بھاگا تو بستہ وہیں رہ گیا۔ وہ گھر گیا تو ماں نے اسے اور مارا۔ تو پڑھنے جاتا ہے یا غنڈا گردی کیکنے، ایک جوتا نہیں تھا۔ اب نہیں پتلون سب پھاڑ لایا۔ بستہ چھوڑ آیا، میں کہاں سے لاؤں یہ سب؟

اکبر نے چیخ کر کہا۔ ”مت لاؤ۔“ میں خود لے آؤں گا۔“ اور گھر سے باہر بھاگ گیا۔ سارا دن وہ یوسف پلازا کے پیچھے والے گراؤنڈ کی ایک بنچ پر بھوکا پیاسا بیٹھا رہا۔ شادو اسے کہاں کہاں تلاش کر رہی ہوگی۔ کتنا رو رہی ہوگی، یہ خیال اسے تسکین پہنچا رہا تھا وہ رات تک اسی جگہ بیٹھا رہا اور باغیانہ خیالات اس کے وجود میں طوفان اٹھاتے رہے۔

اچانک ایک شخص اس کے پاس آ بیٹھا۔ وہ وہلا پٹلا اور لمبا تھا۔ اس کے بڑے بڑے بال تھے۔ اس نے گلے میں زور دنگ کا رومال ڈال رکھا تھا اور وہ پان کھا رہا تھا۔ اس کی ریشمی ٹی شرٹ پر ایک سانپ کا چمکن تھا۔ ”کون ہے بے

تو.....؟ اس وقت یہاں کیوں بیٹھا ہے، گھر نہیں ہے تیرا.....؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کہا۔ ”گھر ہے۔“ مگر میں جاؤں گا نہیں۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”ابا نے مارا ہے، پکڑے پھاڑ دیے۔“ ”ابا تو خود مر چکا ہے۔“ پکڑے کسی اور نے پھاڑے تھے۔ میں اس سالے کی۔“ پھاڑ دوں گا کسی دن۔“ ماں نے مجھے مارا کہ اب اور یو نیفارم کہاں سے لاؤں، میں نے کہا نہیں چاہیے مجھے تمہاری خیرات..... میں خود لے آؤں گا۔“

اس نے اکبر کو غور سے دیکھا۔ ”اچھا۔“ یہ کہا تو نے..... بات تو سولہ آنے سو پیسے ٹھیک کئی گھر یہاں کیا تیرے لیے فرشتے یو نیفارم لے کر آئیں گے.....؟ یہ لے.....“ اس نے جیب میں سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکالا اور اکبر کی طرف بڑھایا۔ ”کل لے لینا دوسری یو نیفارم۔“ چل اب گھر جا..... پکڑ پیسے۔“

اکبر نے نوٹ پکڑ لیا۔ ”ماں پوچھ گئی۔“ ”ابے کہہ دینا راستے میں پڑے لے ہیں، اٹھ میں گھر چھوڑ آؤں تجھے۔“ تو علامہ اقبال اسکول میں پڑھتا ہے نا.....“

اکبر نے سر ہلایا۔ ”پانچویں میں..... بی سیکشن ہے میرا۔“ ”ماں کو یقین دلانے کے لیے اکبر کو قسم کھانا پڑی۔ بڑی آسانی سے اس نے ہر قسم اٹھائی۔ ماں چپ ہوئی مگر اس کی آنکھوں میں شک باقی رہا۔ وہ ایک دن اسکول نہیں گیا مگر اگلے دن گیا تو اس کے یو نیفارم میں ہر چیز نئی تھی، وہ چھٹی کے بعد نکلا تو باہر وہی شخص اس کا منتظر تھا۔

اس نے اکبر کو حسی نظر سے دیکھا۔ ”خریدی لی نا اپنی یو نیفارم تو نے۔“ ”ماں نے کہا میں جھوٹ بول رہا ہوں..... میرے قسمیں کھانے کے باوجود۔“ ”چار بچے وہیں آ جانا۔“ کل والی جگہ..... اب تو ہم دوست ہیں۔“

”ماں نہیں آنے دے گی۔“ ”کہہ دینا..... ابے کچھ بھی کہہ دینا کہ پیچھے تک جا رہا ہوں، وہ کون سا سربیس سے باندھ کے رکھی ہے تجھے، نہ آیا تو میں گھر جا کے تیری ماں کو سب بتا دوں گا کہ نوٹ مجھ سے مانگا تھا تو نے، کہا تھا کہ ماں اسپتال میں پڑی ہے۔“ جھوٹی قسمیں کھائی تھیں تو نے۔“

اکبر ڈر گیا۔ وہ چار بچے وہیں پہنچا تو اس شخص کے ساتھ دو آدمی جیسے اور بیٹھے تھے۔ وہ سب سرگرمیوں میں پھونک رہے تھے اور زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ”جانی یہ ہے تیرا دوست.....“ ایک نے کہا۔

اکبر کو پانچ سو دینے والے نے کہا۔ ”ہاں..... کل میں نے اسے پانچ سو روپے ادھار دیے تھے۔“ ”ادھار ہے کیسے واپس کرے گا یار۔“ دوسرا بولا۔

جانی نے اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”واپس نہیں کرے گا تو ہم اس کی ماں کو اٹھالیں گے، وہ اچھی عورت ہے۔“ ”نہیں یار یہ تو ابھی پانچویں میں پڑھتا ہے، اس کی کون سی کمائی ہے کہ یہ تیرا ادھار چکا سکے۔“

”یہ ہمارا ایک چھوٹا سا کام کرے گا۔“ اس کا ادھار ختم ہو جائے گا اور پیسہ مل جائیں گے اسے..... جو ہم اس کی ماں کو خود پہنچا دیں گے کہ تیرے بیٹے کی کمائی ہے..... چل بیٹے.....“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اکبر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا مگر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پانچ سو لے کر اس نے خود کو بیٹھ نہیں اپنی ماں کو بھی کسی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ماں پہلے ہی بڑی مشکل زندگی گزار رہی تھی۔ مگر وہ ان کی بات ماننے پر مجبور تھا۔

انہوں نے اکبر کو ایک کرکٹ کا بیٹ دیا۔ پھر ایک بال اور کہا۔ ”یہ اس کھڑکی پر مارو..... اور ادھر جا کے کھٹی بجادو، اپنی بال مانگو۔“ آئی دروازہ کھولیں گی اور ہمیں بال دے دیں گی، بس تمہارا کام ختم۔“

”آئی ماں میں تجھے کھیشہ توڑ دیا۔“ ان میں سے ایک بولا۔ ”چلو شیشہ ہم توڑ دیتے ہیں، تم کہنا کہ میں نے تو شات مارا تھا لیکن ادھر نہیں..... ایک لڑکے نے تھرو کی، بال کھڑکی میں لگ گئی..... چلو اب زیادہ باتیں نہیں، جاؤ تیل بجادو۔“

اکبر کے تیل بجانے سے پہلے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ گئی تھی، اندر سے کسی نے کہا۔ ”کون ہے؟“

جو غصے سے لال ہو رہی تھی۔ ”یہ کرکٹ گراؤنڈ ہے تمہارا؟“ اس پاس سب گھر ہیں۔“ اس سے زیادہ بولنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا۔ اچانک اکبر کے پیچھے سے وہ تینوں دندناتے آگے بڑھے اور عورت کو دھکیل کر لے گئے۔ ایک کے ہاتھ میں ریو اور دیکھ کے عورت نے پیچ مارنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دوسرے نے اس کو دیو پھینک لیا۔ اس دھکم پیل میں اکبر پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ ایک دم پلٹا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ دروازہ اس سے پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ شاید انہیں بعد میں احساس ہوا ہوگا کہ جو سب سے آگے تھا وہ اب کہاں بھی نہیں ہے۔

اکبر بیٹ اٹھا۔ بھاگتا چلا گیا۔ اپنے فلیٹ کے احاطے میں داخل ہو کے اس نے دیکھا۔ اس کی عمر کے اور اس سے بڑے بہت سے لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکے نے گھما کے شات مارا گیند اوپر اٹھی اور سیکنڈ ٹھوک کے ایک فلیٹ کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹی غائب ہوئی۔ اکبر برک گیا، سب لڑکے اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے اور منہ اٹھا کے دوسری طرف دیکھ رہے تھے۔ چند منٹ بعد ایک عورت بال کے ساتھ گیلری میں نمودار ہوئی، اس نے نیچے دیکھا تو چھ سات ٹیوں کے پچاس ساٹھ لڑکے کھیلنے میں مصروف تھے۔ فرد جرم کسی ایک پر عائد کرنے کی ناکام کوشش کے بعد عورت نے بال پیچھے پیچھے اور واپس اندر چلی گئی۔

اکبر نے سکون کا سانس لیا۔ یہ لڑکے اسے جانتے تھے، وہ فوراً گھر جاتا تو ماں اس کے چہرے کو دیکھ کر بہت سے سوال کرتی، وہ کھیل میں شامل ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ گھر پہنچا تو ماں نے پوچھا۔ ”کہاں چلا گیا تھا بغیر بتائے، یہ بیٹ کس کا ہے؟“

”نیچے ہی تو کھیل رہا تھا ماں..... بیٹ نیم کا ہے۔“ وہ جوتے اتار کے ہاتھ دھوئے چلا گیا۔ اس کی نظر میں اب پھر ریو اور دیکھ کر پیچ مارنے والی عورت کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنی دہشت تھی، وہ تینوں ڈاکو تھے اور یقیناً انہوں نے اکبر کو دروازہ کھلوانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ پھر اب کیا ہوگا، کیا انہوں نے اس عورت کو مار دیا ہوگا؟ کیا وہ پکڑے جائیں گے؟ کیا ان کے ساتھ وہ بھی پکڑا جائے گا.....؟ عورت اسے پہچان لے گی، کیا وہ ماں کو بتائے.....؟ لیکن ماں کو بتانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ وہ کھانا بھی پورا نہیں کھا سکا اور بہانہ کر کے اٹھ گیا کہ پیٹ میں درد ہے۔ خوف سے واقعی اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ بہت رات تک وہ دروازے پر کسی دستک کا منتظر

دو دن کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے اصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بیشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ تم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے لیے ہوئے تھے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے ملنے والی سب سے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجا جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسالہ حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
53-C فیئر II کینٹین ڈائننگ سٹاک تھارٹی سین کوئی روڈ، کراچی
فون: 35895313 25802551

بستا چھوڑ کے نکل آیا۔

دوسری واردات شہر کے مخالف حصے میں مگر ایک پوش علاقے میں بالکل اسی طرح ہوئی۔ لیکن اس بار اکبر بدحواس ہو کے فرار نہیں ہوا۔ وہ ہیٹ ہاتھ میں پکڑے کچھ دور کھڑا رہا اور جب جانی اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر آیا تو اکبر نے انہیں جالیا۔ وہ پریشان ہو گئے۔

”دوست..... میرا حصہ مجھے نہیں دے دو۔“ اس نے کہا۔

”کیسا حصہ ہے..... کون ہے تو۔“ جانی کے ایک ساتھی نے کہا۔

جانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ہم تجھ پر بھروسہ کرتے ہیں، تو ہم پر بھروسہ سارہ..... اتنا نقد نہیں ہے ابھی۔“

”چلو جو بھی ہو، مگر میرے گھر مت جانا۔ ماں پریشان ہوتی ہے، پہلے بھی پولیس کو بتانا جاتی تھی۔ میں نے روک دیا۔“

جانی نے سر ہلایا اور وہ چلے گئے۔ ان کو یقیناً بڑی کامیابی ہوئی تھی۔ ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ اکبر نے اگلے دن تین اخبار خریدے۔ اس واردات کی خبر سب میں تھی۔ ڈاکو ایک عورت کو باندھ کر اس کا سارا زور اتروالے گئے تھے۔ عورت کے بیان کے مطابق ڈاکوؤں کا مددگار ایک بارہ تیرہ سال کا بچہ تھا جس نے بال لینے کے بہانے اس سے دروازہ کھلوا لیا تھا۔ ڈاکوؤں کو لاکھ کے بانڈ زبھی لے گئے تھے۔

جانی ایک ہفتے بعد نمودار ہوا۔ اس کا موڈ پھر بھیجیں دینے کا تھا مگر اکبر نے اسے اخبارات دکھائے۔ ”صرف بانڈ زبھی دولا لاکھ کے تھے، مجھے پچاس دو..... زیورات اپنے پاس رکھو۔“

جانی نے اسے گھورا۔ ”سالے حصے دار..... اگر میں انکار کروں پھر.....؟“

”مجھے پتا ہے، تم انکار نہیں کرو گے جانی بھائی۔“ اکبر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بول کہا کہ جانی کا ہاتھ اپنی جیب میں کیا۔ ایک لمبے کے لیے اکبر کو لکھ ہوا کہ وہ ریو اور نہ نکال لے کر اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں نوٹ تھے۔ ”لے پاؤ۔“ قسمت ابھی ہے تھری، اس بار میں پچاس ہی لایا تھا ورنہ جانی کو دم کی دی تھی تو نے..... سوچ مجھ کے بات کیا کر..... یہ رقم ماں کو دے گا تو خود.....؟“

اکبر نے لافانہ ہتے میں رکھ کے لمبی میں سر ہلایا۔ ”اب مجھے طریقہ آ گیا ہے، میں یہ رقم اس کے اکاؤنٹ میں بن

کے ساتھی..... دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا اور اکبر مایوس ہونے لگا۔ شاید اس روز اس کی حالت پر دم کھا کے خدا نے اس کے لیے فیعی اعداد فراہم کر دی تھی۔ وہ قیدیوں اور بیواؤں کو اس بے رحم اور خود غرض دنیا کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے شرم آئی، وہ ڈاکا ڈالنے کی ایک واردات کو جو اس نے مجبوری میں کی تھی تائید یزدی سمجھ رہا ہے۔

ایک مہینے بعد جانی اسے پھر دکھائی دے گیا۔ اس نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ”جانی بھائی..... آپ نے مجھے نہیں پہچانا، میں تو شکر یہ ادا کرنے کے لیے آپ کی تلاش میں تھا۔“

وہ اکبر کو ایک طرف لے گیا۔ ”کس بات کا شکریہ ہے۔“

”آپ نے پچیس ہزار میرے گھر پہنچا دیے۔ میرا حصہ.....“

اس نے اکبر کے ایک ہلکا سا تھپڑ مارا۔ ”سالہ حصے کی اولاد..... تو نے کسی سے ذکر نہیں کیا تھا اس بات کا.....؟“

”نہیں جانی..... میں کوئی بے وقوف ہوں، اسی لیے تو تم کلمے پھر رہے ہو کہ میں نے اپنی ماں سے بھی ذکر نہیں کیا تھا، وہاں کوئی گویا تو نہیں ہوتی تھی۔ میرا مطلب ہے کوئی ڈراڈ.....“

جانی کچھ نرم پڑا۔ ”ابے نہیں..... وہ تو ہو گئی تھی بے ہوش۔“

”بال کتنا ہاتھ لگا.....؟“

جانی نے پھر اس کے جھانپڑ مارا۔ ”تو حساب مانگ رہا ہے، سالے؟ چل پھٹ ادھر سے۔ ہم نے ترس کھا کے اتنا دے دیا۔“

اکبر کو مایوسی ہوئی۔ اسے یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ پھر میری خدمات کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔ اس کی ماں نے بالآخر وہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں ڈال دی تھی۔ اس عزم کے ساتھ کہ جب بھی کوئی طلب گار آیا، اس کے جسم کا یا رقم کا..... اس کے منہ پر مار دے گی، وہ سخت تعجب میں تھی کہ دو ہفتے گزر گئے پھر پورا مہینا، کیا سچ یہ تائید ایزدی تھی؟ کون تھا وہ نادیدہ مددگار.....؟

ایک مہینے بعد جانی پھر نظر آیا، اس نے کلاس کے باہر فٹ ہاتھ پر سے اکبر کو اشارہ کیا اور وہ سر کو دو انگلیاں دکھائے باہر آ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ کلاس روم سے بستا اٹھا کے جانے لگا تو باسٹرنے پوچھا کہ اب کہاں..... اکبر نے مصیبت سے کہا۔ ”میری چٹلون خراب ہو گئی ہے سر.....“ اور سب کو

آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ وہ ملے کر چکا تھا کہ اب پولیس آئی ان تینوں کے ساتھ یا اس عورت کے ساتھ تو وہ صاف انکار کر دے گا کہ وہ کسی کو نہیں جانتا۔ نیچے کھینچنے والے سب لڑکے کو گواہ کیا کہ وہ یہاں کرکٹ کھیل رہا تھا۔ وہ گھر تو یہاں سے بہت دور ہے۔

معلوم نہیں کب اسے نیند آ گئی، صبح ماں نے اسے اسکول جانے کے لیے بیدار کیا تو اس نے پھر پیٹ کے درد کا بہانہ کیا۔ ماں کی صورت پر اسے کچھ فکر مند نظر آئی۔ اس کے پوچھنے پر ماں نے بچے کے نیچے سے ایک لفافہ نکالا۔ ”معلوم نہیں یہ کس نے دروازے کے پیچھے سے اندر ڈالا اور کس وقت.....“

”کیا ہے اس میں.....؟“

ماں نے فکر مند سے اس کو دیکھا۔ ”پچیس ہزار روپے..... کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کروں، شاید کوئی غلطی سے یہاں ڈال گیا مگر غلطی کیسی..... وہ دروازہ ہجاکے بھی دے سکتا تھا، ہو سکتا ہے وہ لفافہ وہاں لینے آئے، کسی کو بتاؤں یا نہیں؟ پولیس تو رکھ لے گی اور کھا جائے گی، کسی اور سے کہوں تو سوا باتیں مشہور ہوں گی..... میرا تو دماغ خراب ہو رہا ہے۔“

”تم کچھ مت کرو ماں..... خاموش ہی رہو۔“ اکبر نے سب کچھ سمجھ لینے کے باوجود اپنے نیچے پر قابو رکھا۔ ماں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنی بڑی رقم کو وہ کسی کی غلطی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ لیکن جو سوال اس کے سامنے جواب کے لیے صدا دے فقیر کی طرح ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا وہ ”کیوں“ تھا۔ کسی نے یہ غلطی کیوں کی آخر..... وہ کیا چاہتا تھا، اس عنایت کا مقصد صرف مدد ہے تو کیوں اور یہ قیمت ہے کسی قسم کی تو خریدار کو کیا چاہے؟..... اس کے پاس ہے کیا، سوائے اس کے اپنے..... مگر کیا اس نے بھی ظاہر ہونے دیا کہ وہ براے فرد وخت ہے؟

اگر اس واقعے کا وہ کسی سے ذکر بھیجی کرتی تو ہر ذہن میں یہ آخری جواب ہی ہوتا۔ اس کا حسن و شباب کسی کے نزدیک اتنی قیمت ضرور رکھتا ہے، خریدار جو بھی ہوگا سامنے ضرور آئے گا اور کیوں نہ آئے جب وہ خود ضرورت ہے کا اشتہار ہی بھرتی ہے۔

اکبر دم سادھ گیا۔ ایک ہفتے تک وہ اسکول کی کھڑکی کے نوٹے شیشوں سے باہر دیکھتا رہا کہ مال غنیمت میں سے اس کا حصہ پہنچانے والا وہ دوست پھر دکھائی دے تو اس سے پوچھے کہ سب ٹھیک تو ہے نا..... وہ عورت..... وہ خود..... اس

شاید وہ اس کا علم چھ مہینے بعد ہوا۔ اس کے حساب میں اب ایک لاکھ بھی نہیں تھے مگر اسے بتایا گیا کہ کل رقم ہونے والا تھا، شاید مجھ سے بھی حساب کتاب میں غلطی ہوئی۔ وہ سوچتی ہوئی لوٹ آئی۔ اس کے اندازے پہلے بھی غلط ہو جاتے تھے جب وہ باج پانچ دس لاکھ جمع کرائی تھی یا نکلاتی تھی، نہ بینک انٹرنیٹ اس نے بھی مانگی تھی نہ اسے ملتی تھی۔

اس سے اگلی واردات میں بھر بعد بالکل مخالف سمت میں ہوئی۔ جانی کا گروہ جس کا اب اکبر چوتھا کرن بن چکا تھا بہت محتاط ہو گیا تھا۔ ایک چھٹی دو وارداتوں کی خبر نے زیادہ بالکل نہیں چلی تھی مگر ایسے واقعات روز ہونے لگتے تو پولیس کے ساتھ پبلک بھی ہوشیار ہو جاتی۔ میں نے بھر بعد بات پرانی ہوئی، شہر میں اسٹریٹ کرائم کی وارداتیں بڑھ رہی تھیں اور میڈیا والے موبائل فونز یا موٹر سائیکل اور گاڑیاں چھینے جانے کی بات زیادہ کرتے تھے۔ ڈلیٹی میں بینک لوٹے جانے پر زیادہ شور ہوتا تھا۔ گھر میں ڈاکو آجائیں تو پولیس خود اسے چوری کا مقدمہ بناتی تھی اور خبر دبانے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ زیادہ تر لوگ گھر میں ہونے والی چوریوں کو ماسیوں کی خبری سے منسوب کرتے تھے اور خود تحقیقی اقدام لیتے تھے جن میں کسی اجنبی کے لیے دروازہ نہ کھولنا شامل تھا، تاہم دروازے کھلوانے والے بھی کم ہوشیار نہ تھے۔

عملاً کچھ نہ کرنے کے باوجود اکبر ایک گروہ کے لیے انتہائی کارآمد خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ اندر کی معلومات وہ اپنے ذرائع سے حاصل کر لیتے تھے مگر اندر جانے کے لیے دروازہ اکبر کھلاتا تھا۔ چار مختلف سمتوں کی وارداتوں میں اکبر کوڑ بڑھ لاکھل گئے تھے۔ مال غنیمت کی مصفاہ تقسیم کے معاملے میں چوروں سے زیادہ ایماندار تو بعض اوقات ایمان کی تبلیغ کرنے والے بھی نہیں ہوتے۔

اکبر کے لیے رقم کو رکھنا مسئلہ بننا تھا۔ وہ اپنی ساری آمدنی ماں کے اکاؤنٹ میں نہیں ڈال سکتا تھا، اس کا ایک حل تو یہ تھا کہ وہ کسی بینک میں اکاؤنٹ کھولے۔ اس میں مشکل یہ تھی کہ اکاؤنٹ کو صرف والدین یا گارجین ہی چلا سکتے تھے۔ اس نے دوسرا طریقہ آزمایا اور پرائیویٹ خرید کر رکھنا گیا۔ قسمت اس کی کس طرح یاوری کر رہی ہے، اس کا اندازہ اکبر کو تین ماہ بعد ایک لاکھ کا انعام نکلنے پر ہوا۔

اسے اندازہ تھا کہ علم، عقل اور ذہانت سے بڑھ کر انسان کا بڑا دھوکہ دینا نہیں ہوتا خواہ وہ ترقی کے روایتی راستے پر

چلے اور محنت سے رزق حلال کمائے یا دولت مندی کا شکار نہ کٹ لے۔ اس کی ماں اور باپ کے ساتھ بھی ٹریڈی تھی کہ وہ گاؤں سے تعلق رکھتے تھے اور تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ ان پڑھ اور بے وقوف جرم پکڑے جاتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم اور ذہانت رکھنے والے بڑے بڑے بزنس کرتے تھے یا سیاست اور بھی پکڑے نہیں جاتے تھے۔

اس کی ماں کو بھی شک نہ ہو سکا کہ اکبر کی جبرمانہ سرگرمیاں کیا ہیں۔ تعلیم میں وہ ہمیشہ آگے رہا اور اس کا شریفانہ رویہ اور سعادت مندی والے اطوار سب کو متاثر کرتے رہے۔ پس منظر میں رہنے کی وجہ سے اکبر ہمیشہ محفوظ رہا۔ جانی کے دو ساتھی ایک گھر کے اندر مارے گئے جب انتہائی غیر متوقع انداز میں عورت نے ریو اور نکال کے دونوں کو شوٹ کر دیا۔ اکبر ہمیشہ سب سے پہلے نکل جاتا تھا۔ جانی بھی کھڑی سے کوکر فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ لاشوں سے پولیس لپکا پوچھتی۔ مگر عورت نے بہت کچھ بتا دیا۔

جانی دو مہینے غائب رہا۔ اکبر بھی میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہو گیا تھا۔ اس نے فائل کر کے ماں کو اپنے کالج کے نزدیک دوسرے فلیٹ میں شفٹ کر دیا۔ کرایہ ادا کرنے کی ذمہ داری بھی خود اس نے لے لی اور اس سے کہا کہ وہ ٹیوشن پڑھاتا ہے حالانکہ فلیٹ اس نے نقد خریدا تھا اور اس کے نام پر تھا مگر یہ بہادر آباد کا علاقہ تھا جہاں نسبتاً خوشحال اور تعلیم یافتہ لوگ رہتے تھے۔ یہاں کرایہ بھی زیادہ تھے اور فلیٹ بھی چمکتے تھے۔ شادو کو وہاں جانے کے بعد تشویش ہوئی مگر اکبر نے اسے مطمئن ہونے پر مجبور کر دیا۔

کئی مہینے بعد جانی اسے اچانک نظر آ گیا۔ وہ ایک عینکی سے سامان اتار کے طارق روڈ کی کسی دکان میں لے جا رہا تھا۔ اکبر سے مل کے وہ بہت خوش ہوا اور اس نے بتایا کہ اب وہ ”چھپی“ بن گیا ہے اور ایک گروہ میں شامل ہے جو اس جیسے نوجوانوں کو بانگ کا ٹنگ، سنگاپور، بینکاک اور ملائیشیا بھیجتا ہے۔ ان شہروں کا بڑا آسانی سے ملتا ہے۔ کرایہ کم ہے اور وہاں دنیا بھر کا مال ملتا ہے۔ وہ ایسی چیزیں خرید لاتا ہے جن کی پاکستان میں زیادہ ڈیمانڈ ہے۔ ایمپورٹ کے ٹیکل پر وہ چیز بہت مہنگی ہو جاتی ہے جو درحقیقت بھارت، پاکستان یا بنگلہ دیش سے ہی بن کر جاتی ہے۔ جانی کا سلیک، پرفیوم اور خاص طور پر زنا نہ مردانہ استعمال کی جنسی دوا بھی لانا تھا۔

اکبر کی عمر اب اٹھارہ سال نہیں ہوئی تھی۔ جانی نے

اسے یوں اپنا پانٹر بنالیا کہ لوکل مارکیٹ میں مال کی تقسیم اور مزید آرڈر لینے کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ یوں اکبر نے عملاً مارکیٹنگ اور لیڈر کی تربیت حاصل کی۔ انٹر پاس کال تو جانی نے اس کو شاختی کارڈ بنوایا۔ اس سے پاسپورٹ کا حصول ممکن ہوا اور اکبر نے ملک سے باہر قدم رکھا تو دیکھا کہ علامہ مرحوم صحیح فرما گئے تھے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، پہلے عشق کے بعد باقی بات ہی اس نے خود ہی سمجھ لی کہ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔

ماں کو مطمئن رکھنا اب اکبر کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ مطمئن نہ ہوتی تو کیا کرتی، بیٹا جوان تھا، اسے نہ مارا جاسکتا تھا اور نہ زبردستی گھر میں بند کیا جاسکتا تھا۔ اس نے خود ہی بتا دیا کہ وہ ایک کلاس فیلو کے ساتھ بزنس پارٹنر بن گیا ہے۔ وہ دونوں ہر چھٹی رات کو جہاز سے جاتے ہیں اور مال خریدنے میں دو دن گزار کر اتوار کی رات کو لوٹ آتے ہیں۔ پھر کی صبح وہ کالج میں حاضر ہو جاتا ہے۔

صرف ایک بار شادو نے پوچھا تھا کہ کہیں وہ اسمگلر تو نہیں بن گیا اور اکبر ہتھ پتھتے دہرا ہو گیا تھا۔ ”ایسی میری قسمت کہاں ماں۔“

”کیا مطلب۔۔۔ تو اسمگلر بننا چاہتا ہے؟“

”ارے ماں وہ لکھ پتی نہیں کروڑ پتی ہوتے ہیں۔ بہت بڑے بزنس کو چلاتے ہیں اور اب اسمگلر نہیں۔۔۔ ایمپورٹ ایکسپورٹ کھلاتے ہیں۔۔۔ تو فکر مت کر۔۔۔ تیرا بیٹا کوئی غیر اخلاقی یا غیر قانونی کام کر ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ ایک پیش امام کی بیٹی اور مولانا صفیر حسین شاہ کی اولاد ہے۔“

لیکن اکبر بڑی تیزی سے دنیا کو سمجھ رہا تھا اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ دو سال میں جب وہ بی اے کر چکا تھا اس نے بڑے دوستانہ ماحول میں جانی سے اپنا بزنس الگ کر لیا۔ خود جانی اب لاکھوں میں کھیل رہا تھا۔ اکبر کو معلوم تھا کہ وہ اسے برابر کا حصے دار نہیں سمجھتا اور اپنی اسٹادی کے زعم میں اکبر کو شاکر گردا گرد جہ دیتا ہے۔ تاہم اکبر میں ایک خاص ذہانت لوگوں سے مراسم بڑھانے اور استوار رکھنے کی کئی تھی۔ اس نے اپنی قوت برداشت کو مفادات کا تابع بنالیا تھا۔ ہر شخص اس سے متاثر ہوتا تھا۔ بڑا اس کی شائستگی اور عزت آمیز رویے سے، چھوٹا اس کے دوستانہ انداز سے اور برابر کا اس لیے کہ وہ برابری کا دعوے دار نہیں، خود کو کمتر سمجھتا ہے۔

وہ اچھے کپڑے پہنتا تھا۔ اگر بڑی بڑی روایتی سے بولتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شادو پر کیا تھا خوش شکل بھی تھا اور ذہین بھی۔۔۔ اس نے باؤی بلڈنگ کی اور اپنے جسم کو

انتہا پرکشش بنالیا کہ اس کی مردانہ وجاہت پر جنس مخالف کی نظر خود شہر جاتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بڑی کامیابی کے لیے حسین سہارا کتنا ضروری ہے اور اوپر جانے کے لیے ہر بیزمی میں اس کے ساتھ ایک غنی عورت ہونی چاہیے جو ہمہ مفت ہو۔ تنہائی کی شریک، افسر رابطہ، سیکرٹری، مشکل کشا، معاملہ فہم اور تعلق کو صرف کاروباری ضرورت سمجھ کے قبول کرنے والی۔۔۔ جو بیوی کی طرح گلے کا ہار بننے کی نہ سوچے بلکہ خود بھی ترقی کے لیے بے ضروری نہ سمجھتی ہو کہ خوب سے خوب تر تلاش کیا جائے مگر جب تک ساتھ رہے ایماندار، رازدار اور وفاداری کے بلند سہرے اصول نبھائے۔

ایسی لڑکیاں بہت کم تھیں، مگر اکبر کی نگاہ انتخاب انہیں تلاش کر لیتی تھی کیونکہ وہ خود بھی کسی کا سہارا یا آلہ کار بننے کی جستجو میں ہوتی تھیں۔ جب وہ چھپی تھا تو ایک شہر سے دوسرے شہر آتے جاتے۔ مال لاتے اور ٹھکانے لگاتے اس نے یہ سبق سیکھا کہ کیا قانون اور کیا انسان۔۔۔ سب خریدے جاسکتے ہیں، کم یا زیادہ قیمت کا انحصار باہمی فائدے کی کئی تہی پر ہوتا ہے۔

ابھی وہ چھپی سے اپورٹا ایکسپورٹ بننے کے عمل سے گزر رہا تھا کہ اس پر ماں کی بیماری کا اور موت کا صدمہ یوں آیا جیسے ہیر دیشا پر پہلا انٹریم کر گیا تھا، اس کا نام قاتل ہوا۔۔۔ ننھا بچی۔۔۔ وہ خود ایک چھوٹا سا بچہ تھا جب ایک گھر میں بال لینے داخل ہوا تھا۔ اب وہ بین الاقوامی سرحدیں پار کر کے دوسرے ملکوں میں آ جا رہا تھا مگر ماں کے سامنے ہنوز وہ لعل ہوا تھا۔ جب اپنی تمام جمع پونجی داؤ پر لگانے کے عزم کو بھی شکست ہوئی تو اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ سب کچھ اس کی قوت خرید میں نہیں ہے۔

پھر مرنے سے پہلے ماں نے اس کے سامنے اعتراف کر لیا کہ وہ کون سی۔ اس کا باپ کون تھا، اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔۔۔ وہ اپنے لیے حسب نسب کی عزت خریدنے پر بس کرتی تو شاید کچھ نہ ہوتا مگر اس کے بعد اس کے احساس محرومی نے اسے لالچ کی راہ پر دھکیل دیا۔ اس نے چوری بھی کی تو اللہ کے گھر میں۔۔۔ اللہ اس کی سزا کیوں نہ دیتا۔ اس نے بتایا کہ اس کا پیسے مصروف ہے۔ اس سے نہ وہ اپنا سہاگ بچا سکی۔ نہ اصفیٰ کی زندگی خریدی اور نہ باعزت زندگی۔۔۔ اور خود اپنی نظر میں گر گئی۔

اکبر نے بعد میں بہت سوچا۔ بہت غور کیا۔ آج وہ خود بھی اسی راہ پر گامزن تھا جس پر اس کے ماں باپ نے چلنا چاہا تھا۔ مگر وہ ناکام رہے تھے۔ اکبر نے ان کی ناکامی کے

اسباب کا تجربہ کیا اور اسی نتیجہ پر پہنچا کہ وہ گاؤں سے شہر آئے تھے، ان پڑھ تھے۔ کسری کے احساس میں مبتلا تھے اور انہوں نے مال کمانے کے لیے غلط وقت، غلط جگہ اور غلط افراد کا انتخاب کیا۔

ایک سماجیات، نفسیات، معاشیات اور کاروباری امور کے تجربہ کار تعلیم یافتہ اور جہاں دیدہ ماہر کی طرح اس نے اپنے والدین کی ہر غلطی کو لکھا اور سمجھا اور بہت سے عملی نتائج اخذ کیے جو اس کے لیے مشکل راہ ثابت ہو سکتے تھے۔

ماں کا کسی کی ناجائز اولاد ہونا کوئی غلطی نہیں تھی جیسے اصغر کا میراثی ہونا۔ ان کا نظریہ ضرورت کے تحت محبت کرنا اور شادی کر لینا مثبت قدم تھا۔ ماں کا اصغر میراثی کو سید اصغر حسین شاہ بنادینا نفرت پر مبنی سماجی رویے کے خلاف بغاوت تھی اور جائز تھی۔ اس کی ماں کا مسجد کا پیسا خورد برد کرنا بھی جائز تھا۔ جو آدمی خالی پیٹ ہو وہ حرام حلال کو دیکھے یا اپنی بھوک کو جائز طریقے سے کمانے کی ہر کوشش میں ناکامی اور ذلت اٹھانے کے بعد اس کے باپ نے وہی راستہ اختیار کیا جو اس کی ماں کے بیان کے مطابق چودھری صاحب اور شاہ جی جیسے سب عزت داروں نے اختیار کیا تھا۔

لیکن اس کے بعد ان سے بہت سی غلطیاں ہوئیں جن کا سلسلہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔ ہاتھ میں دس بیس لاکھ آتے ہی اس جگہ کو چھوڑنا غلطی تھی۔ اتنی رقم کو دو گنا یا دس گنا کرنے کے لیے راستے کھلے تھے جو محفوظ تھے، وہ کراچی آکے بزنس کر سکتے تھے۔ اس کے باپ نے مشتعل ہو کر غلطی کی۔ ہاشمی کے حوالے سے بلیک میل کرنے والے کو خریدنا جاسکتا تھا۔ اس کا منہ بند کرنے کے لیے ایک لاکھ بھی بہت ہوتے۔

پیش امام صاحب کو بلا وجہ قتل کرنا اس کی سب سے بڑی غلطی بن گیا۔ فرار کی کوششیں نہ کر کے بھی اس نے غلطی کی تھی۔ تمام مالی معاملات میں ماں کو خود مختار بنانا بھی غلط تھا۔ وہ خود پولیس سے بات کرتا اور قانونی معاملات کو خراب کرنے سے گواہوں کو خریدنے تک ہو کام کرتا۔ ایک عورت کو ان معاملات کا کیا چارہ۔ لیبر سے سب لوٹ کے کھا گئے اور شوہر کو بھگالے جانے کے بجائے خود کو جان بچا کے بھاگنا پڑا۔

خیر..... عزت دار تو ماں باپ اسے بنا ہی گئے تھے ورنہ آج وہ بھی اکبر میراثی ہوتا۔ رزق حلال اور محنت کی کمائی کے پیکر میں وہ خود نہیں پڑا ورنہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد درخواست برائے لکری کے لیے دفتروں میں خوار پھرتا۔ زندگی

نے خود اسے کامیابی کے راستے پر پہنچ لیا تھا اور وہ عملی سبق دے تھے جو اس کے آگے بڑھنے میں معاون تھے۔

دنیا بیتی ہے کہ فرسٹ ملین ہی مشکل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پیسے کو پیسا سمجھتا ہے۔ یہ پہلا ملین کوئی ذہین ترین قوم کا شاہین بچہ پھاڑوں کی چٹانوں پر بیٹھ کے نہیں کھا سکتا۔ تمام ڈگریاں لے کر اعلیٰ ترین مقابلے کے امتحان کی کسی پوسٹ سے شخص تنخواہ سے نہیں بچا سکتا۔ خصوصاً اس وقت جب وہ خود جوان ہو، اس کا عزم جوان ہو اور جذبات جوان ہوں۔ اس کے لیے واحد راستہ ناجائز ذرائع کے خازنار سے گزرتا ہے۔ آسان پسند اس پر نہ چل پاتے تو پھر کلرکی کر کے ریٹائر ہو جاتے۔

اکبر کا استاد جانی تھا جس نے اس کو خواہاں کی تعبیر بیچنے والی دنیا دکھائی۔ جو چاہو لے لو، پیسا اور ہوتا کھلے ہے۔ شخص دیکھ کر خوش ہونے کے لیے کہ لاکھ کر کوڑ بن گئے اور کوڑ کے ارب۔ ایک مختصر اور محدود زندگی میں قوت خرید دیتا ہے۔ آرام اور عیش و عشرت کے لوازمات فراہم کرتا ہے۔ سوسائٹی میں اعلیٰ مقام..... اثر رسوخ اور طاقت..... اقتدار سب کچھ خریدنا جاسکتا ہے اگر خزانے بھرے ہوئے ہوں۔

صرف بیس سال کی عمر میں اکبر ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ جس کی گندول بہت اچھی تھی۔ دینی میں اس کی ملاقات ایک پاکستانی تاجر سے ہوئی جو پہلے لندن میں جلا وطنی کی زندگی گزارتا رہا اور ملک میں حالات بہتر ہوئے تو دینی آکے سیٹل ہو گیا۔ یہ امریکا سے بہتر تھا کہ وہ کھینے میں پاکستان جانا ممکن تھا اور واپس آنے کے لیے ویزا کا حصول کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا۔ یہاں یورپ و امریکا سے زیادہ آسانیاں تھیں، صرف پیسے والوں کے لیے.....

ممتاز رشیدی فی الحال سیاست سے دور تھا اور حالات کے مزید سازگار ہونے کا انتظار کر رہا تھا جب وہ پاکستان جائے تو کم سے کم وزیر بن سکے۔ مرکزی نہ کسی صوبائی سکی۔ ایک ہی سرخاب کا پر لگنا باقی تھا، باقی تو خدا امن فضل رنی..... وہ دنیا بھر سے پرانے کپیڈ فرمز اور ری کنڈیشنڈ گاڑیاں منگوا کے پاکستان بھیج رہا تھا۔

وہ اکبر سے مل کر بہت متاثر ہوا۔ ان کی ملاقات ایک مسلم ملک کے سفارت خانے کی تقریب میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ اکبر نے انہیں ایک سیون اسٹار ہوٹل میں ڈنر کے لیے مدعو کیا جہاں وہ مقیم تھا۔ یہ ایک بزنس ڈنر تھا جس میں شرکاء صرف تین تھے۔ رشید، اس کی حسین و جمیل بیوی مہناز فاطمہ عرف مونا اور اکبر۔

”آپ اکیلے دینی آتے ہیں۔ اپنی مسز کو ساتھ نہیں لاتے۔“ مونا نے اپنے ناز و داد اور حسن و شباب کی بے ضرر ساوگی اور عنایت کے ساتھ کہا۔

”اگر وہ ہوتی تو مجھے شاید نہ لانا۔“ اکبر مسکرایا۔

”ہوتی کیا مطلب.....“ وہ معصومیت سے بولی۔

”شادی نہیں کی آپ نے؟“

”کر چکا ہوتا اگر آپ رشید صاحب سے پہلے مجھے مل گئی ہوتیں۔“ اکبر نے ایک تیرے دو شکار کیے۔ رشید کے غرور ملکیت کو بانس پر چڑھا دیا اور مونا کے حسن کو خراج تحسین پیش کر دیا۔

رشید نے کہا۔ ”تمہیں اس سے اچھی بھی مل سکتی ہے۔ دیکھو، تلاش کرو۔ ونڈو شاپنگ کرو، لندن، پیرس اور ہالی وڈ سے ہالی وڈ تک..... ایک سے ایک مال سجا ہے۔“

”میرا خیال ہے کچھ کام کی بات ہو جائے۔ مسز رشید اتنی دیر میں مینو کا مطالعہ کر کے آرڈر دینے کا مشکل کام کر سکتی ہیں۔“

مونا نے اٹھلا کے کہا۔ ”مجھے خود دیکھو کیا کھانا ہے، مجھے آپ کی پسند کا کیا پتا۔“

”پتا تو یقیناً چل گیا ہوگا۔“ اکبر معنی خیز انداز میں بولا۔ ”مگر ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔ اس میں زہر ہو تو آپ کے آرڈر پر ہم کھائیں گے۔“

رشید نے کہا۔ ”دیکھو..... تمہارے لیے ایک بزنس پروپوزل ہے میرے پاس، جو میں بہت لوگوں کو دے چکا ہوں، لیکن کسی نے سیریس ہو کے کام نہیں کیا۔ میں جو پرانے کپیڈ فرمز کے مانیٹر جہاز بھر بھر کے منگوا رہا ہوں۔ پرانے پیکر ٹیوب والے، ان سے ٹی وی بناؤ۔“

”ٹی وی بناؤں..... وہ کیسے؟“

”وہ میں بتاتا ہوں۔“ رشید بڑے انہماک سے اس کو بتانے لگا۔ ”ہاڈی ادھر سے بنواؤ۔ سرٹک چائنا سے لو، اسپیکر وغیرہ لوکل..... بہترین کلر پیکر والا پندرہ اور سترہ انچ کی وی آدھی قیمت پر مارکیٹ کرو، پاکستان میں کون پوچھتا ہے..... جو نام چاہو رکھو۔“

اس وقت جمیلی بار مونا نے میز کے نیچے اکبر کے پیر کو آہستہ سے ٹھوک ماری اور ”سوری“ کہہ کر پھر مینو دیکھنے لگی۔ آرڈر کی تعمیل ہونے تک اور کھانے کے دوران اکبر جب رشید اپنی پروڈکٹ کی تکنیکی سائڈ سے مارکیٹنگ تک ڈسکس کر رہا تھا اور یہ بتا رہا تھا کہ ایسے ٹی وی غریب لوگ مفت بھی کر لوئیں گے اور منافع کی شرح کیا ہوگی۔ تو اکبر کی توجہ مونا کی طرف

تھی۔ اس وقت مونا نے تیسری بار گنجل دیا اور اکبر نے ایک لمبے کے لیے رشید کی طرف سے نظریں ہٹائے بغیر پہلا جوابی گنجل دیا..... اگلا ڈنر دونوں بد رشید کی طرف سے تھا مگر اس سے پہلے ہی فون آ گیا۔ ”آپ آرہے ہیں نا..... میں بے چینی سے انتظار کروں گی۔“

”میرا تو دل چاہتا ہے ابھی آ جاؤں..... اجازت ہے؟“ اکبر نے کہا۔

”یہ اجازت کی نہیں، ہمت کی بات ہے جناب۔“ وہ ہنسی مگر اکبر نے جلد بازی سے گریز کیا۔ ہمت تو اس میں اتنی تھی کہ ابھی جا کے مونا کو اٹھا لانا..... لیکن وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈنر پر گیا۔ اس نے مونا کی شکایت بھری مایوس اور حوصلہ بڑھانے والی نگاہوں کو بھی نظر انداز کیا، وہ صرف رشید سے کاروباری معاملات میں الجھا رہا۔ ان کے درمیان مکمل تعاون کا انگریجمنٹ ہو گیا تھا۔ بس اسے کاروباری معاہدے کی شکل دینا باقی تھا جو ان کے قانونی مشیروں کا مسئلہ تھا۔

رشید پچاس پچپن سال کا اڈیٹر مضمض تھا جو شاید کاروبار کو حد سے زیادہ توجہ دینے یا اعتدال سے بڑھ کر شراب و شباب کے مزے لوٹنے کے باعث ٹھکن اور بڑھاپے کے احساس کا شکار تھا۔ مونا کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا کہ رشید کے مقابلے میں تیس سال کم ہے یا تیس سال..... اس نے اپنی فکر کو ایسے طریقوں سے سنبھال کر رکھا تھا کہ لباس اور میک اپ بدل کے وہ کبھی بیس کی لکھی تھی تو کبھی تیس کی..... صاف ظاہر تھا کہ اس ازدواجی تعلق کو استوار کرنے والی قوت صرف دولت کی ہے..... محبت کی نہیں.....

دو ہفتے میں کنٹریکٹ فائل ہو گیا۔ رشید اور اکبر بزنس پارٹنر بن گئے۔ پرانے کپیڈ فرمز کی پیکر ٹیوبس سے ہر برائے کی ٹی وی بنانے کا بزنس اکبر کو پاکستان میں شروع کرنا اور چلانا تھا۔ ٹیوبس کی اور کچھ دوسرے پروڈکٹ کی فراہمی رشید کی ذمہ داری تھی۔ ٹی وی سیٹ بنانے کا پاکستان کی مارکیٹ میں ڈالنا اور ویل پروڈکشن وغیرہ اکبر کے ذمہ تھا۔ رشید نے ان سٹش کو دینی کے راستے مختلف برائے نیم سے انڈیا پہنچانے کا وعدہ بھی کیا تھا کیونکہ دینی میں کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نقلی مال رکھنا سنگین جرم تھا۔

اکبر کا رشید کے ری کنڈیشنڈ گاڑوں والے بزنس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ٹی وی ٹیٹس بنانے کے بزنس میں دونوں کی سرمایہ کاری برابر تھی اور قانونی طور پر نفع نقصان میں وہ برابر

کے شریک تھے۔ ان معاملات کے طے ہونے تک اکبر بھی دینی میں پیغمبر باور اس نے رشید کا اعتماد حاصل کرنے پر زیادہ توجہ دی۔ اس کی عاجزی و انکساری محض دکھاوا تھی۔ وہ رشید کو بڑا بھائی کہتا رہا اور سیاسی داؤ بیچ اور کاروباری رموز کا ماہر رشید اس کی نفسیاتی چال کو نہ سمجھ سکا۔ وہ اکبر کی نیکی شرافت اور خلوص کا قائل ہو گیا اور اسے واقعی چھوٹا بھائی سمجھنے لگا۔

رشید کے سامنے اکبر نے مونا کو حتمہ بھائی صاحبہ کہا تو خود رشید بولا کہ بھئی یہ کیا غربت والا انداز مخاطب ہے صرف بھائی کہنا کافی ہے۔ چھوٹے بڑے ہر بھائی کی بیوی کو بھائی ہی کہا جاتا ہے۔ اکبر نے چھوٹے سے تکلف کے بعد یہ بات مان لی مگر اس رشتے میں ایک ظاہری فاصلہ رکھا۔ قربت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے بھی رشید کے بلائے بغیر اس کے گھر میں قدم نہیں رکھا۔

یہ الگ بات ہے کہ خود مونا نے اس کے ہونٹ کے لاؤنج سے کمرے تک کا فاصلہ چند روز میں طے کر لیا۔ ایک رات اس کا فون آیا۔ ”کل تم مجھے بچ پر بلارہے ہو۔“ اکبر نے کہا۔ ”نہیں تو۔“

مونا کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس کی نظر نے بہت پہلے تاڑ لیا تھا اور اس کے ذہن نے سمجھ لیا تھا کہ اکبر کی نظر میں اس کے لیے ایک CODED پیغام کیا ہے جسے اس کے شوہر کی نظر پڑھ ہی نہیں سکتی۔

اکبر نے چند سیکنڈ بعد کہا۔ ”میں نے ڈنر پر مدعو کیا تھا مونا تاکہ ہمیں کچھ فرصت اور خلوت میسر آئے۔“

مونا کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”ابھی لُج کے لیے بھی فرصت کو غنیمت جانو۔۔۔۔۔ خلوت کی بعد میں سوچیں گے۔“

اس شوخ بیانی میں نہ انداز تھا نہ انکار۔۔۔۔۔ لیکن اکبر بساط عشق کا پرانا شاطر تھا اور عورت کی ہر چال کو سمجھتا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ ان کی اگلی چال کیا ہوگی۔ اکبر نے دانستہ لُج کے لیے اب ہونٹ کے بجائے ایک انڈین ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا۔ پہلے ایک گھنٹے میں موڈ بنانے کے لیے ”سپ“ کرتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے سے محض جھوٹ بولا۔ لیکن ایک ہی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے جس کا اظہار صرف آنکھوں سے ہوا، ہونٹوں سے نہیں۔۔۔۔۔ پھر انہوں نے فون کر کے رشید کو بلا لیا۔ ”بھئی میں یہاں ایک بزنس چل رہی تھا کہ میں نے دیکھا کہ بھائی اکیلی بیٹھی ہیں۔۔۔۔۔ جس سے میری میننگ بھی اس نے معذرت کر لی۔۔۔۔۔ اس کی جگہ آ جاؤ۔“

رشید کچھ دیر میں پہنچ گیا تو مونا اور اکبر وہاں اپنے اپنے حلقہ مراتب کے خول میں سٹ گئے۔ ”آپ

جناب۔۔۔۔۔ بھائی۔۔۔۔۔ اکبر بھائی۔۔۔۔۔ لُج کے دوران کچھ ذاتی معلومات کا تبادلہ ہوا۔ اکبر نے مزید جھوٹ بولا۔ رشید نے مونا سے اپنی بے پناہ محبت کا حوالہ بھی دیا اور مونا خالص مشرقی لڑکی بن کے شرمائی بھی۔ بڑھا واقعی دیوانہ ہے لڑکی کے عشق میں۔۔۔۔۔ اس عمر میں عشق اور محبت بھی نام ہو جاتا ہے جسمانی ہوس کا۔۔۔۔۔ یہ بھی دوطرفہ طلب کا رشتہ تھا، جو کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر چل رہا تھا۔ شاید مونا سب کچھ دے رہی تھی، رشید سب کچھ دے ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن دونوں کے لیے وہ بہت تھا جو وہ ایک دوسرے کو دے رہے تھے۔

لُج کے دوران ہی مونا نے کہا۔ ”ڈارلنگ۔۔۔۔۔ تمہیں تو ناغہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ کرن مجھے کب سے بلارہی ہے۔“

”دیکھو۔۔۔۔۔ ابھی ہم یہاں ایک بزنس ڈیل فائل کر رہے ہیں۔ تم چاہو تو دو چار دن کے لیے چل جاؤ۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ تم مجھ سے دور رہ سکتی ہو، میں نہیں رہ سکتا۔“

مونا نے کسی کی پروا کے بغیر اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ ”یو آر جی اے ڈارلنگ۔۔۔۔۔ میں کل کوئی فلائٹ دیکھ لوں؟“

رشید نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”دن میں کئی بار فون کرنا ہے۔ یہ مت بھولنا۔“

”اور تم بھی مجھے آرپورٹ پر سی آف کرنا مت بھولنا۔“ وہ اٹھلا کے بولی۔

اگلے دن ایک ٹریول بیگ کے ساتھ وہ سورج غروب ہونے کے کچھ دیر بعد اکبر کے ہونٹ پہنچی۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو اکبر نے کہا۔ ”میں!“ مگر وہ اس سے پہلے ہی اندر پہنچ چکی تھی۔ اکبر واقعی حیران ہوا جب مونا نے اپنا برقعہ اتار کے پھینکا اور اس سے لپٹ گئی۔

”تم بس حیران ہوتے رہنا اور کچھ مت کرنا دیور جی۔۔۔۔۔ وہ اسے چومتے ہوئے بولی۔

رات کو مونا نے کچھ لُج بولا۔ ”میرا اصل نام مہناز فاطمہ نہیں۔۔۔۔۔ مونا سنگھ ہے، میرا تعلق انڈیا سے ہے۔“

”رشید سے شادی کے لیے تم مسلمان ہو گئیں؟“

”ہونا بڑا۔۔۔۔۔ وہ شادی کے معاملے میں پکا مسلمان ہے۔ اس کی بچی خاندانی بیوی پاکستان کے ایک گاؤں میں ہے، خاندان کے ساتھ۔۔۔۔۔ دو وہ چھوڑ چکا تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اسے چھوڑ چکی تھیں، چوتھی میں ہوں۔“

”تم اسے کب چھوڑو گی؟“ اکبر نے اسے آہستہ سے چوما۔

”کیوں چھوڑوں میں اسے۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ کٹھ کا لوبہ ہے۔۔۔۔۔ سونے کا بنا ہوا۔“

مونانے اسے دکھایا۔ ”بکواس فرماتے ہیں آپ۔۔۔۔۔ مجھے تو سچی محبت ہے اس سے۔۔۔۔۔“ مونا نے کہا اور پھر خود ہی ہنس پڑی۔

”مجھے اس کا ثبوت مانگنے کی ضرورت نہیں، وہ بھی اتنی ہی اور ایسی ہی محبت کرنا ہو گا تم سے۔۔۔۔۔“

مونانے سر ہلایا۔ ”مجھے آرپورٹ چھوڑنے آیا تھا تو بڑا اداس چہرہ بنا رکھا تھا۔ ڈرامے باز۔۔۔۔۔ اگر ابھی میں چھاپا ماروں اس کے بیڑوم پر تو مجھے معلوم ہے وہاں کون سے لے گی۔“

”اور اس نے فون کیا تمہاری بہن کو پیرس۔۔۔۔۔ پھر؟“

”کرن اور میں ایک دوسرے کے راز دار ہیں۔ اس کی صورت تو مجھ سے نہیں کئی گراؤ ڈالتی ہے، وہ اسے پیرس سے روز فون کرے گی اور میرے ڈائنامک بولے گی۔“

”ایسا تم نے بھی کیا ہو گا اس کے لیے۔۔۔۔۔ اکثر۔۔۔۔۔“

مونانے اقرار میں سر ہلایا۔ ”اس کا شوہر ایک فارم ہے، وہ پیرس کے مصافحات میں رہتے ہیں۔ کرن نے اپنا نام پانڈے نہیں بدلا بلکہ شادی کا رسمی تکلف بھی نہیں برتا۔۔۔۔۔ شئی از گئی۔۔۔۔۔ وہ یہ دستور کرن سنگھ ہے اور ایک معاہدے کے تحت بڑے کے ساتھ رہتی ہے، بڑے کے سب بیٹے اور بیٹیاں ادھر ادھر نکل گئے۔ وہ کبھی کبھار آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ڈیڈا اچھا کیا آپ نے ایک عورت رکھ لی، شاید ماں کے پاس جا کے کہتے ہوں گے کہ کبھی آپ نے اچھا کیا کہ ایک مرد رکھ لیا۔“

ڈرامائی انداز میں اکبر نے ایک دم کہا۔ ”مونا۔۔۔۔۔ رشید کو چھوڑ دو۔۔۔۔۔ مجھے سے شادی کر لو۔“

مونا اس کی سنجیدگی پر چوکی۔ ”شادی۔۔۔۔۔ ہم شادی کر چکے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ تم قانونی اور شرعی طور پر میری بیوی بن جاؤ، مجھے خوبصورت عورت نہیں، تم جیسی شریک حیات چاہیے۔ صرف ایک، تمام عمر کے لیے جو مجھے آج تک ملی نہیں تھی حالانکہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔۔۔۔۔ خود مجھے پانڈوں کہ میری زندگی میں کتنی عورتیں آئیں۔۔۔۔۔ کچھ چند دن کے لیے، کچھ چند ہفتوں کے لیے۔۔۔۔۔ ایک ہی جو سال بھر رہی لیکن وہ شادی کی قائل نہ تھی۔“

”وہ تو میں بھی نہیں۔۔۔۔۔“ مونا سمجھت کو دیکھتی رہی۔

”کیوں۔۔۔۔۔ بس بہت بھیک کچے ہم دونوں۔۔۔۔۔“

چلو اب اپنا گھر بنائیں۔۔۔۔۔ جہاں اپنے بچے ہوں جن کو ہم بڑا کریں۔۔۔۔۔ میرے ساتھ پاکستان چلو۔۔۔۔۔ میرا گھر دیکھو جو بہت بڑا ہے گروہاں میں اکیلا رہتا ہوں، اسے آباد کرو۔۔۔۔۔ وہ پسند نہ آئے تو لاہور، کراچی، اسلام آباد میں کوئی گھر پسند کرو۔۔۔۔۔ پھر اسی گھر میں ہم بوڑھے ہونے تک رہیں۔۔۔۔۔ اور مر جائیں۔۔۔۔۔“

مونا جو خاموش تھی اچانک رونے لگی۔ ”بکواس بند کرو، تم مرد اپنی باتوں سے بے وقوف بناتے ہو لیکن تمہیں یہ سب ڈرامے بازی کرنے کی کیا ضرورت ہے جب میں تمہارے پاس ہوں۔ تم جب کہو گے، جب بلاؤ گے میں آ جاؤں گی، مگر شادی کے لیے نہیں۔ تم اسے نہیں جانتے سید اکبر حسین۔۔۔۔۔ وہ کتنا POSSESIVE ہے۔۔۔۔۔ وہ مجھے قتل کر دے گا۔“

”قتل کرنا میرے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں۔“ اکبر نے بڑے عزم سے کہا۔ ”تمہیں حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں میں۔۔۔۔۔ اور تم بھی یہ بات سمجھ لو تو اچھا ہے۔ جب میں نے زندگی بھر کے لیے کہا ہے تو اس کا مطلب کچھ اور نہیں ہے، اگر کبھی تم نے مجھے چھوڑنے کا سوچا بھی۔۔۔۔۔ تو انجام اچھا نہیں ہو گا، میں تمہیں بھی مار دوں گا اور خود بھی مر جاؤں گا۔“ یہ بات کرتے ہوئے اکبر پر جیسے وحشت سوار تھی۔

مونانے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔ ”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ جیسا تم چاہتے ہو ایسا ہی ہو گا مگر ایسے نہیں۔۔۔۔۔ ذرا اپنی حالت دیکھو، بالکل پاگل لگ رہے ہو۔۔۔۔۔ ہم مل کے کچھ کریں گے۔“

اکبر نے ایک کامیاب ڈراما کیا تھا، اسے اندازہ تھا کہ مونا جیسی لڑکیوں کو اپنے خلوص نیت کا یقین دلانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ اتنی بار کھلونا بن چکی ہوتی ہیں کہ ہر مرد انہیں کھلاڑی لگتا ہے۔ اس کے باوجود ایک گھر۔۔۔۔۔ ایک محبت کرنے والے، وفادار شوہر اور اپنے بچوں کا اور پھر ان کے بچوں کی شوخی اور شرارت سے بھرا بڑھا چالاک کا وہ خواب رہتا ہے جس کی تعبیر وہ تمام عمر تلاش کرتی رہتی ہیں۔

اکبر بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ مونا جیسی لڑکیاں کبھی اچھی بیوی نہیں ہوتیں۔ انہیں اپنے گھر کے خواب کی تعبیر بچ لُج مل جائے تو بہت جلد زے داریاں اور پانڈیاں انہیں بیزار کرنے لگتی ہیں۔ پھر انہیں اپنی آزادی کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب وہ کسی ایک مرد کی غلام نہیں تھیں۔ تمام مردان کے ایک اشارہ ابرو کے غلام تھے۔

وہ بے وقوف نہیں تھا کہ مونا سے شادی کرنا۔ شادی

جذبات میں اوجھالنے لگے۔
 ”پلیز سر..... ایسا مت کہیں..... میری ماں کا دیا ہوا
 قول میرا قول ہے، میں اس پر قائم ہوں اور قائم رہوں گا۔“
 ”یعنی میں انتظار کرتا رہوں..... عزرائیل سے بھی
 کہوں کہ انتظار کرے۔ اکبر صاحب کو ابھی فرصت نہیں.....
 ”ان کا سانس چھوٹنے لگا۔

”جی نہیں..... میں ہر وقت تیار ہوں..... جب آپ
 کہیں.....“
 پروفیسر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے اکبر
 کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”اکبر میاں..... کلثوم کو میری زندگی
 میں لے جاؤ..... وہ میری اکلوتی بیٹی ہے، میں اسے باپ ہی
 نہیں، ماں بن کے بھی پال رہا ہوں۔“

”یہ کیوں..... اس کی والدہ.....“
 ”تمہیں تو کچھ پتا نہیں..... چھ مہینے ہو گئے اس کے
 انتقال کو۔“ پروفیسر نے کہا۔

اکبر کی کلثوم سے شادی انتہائی سادگی سے ہوئی۔
 حالات ایسے تھے کہ دھوم دھام کی گنجائش بھی نہ تھی۔ پروفیسر
 جیسے کلثوم کی رخصتی کے انتظار میں زندگی کی ہر سانس شمار کر رہا
 تھا۔ صرف تین دن بعد اس کی موت آپریشن ٹیبل پر ہو گئی
 حالانکہ بانی پاس میں ناک کی کتا سبب نہ ہونے کے برابر سمجھا
 جاتا ہے اور جدید سہولیات نے اسے بہت آسان کر دیا ہے مگر
 ہونے والی بات ہو گئی۔

اکبر کو مہینے بھر فرصت نہ ملی۔ وہ ایک طرف کلثوم کی
 دلجوئی کرتا تو دوسری طرف کاروباری مصروفیات کے لیے
 وقت نکالتا لیکن اسے ایک عجیب سی اطمینان اور مسرت کے
 احساس نے مغلوب رکھا۔ اس نے بروقت فیصلہ کیا تھا۔ ایک
 طرف اپنی مرحوم ماں کی وی ہوئی زبان کا پاس رکھا تھا تو
 دوسری طرف پروفیسر کے لیے ایک پرسکون موت کو آسان بنا
 دیا تھا۔ مرتے وقت اس کے دل پر کوئی بوجھ نہ تھا کہ بعد میں
 بیٹی کا کیا ہوگا۔

کلثوم ایک آئیڈیل بیوی ثابت ہوئی۔ جیسا کہ اسے
 یقین تھا۔ شوہر کی خدمت کو اپنا فرض اور وفاداری کو
 جزو ایمان سمجھنے والی..... مشرقی روایات اور وضع داری کا
 نمونہ۔ حسن صورت اور حسن سیرت کا مکمل پیکر..... صرف
 ایک مہینے میں اکبر پر واضح ہو گیا کہ مثالی عورت کیا ہوتی ہے۔
 وہ عام عورت پر کیا برتری رکھتی ہے۔ مونا جیسی عورتوں کو
 سرے سے عورت سمجھنا ہی عورت کی تذلیل سے کم نہ تھا۔
 اس ایک مہینے میں مونا نے اسے کئی فون کیے اور اس

کے لیے اس نے بہت پہلے سے ایک لڑکی کا انتخاب کر رکھا تھا
 جو درحقیقت اس کی ماں کا انتخاب تھی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور
 مہذب مذہبی گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے والد یونیورسٹی میں
 پروفیسر تھے اور لڑکی خود ہی اسے کے بعد ایم اے کرنے کا
 ارادہ رکھتی تھی مگر ملازمت کے لیے نہیں..... وہ پردہ دار تھی
 اور بلاشبہ خوبصورت بھی، اکبر کی ماں زندہ ہوتی تو شادی بھی
 ہو جاتی۔ اب وہ انتظار کر رہے تھے کہ خود اکبر کی طرف سے
 سلسلہ جذباتی کب ہوتا ہے۔ وہ ایسی لڑکی تھی جو صرف ایک
 گھر اور شوہر کی خدمت کے لیے ساری زندگی وقف کرنے کو
 اپنا ایمان سمجھتی ہیں، خواہ شوہر کا رو بار کے نام پر دنیا بھر میں
 عیاشی کرتا پھرے۔

وہ لوٹ کے پاکستان گیا تو اپنے فی وی بنانے کے
 پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں اس کے کئی مہینے لگ گئے۔ وہ
 درمیان میں صرف مونا سے ملنے دو بار دعویٰ بھی کیا اور اس کے
 لیے اپنے جال کا پسند ازید سخت کر آیا۔ مونا اب جذباتی طور
 پر اس کے دام میں گرفتار تھی اور اس وقت کی خنجر بھی جب وہ
 اس کی بیوی بنے گی، بہ ظاہر یہ کام آسان نظر نہیں آتا تھا۔
 فی وی بنانے کے بازار میں فروخت کے لیے جانے تک
 اکبر کو بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑی لیکن اسے رشید کے اندازے
 سے زیادہ کامیابی ملی۔ پاکستان میں دو اچھے تک دو مہر اور نقلی
 فروخت ہو رہی تھیں..... اور سادہ لوح انہیں سستا اور اصلی
 سمجھ کے خرید بھی رہے تھے۔

اس دوران میں اکبر کو پروفیسر صاحب کی بیماری کی خبر ملی۔
 وہ اسپتال میں تھے اور انہوں نے پیغام دے کر اکبر کو بلوایا
 تھا۔ اکبر کو معلوم ہوا کہ ہارٹ ایٹک ہوا ہے اور وہ آئی سی یو
 میں تھے لیکن اب وارڈ میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔ انہوں
 نے بتایا کہ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اب اچانک یہ بیماری آگئی
 ہے..... شاید بانی پاس ہوگا۔

اکبر نے کہا۔ ”بانی پاس معمولی بات ہے، آپ علاج
 کی یا اخراجات کی پائلز فکر نہ کریں۔“

انہوں نے کہا۔ ”اکبر میاں..... فکروں سے زندگی میں
 ایک دن کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس عمر میں یہ بیماریاں تو آئیں
 گی اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے محتاجی بھی کوئی نہیں، مگر البتہ کلثوم
 کی ہے۔“

اکبر چونکا۔ ”اب اس کی فکر کیوں ہے آپ کو؟“
 ”اس لیے کہ میں باپ ہوں اس کا..... اور تمہاری
 طرف سے خاموشی ہے، میں اس کا کیا مطلب لوں۔ جو بات
 تمہاری ماں نے کی تھی وہ اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔“ وہ

سے بار بار بولی رہی کہ وہ دینی کب آرہا ہے۔ دوبار اس نے پاکستان آنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا مگر اکبر نے اسے ٹال دیا۔ نہ اس نے مونا کو اپنی شادی کا پتا چلنے دیا اور نہ وہ چاہتا تھا کہ اسے پتا چلے۔ اس کے عزائم کچھ اور تھے جن کی تکمیل صرف مونا کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ چنانچہ موقع ملنے پر وہ مونا کو اپنی دیوانگی آمیز محبت سے دیوانہ بناتا رہا۔

کلوٹم تعلیم یافتہ، ذہین اور نیک لڑکی تھی جو کسی کے بارے میں نہ برا سوچتی تھی اور نہ چاہتی تھی، شوہر پر شک کرنا تو اس کے نزدیک گناہ عظیم تھا۔ وہ مجسم وفا تھی اور وفاداری ثابت کرنے کے لیے جان بھی دینی پڑتی تو دے سکتی تھی۔ اپنے حسن انتظام سے اس نے اکبر کے لیے گھر کو واقعی جنت بنا دیا تھا۔

گھر کی طرف سے بے فکری کے بعد اکبر نے پھر کاروبار کو زیادہ وقت دینا شروع کیا اور اس کے دینی کے چکر بھی بڑھ گئے۔ کلوٹم نے ایک بار بھی نہ شکایت کی کہ وہ اسے کم وقت دیتا ہے، نہ اس کے ساتھ دینی جانے کی خواہش ظاہر کی اور نہ اس کی مصروفیات کی نوعیت کے بارے میں کوئی سوال کیا۔

وقت آ گیا تھا کہ وہ مونا سے مطالبہ کرتا کہ رشید کو چھوڑ دے۔ اس نے ایک دن ڈرامائی انداز میں اعلان کر دیا۔ ”میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ تم اس سے طلاق مانگو۔“

”اکبر..... اسے پہلے ہی شک ہے، تم پر نہیں..... مجھ پر..... تمہیں تو وہ اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھتا ہے۔ خوب کھیل رہا ہے۔ یہ بھی تم نے..... اگر میں نے طلاق مانگی تو اس کا شک خود بخود یقین میں بدل جائے گا۔ تم جانتے نہیں اکبر..... وہ جتنا بے ضرر نظر آتا ہے، اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ مجھے قتل کروادے گا لیکن اس سے پہلے وہ جاسوس چھوڑ دے گا میرے پیچھے..... میری نقل و حرکت کی نگرانی کرے گا، اس سے تم بھی مارے جاؤ گے۔“

”پھر..... کیا اس سے پہلے کہ سانپ ڈسے مجھے اس کا بچن کچل دینا چاہیے..... دشمن کے وار کرنے سے پہلے دشمن کا خاتمہ.....“

”بالکل..... یہی کرنا ہوگا تمہیں..... تمہاری مدد میں کروں گی۔“

اکبر یوں..... ”تم کیا کر سکتی ہو۔“

”سنو..... وہ خواب آور گولیاں کھاتا ہے، کل میں اسے رات کے وقت دودھ کا گلاس دوں گی، اس میں دس

بیس گولیاں پہلے سے حل کر دوں گی، اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔ رات بارہ بجے کے بعد تم آ جاؤ۔ دروازہ کھلا ہوگا، وہ بے ہوش پڑا ہوگا..... اس کے منہ پر پتھر رکھ کے اس کا خاتمہ کر دینا..... اور نکل جانا۔“

”اور تم؟“

”میری بہن کرن کی بھابی یہاں اسپتال میں داخل ہے۔ وہ میری گواہ بنے گی کہ میں رات بھر اس کے ساتھ تھی..... رشید کی موت خود ہی سمجھی جائے گی یا سلیپنگ پلو کے زیادہ استعمال کا نتیجہ۔“

اکبر کو یہ پروگرام عین اپنے پروگرام کے مطابق لگا۔ وہ خود پولیس کو بتا دے گا کہ مونا اس رات گھر میں ہی تھی، اس کی بھابی جھوٹ بول رہی ہے۔ اور جھوٹ کا پتا بھی چل جائے گا۔ رشید کا پتا صاف ہوتے ہی وہ پورے بڑس کا مالک بن جائے گا۔ مونا ڈرائنگ..... تمہارا خوابوں کا گھر اب بڑا گھر ہوگا، سرکاری مہمان خانہ.....

اگلی رات وہ شہر پر وگرام کے مطابق رات بارہ بجے رشید کے گھر میں داخل ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ بیڈروم کس طرف ہے۔ وہ مین گیٹ کے بجائے عقبی دیوار پر چاند کے اندر پہنچا۔ اسے اندازہ تھا کہ رشید کے گھر میں گیٹ پر موجود سکیورٹی گارڈ کے علاوہ کہاں کہاں کلوزڈ سرکٹ ٹی وی کیمرے نصب ہیں۔ اپنی دانست میں اس نے سب کیمروں کو دھوکا دیا اور چکن کی طرف سے گھر کے اندر پہنچا تو سب کی نظر سے محفوظ رہا۔ اندر کی راہداری میں بھی کیمرے دونوں طرف سے تمام نقل و حرکت ریکارڈ کرتے تھے چنانچہ اس نے ایک کھڑکی کا شیش توڑا اور چکن میں اتر ا۔ وہاں سے لمحہ اسنور میں گیا۔ سرورٹ کوارٹر کی طرف سے بیڈروم کی ایک کھڑکی کا شیش توڑ کے اندر گیا۔

اکبر کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ آج کیمروں کی نوڈیشن اس طرح بدل دی گئی ہے کہ اس کی ایک ایک حرکت مسلسل فلم کی صورت میں ریکارڈ ہو رہی ہے۔ اس نے تو محتاط رہتے ہوئے وہی راست اختیار کیا تھا جو مونا نے محفوظ قرار دیا تھا۔ کمرے میں اترتے ہی اس نے نائٹ لیپ کی مدد روشنی میں رشید کو بستر پر ساکت پڑا دیکھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر جھکا اور یہ دیکھنا چاہا کہ خواب آور گولیوں کے زیر اثر وہ ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے یا ابھی زندہ ہے۔

رشید اس کے ہاتھ کا کس محسوس کرتے ہی ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ایک دم اس نے اکبر کو خود پر جھکے دیکھا اور خطرے کو محسوس کرتے ہی پیچ کر گاڑی کو طلب کرنا چاہا۔ اب اکبر کے

لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ رشید کو آؤٹ کال کے لیے ملے، اسے دلچ کرے بس کر دے۔ اپنی عمر کی طاقت کے اعتبار سے رشید نے مزاحمت کی اور خود کو بچانے کے لیے آؤٹ کال نکالی مگر اب اکبر پر خون سوار تھا، اس نے رشید کا گلا دبوچا اور اسے اپنے پیچھے دبا لیا۔ رشید کی وحشت زدہ آنکھوں نے پوچھا بھی کہ چھوٹے بھائی، تم ایسا کیوں کر رہے ہو مگر اکبر کے ہاتھوں کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی چلی گئی۔

چند منٹ میں رشید کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ اکبر کو بالکل اندازہ نہ ہوسکا کہ اس نے وہ کارڈ لیس سوچ بادی کیا تھا جس کی کھنٹی چکن میں تھی تھی۔ یہ عام حالات میں ملازم کو بلانے کے لیے بھی مگر آج ملازم چھٹی پر تھا تو نیل گیٹ پر سکیورٹی گارڈ کے پاس رکھوا دی گئی تھی۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک دم لائٹس آن ہو گئیں۔ اکبر نے سکیورٹی گارڈ کی کن کارخ اپنی طرف دیکھا، اس کی نظر نے مونا کو ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ واقعی اسپتال میں کرن کی بھابی کے ساتھ تھی۔

اکبر کا سارے کاروبار پر قبضے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ وہ آدھے سے بھی گیا اور اپنی زندگی سے بھی، پولیس نے عدالت کے سامنے اس کے اندر آنے کی اور رشید کو قتل کرنے کی پوری قلم پیش کر دی۔ اس کو جائے واردات سے گرفتار کرنے والے سکیورٹی گارڈ کے علاوہ دوسرا گواہ نوکر بن گیا۔ اس نے کہا کہ وہ سرورٹ کوارٹر میں سو رہا تھا جب رشید صاحب نے کھنٹی بجائے اسے طلب کیا۔ اس نے جا کے دیکھا تو ملازم ان پر سوار تھا۔ وہ گاڑی کی طرف بھاگا۔ اسے ڈر تھا کہ اندر جا کے اس نے رشید صاحب کو بچانے کی کوشش کی یا شور مچا یا تو وہ خود بھی مارا جائے گا اور ملازم اسے گولی مار کے بھاگ جائے گا۔ گاڑی کے پاس اسلحہ تھا۔ ہم نے ملازم کو رگنے ہاتھوں پڑلایا۔

انکار کی کہیں گنجائش نہ تھی۔ اسے گرفتار کر کے پاکستان بھیج دیا گیا جہاں اس پر تین برات پاکستان کی دفعہ تین سو دو کے تحت مقدمہ چلا۔ سیشن کورٹ میں حاضر ہو کر مونا نے رو کر اکبر کے خلاف گواہی میں کہا کہ ایک بار اس نے مونا کو بھی وغلایا تھا مگر وہ اپنے شوہر سے حد صحبت کرتی تھی۔ اس نے سختی سے ملازم کو منع کیا کہ وہ پھر ایسی بات نہ کرے۔ رشید صاحب تو اسے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے ہیں۔ اس نے قتل کی رات گھر سے اپنی غیر موجودگی کا جو سبب بتایا وہ حقیقی تھا۔ اپنے دفاع میں اکبر نے جو کہا وہ جھوٹ ثابت ہوتا چلا گیا۔ مونا بھی سکھ نہیں تھی۔ اس کا نام والدین نے مہناز فاطمہ رکھا تھا۔ وہ انڈین نہیں پاکستانی اور فیصل آباد کی رہنے والی تھی۔

اس کی کوئی بہن کرن نام کی بیوی میں نہیں تھی۔ اپنی بھابی کے نہیں اسے کرن کی نہیں اپنی بھابی کے ساتھ تھی۔

عدالت نے اسے قتل عہد کے جرم میں سزائے موت دی۔ اکبر کی مقدمہ پر اثر انداز ہونے کی ہر کوشش ناکام رہی۔ اس نے فوجداری کے سب سے بڑے وکیل کو بیرونی کی نہیں ایک کروڑ دی تھی تاکہ وہ ہائی کورٹ میں بھی اس کا دفاع کرے اور سپریم کورٹ میں بھی..... اپیل کی سماعت کے دوران ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا وکیل بک گیا ہے۔

کلوٹم نے اس تمام عرصے میں اپنے شوہر کی جان بچانے کے لیے دن رات ایک کر دیے تھے۔ اس نے تصدیق کر دی کہ مونا اب اس کے وکیل کے ساتھ رہتی ہے اور شاید اسی سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ اس وقت ہوا جب ہائی کورٹ نے اس کی اپیل مسترد کر دی۔ ابھی تک وہ رشید کی بیوہ تھی اور پانٹر شپ کے معاہدے کی ایک شق کی رو سے اگر ایک پانٹر نہ رہتا تو دوسرا خود بخود دکل کا مالک بن جاتا۔ دونوں کے نہ رہنے کی صورت میں حقوق ملکیت مہناز فاطمہ کو منتقل ہو جاتے جو رشید کی بیوہ تھی۔ اگر اکبر کی بیوی ہوتی تو شاید معاہدے میں اس کا نام بھی آتا اور نصف کی حقدار وہ بھی ہوتی مگر اکبر نے تو شادی بھی بہت بعد میں کی تھی..... اور اب مونا اس کی موت کو یقینی بنانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے شادی کر کے اپنا ٹیس کیوں خراب کرتی، اس نے وکیل صفائی کو حسن و شباب کی قوت خرید سے اپنا بنالیا تھا اور یہ اکبر کے ایک کروڑ کے مقابلے میں بڑی قیمت تھی۔

کلوٹم نے وہی کیا جو اس کے شوہر نے کیا۔ حیرت انگیز طور پر وہ گھریلو پردہ دار عورت جب اپنے سہاگ کو بچانے کے لیے لنگی تو اس نے جھجک کو بالائے طاق رکھ دیا اور اتنے اعتماد کا مظاہرہ کیا کہ اکبر کو حیران کر دیا۔ اس نے نہ صرف مقدمہ لڑا اور باہر سے اپنے شوہر کی مکمل قانونی مدد کی بلکہ جہاں ضرورت پڑی اس نے غیر قانونی مدد حاصل کرنے کی کوشش میں بھی تعاون کیا۔

اکبر نے جیل میں رہ کے بھی پاور آف اٹارنی کلوٹم کو دے دی تھی چنانچہ اس کے کاروباری امور مالی امور کو بھی اس کی گھریلو بیوی نے حیرت انگیز مہارت کے ساتھ چلایا۔ اکبر پہلے سے قائل تھا کہ دنیا میں ہر چیز خریدی جا سکتی تھی۔ کیا انصاف اور کیا قانون..... کلوٹم نے اس کے اعتماد اور یقین کو زندہ رکھا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔

یہ کلوٹم کی کوشش کا نتیجہ ہی تھا کہ موت سے چند قدم

کے قافلے پر بھی اکبر زندگی سے مایوس نہ تھا۔ اکبر جیسا اسے بتاتا گیا کلثوم ویسا ہی کرتی تھی۔ اس نے اکبر کے لیے نئے نام اور ولایت کے ساتھ نیا شناختی کارڈ حاصل کر لیا۔ پھر نیا پاسپورٹ بنوایا۔ یہ طے تھا کہ اکبر اور وہ پاکستان سے نکل جائیں گے۔ اکبر کی ہدایت کے مطابق اس نے تمام کاروبار کا بھی سودا کر لیا تھا۔ پھر اس نے اکبر کو مطلع کیا کہ نئے خریدار نے رقم ادا کر دی ہے اور اب وہ دنیا کے کسی بھی ملک میں جا کے رہنے کے لیے آزاد ہیں۔ ان کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ وہ کینیڈا یا ملائیشیا کہیں کی ٹشکنی بھی اونٹنٹ کر کے فوراً حاصل کر سکتے ہیں۔

آخری بات اکبر نے اسے یہ بتائی تھی کہ اس کی رحم کی اہل بھی مستز ہو چکی ہے۔ اب اس کو بھائی دیے جانے کی تاریخ کا انتظار ہے۔ بلیک وارنٹ موصول ہونے کے بعد کلثوم نے آخری داؤ کھلایا..... بھائی دیے جانے کے وقت جو لوگ موجود ہوتے تھے اور کلثوم کی موت کی تصدیق کرتے تھے ان میں جنیل کے علاوہ بمبشریٹ، ایک ڈاکٹر، غلام اور مولوی شامل تھے۔

پانچ کروڑ میں کلثوم نے ان سے سودا کر لیا تھا۔



سب دیکھنے والوں نے اسے بڑی بہادری کے ساتھ مسکراتے ہوئے تختہ دار کی جانب یوں جاتا دیکھا جیسے رہا ہونے والے مجرم جنیل کے دروازے کا رخ کرتے ہیں۔ وہ اس شخص کی ہمت پر حیران تھے جو موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ وہ گاڑ بھی جس نے پچھویر پہلے اس کے منہ سے یہ الفاظ سنے تھے کہ زندگی خریدی جا سکتی ہے۔

صرف ایک گھنٹے بعد وہ ایک اسٹریچر پر لیٹا ہوا تھا، اس کا جسم مردے کی طرح ساکت تھا مگر سر سے ہیر تک ڈھکی ہوئی چادر کے نیچے اکبر مسکرا رہا تھا۔ شاید ایسا پہلے بھی ہوا ہو مگر اس نے جو دولت کمائی تھی، بے مصرف نہیں کی۔ وہ اپنے لیے دوسری زندگی خریدنے میں کامیاب رہا تھا۔ پچانسی کے وقت موجود تمام سرکاری اہلکار اس کی موت کے گواہ تھے۔ ڈاکٹر نے اس کی موت کی تصدیق کی تھی، کلثوم نے زبردست شوہر پرستی کا مظاہرہ کیا تھا اور ہر ایک کو منہ مانگی قیمت پر خرید لیا تھا۔

اس کے بعد نئے والی دوسری زندگی کی ساری ڈے داری کلثوم نے قبول کی تھی۔ مجرم کی یہاں تدفین بھی ہوگی اور وہ کبھی دوبارہ کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ دستاویزات کی رو سے اکبر کو پچانسی دے دی گئی تھی اور وہ مر چکا تھا۔

اسٹریچر دھکیلنے والے آہستہ آہستہ اسے باہر کی جانب لے آئے جہاں اس کی لاش روتا کے حوالے کی جاتی تھی۔ کلثوم اس کی واحد وارث تھی۔ وہ خون کے آنسو ریتی تھی اور اس کی حالت دیکھ کر دیکھنے والوں کا بھی کلیجہ پھٹتا تھا۔ اس کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ وہ دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔

لاش کو اسٹریچر سے ایک ایسولینس میں منتقل کیا گیا جو اسی مقصد کے لیے خود کلثوم لائی تھی۔ ایسولینس جیسے ہی جنیل کے دروازے سے نکلی اکبر نے چادر ہٹائی اور ایک بقیہ مار کے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ ایسولینس ڈرائیور کی پروا کیے بغیر کلثوم کو چوم چوم کے اس کا برا حال کر دیتا۔ تم نے تو کمال کر دیا میری جان..... پھر وہ کسی وفا شعار بیوی کی طرح ہنسی۔ یہ سب آپ کی محبت کا اعجاز تھا میرے سرتاج۔

لیٹن ابھی وہ اٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ ایسولینس میں کلثوم کے مقابل بیٹھے ہوئے ایک وینڈز ہیرو ٹائپ نوجوان نے اس کے سر پر کوئی چیز ماری..... ضرب اتنی شدید تھی کہ اکبر کی آنکھوں کے سامنے موت سے زیادہ گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ اٹھنے سے پہلے وہ گر گیا۔

اس نے اپنی وفا شعار بیوی کی آواز سنی۔ ”سر نہیں، اس کی گردن توڑ دو..... تم تو جو ڈوکرائے کے ماہر ہو۔“ اکبر چلا یا۔ ”کلثوم..... یہ سب..... یہ کیا ہے، یہ کون ہے؟“

”یہ وہ ہے جو چار ماہ دس دن بعد میرا دوسرا شوہر ہوگا۔ جو میری پہلی محبت تھا۔ یہ میرا ہی نہیں تمہارے سارے کاروبار کا بھی مالک ہوگا کیونکہ تم تو سر پچکے ہو۔ تمہیں پچانسی ہوئی تھی نا..... میت گھر پہنچ گئی تو بہت سے سوگوار منتظر ہوں گے۔ وہ سب آج تمہاری تدفین میں شریک ہوں گے۔“ کلثوم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اکبر کی خریدی ہوئی زندگی کا سفر تمام ہوا، جس کی اس نے بڑی بھاری قیمت ادا کی تھی مگر اپنی اس زرخیز زندگی میں وہ صرف چالیس منٹ جیا..... اس کی عالی شان کوٹھی کے دروازے پر وہ سب سوگوار سرنگوں کھڑے تھے جن کا وہ ان داتا تھا..... نوکر چاکر..... فیکٹری کے ملازم..... دوست احباب..... شام سا!

جنیل سے بھائی پائے آنے والی میت کو اتار تے وقت ان میں سے کسی کو اندازہ نہ تھا کہ وہ چالیس منٹ کی خریدی ہوئی زندگی پانے والے کی میت ہے۔